سیّارہ ڈائجسٹ

عکسِ سیرت نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

ربِّ اعلیٰ کی نعمت پہ اعلیٰ درود
حق تعالیٰ کی منت پہ لاکھوں سلام

ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد درود
ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام

قدِ بے سایہ کے سایۂ مرحمت
ظل ممدود رافت پہ لاکھوں سلام

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

جس طرف اٹھ گئی دم میں دم آ گیا
اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

حجرِ اسود و کعبۂ جان و دِل
یعنی مُہرِ نبوت پہ لاکھوں سلام

کُل جہاں ملک اور جو کی روٹی غذا
اُس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اُس دِل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

اس بتولِ جگر پارۂ مصطفیٰ
حجلہ آرائے عفت پہ لاکھوں سلام

جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے
اُس ردائے نزاہت پہ لاکھوں سلام

سیدہ زاہرہ طیبہ طاہرہ
جانِ احمد کی راحت پہ لاکھوں سلام

وہ حسن مجتبیٰ سید الاسخیا
راکبِ دوشِ عزت پہ لاکھوں سلام

مرتضٰی شیرِ حق اشجع الاشجعین ساقیِ شیر و شربت پہ لاکھوں سلام
اصل نسل صفا وجہِ وصلِ خدا بابِ فصلِ ولایت پہ لاکھوں سلام
اولیں دافعِ اہلِ رفض و خروج چارمی رکنِ ملت پہ لاکھوں سلام
شیر شمشیر زن شاہِ خیبر شکن پرتوِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
تیرے ان دوستوں کے طفیل اے خدا بندۂ ننگِ خلقت پہ لاکھوں سلام
میرے اُستاد ماں باپ بھائی بہن اہلِ وَلد و عشیرت پہ لاکھوں سلام
ایک میرا ہی رَحمت پہ دعویٰ نہیں شاہ کی ساری اُمت پہ لاکھوں سلام
کاش محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور بھیجیں سب انکی شوکت پہ لاکھوں سلام
مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ مصطفٰی جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم

(جناب احمد رضا بریلوی)



حرف تعارف

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت طیبہ پر اہل ایمان نے تو روز اول ہی سے کہنا اور لکھنا شروع کر رکھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس محبوب پیغمبر کی حیات پاک کے بے داغ اور انسانیت کے لئے باعث اطمینان وہدایت ہونے کی گواہی دی ہے (سورہ یونس) اور آپ کی عملی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دے کر قابل تقلید واتباع قرار دیا ہے (سورہ احزاب) عملی مشاہدہ کرنے والے حسان بن ثابت کہہ اٹھے تھے کہ

"تجھ سے حسین تر میری آنکھ نے دیکھا ہی نہیں اور تجھ سے زیادہ اچھا اور خوبصورت کبھی عورتوں نے جنا ہی نہیں"۔

اہل اسلام نے جس اہتمام سے کتاب اللہ کی حفاظت، تبلیغ اور تفسیر کو حرز جاں بنایا اسی طرح حدیث نبوی اور اسوۂ حسنہ کو بھی حکم قرآنی سمجھ کو محفوظ اور اجاگر کرنے میں بھی لگے رہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ غیر مسلم اہل علم ودانش خصوصاً یورپ و امریکہ کے مستشرقین نے بھی سیرت نبوی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور اس موضوع پر بڑا کام کیا ہے جس کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ سیرت طیبہ پر غیر مسلم اہل علم ودانش کا یہ وسیع ذخیرہ تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک قسم ایسی تصانیف پر مشتمل ہے جن کے مصنفین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو ایک نکتہ چینی وعیب جوئی کا موضوع بنایا ہے تاکہ دنیا کو آپ کے پیغام رسالت سے متنفر کرنے کی ناپاک کوشش کی جائے۔ مصنفین کی دوسری قسم وہ ہے جنھوں نے اپنی طرف سے منصفانہ تحقیق وتنقید سے غیر جانبدارانہ انداز میں حقائق کی چھان بین کی ہے لیکن مستشرقین کی ایک تیسری قسم بھی ہے جنھوں نے ہمدردانہ بلکہ عقیدت مندانہ انداز میں سیرت نبوی کو مغرب کے انسان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ رومانیہ کے فاضل مستشرق (مسٹر کونسٹن ورجیل چورجیو) جو اپنے ملک کے وزیر خارجہ بھی رہے ہیں، کی کتاب (محمدؐ ایسے پیغمبر ہیں جنہیں پہچاننے کی از سرنو کوشش ہونی چاہئے) اسی تیسرے زمرے میں آتی ہے جو اس اہم اور خوبصورت تصنیف کو اردو قارئین کی نذر کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ پہلے یہ کتاب عکس سیرت کے عنوان سے بالاقساط شائع ہوئی اب اسے مکمل اور کتابی شکل میں بھی شائع کیا جارہا ہے۔

میں نے اس کتاب کو بغور پڑھا ہے۔ مصنف کی واقعی ہمدردانہ کوشش یہ ہے کہ مغرب کا انسان پیغمبر اسلام کے پیغام حق کو بڑے غور سے اور ہمدردانہ انداز سے پڑھے اور اسے پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرے۔ بڑا دلچسپ اور مفصل انداز بیان ہے۔ مصنف نے روایتی ماخذ ائے سیرت سے ہٹ کر کتب حدیث، ادب، تصوف اور اسمائے رجال سے بھی مدد لی ہے اس لئے سیرت کے بعض نئے اور منفرد گوشے عیاں ہوتے ہیں۔ اردو کے سیرت لٹریچر میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

(ڈاکٹر ظہور احمد اظہر۔ شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی)

سیّارہ ڈائجسٹ

عکسِ سیرۃ نمبر

ستر ہواں ایڈیشن اکتوبر 2006ء

مُدیرِ اعلیٰ: امجد رؤف خان

خصوصی ادارت: خلیل الرحمٰن

مُدیر: شاہ جہان

نائب مدیر: محمد ثاقب، کامران امجد

کتابت: علی احمد

کمپوزنگ: سید عادل بخاری۔

نگران پرنٹنگ: خالد محمود۔ محمد توفیق۔

سرکولیشن: محمد بشیر

ناظم اشتہارات: طارق محمود، خرم احمد لاہور۔

عام جلد -/150 روپے۔ سفید کاغذ مجلد - 300 روپے

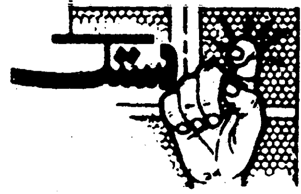
خط و کتابت و رابطہ کیلئے: 244۔ مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 45412

امجد رؤف خان پبلشر نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر

244- مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا

فہرست





الحمد للہ "سیارہ ڈائجسٹ" نے اب تک جو بھی خصوصی نمبرز شائع کئے ہیں وہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر قارئین میں بے حد مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب "سیارہ ڈائجسٹ" ایک اور نایاب ایمان افروز کتاب کا ترجمہ "عکس سیرت نمبر" کی صورت میں شائع کر رہا ہے جس میں سرور کائنات کی ایام طفولیت، نجی زندگی، پیغمبری صفات اور عسکری ذہانت کے بارے میں مخفی پہلو پیش کئے جا رہے ہیں۔ ہمارے عالم دین حضرات نے اسے اردو کے سیرت لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا ہے۔

یہ کتاب رومانیہ کے ایک دانشور کونستن ویرژیل نے لکھی ہے جو کہ اپنے ملک کے وزیر خارجہ بھی رہ چکے ہیں، یہ کتاب 20 سال عرب میں رہ کر تحقیق کے بعد تحریر کی گئی ہے۔ اس کا نام محمدؐ (ایسے پیغمبر ہیں جنہیں پہچاننے کی از سر نو کوشش ہونی چاہئے) رکھا۔ اس کتاب کا عربی فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مصنف کا انداز بیان بہت اچھا ہے۔ ان کی تحریر دل پر اثر کرتی ہے۔

عکس سیرت کے اس ایڈیشن کی تیاری میں جناب ڈاکٹر میاں محمد سلیم اختر صاحب اور جناب مشتاق بھٹی صاحب کا تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون اور اپنے مشوروں سے نوازا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ وہ مجھے اس کتاب میں اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو معاف فرمائے۔

امجد رؤف خان



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زمانہ طفولیت

محمد بن عبداللہ (ﷺ) صحیح معنوں میں ایک رنج کشیدہ شخصیت تھے۔ دنیا کے تمام نامور اور برجستہ لوگوں میں جنھوں نے اپنے بچپن اور جوانی میں مختلف زحمتیں اٹھائیں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی طرح اپنے بچپن اور جوانی میں اتنی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کی ہوں۔

جب مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو ان کے والد اس جہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔ اگرچہ محمد ﷺ کا تعلق قریش نامی قبیلے سے تھا اور یہ قبیلہ مکہ میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود محمد ﷺ کی والدہؓ اس بات پر مجبور ہو گئیں کہ اپنے عزیز و اقارب کے پاس مدینہ چلی جائیں تاکہ شاید ان لوگوں کی مدد سے اپنے فرزند کی پرورش کر سکیں کیونکہ (حضرت) عبداللہ کی وفات کے بعد اس طفل یتیم اور اسؐ کی ماں کے پاس مال دنیا سے کچھ نہ رہا تھا۔

جب ماں اور بیٹا مدینہ پہنچے تو محمد ﷺ کی والدہ جن کا نام آمنہؓ تھا اور جو اس وقت جوان بھی تھیں، اپنے شوہر کی موت کا غم بھلانے اور تنہائی اور تہی دستی میں اپنے آپ کو تسلی دینے کی خاطر شعر کہنے اور پڑھنے کا سہارا لیتی تھیں۔

اس زمانے میں جزیرۃ العرب میں معزز طبقے کی خواتین شعر کہنے کا ذوق رکھتی تھیں اور مجھے (یعنی اس تحقیقی کتاب کے مصنف جو کہ رومانیہ کا ایک دانشور ہے) آمنہؓ کے کہے ہوئے چند اشعار جمع کرنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔

اسلامی تاریخ کے مؤرخین میں سے تین افراد یعنی ''سیوطی'' ''ابن سعد'' اور ''حمید اللہ'' لکھتے ہیں کہ جب محمد ﷺ مدینہ پہنچے تو ایک ایسا واقع پیش آیا جو اس طفل کے لئے بالکل نیا تھا۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ مدینہ پہنچنے کے بعد محمد ﷺ نے پہلی مرتبہ پانی کے ایک تالاب میں پیراکی کی اور اپنے بدن کو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا پایا۔

مکہ میں پانی اور اشیائے خورد و نوش کی قلت تھی اور وہاں کوئی تالاب بھی موجود نہیں تھا کہ جہاں شدید گرمیوں کے دنوں میں بچے پیراکی کر سکیں لیکن مدینہ میں پانی کا تالاب موجود تھا اور وہاں کے بچے اپنے کپڑے اتار کر پانی میں کود جاتے تھے اور شدید گرمی میں ٹھنڈک اور خنکی کے احساس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس دن کمسن محمد ﷺ بھی تالاب میں اترے لیکن زندگی میں پہلی بار۔

حضرت آمنہؓ کے رشتہ داروں نے مرحوم عبداللہؓ کی جوان بیوہ کی ہر ممکن مدد کی لیکن افسوس کہ مدینہ پہنچنے کے بعد محمد ﷺ کی والدہ بیمار ہو گئیں اور جلد ہی ان کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ سب کو ان کی عنقریب موت کا یقین ہو گیا۔

عرب قوم میں یہ رواج تھا کہ جب کسی کی موت واقع ہونے لگتی یعنی اس پر نزاع کی حالت طاری ہو جاتی تو نزدیکی رشتہ دار اس کے گرد جمع ہو جاتے اور مرنے والے کے ساتھ مسلسل گفتگو کرنا شروع کر دیتے تاکہ وہ آخری لمحات میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے

اور خوفزدہ نہ ہو۔

وہ لوگ جو حضرت آمنہؓ کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے تھے ان کے ساتھ بلاتوقف باتیں کرنے میں مشغول تھے تاکہ وہ جوان خاتون خوفزدہ نہ ہو اور حضرت آمنہؓ بھی کبھی کبھی زیر لب کچھ کہتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

ناگہاں ایک موقع پر ننھے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ ان کی والدہ اب جواب نہیں دے رہیں تو اپنا سر ماں کے سینے پر رکھ کر شیون کناں کہنے لگے "ماں..... ماں..... جواب کیوں نہیں دیتی؟"

لیکن روح اس جوان خاتون کے جسم سے پرواز کر چکی تھی۔

وہ عورتیں جو حضرت آمنہؓ کی نزدیکی رشتہ دار تھیں انہوں نے حضرت آمنہؓ کے جسم کو غسل دیا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی والدہ کو کفن پہنے ہوئے دیکھا اور اس کے بعد انہیں ابوا نامی قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

جزیرۃ العرب میں یہ رواج نہیں تھا کہ میت کو تابوت میں رکھ کر دفنایا جائے کیونکہ لکڑی کی کمیابی کے باعث تابوت کا مہیا کرنا بہت مہنگا پڑتا تھا لہٰذا آمنہؓ کو بھی دوسری اموات کی طرح تابوت کے بغیر ہی دفن کر دیا گیا۔

حضرت آمنہؓ کی قبر کو ڈھانپنے کے بعد جب عزیز و اقارب واپس لوٹنے لگے تو انہوں نے دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کے ہمراہ نہیں ہیں لہٰذا جب وہ لوگ قبرستان آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ماں کی قبر پر بیٹھے ہوئے انہیں پکار رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "ماں گھر کیوں نہیں چلتی۔ کیا تو نہیں جانتی کہ تیرے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں؟"

خورد سال محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو ماں اور باپ دونوں طرف سے یتیم ہو چکے تھے اپنا سارا دن گوشہ نشینی میں گزارتے اور جب ان کے ہم عمر بچے ان کو کھیلنے کی دعوت دیتے تو وہ جواب میں کہتے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میں تمہارے ساتھ نہیں کھیل سکتا۔

ماں کی موت نے اس معصوم بچےؐ کو کچھ اس طرح ملول اور رنجیدہ خاطر بنا دیا تھا کہ اس نے کھانا پینا ترک کر دیا اور حضرت آمنہؓ کے رشتہ داروں کو شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ یہ بچہ روز بروز کمزور اور نحیف ہوتا جا رہا ہے۔

محمد ﷺ کے دادا عبدالمطلبؓ مکہ میں رہتے تھے اور وہ ایک سو آٹھ سال کی عمر کے ایک معمر انسان تھے۔ آمنہؓ کے رشتہ داروں نے اس طفل یتیم کو اس کے دادا کے پاس بھیج دیا۔

عبدالمطلبؓ نے جب محمد ﷺ کو دیکھا تو اس بچے کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی اور انہیں محمد ﷺ سے اتنا لگاؤ ہو گیا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ "الندوہ" لے جانے لگے۔

الندوہ دراصل مکہ کی "مجلس شوریٰ" کا نام تھا جس میں صرف قبیلہء قریش کے مردوں کو شرکت کرنے کی اجازت تھی اور وہ بھی اس شرط پر کہ ان کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو چکی ہو۔

لیکن عبدالمطلبؓ کمسن محمد ﷺ کو اپنے ہمراہ الندوہ لے گئے اور پہلے ہی دن اس مجلس کے ارکان نے عبدالمطلبؓ پر یہ اعتراض اٹھایا کہ وہ ایک بچے کو بڑوں کی مجلس میں کیوں لائے ہیں لیکن بعد میں وہ لوگ بھی کچھ اس طرح اس بچے کی محبت میں سرشار ہو گئے کہ ہر بار جب محمد ﷺ اپنے دادا کے ساتھ اس مجلس میں آتے تو قریش کے بزرگ ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے اور ان سے نوازش کرتے تھے۔

لیکن افسوس کہ عبدالمطلبؓ بھی دو سال کے بعد ایک سو دس سال کی عمر میں دارفانی کو وداع کہہ گئے اور محمد ﷺ ایک بار پھر بے یار و مددگار رہ گئے۔

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کی عمر آٹھ سال تھی اور ان کے چچا ابوطالبؓ نے ان کی دیکھ بھال اور سرپرستی کے فرائض سنبھال لئے۔

"ابوطالبؓ" پیغمبر ﷺ کے چچا کی کنیت تھی۔

ظہور اسلام سے قبل عرب باشندے لڑکی ذات سے متنفر تھے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے تاکہ ان کی دیکھ بھال اور پرورش جیسی "شرم آور" ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی زحمت میں نہ پڑیں۔

لیکن اس کے برعکس لڑکے کی پیدائش پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے کیونکہ ایک عرب مرد کے ہاں لڑکے کا ہونا اس کے لئے سربلندی اور افتخار کا باعث ہوتا تھا اور وہ اس لڑکے کا نام اپنے نام کی جگہ استعمال کرتا تھا جسے کنیت کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر "ابو طالب" یعنی طالب کا باپ اور پیغمبر اسلام کے چچا کا "طالب" نامی ایک لڑکا تھا جس کا نام انہوں نے اپنی شناخت کے لئے استعمال کیا ہے [وضاحت : تاریخی روایات کے مطابق ابو طالب کا اصل نام عبدالمناف تھا اور حضرت محمد ﷺ کے دادا عبدالمطلبؓ کا اصلی نام عامر تھا۔ تاہم انہیں "شیبہ" کے لقب سے بھی پہچانا جاتا تھا (خلیل)]

خود محمد ﷺ بن عبداللہ کا کنیہ قاسم تھا۔ کیونکہ ان کا قاسم نامی ایک فرزند تھا جو کم عمری میں ہی فوت ہو چکا تھا۔

پیغمبر ﷺ کے چچا ایک شریف لیکن بے بضاعت انسان تھے اور ان پر اپنے کثیر خاندان کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی۔ وہ کمسن محمد ﷺ کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے سے قاصر تھے لہٰذا وہ طفل یتیم آٹھ سال کی عمر میں ہی اپنی زندگی کا بوجھ اٹھانے کی خاطر محنت و مزدوری کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اگرچہ ابو طالبؓ محمد ﷺ کے چچا تھے اور بظاہر ان کی سرپرستی کرتے تھے لیکن اپنے بڑے خاندان کی معاشی ضروریات کے پیش نظر وہ حضرت محمد ﷺ کی رفاہی اور بنیادی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے تھے، نہ تو ان کے لئے کپڑے خرید سکتے تھے اور نہ ہی اس طفل یتیم کو پاؤں میں پہننے کے لئے کوئی پاپوش فراہم کر سکتے تھے۔ لہٰذا عمر کے اس حصے میں جہاں دوسرے بچے اپنا تمام وقت کھیل کود میں گزارتے ہیں وہاں محمد ﷺ مجبور تھے کہ حصول معاش کی خاطر سارا دن کام کریں اور وہ بھی دشوار ترین کاموں میں سے

ایک یعنی موسم گرما میں جزیرۃ العرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں مویشیوں کی دیکھ بھال!

حضرت محمد ﷺ کے دوران طفولیت میں تحقیق کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ قابلیت اور استعداد کہ جس کی بنا پر وہ طفل یتیمؐ اللہ کی طرف سے آخر کار پیغمبری کے لئے مبعوث ہوا' بچپن سے ہی اسؐ میں موجود تھی اور اسی زمانے سے جب محمد ﷺ جزیرۃ العرب کے گرم صحراؤں میں گلہ چرانے جاتے تھے ان کی یہ عادت بن چکی تھی کہ اپنے آپ میں کھو کر سوچوں میں ڈوب جائیں..... اور صحرا غور و فکر کرنے و اپنے آپ میں ڈوب جانے کے لئے بہترین جگہ ہے۔

دنیا کے قدیم اور عظیم مذاہب اسی وجہ سے تپتے صحراؤں سے ظہور پذیر ہوئے کہ ان ادیان کے لانے والوں کو یہ صلاحیت حاصل تھی کہ وہ لامتناہی صحراؤں میں اللہ' اس کی خلقت اور بشریت کے بارے میں غور و خوض کر سکیں۔

جب تک کوئی انسان "جزیرۃ العرب" اور "مشرق قریب" کے صحراؤں میں کچھ عرصہ بسر نہ کرے وہ نہیں سمجھ سکتا کہ صحرا کی وسعت اور اس کا سکوت کس انداز میں اس کے افکار میں پھیلاؤ اور اس کی سوچوں میں استحکام کا سبب بنتا ہے۔

حتیٰ کہ جزیرۃ العرب اور مشرق قریب کے صحراؤں کے پودے اور بوٹے بھی یورپی پودوں سے مختلف ہیں۔ ان گرم صحراؤں میں کوئی بوٹا ایسا نہیں ملے گا جو معطر نہ ہو اور حتیٰ کہ جزیرۃ العرب کے صحرا کے کانٹے بھی جنہیں "خار مغیلان" کہا جاتا ہے ایک دل پسند خوشبو کے حامل ہیں۔

اگر یورپ کے ادنیٰ اور بے خوشبو پھولوں کو جزیرۃ العرب کے گرم صحراؤں میں لاکر بویا جائے تو ایک دو نسل کے بعد انہی ادنیٰ پھولوں میں سے خوشبو پھوٹنے لگے اور یورپ کے کوتاہ پودے ایک درخت کا روپ دھار لیں۔

جو لوگ جزیرۃ العرب اور "مشرق نزدیک" کے صحراؤں میں زندگی بسر کرتے تھے وہ اگر کسی عقیدے پر کاربند ہو جاتے تو اس میں ریاکاری سے کام نہ لیتے اور اس عقیدے کو

دینوی امور کے لئے استعمال نہیں کرتے تھے۔

جزیرۃ العرب اور مشرق قریب کے گرم صحراؤں میں اگر کوئی کسی عقیدے کو اپنا لیتا تو اس پر قائم رہتا اور اس عقیدے پر ثابت قدم رہنے کو اپنا فرض تصور کرتا تھا۔

شک و تردید اور فرقے بندیاں اس وقت شروع ہوئیں جب دنیا کے عظیم مذاہب صحرا سے باہر نکلے اور ایسی سرزمینوں میں پھیلے جہاں صحرا نہیں تھا تو اس وقت جن لوگوں نے اس مذہب کو صحرا میں پہچانا اور اپنایا تھا انہوں نے اعتراض اٹھایا اور منشعب ہوئے اور اس طرح یہودیت، مسیحیت اور اسلام میں گوناں گوں فرقوں نے جنم لیا۔

بہرحال پیغمبر اسلامؐ آٹھ سال کی کم عمر میں ہی اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی خاطر صحرا میں گلہ چرانے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ہر صبح شہر سے باہر نکل جاتے اور شام گئے تک اکیلے ہی صحرا میں وقت بسر کرتے تھے۔ اکثر اوقات لامحدود آسمان اور لامتناہی افق پر نظریں جمائے رکھتے اور سورج ڈھلنے سے پہلے مویشیوں کو لے کر واپس آبادی میں لوٹ آتے اور رات بسر کرنے کے لئے اپنے چچا ابو طالبؓ کے ہاں چلے جاتے تھے۔

دراصل یہ تسلیم شدہ بات ہے یتیم بچے عقلی اور شعوری طور پر عام بچوں سے کہیں پیشتر تکمیل کے مراحل طے کر لیتے ہیں کیونکہ انہیں پیار اور لاڈ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی ان کے چہرے سے غم کا غبار دھونے کی کوشش کرتا ہے۔

کوئی ماں باپ ایک یتیم بچے کو اپنی آغوش میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ نہیں دیتا اور نہ ہی عید جیسے مواقع پر کوئی یتیموں کے لئے نئے جوتے اور کپڑے خریدتا ہے۔

وہ بچہ جس کا باپ ہو نہ ماں اور جو آٹھ سال کی عمر میں محنت اور مزدوری کرنے پر مجبور ہو جائے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیتا ہے کہ اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے پر بھروسہ نہ کرے اور اپنی مشکلات کا حل خود ہی تلاش کرے۔

ایک دن جب محمد ﷺ گلے کو چرانے کے بعد صحرا سے واپس لوٹ رہے تھے، تو جن لوگوں نے انہیں دیکھا ان کا بیان ہے کہ اس معصوم بچے کے پاؤں برہنہ تھے اور برہنہ

پار ریگستان کی تپتی ریت پر قدم اٹھا رہا تھا۔

بے پناہ مشکلات' تنہائی اور ذمہ داری کے احساس نے محمد ﷺ کو کچھ اس طرح قبل از وقت فہیم اور متین بنا دیا تھا کہ جب انؐ کی عمر صرف بارہ سال تھی تو ابو طالب نے انہیں اپنے ساتھ سفر پر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا ابو طالبؓ ایک تاجر تھے۔ وہ محمد ﷺ کو اپنے ہمراہ شام لے گئے۔ شام کے شہر "بصرہ" کے نزدیک ان کا کارواں ٹھہرا۔ جس جگہ کارواں نے پڑاؤ کیا وہاں ایک صومعہ تھا جس میں "بحیراء" نامی شخص زندگی بسر کرتا تھا۔

سریانی (SYRIAC) زبان میں بحیراء کا مطلب ہے "عبقری" یا نابغہ یا "بزرگ دانشور"۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ شخص اس زمانے کی دنیائے مسیحیت کا بلند مرتبہ عالم تھا۔

ایک عرب سیرت نگار "ابن ہشام" لکھتا ہے کہ عام لوگوں کے تصور کے برعکس "بحیراء" دراصل مسیحی نہیں تھا بلکہ ایک "مانوی" زاہد ہوتا تھا۔ وہ "مانی" نام کے ایسے شخص کا پیروکار تھا جس نے ساسانیوں کے دور سلطنت میں نبوت کا دعویٰ کیا اور ساسانی سلسلے کے بادشاہ بہرام اول نے سن ۲۷۶ عیسوی میں اسے ایران کے صوبہ خوزستان کے ایک شہر "جندی شاپور" کے دروازے پر مصلوب کروا دیا تھا۔

(وضاحت : "مانی" جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا قدیم ایران کا نامور نقاش تھا۔ وہ ۲۱۶ء میں مشہور شہر بابل کے نزدیک ایک قصبے میں جس کا نام "مارڈیز" تھا' پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام بابک بن ابوبزرام اور ماں کا نام مریم تھا۔ اس کا سلسلہ نسب مشہور "اشکانی" سلسلے سے جا ملتا ہے۔ مانی روحانی طبابت میں بھی عمل دخل رکھتا تھا۔ ایک تاریخی روایت کے مطابق اس نے شاہی خاندان کے ایک فرد کو جو خطرناک بیماری میں مبتلا تھا شفا دینے کا وعدہ کیا لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا لہٰذا اسی بنا پر اس وقت کے بادشاہ بہرام اول نے اسے جیل بھجوا دیا۔ وہ چھبیس دن تک جندی شاہ پور کی جیل میں رہا اور وہاں اسے زنجیروں سے باندھ کر اتنا کسا گیا کہ اس کی جان نکل گئی۔ مورخہ ۲۶ فروری ۲۷۶ء بروز سوموار مانی

کی موت واقع ہوئی جس کے بعد اس کا سربدن سے جدا کر کے باقی بدن میں بھوسہ بھروا کر شہر کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ یہ دروازہ عہد اسلامی میں بھی "باب مانی" کے نام سے مشہور تھا۔ عیسائیوں نے مانی کو "زندیق" (بدعتی) کے نام سے پکارا ہے کیونکہ اس نے عیسائی مذہب میں ترقی پسندانہ افکار کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کی مشہور کتاب کا نام "ارژنگ" ہے جو اس کے نظریات اور عقائد کے علاوہ خوبصورت تصاویر سے بھی مزین تھی۔ اس کی دوسری کتابوں میں کتاب الاسرار' رسالہ اشنین' زندہ انجیل اور کنزالحیات بھی خاصی مشہور ہیں۔ مانی کی ایک اور کتاب "کفلایہ" کا بڑا حصہ "قبطی" زبان میں آج بھی موجود ہے۔ (خلیل)

مانی جو نبوت کا دعویدار تھا اور اس کے پیروکار جن میں "بحیراء" بھی شامل تھا اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ خدا کسی خاص امت کے لئے نہیں بلکہ اس کا تعلق دنیا کی تمام اقوام سے ہے۔ اس جہان کی ہر قوم خدا کی مخلوق ہے اور وہ جب چاہے کسی بھی قوم میں پیغمبر بھیج سکتا ہے جو اسی قوم کی زبان میں ان سے گفتگو کرے اور احکام خداوندی کو ان تک پہنچائے۔ لہٰذا یہودیوں اور عیسائیوں کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی برتر قوم کہلائیں اور یہ اصرار کریں کہ دوسری قوموں کو ان کا دین اپنا لینا چاہئے۔ بحیراء نے اس دن تک اپنے صومعہ سے باہر قدم نہیں نکالا تھا اور نہ کسی کارواں کے مسافر سے گفتگو کی تھی لیکن اس دن جب بارہ سالہ محمد ﷺ اپنے قافلے کے ہمراہ اس علاقے میں داخل ہوئے تو بحیراء اپنی عبادت گاہ سے باہر نکلا اور ابوطالبؓ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک قافلہ یہاں آئے گا جس میں ایک لڑکا شامل ہے جو اللہ کی طرف سے عرب قوم میں پیغمبری کے لئے مبعوث ہو گا اور عربی زبان میں اپنی ہدایات جاری کرے گا۔ لہٰذا تم لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کے دین کو اپنانے پر مجبور نہ ہو گے کیونکہ اللہ تمہارے لئے ایک پیغمبر مبعوث کرنے والا ہے۔

ہو سکتا ہے اس کتاب کے پڑھنے والے' مجھ مصنف (کونستان ورژیل) پر یہ

اعتراض اٹھائیں کہ بحیراء نے پیغمبر اسلام کے بارے میں جو اظہار نظر کیا ہے وہ صرف ایک روایت ہے اور تاریخ کا علم اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

میں اس تنقید کو تسلیم کرتا ہوں کیونکہ تاریخ کا علم اس مانوی زاہد (یعنی بحیراء) کے نظریئے کی تائید نہیں کرتا کیونکہ اس کے لئے استدلال کی ضرورت ہے لیکن ہمیں اس بات کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کا ایک حصہ روایات پر مبنی ہے اور اگر ہم ان روایات کو قبول نہ کریں تو ہم تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کو نہ تو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ لکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا جہاں بھی ہماری اطلاعات کا دارومدار روایات پر ہو گا میں اس نکتے کی وضاحت کر دوں گا۔

حضرت عبداللہؓ کی سرگزشت

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا تعلق قریش نامی قبیلے سے تھا اور مکہ کے قریش دس مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔

قریش کا ہر قبیلہ اپنے داخلی معاملات میں خودمختار ہوتا تھا اور دوسرے ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

قریش کے دس قبیلوں میں سے ایک کا نام تھا "ہاشم"۔ رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلبؓ اس قبیلے کے سربراہ تھے اور وہ مکہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ ان دنوں مکہ کی سرزمین کا رقبہ تقریباً" دو سو مربع کلومیٹر تھا اور اس وسیع خطے میں ایک درخت بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مکہ کے رہنے والے دو طریقوں سے اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرتے تھے ایک تجارت اور دوسرے مویشیوں' خاص طور پر اونٹوں کی پرورش کے ذریعے۔

نہ صرف قریش کے دس قبیلوں بلکہ دوسرے عرب قبائل میں بھی شتر یعنی اونٹ کی اہمیت معاشی لحاظ سے ہی قابل ذکر نہیں بلکہ کسی کے ہاں اونٹ کا ہونا خاندانی اعزاز اور

طبقاتی برتری کی علامت بھی تصور کیا جاتا تھا۔

ایک بدوی عرب (بیابان یا صحرا میں رہنے والا) جب تک اونٹ کی پرورش اور دیکھ بھال کو اپنا پیشہ بنائے رکھتا تو اس دور کے معاشرے میں اسے ایک اعلیٰ اور معزز طبقے کے فرد کی حیثیت حاصل ہوتی تھی اور اگر وہ بھیڑ اور بکریوں کو پالنے کا مشغلہ اپنا لیتا تو وہ اپنی برتری کھو بیٹھتا اور ایک درمیانے طبقے کے فرد میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

ایک عرب ریگستان میں زندگی بسر کرتا' اونٹوں کی پرورش کرتا اور ایک خاص قبیلے سے منسوب ہوتا تھا۔ عرب قوم میں انفرادی زندگی بسر کرنے کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا۔

جس طرح ایک ایٹم اکیلا نہیں رہ سکتا اور وہ مجبور ہے کہ دوسرے ایٹموں کے ساتھ مل کر ایک مالیکیول کی شکل اختیار کرے تاکہ اپنے وجود کو برقرار رکھ سکے' اسی طرح اس زمانے میں ایک عرب بھی صرف اور صرف اپنے قبیلے کے ساتھ وابستہ رہ کر ہی اپنی شناخت کو برقرار رکھ سکتا تھا۔

اگر کبھی کوئی قتل واقع ہو جاتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل سے قصاص لینے کی بجائے اس کے تمام قبیلے سے انتقام لیتا تھا۔

اگرچہ قبیلے کے سربراہ کی حیثیت ایک بادشاہ جیسی ہوتی تھی یعنی اسے تمام اختیارات حاصل تھے لیکن اس کے باوجود اس کے پاس بھی اونٹ کے سوا شان و شوکت والی کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی تھی۔

عبدالمطلبؓ جو ہاشمی خاندان کے سربراہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا' ان کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے خدا سے نرینہ اولاد کی دعا مانگی اور یہ نذر بھی کی کہ اگر اللہ نے مجھے دس بیٹے عطا کئے تو میں اپنے دسویں بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گا۔

اللہ نے ان کی خواہش کی تکمیل کی اور ان کے ہاں دس بیٹوں نے جنم لیا اور ان کا

آخری فرزند جس نام عبداللہؓ تھا' عبدالمطلبؓ کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ خوبرو اور حسین دکھائی دیتا تھا۔

عبدالمطلبؓ اپنے دسویں بیٹے کی پیدائش کے بعد عبداللہ کے سن بلوغ تک پہنچنے کا انتظار کرتے رہے کیونکہ قربانی کرنے کی ایک شرط یہ تھی کہ وہ لڑکا بالغ ہو جائے اور اس وقت عبدالمطلبؓ خود اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلا کر قربانی کا فریضہ انجام دیں۔ جیسے جیسے عبداللہ بڑے ہوتے گئے ان کی خوبصورتی اور وجاہت میں اضافہ ہوتا گیا۔

بہرحال عبداللہ کے بالغ ہو جانے کے بعد ان کے والد نے اپنے عہد کو پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

جزیرۃ العرب کے باشندے چاہے ان کا تعلق قبیلہ قریش سے ہوتا یا دوسرے قبیلوں سے' اپنے عہد کا پاس رکھتے تھے اور جب بھی ادھار لیتے تو اپنا قرض مقررہ وقت پر ادا کرتے اور اگر کوئی وعدہ کرتے تو اسے معینہ وقت پر پورا کرتے تھے۔ ایک بدوی شخص جیسا سوچتا اسی کو زبان پر لاتا اور اس کی سوچ اور کلام میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے عبدالمطلبؓ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے عہد کو پورا کریں۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ وہ ایک "حنیف" تصور کئے جاتے تھے اور حنیف اسے کہا جاتا ہے جو سچے خدا اور آسمان و زمین کے حقیقی خالق کی تلاش میں ہو۔

اس وقت مکہ میں چند لوگ (کہ تاریخ میں جن کا نام ثبت ہے) ایسے تھے جن کا شمار حنیفوں میں ہوتا تھا اور عبدالمطلبؓ ان میں سے ایک تھے۔

عبدالمطلبؓ اگرچہ حنیف تھے تاہم اپنے آباؤ اجداد کے خداؤں کا انکار نہ کرتے اور ان میں سے کچھ کو بادیدۂ احترام بھی دیکھتے تھے۔

عبدالمطلبؓ اگرچہ یہ جانتے تھے کہ عبداللہؓ کو قربان کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تاہم انہوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا کہ وہ خدا جس کی تلاش میری زندگی کا نصب العین ہے وہ بہت عظیم اور بے نیاز ہے اور میں جو اس کا بندہ

ہوں جب یہ دیکھتا ہوں کہ میرا مقروض اپنا قرض ادا کرنے کے قابل نہیں تو اپنی طلب سے چشم پوشی کرلیتا ہوں تو کیا وہ اللہ جس نے اس زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے وہ اپنے ایک ادنٰی بندے کے قرض سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

لیکن عبدالمطلبؓ یہ کیسے جان سکتے تھے کہ اللہ ان کی قربانی میں چھوٹ دے سکتا ہے یا نہیں؟

اس بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی "عارف" یعنی ایک شخص سے مدد لی جائے جسے آسمانی رموز سے واقفیت حاصل ہو۔

ان دنوں یثرب کے شہر (آج کا مدینہ) میں ایک عارف رہتا تھا جو آسمانی احکامات اور اشاروں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ عبدالمطلبؓ ایک اونٹ پر سوار ہو کر یثرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اس لحاظ سے اونٹنی کا انتخاب نہیں کیا کہ عربوں کے نزدیک اونٹنی ایک باتجمل اور گراں قیمت جانور تصور کی جاتی تھی وہ اسے صرف اونٹوں کی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اس زمانے میں سفید اونٹنی کی قیمت بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔

عبدالمطلبؓ اونٹ پر سوار گیارہ دن کا سفر طے کرنے کے بعد یثرب پہنچے اور بلا وقفہ مذکورہ عارف کے ہاں حاضر ہو گئے اور اس کے سامنے اپنا مدعا پیش کر دیا۔

عارف نے آسمان کے ستاروں پر نظر ڈالنے کے بعد کہا کہ وہ اللہ جس سے تو نے دس بیٹوں کی آرزو کی تھی وہ اس شرط پر تیرے دسویں بیٹے کے خون سے چشم پوشی کرنے پر رضامند ہے کہ تو اس کا خون بہا یعنی (دیہ) ادا کرے۔

جزیرۃ العرب میں انسانی خون کی قیمت اونٹ کی شکل میں ادا کی جاتی تھی للٰہذا عبدالمطلبؓ نے عارف سے پوچھا کہ اگر میں دس اونٹ دیہ کے طور پر ادا کروں تو کیا اللہ راضی ہو جائے گا؟

عارف نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

عبدالمطلبؓ نے رفتہ رفتہ اونٹوں کی تعداد جب ایک سو تک بڑھا دی تو اس وقت عارف نے کہا کہ اللہ نے تیرے "دیہ" کو قبول کر لیا ہے۔

اس کے بعد عبدالمطلبؓ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کی جگہ اللہ کی راہ میں ایک سو اونٹوں کی قربانی دے دی۔

برسوں بعد جب عبداللہ کے اکلوتے بیٹے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبری کے رتبے پر فائز ہوئے اور ان پر قرآن نازل ہوا تو اللہ نے انسانی قتل کے خون بہا یعنی "دیہ" کے لئے ایک سو اونٹ مقرر کئے لیکن اس شرط پر کہ وہ قتل جان بوجھ کر کسی قبائلی منصوبے کے تحت واقع نہ ہوا ہو۔

جب حضرت عبداللہؓ کی جان اللہ کی طرف سے بخش دی گئی اور ان کی بجائے ایک سو اونٹوں کی قربانی دے دی گئی تو کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے حضرت آمنہؓ کے ساتھ ازدواجی بندھن باندھا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت آمنہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ آپؐ اس جہاں میں آنکھیں کھولیں آپؐ کے والد عبداللہؓ کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔



مکہ پر حملے کا سال اور عربوں کی قبائلی زندگی

عربوں کا کہنا ہے کہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے جبکہ بتوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ مکہ آنے والی دوسری قوموں اور قبیلوں کے مذہبی آثار بھی کعبہ میں موجود تھے تاکہ وہاں پہنچنے کے بعد ہر کوئی اپنے مخصوص خدا کی پرستش کر سکے۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصاویر بھی وہاں موجود تھیں۔

حرم کا مطلب ہے محفوظ علاقہ اور کعبہ ایسے مقام پر واقع تھا جسے ہم اپنی زبان میں ایک بے طرف علاقہ کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی کسی کو یہ اجازت نہیں تھی کہ حرم کی حدود میں کسی دوسرے سے تنازعہ کرے (اور آج بھی ایسا ہی ہے) حتیٰ کہ جب دو خونی دشمن حرم میں داخل ہو جاتے تو انہیں عارضی طور پر ہی سہی اپنی دشمنی اور عداوت کو فراموش کرنا پڑتا تھا۔

وہ مسافر اور کارواں جو چاہے کہیں سے بھی آتے انہیں حرم میں داخل ہونے کے

بعد اپنے مخصوص خداؤں کی پرستش کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی تاہم ہر قوم اور قبیلے کا اپنا ایک علیحدہ حجرہ یا علاقہ ہوتا تھا جہاں وہ اپنے خدا کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

جب جزیرۃ العرب کے جنوب میں واقع ملک حبشہ (آج کا یمن) کے نائب السلطنت (گورنر) ابرہہ نے خانہ کعبہ کو مٹانے کا عزم کیا تو وہ ایک طویل راستہ طے کرنے کے بعد مکہ کے نزدیک پہنچا لیکن اس سے پہلے ایک چھوٹے شہر میں داخل ہوا جس کا نام طائف تھا جو آج بھی موجود ہے۔

طائف کے رہنے والوں نے اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ابرہہ سے کہا کہ تجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ تو جیسے بھی چاہے خانہ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے لیکن تجھ سے ہماری درخواست ہے کہ وہاں پر موجود ہمارے خداؤں کے حجرے کو ویران مت کرنا اور ابرہہ نے بھی بظاہر ان کی درخواست کو قبول کر لیا۔

طائف کا شہر سطح سمندر سے دو ہزار پانچ سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس زمانے میں بھی وہاں پانی' درخت اور سرسبز کھیت پائے جاتے تھے اور آج بھی اس علاقے میں کھیتی باڑی اور شجرکاری وافر مقدار میں ہوتی ہے۔

طائف کے رہنے والے اہل مکہ کے سامنے اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ لوگ گندم کی روٹی کھاتے ہیں۔

اس بات میں حقیقت موجود ہے کہ مکہ کے رہنے والے روٹی کا استعمال بہت کم کرتے تھے کیونکہ گندم کو دوسرے شہر سے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ ان کی اصلی غذا کھجور' اونٹ کے دودھ' صحرائی جانوروں اور خشک مچھلیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ مچھلی کو بحیرۂ احمر کے ساحل سے لایا جاتا تھا کیونکہ مکہ اور بحیرۂ احمر کے درمیان زیادہ فاصلہ موجود نہیں تھا۔

چونکہ مکہ سمندر سے قریب تھا لہٰذا مکہ کے رہنے والے سمندری جانوروں منجملہ شارک مچھلی کو پہچانتے تھے اور اس کا نام اپنی شناخت کے لئے استعمال کرتے تھے اور لفظ قریش کے معنی ہیں ''چھوٹی شارک مچھلی''۔

(وضاحت : بعض علمائے کرام نے لفظ قریش کو "تقرش" سے ماخوذ کیا ہے جس کے معنی اکتساب اور تجارت کے ہیں۔ تاہم قدیم عربی زبان میں قریش کا مطلب وہی ہے جو رومانیہ کے مصنف نے تحریر کیا ہے۔ مترجم)

اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جس بنا پر ابرہہ نے خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کی ٹھانی تھی اس کی وجہ زیادہ تر اقتصادی اور معاشی مطمع نظر تھی۔ ابرہہ حبشہ کی فوج کا سپہ سالار تھا اور حبشہ کے نائب السلطنہ کے احکام کی پیروی کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا لیکن اس نے غداری اور بغاوت کے ذریعے علاقائی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اس وقت کے گورنر کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد خود اس کی جگہ سنبھال لی۔ بعد میں حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے بادل نخواستہ اس کی حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا۔

ابرہہ ایک موقع پرست اور شان و شوکت اور جاہ و جلال کا بھوکا انسان تھا۔ اس نے عبرستان کے جنوب میں جو "کتبے" چھوڑے ہیں میں نے خود انہیں دیکھا ہے جو اس کی جاہ طلبی کا ثبوت ہیں۔ ان تمام کتبوں میں اس نے اپنے آپ کو مختلف القاب اور عناوین سے نوازا ہے۔

اس خود پسند شخص نے بین الاقوامی تجارت کا مرکز مکہ سے صحرائے عرب کے جنوب میں واقع صفا نامی شہر میں منتقل کرنے کے لئے وہاں ایک نیا کعبہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ تاہم ابرہہ کا "کعبہ" کلیسا کی شکل کا تھا کیونکہ ابرہہ عیسائی مذہب کا پیروکار تھا۔ مذکورہ کعبہ بہر حال تعمیر کے مراحل کو پہنچا اور اس کی تعمیر میں حصہ لینے والے چند افراد کے نام تاریخ میں درج ہیں۔

جب ابرہہ کا نیا کعبہ کلیسا کی شکل میں بن کر تیار ہو گیا تو ابرہہ کو یہ جان کر بہت حیرت اور مایوسی ہوئی کہ اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود مکہ میں موجود خانہ کعبہ کی اہمیت و افادیت اور تقدس و احترام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی بین الاقوامی تجارت کا مرکز مکہ سے صفا میں منتقل ہو سکا۔ لہٰذا اس نے جھنجھلا کر ایک بڑی فوج کے

ساتھ مکہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تاکہ اپنے منصوبے کی شکست اور اس شکست سے حاصل ہونے والی خفت و خواری کو مٹانے کے لئے خانہ کعبہ کو صفحہ ہستی سے مٹا دے!

چونکہ ابرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا تھا لہٰذا اہل عرب نے اس کی لشکر کشی کے راستوں کو صراط فیل کا نام دیا اور وہ چشمے جو اس کی راہ میں آئے انہیں "عین الفیل" پکارا گیا اور جس مقام سے وہ مکہ میں داخل ہوا اسے "باب الفیل" کہا گیا اور حتیٰ کہ سن ۵۷۰ عیسوی میں جب ابرہہ مکہ میں داخل ہوا تو وہ سال اہل عرب میں "عام الفیل" کے نام سے مشہور ہوا اور یہی سال رسول اللہ ﷺ کی ولادت کا سال بھی ہے۔

انجیل میں جیسا کہ یوحنا نے لکھا ہے (اور ہم جانتے ہیں کہ فی الوقت چار مختلف انجیلیں موجود ہیں) کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے پیغام کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھو اور میں بھی اللہ کی بارگاہ میں تمہارے لئے دعائے خیر کروں گا اور وہ (یعنی اللہ) میرے بعد تمہارے لئے ایک "فارا قلیط" بھیجے گا اور میں تمہیں یتیم نہ ہونے دوں گا۔" یعنی تمہیں بے سرپرست نہیں چھوڑوں گا۔

"فارا قلیط" ایک یونانی لفظ ہے۔ جو یوحنا کی انجیل میں آیا ہے۔ یونانی زبان میں "فارا قلیط" کا مطلب ہے تسلی دینے والا، ہمت بڑھانے والا اور حمایت کرنے والا۔

یوحنا کے کہنے کے مطابق جو کہ چار انجیلوں میں سے ایک کا لکھنے والا ہے، حضرت عیسیٰؑ نے اس سے پہلے کہ وہ اس جہان سے رخصت ہوں اپنے پیروکاروں سے کہا تھا کہ میرے بعد ایک ایسا شخص آئے گا جو تمہاری حمایت اور مدد کرے گا۔

عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کا مقصود نظریہ تھا کہ وہ شخص یعنی "فارا قلیط" امت عیسیٰؑ اور اللہ کے درمیان رابطہ برقرار کرے گا کہ عیسائی قوم بے یار و مددگار نہ رہ جائے۔ مزید برآں اہل مسیحیت کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے پچاس دن بعد "فارا قلیط" جو وہی "روح القدس" ہے، ظاہر ہوا اور اس وقت سے اب تک اللہ اور عیسائیوں

کے درمیان واسطہ بنا ہوا ہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے کلام میں رد و بدل کر دیا ہے کیونکہ حضرت مسیحؑ نے کہا تھا کہ میرے بعد پریکلیطاس (Precletus) آئے گا۔ یونانی زبان میں اس کلمے کا مطلب ہے "احمدؐ" اور احمد کے معنی ہیں "ستودہ" یعنی جس کی تعریف کی گئی ہو اور محمد(ﷺ) یعنی جس کی بہت زیادہ تعریف کی گئی ہو۔

روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے بھی اس کلمے کو پریکلیطاس ہی پڑھا تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ بشارت دی ہے کہ ان کے بعد "احمدؐ" آئے گا کیونکہ ایک اور روایت کی رو سے جس رات پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت ہوئی یہودی بہت مضطرب تھے اور (حضرت) آمنہؓ کے فرزند کی پیدائش سے خوفزدہ تھے۔

روایت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی والدہ (حضرت) آمنہؓ یہ کہتی تھیں کہ حاملگی کے دوران انہیں بچے کا وزن محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اور ایک دوسرے روایت کے مطابق محمد ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو ختنہ شدہ تھے۔

اگرچہ یہودی یہ جان چکے تھے کہ وہ شخص جس کا ذکر یوحنا کی انجیل میں ہوا ہے وہ اس دنیا میں قدم رکھ چکا ہے لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کے دنیا میں آنے کے بعد بھی اہل مکہ اور صحرائے عرب کے دوسرے علاقوں میں رہنے والوں کی طرز زندگی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی کیونکہ جزیرۃ العرب میں ایک پیامبر کا پیدا ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ تصور نہیں ہوتا تھا۔

جزیرۃ العرب نے ایک روایت کی بنا پر ایک لاکھ چوبیس ہزار، دوسری روایت کے مطابق ایک لاکھ اور ایک اور روایت کی رو سے چالیس ہزار پیغمبر اس دنیا کو پیش کئے اور اس دنیا کے تین توحیدی مذہب، یہودیت، مسیحیت اور اسلام بھی جزیرۃ العرب سے ہی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ بشرطیکہ ہم دریائے روم کے مشرقی کناروں کو بھی جزیرۃ العرب کا حصہ تصور کریں۔

اگرچہ ہم تمام پیغمبروں کو نہیں پہچانتے لیکن ان میں سے سینکڑوں کے ناموں سے واقف ہیں۔ ان کی زندگی کی تاریخ سے (بر حسب روایات) کم و بیش آگاہی رکھتے ہیں۔

یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ عرب باشندے ایک پیغمبر کی پیدائش پر حیرت اور تعجب کا اظہار نہیں کرتے تھے کیونکہ اس قسم کے واقعات کو وہ اپنی تاریخ کے مختلف دورانیوں میں کئی بار دیکھ چکے تھے۔ حتیٰ کہ (حضرت) آمنہؓ نے جب یہ سنا کہ ان کے بطن میں جو فرزند ہے وہ ایک پیغمبر ہے تو انہوں نے زیادہ حیرانی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ جزیرۃ العرب کی سر زمین ایسی جگہ تھی جہاں نہ صرف پیغمبر کی پیدائش کو ایک انوکھا واقعہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اللہ اور انسان کے باہمی رابطے کو بھی حیرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ وہ تمام پیامبر جو جزیرۃ العرب سے اٹھے وہ (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اللہ کے ساتھ ہمکلام ہوتے رہے ہیں۔

اللہ سب جگہ موجود ہے لیکن آج بھی جبکہ اکیسویں صدی کا زمانہ ہے جو لوگ اللہ کے ساتھ راز و نیاز کرنا چاہتے ہیں وہ جزیرۃ العرب ہی کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ یہودی کنعان کا راستہ پکڑتا ہے' عیسائی بیت المقدس کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور مسلمان کعبہ کی طرف چل نکلتا ہے۔

دوسرے ملک ایک ایسی عمارت کی مثال ہیں جو تکمیل کے مراحل سے گزر چکی ہو اور جس کی مختلف منزلیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکی ہوں اور ان منزلوں کے درمیان بھاری بھرکم دیواروں نے رکاوٹیں کھڑی کر دی ہوں اور ان میں سے بعض منزلوں میں اللہ موجود ہو' کچھ میں فرشتے اور کچھ میں انسان زندگی بسر کرتا ہو۔ (وضاحت: اس مثال سے مصنف کا نقطہء نظر یہ ہے کہ اگرچہ اللہ سب جگہ موجود ہے لیکن انسانوں نے اپنے آپ کو اپنی کوتاہ فکری کے دائرے میں محدود و محبوس کر لیا ہے۔ مترجم)

لیکن جزیرۃ العرب کے ریگستانوں میں جس طرح ایسی کوئی رکاوٹ موجود نہیں جو نظروں کے سامنے آئے اور جس طرف بھی نگاہ ڈالیں لامحدود صحرا اور بے پایاں آسمان ہی دکھائی دے گا' اسی طرح وہاں پر اللہ اور فرشتوں کو پہچاننے میں بھی کوئی رکاوٹ موجود نہیں

ہے۔ جب جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں اللہ کے ساتھ رابطہ برقرار کرنا کوئی انہونی بات نہیں تو یقیناً ایک پیغمبر کی پیدائش بھی کوئی حیران کن واقعہ تصور نہیں ہوتی تھی۔

روایت ہے کہ حضرت آمنہؓ کے علاوہ حضرت محمد ﷺ کے دوسرے رشتہ دار بھی یہ جان چکے تھے کہ وہ بچہ ایک پیغمبر ہے لیکن اس کے باوجود وہ انہیں تعجب خیز نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے اور حضرت محمد ﷺ کی دیکھ بھال اور پرورش کا طریقہ بھی دوسرے عام بچوں کی دیکھ بھال کے طریقہ کار سے مختلف نہیں تھا۔

شاید اسی وجہ سے اس طفل کو ایک عام بچے کی طرح دیکھا جاتا تھا۔ نہ صرف پیغمبر بن کر دنیا میں آنا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا بلکہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ ایک پیغمبر اپنی رسالت کو پایہء تکمیل تک پہنچا سکے۔

جزیرۃ العرب میں ایک لاکھ چوبیس ہزار یا چالیس ہزار پیغمبر پیدا ہوئے لیکن ان میں سے جو اپنے مشن کو پایہء تکمیل تک پہنچا سکے ان کی تعداد بہت محدود ہے اور وہ جو اپنی ذمہ داری کو نبھانے میں کامیاب ہوئے انہوں نے جزیرۃ العرب کے وسیع صحراؤں کے دامن ہی میں پرورش پائی تھی۔

میں (یعنی کونسٹن ویرژیل) یہاں مجبور ہوں کہ کچھ حاشیہ میں جاؤں تاکہ اپنا مطلب بہتر طور پر ادا کر سکوں۔

عرب باشندے شروع میں جزیرۃ العرب کے جنوب میں زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ علاقہ بہت سرسبز اور شاداب تھا جسے عربستان خضیب (Khozab) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یونانیوں نے اس خطے کو عربیہ فلیکس (Arabia Flex) کا نام دیا جس کا مطلب ہے "بارونق بلاد عرب" یا "حاصل خیز بلاد عرب"۔

مختلف جنگوں، خشک سالیوں اور پانی کے ڈیموں کی خرابی اور ویرانی کی بنا پر جنہیں وہ دریاؤں پر باندھتے تھے، عربی قوم مختلف ادوار (دورانوں) میں جزیرۃ العرب کے جنوبی حصے سے کوچ کرنے پر مجبور ہو گئی اور چونکہ جنوب کی طرف مزید پیش قدمی کرنے میں سمندر

حائل تھا لہٰذا انہوں نے مجبور ہو کر شمال کا راستہ اختیار کیا اور یوں اس مہاجرت کی بنا پر انہیں "صحراگرد" یا "بدوی" بننا پڑا۔ جب جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں قوم عرب کی نقل و حرکت شروع ہو گئی تو انہیں خشک اور وسیع صحراؤں میں مشکلات سے بھرپور زندگی گزارنے کے تقاضوں پر پورا اترنا پڑا۔ اس مہاجرت کے دوران اگرچہ کچھ لوگ سختیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی جانیں گنوا بیٹھتے لیکن جو لوگ زندہ بچ جاتے وہ اس کڑی آزمائش سے گزرنے کے بعد ایک مضبوط اور باارادہ شخصیت میں تبدیل ہو جاتے تھے۔

"ڈارون" (جس نے بقائے حیات کا نظریہ پیش کیا) کہتا ہے کہ حیوانات کی دنیا میں وہی زندہ رہتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں جن میں اپنے ماحول اور گرد و پیش کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ کمزور' بزدل' ناتواں اور بے عقل حیوانٔ جلد ہی نابودی اور نیستی کے گرداب میں پھنس کر فنا ہو جاتے ہیں۔

جزیرۃ العرب کے سہمناک صحراؤں میں بھی وہی لوگ زندہ بچتے تھے جو نہ صرف جسمانی توانائی کی بنا پر بلکہ روحانی لحاظ سے بھی زندہ رہنے کے مستحق ہوتے تھے۔

صحرائے عرب کی بے آب و گیاہ سرزمین میں جہاں کھانے کے لئے صرف خار مغیلاں یا صحرائی جانور ہی یافت ہوتے تھے زندگی بسر کرنے کی پہلی شرط یہ تھی کہ ہر شخص جسمانی استقامت اور روحانی پائیداری کا حامل ہو اور اپنے قبیلے یا طائفے کے نظم و ضبط اور اس کے قوانین کی بے چون و چراں اطاعت کر سکے۔

حتیٰ کہ آج جبکہ موٹر کار اور ہوائی جہاز کا زمانہ ہے کوئی بھی شخص جزیرۃ العرب کے لق و دق صحرا میں اکیلے بسر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ بھوک و پیاس اور کہیں سے مدد نہ ملنے کی مایوسی اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو گی لیکن اگر مذکورہ شخص کسی صحرائی قبیلے کے ساتھ زندگی بسر کرے اور اس قبیلے کے قانون کی پیروی کرے تو قبیلے کے افراد اس کی مدد کریں گے اور ایک طائفے کی اجتماعی کوششوں سے ایسی بہت سی مشکلات پر قابو پا لیا جاتا ہے جن سے انفرادی طور پر نبٹنا ممکن نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں طائفے یا قبیلے کی اہمیت اتنی زیادہ ہو گئی کہ جب بھی کوئی شخص اپنے قبیلے کی طرف سے ٹھکرا دیا جاتا اور کوئی دوسرا قبیلہ اسے پناہ نہ دیتا تو اس کی مثال شہد کی اس مکھی جیسی ہوتی جسے چھتے سے باہر نکال دیا جائے اور یوں اس کے نیست و نابود ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

لیکن ایک صحرا نشین قبیلے میں زندگی گزارنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص معاشی لحاظ سے آسودہ خاطر ہو جائے اور اسے مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ایک بدوی عرب کے لئے بھوک اور پیاس کو برداشت کرنا کچھ اس طرح اس کی خو میں شامل ہو جاتا تھا گویا بھوکا اور پیاسا رہنا اس کی فطرت کا حصہ ہو۔

دنیائے قدیم کے تمام عرب مرد اور عورتیں اپنے لباس کے نیچے ایک کمر بند (بیلٹ) کا استعمال کرتے تھے جسے وہ مضبوطی کے ساتھ اپنے پیٹ پر باندھ لیتے تاکہ اس کے دباؤ کی بنا پر انہیں بھوک کا احساس نہ ہو لیکن اگر کبھی کبھار مذکورہ کمر بند بھی بھوک کا احساس مٹانے میں کارگر ثابت نہ ہوتا تو کمر بند اور پیٹ کے درمیان ایک پتھر بھی رکھ لیتے تھے تاکہ اس پتھر کا بوجھ اپنے پیٹ پر محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو فریب دے سکیں اور یہ تصور کریں کہ ان کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔

دوران جاہلیت کا مشہور شاعر "شنفرہ" اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

میں اپنی بھوک کو دھوکا دے سکتا ہوں اور پیاس کی شدت کا گلا گھونٹ سکتا ہوں اور اگر پھر بھی بھوک کی آواز بلند ہو جائے تو میں اسے اپنے معدے میں کچھ اس طرح مروڑ ڈالوں گا کہ کوئی چمار بھی جوتا سیتے وقت دھاگے کو اتنے پیچ و تاب نہیں دیتا۔

گرسنگی اور تشنگی یعنی بھوک اور پیاس کے مقابلے میں ایک بدوی عرب کی قوت برداشت اتنی زیادہ تھی اور ہے کہ دوسرے علاقوں کے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ صحرائے عرب میں ایک اونٹ بھوک کی تاب نہ لاتے ہوئے

اپنے بدن کے سارے بال کھا گیا اور اس کے بدن پر ایک بال بھی نہ بچا۔

جزیرۃ العرب میں بہار کا موسم یا بقول عربوں کے "فصل ربیع" صرف تین ہفتے تک قائم رہتا ہے۔ ان تین ہفتوں میں آسمان سے بارش برستی ہے اور ان علاقوں میں جو ریت سے ڈھکے ہوئے نہ ہوں سبزہ سر اٹھاتا ہے جو بعد میں گرمی کے شروع ہونے پر خار مغیلاں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

فصل بہار میں جب صحرا سبز پوش ہوتا اور صحرائی ہرنیں خوراک کی تلاش میں وہاں آتیں تو عرب باشندے ان کا شکار کر سکتے تھے وگرنہ اس فصل کے بعد چونکہ صحرا بے آب و گیاہ ہو جاتا تو انہیں کوئی شکار بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔

جزیرۃ العرب کے بدوی باشندے جب شہر نشین ہو جاتے تو وہاں بھی اپنی صحرائی زندگی کی تمام تر خصوصیات کو برقرار رکھتے اور صرف خیموں میں رہنے کی بجائے شہر کے گھروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔

مکہ' مدینہ اور طائف میں جن کا شمار جزیرۃ العرب کے شہروں میں ہوتا تھا' ہر قبیلہ صحرا میں رہنے والوں کی طرح اپنے لئے مخصوص جگہ اور معینہ حدود کا انتخاب کرتا تھا اور کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے کے ساتھ مل کر نہیں رہتا تھا۔

ایک عرب چونکہ ہمیشہ نقل مکانی کرتا رہتا تھا اور اسے اپنے اونٹوں کے ہمراہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا پڑتا تھا اسی لئے وہ وزنی اشیاء کا استعمال نہیں کرتا تھا اور اس کا گھریلو سامان ضروریات زندگی کی کم سے کم چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

مکہ میں قریش کے بزرگ بھی اپنے گھروں میں ایسی ہی زندگی بسر کرتے تھے اور جیسا کہ ایک بار پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ان کے پاس اونٹ کے سوا ظاہری آن بان والی کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی تھی۔

حضرت عائشہؓ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہؓ کہتی ہیں کہ جب تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ تھے ہمارے گھر میں ایک چھلنی بھی موجود نہ تھی جس کے ذریعے ہم کبھی کبھار روٹی

پکانے کے لئے آٹا چھان سکیں۔

قریش کے جن قبیلوں نے مکہ میں سکونت اختیار کی اور اپنی زندگی کے ڈھانچے میں تبدیلی نہ آنے دی' وہ اپنے بچوں کو ان کی پیدائش کے بعد دایہ کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ ان کے بچے صحرا میں پرورش پائیں اور پروان چڑھیں۔

اگرچہ بچوں کو دایہ کے سپرد کرنا عربوں کا ایک رواج تھا لیکن اس کی دو علیحدہ وجوہات بھی تھیں۔

پہلی وجہ یہ کہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مکہ کی آب و ہوا نقصان دہ ہے اور جو بچے مکہ میں پروان چڑھیں وہ بچپن ہی میں فوت ہو جاتے ہیں۔

یہ نظریہ کسی حد تک ٹھیک بھی تھا کیونکہ مکہ میں جراثیموں سے پیدا ہونے والے مختلف امراض بچوں کی زندگی کے لئے خطرہ بنے رہتے تھے۔ جبکہ صحرا کا ماحول جراثیموں سے پاک تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ شیرخوار بچے کو دایہ کے سپرد کرنے سے مختلف عرب قبیلوں کے درمیان نئے تعلقات کا اضافہ ہوتا تھا کیونکہ دودھ پلانے والی دایہ کے بچے اور وہ بچہ جس نے اس کی چھاتی سے دودھ پیا ہو آپس میں "رضاعی بھائی" کہلاتے تھے اور عربوں کے ہاں ایسے بھائی کو حقیقی بھائی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بعد قریش کی رسم کے مطابق ان کے سر کے بال منڈوا دیئے گئے اور ان کے بالوں کے وزن کے برابر فقیروں میں سونا تقسیم کیا گیا۔

ایک نومولود کے سر کے بال زیادہ وزنی یا بھاری نہیں ہوتے لیکن قریش اس رسم کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اگر دنیا کے کسی بھی گوشے میں نومولود بچے کے سر کے بالوں کو منڈوا کر تولا جائے اور اس کے وزن کے برابر سونا صدقے میں دیا جائے تو جان لیجئے کہ یہ وہی رسم ہے جو عربوں نے قائم کی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر کے بال اتروانے کے بعد انہیں دایہ کے سپرد کر دیا گیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی دو دایہ تھیں کہ اسلامی تاریخ میں ان دو میں سے ایک یعنی پہلی دایہ کا تذکرہ بہت کم ہوا ہے۔ شاید اسلامی مؤرخین نے محمد ﷺ کی پہلی دایہ کا تذکرہ اس بنا پر کم کیا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے چچا ابی لہب کی کنیز تھی۔ ابی لہب مسلمانوں کے نزدیک بہت ہی منفور شخص ہے کیونکہ اس نے پیغمبر اسلام کو اذیت و آزار پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ابدی لعنت سے دوچار کیا اور فرمایا: "تبت یدا ابی لھب" یعنی ٹوٹ جائیں ابی لہب کے ہاتھ۔ کیونکہ حضرت محمد ﷺ کے پیغمبر بننے کے بعد ابی لہب ان پر پتھروں سے حملہ کرتا اور اس کے پھینکے ہوئے پتھر حضرت محمد ﷺ کے چہرے اور سینے پر پڑتے اور انہیں مجروح کر دیتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ چہرے پر بہنے والے خون کو اپنے دامن سے پاک کرتے اور اللہ کے حضور درخواست کرتے تھے کہ وہ ابی لہب کو اسلام کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ابی لہب کی بیوی کا نام ام جمیل تھا وہ بھی پیغمبر اسلام ﷺ کو بہت زیادہ ستاتی اور پریشان کرتی تھی۔ اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ رات کے وقت حضرت محمد ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتی جس کے نتیجے میں پیغمبر اسلام ﷺ کے پاؤں ہر شب زخمی ہو جاتے تھے۔ اللہ نے اس عورت کو بھی اس کے خاوند کی طرح ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا کر دیا اور قرآن کہتا ہے۔

"وامرتہ حمالتہ الحطب" (یعنی وہ عورت جو ہمیشہ کانٹے ڈھوتی رہی) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ابی لہب جہنم میں جائے گا تو اس کی بیوی جو ہمیشہ خار و خاشاک ڈھوتی رہی اپنے خاوند کے ساتھ ملحق ہو جائے گی۔

بہرحال پیغمبر اسلام ﷺ کی پہلی دایہ ابی لہب کی کنیز تھی اور اگرچہ وہ رسول اللہ ؐ کو دودھ پلانے میں غفلت سے کام لیتی تھی لیکن جب محمد ﷺ بڑے ہوئے اور سن بلوغ کو پہنچے تو انہوں نے اس دایہ کو ابی لہب سے خرید کر آزاد کر دیا۔

(وضاحت : کچھ اسلامی مؤرخین نے ابی لہب کی لونڈی اور پیغمبر اسلامؐ کی پہلی دایہ کا نام "ثویبہ" ذکر کیا ہے۔ مترجم)

اس بات کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ قریش کی عورتیں بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ دایہ کے سپرد کر دیتی تھیں تاکہ وہ ان کے بچوں کو صحرا میں لے جا کر اپنا دودھ پلائیں اور ان کی پرورش کریں۔

دراصل ہوتا یوں تھا کہ کچھ بادیہ نشین عرب عورتیں سال کے مختلف حصوں میں من حیث المجموع مکہ کا رخ اختیار کرتی تھیں تاکہ شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں سے لے کر دوبارہ صحرا کو لوٹ جائیں اور وہاں اپنے دودھ سے ان کی پرورش کریں اور یوں مستقبل میں بزرگان قریش کے ساتھ ان کے باہمی تعلقات بھی مستحکم ہو جاتے تھے۔

چونکہ ابی لہب کی کنیز حضرت محمد ﷺ کو دودھ پلانے میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیتی تھی لہٰذا آپ کو اس دایہ سے واپس لے لیا گیا اور اس بات کا انتظار ہونے لگا کہ دودھ پلانے والی عورتیں بچوں کو لینے کے لئے کب مکہ آتی ہیں۔ اسی اثناء میں قبیلہ بنو سعد بن بکر کی عورتوں کا دستہ مکہ میں داخل ہو گیا۔

میں نے جزیرۃ العرب میں تحقیق کی ہے اور یہ جانا ہے کہ آج جب کہ جزیرۃ العرب پہلے کے مقابلے میں بہت بدل چکا ہے اور وہاں کے امیر لوگ اب موٹر کاروں پر سفر کرتے ہیں لیکن آج بھی ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنے بچوں کو اس لئے دایہ کے سپرد کرتے ہیں کہ وہ مکہ سے باہر رہ کر پروان چڑھیں اور یہ رسم اب تک ختم نہیں ہوئی۔

بہرحال قبیلہ بنو سعد بن بکر کی عورتیں چند گھنٹوں کے اندر ہی ان بچوں کو جنہیں دودھ پینے کی ضرورت تھی' لے کر صحرا واپس چلی گئیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی محمد ﷺ کو اس بنا پر کہ وہ یتیم اور غریب تھے' قبول نہیں کیا اور صرف ایک عورت جس کا نام حلیمہؓ تھا اس نے انہیں گود لینا منظور کر لیا۔ حلیمہؓ نے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہا ہے : اس سال فصل ربیع (بہار) میں بارشیں بالکل نہیں ہوئیں اور میں نے یہ

دیکھتے ہوئے کہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں رہا اپنے خاوند کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ کیا ہی اچھا ہو ہم بھی مکہ چلیں اور وہاں سے کسی بزرگ کے شیرخوار بچے کو اپنے ساتھ صحرا لے آئیں اور اسے بڑا کریں تاکہ اس کے بدلے میں اس کے والدین سے مزدوری حاصل کرکے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔

میرے خاوند نے میری بات مان لی اور میں جبکہ اپنے شیرخوار بچے کو گود میں لئے ہوئے تھی، اپنی اکلوتی اونٹنی پر سوار ہو گئی۔ میرے خاوند نے اونٹنی کی لگام تھامی اور ہم مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرا بچہ بھوک کی شدت سے روتا رہتا تھا کیونکہ میری چھاتی دودھ سے خالی تھی اور تقریباً" خشک ہو چکی تھی۔ دوسری جانب خشک سالی اور گھاس پھونس کی قلت کے باعث ہماری اونٹنی بھی دودھ نہیں دیتی تھی لہذا میں اور میرا خاوند بھی اکثر و بیشتر بھوکے رہتے تھے۔

جب ہم مکہ پہنچے تو ہمارے قبیلے (یعنی قبیلہ بنو سعد) کی عورتیں ثروت مند لوگوں کے بچوں کو لے کر واپس جا رہی تھیں اور ان میں سے ہر کسی کو متعلقہ بچے کے باپ کی طرف سے مناسب انعام بھی نصیب ہوا تھا۔

لیکن کسی کھاتے پیتے گھرانے کا بچہ ہمیں نصیب نہ ہوا۔ صرف ایک یتیم بچہ جس کا نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا ہمارے حصے میں آیا کہ جس کی ماں یا دادا ہمیں کوئی قابل ذکر انعام یا تحفہ بھی نہ دے سکتے تھے۔

میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ خالی ہاتھ لوٹنے سے اچھا تو یہی ہے کہ ہم اس بچے کو گود لے لیں کیونکہ جیسا بھی ہو اس کا تعلق قریش سے ہے اور جب یہ بڑا ہو گا تو اس کا شمار قریش کے بزرگوں میں ہو گا اور یوں ہم گزشتہ تعلقات کی بنا پر مستقبل میں کوئی استفادہ کر سکیں گے۔

میرے شوہر نے یہ تجویز بھی قبول کر لی اور ہم اپنے قبیلے کی دوسری عورتوں کے

ساتھ واپس لوٹنے کی تیاری کرنے لگے۔ ابھی ہم مکہ سے آدھی منزل بھی دور نہ ہوئے تھے کہ میں نے بے پناہ تعجب کے عالم میں یہ دیکھا کہ میرے دونوں پستان کچھ اس طرح دودھ سے بھر چکے تھے کہ میں نے اپنے بچے کو بھی پیٹ بھر کر دودھ دیا اور محمد ﷺ کو بھی۔
جب ہم اپنی منزل پر پہنچے تو میرے خاوند نے اونٹنی کے تھنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ حلیمہؓ ادھر دیکھ' ہماری اونٹنی کے تھن بھی دودھ سے بھر چکے ہیں۔
ہم دونوں نے جو بھوک سے نڈھال تھے' اونٹنی کا دودھ دوہیا اور جی بھر کر پیا۔ وہ رات ہم پر بہت آرام سے گزری۔ اگلے دن صبح سویرے میرے شوہر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے حلیمہؓ! یہ بچہ جسے تو قریش سے لے کر آئی ہے بلاشبہ بہت برکت والا ہے اور وہ یقیناً ہماری قسمت بدل دے گا۔



"محمدؐ امین"

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دودھ سے ہٹانے کے بعد حلیمہؓ نے انہیں ان کی والدہ حضرت آمنہؓ کے سپرد کر دیا اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ اور ان کے جد حضرت عبدالمطلبؓ یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت ابو طالبؓ نے ان کی سرپرستی کا فرض سنبھالا اور وہ انہیں بارہ سال کی عمر میں اپنے ہمراہ شام لے گئے۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پہلے سفر کے بعد شام سے واپس لوٹے تو انہیں دوبارہ مویشیوں کی پرورش کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ وہ ہر صبح بھیڑوں اور بکریوں کو لے کر صحرا کی طرف نکل جاتے اور جزیرۃ العرب کی جھلسا دینے والی دھوپ میں مویشیوں کی دیکھ بھال کرتے رہتے۔

جب تک گلے کی بھیڑیں دودھ دیتیں، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحرا میں ان کے دودھ سے تغذیہ کرتے اور جب بھیڑوں کا دودھ خشک ہو جاتا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غذا صحرائی

نباتات اور ان کے ریشے ہوتے تھے۔ جب پیغمبر ﷺ رجولیت (یعنی بلوغ) کی عمر کو پہنچے تو اپنے دوستوں کو مکہ کے صحرا میں لے جاتے اور وہاں کے کچھ حصوں کی نشاندہی کرتے اور فرماتے کہ میں ان مقامات پر مویشی چرایا کرتا تھا اور یہ نباتات میری خوراک ہوا کرتے تھے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے عرب باشندے سال میں چار مہینے ایک دوسرے سے لڑائی نہیں کرتے تھے اور حج کے زمانے میں صحرائی لٹیرے نہ تو کعبہ کی زیارت پر جانے والوں پر حملہ کرتے اور نہ ہی تجارتی قافلوں پر اور بقول عربوں کے نہ "حاج" پر حملہ ہوتا تھا نہ "داج" پر۔

حج کے زمانے میں مکہ کے نزدیک ایک بہت بڑا بازار منعقد ہوتا تھا جسے آج بازار عکاظ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ جزیرۃ العرب کے ہر خطے کے لوگ اشیائے ضرورت کی خرید و فروخت کے لئے اس بازار میں جمع ہوتے تھے۔ یہ بازار دراصل خود مکہ میں نہیں بلکہ اس کے نزدیک ایک چھوٹے شہر میں منعقد ہوتا تھا اور میں نے جزیرۃ العرب میں خاصی تحقیق کی لیکن کوئی بھی میرے لئے عکاظ کے بازار کی اصلی جگہ کی نشاندہی نہ کر سکا۔

جزیرۃ العرب ایک وسیع و عریض خطہ زمین ہے لیکن اس کا بڑا حصہ ریت یا بقول عربوں کے "رمل" تلے چھپا ہوا ہے۔ اگر دنیا کی ساری ریت کو اکٹھا کیا جائے تو بھی شاید جزیرۃ العرب کے صحراؤں کی ریت کے برابر نہ ہو سکے۔ ان گرم اور ریگ رواں کے حامل بیابانوں میں ایک عرب کا بنیادی سرمایہ جن چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا ان میں ایک خیمہ جو اسے سورج کی تمازت سے محفوظ رکھتا' ایک اونٹ جسے بوقت ضرورت سواری کے لئے استعمال کرتا یا اس کے دودھ سے رفع جوع کرتا اور ایک تلوار تھی جسے اپنے دفاع کے لئے استعمال کرتا تھا لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے لئے "سرمایہ ذوق" نہ ہوتی اور اس کی روح کو تسکین نہ پہنچاتی تھی۔ وہ نقاشی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ رنگوں سے محروم تھے' حجاری نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مناسب پتھر موجود نہ تھے لہٰذا عرب کے مختلف قبیلوں کا ذوق

ہنر صرف ایک طرف مائل ہو گیا اور وہ تھا سخن وری!

فرانس کا مشہور فلاسفر اور دانشور "ارینسٹ رونان" کہتا ہے کہ اگر دوسری قوموں خاص طور پر ایرانی قوم کے علم و ثقافت کو جو اسلام کے بعد دنیائے عرب میں داخل ہوا، عرب قوم سے علیحدہ کر دیا جائے تو پھر عرب باقی رہ جاتا ہے اور اس کا اونٹ! لیکن میرے خیال میں یہ بات بغیر سوچے سمجھے کہی گئی کیونکہ اگر دوسری قوموں کے، علم و ثقافت کو عربوں سے واپس لے لیا جائے تو بھی ان کے پاس جو چیز باقی رہ جائے گی وہ ہے سخن وری یا علم بیان!

عرب اگرچہ معماری، مجسمہ سازی اور نقاشی تو نہ کر سکا کیونکہ ان کاموں کے لئے اس کے پاس مناسب اوزار موجود نہ تھے تاہم وہ تھیوری کے لحاظ سے تمام مذکورہ چیزوں کو سخن وری کی مدد سے تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

شاعری کے روپ میں سخن وری کرنا اس دور کے عربوں کا یگانہ ثقافتی اور قومی خزانہ تصور ہوتا تھا اور حتیٰ کہ ان کی تاریخ، ان کا ادب اور ثقافت سب کچھ شاعری پر ہی ختم ہوتے تھے۔

اگر کوئی عربوں کی تاریخ اور تمدن کے بارے میں جاننا چاہتا تو اس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ عرب شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرے۔ دوسری جگہوں پر شاعر صرف ایک ادیب ہوتا ہے لیکن جزیرۃ العرب میں ایک شاعر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک حکیم، ایک مذہبی پیشوا، ایک محتسب اور ایک دانشور تصور کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ شاعر کو ایک ایسا شخص سمجھا جاتا تھا جو اپنے زہر آگیں کلام سے دشمن کو نیست و نابود کر سکتا ہے یا اپنے آرام بخش کلام کے ذریعے کسی بیمار کی شفایابی کا سبب بن سکتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے پیغمبر بننے کے بعد ایک جنگ کے دوران حضرت حسان بن ثابتؓ نامی شاعر کو، جو اس جنگ میں شریک تھے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"انہیں (یعنی دشمن کو) اپنے اشعار سے عتاب کا نشانہ بنا کر کیونکہ تیرے اشعار اس

تیر سے بھی زیادہ موثر ہیں جنہیں تاریکی میں دشمن کی طرف پھینکا جائے اور یقین جان کہ جبرائیل تیرا ساتھ دے گا"۔

عرب قبیلوں میں "شعر" سورج اور ہوا کی طرح ضروریات زندگی میں شمار ہوتا تھا اور عرب قوم کے پاس زندگی کے مختلف حالات جیسے خوشی یا غم' خوش قسمتی یا بدقسمتی' شادی یا موت اور صلح یا جنگ کے لئے مخصوص اشعار کا ذخیرہ موجود ہوتا تھا۔

ایک عرب جب غمگین ہوتا تو "زہیر" کے اشعار گنگناتا' اگر خوفزدہ ہوتا تو "نابغہ" کے اشعار کو پڑھتا' اگر غضبناک ہوتا تو "اعشیٰ" کے شعروں کو زبان پر لاتا اور جب کسی سے نبرد آزما ہونا چاہتا تو "عنترہ" کے اشعار کو پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوتا تھا۔

قدیم عرب شاعر ایسے بازوق اور باصلاحیت افراد ہوتے تھے جن کی سوچیں آزاد اور جن کے افکار کی ماہیت متعلقہ قبیلے یا خاندان کے افکار سے بالکل مختلف ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں ہر قدم پر قبیلے کے رسم و رواج کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور چونکہ وہ اپنے آپ کو ان کے رنگ میں نہیں ڈھال سکتے تھے لہٰذا صحرا کا رخ اختیار کر لیتے اور ان میں سے کچھ صحرا میں بھوک اور پیاس کی شدت سے ہلاک ہو جاتے تھے کیونکہ جزیرۃ العرب میں جو کوئی بھی اپنے قبیلے سے جدا ہو کر اکیلے زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا تو اس کا یہ عمل موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا تھا۔ تاہم کچھ شاعر اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر صحرا میں راہزنی یا ڈکیتی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیتے تھے۔

عکاظ کے بازار میں ہر سال عرب شاعروں کا اجتماع ہوتا تھا اور اسی بازار میں محفل سخن بھی منعقد ہوتی تھی۔ جو شاعر پہلا مقام حاصل کرتا وہ انعام و اکرام سے نوازا جاتا اور اس کے اشعار کو سنہری لفظوں میں ریشمی کپڑے پر لکھ کر کعبہ کی دیوار سے آویزاں کر دیا جاتا تھا تاکہ دوسری عرب قومیں جب مکہ آئیں تو ان اشعار کو پڑھ کر لطف اندوز ہو سکیں۔ حتیٰ کہ یہ اشعار پورے ایک سال تک دیوار کعبہ پر لٹکے رہتے اور اسی بنا پر انہیں "معلقات" کہا جاتا تھا۔

عرب شاعر کے کلام میں اتنا اثر ہوتا تھا کہ ایک دفعہ ایک ایسے شخص نے جس کی سات بدصورت لڑکیاں تھیں ایک شاعر سے درخواست کی کہ وہ اپنے اشعار میں ان لڑکیوں کی کچھ اس طرح تعریف کرے کہ مردوں کے دلوں میں ان سے شادی کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے اور اس شاعر نے لڑکیوں کے "کمالات" کی کچھ اس طرح تعریف کی کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے کئی چاہنے والے پیدا ہو گئے۔

عکاظ کے بازار کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ جب کوئی سلطان یا بادشاہ کوئی گراں قیمت شے جیسے تلوار یا زربفت کپڑے فروخت کی غرض سے مکہ کے بازار میں بھیجتا تو عربوں کی رسم کے مطابق ان چیزوں کو صرف وہی شخص خریدنے کا حق رکھتا تھا جو دوسروں سے برتر اور افضل ہو۔ خریداری کا طریقہ کار یہ تھا کہ منتخبہ یا مستحق افراد باری باری قدم آگے بڑھاتے اور مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر اشعار کے روپ میں اپنا تعارف کرواتے۔ اپنے حسب و نسب کا ذکر کرتے اور اپنے شجاعت کے گن گاتے تھے۔ اگر کوئی خریدار شعر نہیں کہہ سکتا تھا تو کسی شاعر کی خدمات حاصل کر لیتا اور ججوں کے فیصلے کے مطابق جو برتر قرار پاتا اسے ان اشیاء کو خریدنے کی اجازت ہوتی تھی۔

عرب قبیلوں میں علم بیان کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ ہر قبیلے کا سربراہ ہونے کے لئے سخن ور ہونا ضروری تھا۔ عربی زبان میں جن کلمات کا مطلب قبیلے کے سربراہ کا ہے جیسے "امیر" اور "سید" دراصل ان کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو سخن کہنا جانتا ہو (یعنی سخن وری کا ماہر ہو)۔

عرب کے مشہور شاعروں میں سے ایک "امری القیس" نامی شاعر ہے جسے تمام مسلمان جانتے ہیں وہ ان سات نامور شاعروں میں جن کے قصیدے دیوار کعبہ سے آویزاں ہوتے تھے سب سے زیادہ برجستہ اور نامور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سات قصیدے یا غزلیں اتنی فصیح و بلیغ اور ہلا دینے والی ہیں کہ میں نے عربی زبان میں ان سے زیادہ بہتر اور خوبصورت کلام نہیں پڑھا ماسوائے قرآن کے۔

میں (یعنی کونسٹن ویرژیل) خود جزیرۃ العرب میں رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ آج بھی کچھ ان پڑھ بدوی باشندوں کو قدیم عرب شاعروں کا کلام زبانی یاد ہے اور حتیٰ کہ ایک بادیہ نشین شخص نے مذکورہ شاعر "امری القیس" کے چند اشعار مجھے سنائے تھے۔

ابن ہشام' ابوداؤد' امام بن حنبلؒ' حمید اللہ اور ابن سعد جن کا شمار اسلامی مؤرخین میں ہوتا ہے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شعر پسند تھے اور وہ کبھی عرب شاعروں کے کلام کو زبان پر لاتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک عرب (بدو) کی تمام اچھی صفات موجود تھیں لیکن وہ ان کی (اس کی) بری صفات سے بالکل پاک اور مبرا تھے۔

اگر مندرجہ بالا الفاظ ان کے پیغمبر بننے کے بعد ادا کئے جاتے تو شاید یہ تصور کیا جاتا کہ باتیں خوشامد گوئی کی غرض سے کہی گئی ہیں لیکن ان کے پیغمبر بننے سے پچیس سال پہلے ہی لوگ انہیں "امین" اور "صبور" کے نام سے پکارتے تھے۔

ہم امین کے لفظ سے صرف ایک ہی مفہوم سمجھتے ہیں جس کا مطلب امانت داری یا دیانت داری ہے لیکن ایک عرب اس کلمے سے امانت داری کے علاوہ وفاداری کا مفہوم بھی استنباط کرتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت داری کی طرح ان کا صبر و تحمل بھی زبان زد عام تھا اور اللہ نے قرآن میں صبر کرنے والوں کو بہت سراہا ہے۔

صبر کرنا ایک عرب کی پسندیدہ صفات میں شمار ہوتا تھا اور عرب باشندے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ دنیا کے مال و متاع سے محروم ہو جانا کوئی عیب نہیں بلکہ عیب کی بات یہ ہے انسان مشکلات میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے اور بے قراری اور اضطراب کا مظاہرہ کرے۔

پیغمبر اسلام کی استقامت' دوستی' وفاداری' عہد کی پابندی اور امانت داری کے چرچے ان کے پیغمبر بننے سے بہت پہلے ہی دور دور تک پھیل چکے تھے۔

ایک عرب محقق ابوداودؒ اپنی کتاب "سنن" میں لکھتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تقریباً" تیس سال کے تھے تو ایک سوداگر نے ان سے ایک مقام پر ملنے کا وعدہ کیا تاکہ تجارت کے بارے میں باہمی گفتگو کر سکیں۔ وہ شخص اپنے وعدے کو بھلا بیٹھا اور مقررہ وقت میں معینہ جگہ پر حاضر نہ ہوا۔ اس واقعہ کے تین دن کے بعد جب وہ شخص مذکورہ مقام سے گزرا تو یہ دیکھ کی حیران رہ گیا کہ حضرت محمد ﷺ ابھی تک وہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے تین دن تک اس شخص کا انتظار کرتے رہے تھے۔

اس زمانے میں جزیرۃ العرب اور عام طور پر ساری دنیا میں سونا بہت کمیاب تھا اور سونے کا ایک سکہ جس کا وزن پانچ گرام ہوتا تھا عرب لوگوں کے لئے بہت بڑی دولت سمجھا جاتا تھا۔ دنیا میں سونے کی زیادتی اور فراوانی کا سبب دراصل براعظم امریکہ کی دریافت تھی۔ ہسپانیہ والوں نے امریکہ کو دریافت کرنے کے بعد اس براعظم کا سونا پہلے یورپ میں منتقل کیا اور پھر افریقہ اور ایشیا میں اس کی برآمد شروع کر دی۔

دوران جوانی میں حضرت محمد ﷺ ایک سوداگر کے لئے کام کرتے تھے جس کا نام قیس بن زید تھا۔ قیس بن زید اپنا سامان تجارت محمد ﷺ کے سپرد کر دیتا تاکہ وہ اسے فروخت کرنے کے لئے دوسرے مقامات پر لے جائیں۔ حضرت محمد ﷺ مذکورہ سامان کی فروخت کے سلسلے میں دور دراز کا سفر طے کرتے اور واپسی پر ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار تک سونے کے سکے فروخت شدہ مال کی قیمت کے طور پر اپنے کارفرما کو ادا کرتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اس کثیر رقم کو لے کر کسی دور افتادہ ملک کی طرف نکل جاتے اور بقیہ عمر آرام سے بسر کر سکتے تھے لیکن چونکہ وہ امین تھے لہٰذا ان کے حساب و کتاب میں کبھی بھی کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ جب محمد ﷺ نے قیس بن زید کی ملازمت کو ترک کیا تو قیس نے کہا: "یا محمدؐ! میری جان آپ پر قربان ہو، میں اس کے بعد آپ جیسا دیانتدار اور شریف انسان کبھی نہ پا سکوں گا"۔

حضرت محمد ﷺ اپنی جوانی کے دنوں میں اشیائے تجارت کی فروخت کے لئے جب بھی سفر پر روانہ ہوتے تو دوسرے سوداگر ان کی دیانتداری کے پیش نظر درخواست کرتے کہ وہ ان کا سامان بھی فروخت کرنے کے لئے اپنے ہمراہ لے جائیں اور مزدوری دریافت کریں۔

رسول اللہ ﷺ ان کا سامان لے جاتے اور فروخت کرتے لیکن جیسا کہ قیس بن زید کا کہنا ہے کہ آپ ان لوگوں سے مزدوری دریافت نہیں کرتے تھے۔

"ابن حنبلؒ" اپنی کتاب "المسند" کے صفحہ نمبر "۴۲۵" میں، جو کہ سن ۱۳۶۸ھ میں قاہرہ میں شائع ہوئی، لکھتے ہیں:

"جب محمد ﷺ سفر سے واپس آتے تو اپنے تمام دوستوں کی خیریت دریافت کرتے اور اگر انہیں یہ پتہ چلتا کہ ان میں سے کسی کی مالی حالت اچھی نہیں تو وہ اپنی کمائی کا کچھ حصہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور یہ عمل ایک سوداگر کی طرف سے مثالی نمونہ ہے"۔

وہ پہلی جنگ جس میں محمد ﷺ نے شرکت کی، وہ جنگ تھی جو قریش کے دس مشترکہ قبیلوں اور مکہ کے جنوبی صحرا میں ساکن قبیلے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ جنگ کی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ قبیلے نے ماہ حرام میں متارکہ جنگ کے عہد کو توڑ دیا تھا۔ ماہ حرام ان مہینوں پر اطلاق ہوتا تھا جن میں عرب باشندے ایک دوسرے سے لڑائی نہ کرتے اور تجارتی قافلوں یا کعبہ کی زیارت کو جانے والوں پر لوٹ مار کی غرض سے حملہ نہیں کرتے تھے۔

اہل مکہ کی معاشی زندگی کا دارومدار بازار عکاظ کے انعقاد پر ہوتا تھا۔ اگر ماہ حرام میں متارکہ جنگ کی پابندی نہ کی جاتی تو لوگ زیارت کے لئے مکہ نہ آ سکتے اور نہ ہی عکاظ کا بازار منعقد ہو سکتا تھا۔

سال کے دوسرے مہینوں میں جب قافلے صحرا سے عبور کرتے تو وہ راہزنوں کو باج

دینے پر مجبور ہوتے تھے تاکہ ان کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہ سکیں لیکن ماہ حرام میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ قافلے والوں سے باج وصول کرے اور اگر کوئی راہزن یا راہزنوں کا ٹولہ کسی قافلے پر حملہ کرتا تو قریش کے قبیلے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

یہ نہیں معلوم کہ قریش کے قبیلوں اور عہد شکن قبیلے کے درمیان جو لڑائی چھڑی وہ کس تاریخ کو شروع ہوئی تھی کیونکہ عرب مورخین نے ان واقعات کو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر بننے سے پہلے پیش آئے' زیادہ وقت کے ساتھ تاریخ کے لئے ضبط نہیں کیا۔ تاہم یہ بات مسلّم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگ میں شرکت کی تھی اور وہ اپنے چچا حضرت ابوطالبؓ کے ہمراہ میدان جنگ میں حاضر ہوئے تھے۔

کچھ مورخین کہتے ہیں کہ اس وقت چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کمسن تھے لہٰذا اپنے چچا (حضرت) ابوطالبؓ کے ترکش کو اٹھائے ہوئے تھے اور انہیں اپنے ہاتھوں سے تیر دیتے تھے تاکہ حضرت ابوطالبؓ ان تیروں کو کمان میں رکھ کر دشمن کی طرف پھینک سکیں۔

کچھ دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ اس لڑائی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شمشیر ہاتھ میں تھامی اور حتیٰ کہ عہد شکن قبیلے کے سرغنہ "بوبرہ" کو زخمی بھی کر دیا تھا۔



حلف الفضول یا رضاکار تنظیم

ہمیں یہ نہیں معلوم کہ حضرت محمد ﷺ کس عمر میں حلف الفضول نامی جماعت میں جو کہ ایک چھوٹی سپاہ کا نام تھا، داخل ہوئے کیونکہ عرب مؤرخین نے جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ظہور اسلام سے قبل حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے واقعات کو تاریخ کے نقطہ ء نظر سے تسلسل کے ساتھ ضبط نہیں کیا۔ لہٰذا ہمیں کچھ واقعات کی صحیح تاریخ کا علم ہے اور کچھ واقعات کی اصلی تاریخ سے بے خبر ہیں۔

گزشتہ باب کے مطالعے سے آپ یہ جان چکے ہوں گے کہ اس زمانے میں ایک بدوی عرب پر انفرادی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔ اسی لئے اگر کوئی عرب باشندہ کسی کے قتل کا مرتکب ہوتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل کی بجائے اس کے پورے قبیلے سے انتقام لیتا تھا۔ لہٰذا ان صحراؤں میں جو کوئی بھی کسی جرم کا مرتکب ہوتا تو اس کا خمیازہ اس کے تمام قبیلے کو بھگتنا پڑتا تھا۔

لیکن جب بدوی باشندے شہر نشین ہو گئے اور انہوں نے مکہ میں سکونت اختیار کر لی تو اس قسم کی انتقامی کارروائیوں کا طریقہ کار مؤثر نہ رہا کیونکہ اگر کوئی فرد مکہ کے شہر میں ظلم و ستم کا نشانہ بنتا تو وہ بدلہ لینے کی غرض سے قریش کے دس متحدہ قبیلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

مکہ میں پولیس تھی نہ عدالت۔ ہر قبیلہ اپنے اختلافات کو خود ہی حل کرتا تھا اور ہر قسم کے اختلافات قبیلے کی حدود سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ تاہم اگر کوئی بیرونی دشمن مکہ پر حملہ آور ہوتا تو قریش کے مختلف قبیلے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آپس میں متحد ہو جاتے اور دشمن کو پسپائی پر مجبور کر دیتے تھے۔

لہٰذا مندرجہ بالا صورت حال کے پیش نظر اگر کوئی صحرانشین مکہ آتا اور وہاں اس کی حق تلفی کی جاتی تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا کہ صحرا جا کر اپنے قبیلے کے افراد کو اکٹھا کرے اور اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینے کی غرض سے متجاوز شخص کے قبیلے سے نبرد آزما ہو لیکن جب ظلم کا نشانہ بننے والے کا قبیلہ صحرا سے مکہ آتا تو ایک بیرونی دشمن محسوب ہوتا اور اسے ایک کی بجائے قریش کے دس قبیلوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب باہر کا کوئی شخص مکہ آتا اور وہاں اس کی حق تلفی ہوتی تو وہ نہ انصاف حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی سے انتقام لے سکتا تھا۔

ایک عرب مؤرخ "سہیلی" لکھتا ہے کہ ایک دفعہ کعبہ کی زیارت کے دنوں میں ایک عربی باشندہ جب اپنی نوجوان لڑکی کے ہمراہ جنوبی صحرا سے مکہ آیا تو وہاں کے ایک مالدار تاجر نے لڑکی کو اغوا کروا لیا۔ لڑکی کے باپ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ صحرا واپس چلا جائے اور اپنے قبیلے کے افراد کے ہمراہ دوبارہ مکہ آئے اور اس تاجر کے قبیلے سے نبرد آزما ہو تاکہ اپنی لڑکی کو نجات دلا سکے۔ لیکن جس شخص نے لڑکی کو اغوا کیا تھا وہ جانتا تھا کہ لڑکی کا قبیلہ بہت چھوٹا ہے اور اس قبیلے کے افراد قریش کے قبیلوں سے لڑنے کی جرات نہیں کریں گے۔

جب محمد ﷺ اس واقعہ سے مطلع ہوئے تو انہوں نے قریش کے نوجوانوں سے کہا کہ وہ اس بات پر رضامند نہ ہوں کہ مکہ میں اس قسم کا ظلم رواج پیدا ہو۔

قریش کے کچھ نوجوان جو رضاکارانہ طور پر مظلوموں کے حامی تھے' خانہ کعبہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے باہمی طور پر یہ حلف اٹھایا:

"ہم حلف اٹھاتے ہیں کہ مظلوم کی اس قدر حمایت کریں گے کہ ظالم اس کا حق دینے پر مجبور ہو جائے اور ہم قسم اٹھاتے ہیں کہ اس راہ میں ہمیں کسی چیز کا لالچ نہیں خواہ مظلوم مالدار ہو یا غریب"۔

مندرجہ بالا حلف اٹھانے کے بعد قریش کے نوجوانوں نے' جن میں محمد ﷺ بھی شامل تھے حجرالاسود کو آب زمزم سے دھو کر اس پانی کو پیا تاکہ ان کی قسمیں پکی ہو جائیں اور ان کے باہمی عہد کی توثیق ہو جائے۔

بعد میں حضرت محمد ﷺ اور قریش کے نوجوان اس تاجر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے جس نے مذکورہ لڑکی کو اغوا کر لیا تھا۔ انہوں نے تاجر کے گھر کو محاصرے میں لے لیا اور اس سے کہا کہ اغوا شدہ دوشیزہ کو بے دریغ اس کے باپ کے حوالے کر دے۔

اس مالدار شخص نے کہا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دو میں اگلی صبح لڑکی کو اس کے باپ کے حوالے کر دوں گا لیکن محمد ﷺ اور قریش کے نوجوانوں نے اس کی بات قبول نہ کی اور کہا کہ لڑکی کو ابھی اور اسی وقت اس کے والدین کے حوالے کیا جائے۔ لہٰذا مذکورہ تاجر اس دوشیزہ کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ایک مرتبہ ابوجہل نے ایک اجنبی سوداگر سے مال خریدا لیکن اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ اجنبی سوداگر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ مکہ میں ایک رضاکار تنظیم حلف الفضول کے نام سے موجود ہے جو اس کی مدد کر سکتی ہے لہٰذا وہ مایوس ہو کر مکہ سے واپس چلا گیا کیونکہ اس کا قبیلہ بھی اتنا چھوٹا تھا کہ وہ قریش کے دس قبیلوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا تھا۔

جب محمد ﷺ اس واقعہ سے آگاہ ہوئے تو ابو جہل کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ وہ اجنبی سوداگر سے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرے اور ابو جہل وہ قیمت ادا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد جب بھی کوئی اجنبی شخص مکہ میں ظلم و ستم یا حق تلفی کا نشانہ بنتا تو رضاکاروں کی تنظیم حلف الفضول بلا تامل اس کی مدد کرتی تھی اور بعد میں پیغمبر اسلام ﷺ یہ کہتے تھے کہ مجھے حلف الفضول نامی سپاہ میں حصہ لینے سے اتنی مسرت اور سربلندی کا احساس ہوتا تھا کہ اگر کوئی مجھے یہ کہتا کہ سرخ بالوں والے ایک سو اونٹوں کے بدلے اس سپاہ کو چھوڑ دوں تو میں کبھی بھی ایسا نہ کرتا۔

پیغمبر بننے سے پہلے محمد ﷺ کی طرف سے حلف الفضول نامی رضاکار تنظیم کی ایجاد کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت عرب قبیلوں کے عدالتی نظام میں انقلاب برپا کر دیا اور قبیلوں کے باہمی انتقام کے اصول کو متزلزل کر دیا۔ بعد میں جب قرآن نازل ہوا تو یہ روش مکمل طور پر باطل کر دی گئی۔

مظلوموں کی حمایت کیلئے حلف الفضول نامی رضاکار تنظیم کی تشکیل کو ایک معمولی واقعہ تصور نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اس تنظیم کی ایجاد سے اس وقت کے معاشرے میں ایک انقلاب بپا کر دیا تھا۔

اس وقت جزیرۃ العرب میں کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک خطاکار سے اس کی زیادتی کے بارے میں پوچھ گچھ ہو سکتی ہے اور اس سے ظلم کا بدلہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی مظلوم کا قبیلہ طاقتور ہوتا یا اس کے قبیلے کے افراد فداکاری کرنے پر تیار ہوتے تو وہ شخص اپنا حق وصول کر سکتا تھا ورنہ اسے اپنے حق سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔

اسی طرح اگر کسی مقتول کا قبیلہ طاقتور نہ ہوتا یا اس کا قبیلہ انتقام لینے کی ہمت نہ رکھتا تو مقتول کا خون بھی پامال ہو جاتا تھا۔ اس وقت کے معاشرے میں سبھی لوگ حتیٰ کہ

وہ لوگ بھی جن پر ظلم ہوتا اور جو ظالم سے اپنا حق مانگنے سے قاصر تھے' یہی سمجھتے تھے کہ یہ صورتحال ایک عام سی بات ہے اور کوئی یہ سوچتا بھی نہیں تھا کہ ایسے سماجی نظام کو بدلا بھی جا سکتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے "حلف الفضول" کی داغ بیل ڈال کر یہ درس دیا کہ ظالم کے مقابلے میں ہمیشہ مظلوم کی حمایت کرنی چاہئے۔ خواہ مظلوم کا قبیلہ کمزور ہو اور کوئی اس کے لئے جان لڑانے پر تیار نہ ہو۔

حضرت محمد ﷺ کی قابل ستائش اخلاقی صفات سے قطع نظران میں پیغمبر بننے سے پہلے ہی بے پناہ صلاحیتیں موجود تھیں اور اگر یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں تو وہ پیغمبری کے لئے کیونکر منصوب ہوتے۔

محمد ﷺ کے کچھ اقدامات سے' جو انہوں نے پیغمبر بننے سے پہلے انجام دیئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ استعداد اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بلاشبہ دوسروں پر برتر تھے۔ وہ سماجی' سیاسی' معاشی اور حتیٰ کہ عدالتی نظام کے مسائل کو ایسے نقطہء نظر سے دیکھتے تھے جنہیں عام لوگوں کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی۔

حضرت ابو طالبؓ حضرت محمد ﷺ کے چچا اگرچہ اپنے بھتیجے کو بہت چاہتے تھے لیکن اپنی بے بضاعتی کے باعث محمد ﷺ کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن مکہ کے دوسرے تاجر جو محمد ﷺ کی دیانت داری اور شرافت کے چرچے سن چکے تھے یہ خواہش رکھتے تھے کہ نوجوان محمد ﷺ ان کے پاس ملازمت اختیار کر لیں۔

انہی تاجروں میں ایک خاتون بھی تھیں جن کا نام حضرت خدیجہؓ تھا اور اس وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ حضرت محمد ﷺ اس وقت پچیس سال کے نوجوان تھے۔

حضرت خدیجہؓ نے محمد ﷺ کو یہ پیغام بھجوایا کہ اگر وہ چاہیں تو ان کے تجارتی قافلوں کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوں اور ان کے لئے کام کریں۔

حضرت محمد ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کی تجویز کو اپنے چچا کے سامنے پیش کیا اور

ان سے مشورہ مانگا کہ آیا اس خاتون کی تجویز کو قبول کر لیا جائے یا نہیں۔ حضرت ابو طالبؓ نے کہا کہ خدیجہؓ ایک مالدار عورت ہے اور وہ تمہیں اچھی مزدوری دے سکتی ہے لہٰذا میرے خیال میں ان کی تجویز کو مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔

اس وقت تک حضرت خدیجہؓ نے دو شادیاں کی تھیں اور ان کے دونوں شوہر فوت ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجہؓ چونکہ ایک سوداگر تھیں لہٰذا وہ "تاجرا" کے نام سے مشہور تھیں اور مکہ کے بہترین گھروں میں سے ایک میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ بہرحال حضرت محمد ﷺ، خدیجہؓ کے پاس گئے اور سفر پر جانے کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ خدیجہؓ نے کہا کہ تمہیں میرے قافلوں کے ہمراہ شام کے سفر پر جانا ہو گا اور میرے دو قریبی لوگ تمہارے ساتھ جائیں گے۔ ان میں سے ایک میرا بھتیجا "خدیمہ" اور دوسرا میرا غلام "میسرہ" ہو گا۔

حضرت محمد ﷺ، حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلے کے سربراہ کے طور پر سفر پر روانہ ہو گئے اور شام کے ملک میں داخل ہو کر بصرہ کے نزدیک پہنچے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ بصرہ کے نزدیک ایک مانوی زاہد رہتا تھا جس کا نام بحیراء تھا لیکن اس مرتبہ جب حضرت محمد ﷺ وہاں پہنچے تو بحیراء فوت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک اور راہب جس کا نام "ناسٹوریس" تھا اس صومعہ میں زندگی بسر کرتا تھا۔

تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ ناسٹوریس بحیراء کی طرح مانوی فرقے سے تعلق رکھتا تھا یا نہیں لیکن جب ناسٹوریس نے پچیس سالہ محمد ﷺ سے ملاقات کی تو اس نے بھی بحیراء کے الفاظ کو دہرایا اور کہا کہ اللہ کسی خاص قوم کے انحصار میں نہیں اور یہودیوں کا یہ کہنا کہ قوم یہود دنیا کی تمام قوموں سے برتر ہے، ان کی خود پسندی کی علامت ہے کیونکہ خدا کا تعلق دنیا کی ساری قوموں سے ہے چاہے وہ یہودی ہوں یا عرب یا کوئی اور قوم۔

ناسٹوریس نے بھی محمد ﷺ کو بتایا کہ جزیرۃ العرب میں ایک پیغمبر آنے والا ہے جو بت پرستی کی رسومات اور باطل عقیدوں کو ایک سچے اور حقیقی دین میں بدل دے گا۔ جب

حضرت محمد ﷺ شام کے سفر سے واپس لوٹے تو حضرت خدیجہؓ نے اس سفر کی مزدوری کے طور پر انہیں ایک اونٹ بخش دیا۔ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ اس وقت ایک اونٹ کی قیمت کیا ہوتی تھی تو ہمیں اس زمانے کی دوسری چیزوں سے اس کا موازنہ کرنا ہوگا۔

اس زمانے میں مکہ میں ایک اونٹ کی قیمت چار سو درہم ہوتی تھی۔ ایک بردہ یعنی غلام ایک سو پچاس سے لے کر آٹھ سو درہم تک خرید و فروخت ہوتا تھا۔ تاہم ایک غلام کی قیمت اس کی جوانی' بڑھاپے اور خوبصورتی یا بدصورتی کے پیش نظر تعین کی جاتی تھی۔

مکہ کے بازار میں ایک نیزے کی قیمت چار درہم تھی اور ایک کجاوہ جسے اونٹ کی پیٹھ پر باندھتے تھے تیرہ درہم میں خریدا جا سکتا تھا۔ ایک کدال جس سے زمین کھودی جاتی' چھ درہم میں بکتی تھی اور مکہ کے بازار میں ایک روٹی کی قیمت بھی چھ درہم ہوتی تھی لہٰذا روٹی بہت مہنگی تھی اور صرف مکہ کے اہل بضاعت ہی روٹی کھا سکتے تھے جبکہ دوسرے عام لوگ گندم کی روٹی کھانے سے محروم تھے اور صرف اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

نوجوان محمد ﷺ نے شام کے سفر کے بعد جو مزدوری حاصل کی وہ اس سے راضی ہو گئے اور خدیجہؓ بھی ان کے کام سے مطمئن ہو گئیں۔ لہٰذا انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو ایک بار پھر سفر پر روانہ کر دیا۔



حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کی شادی

جب حضرت محمد ﷺ اپنے دوسرے سفر سے واپس لوٹے اور تجارت سے حاصل شدہ آمدنی کا حساب چکانے کی غرض سے حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے تو اس مرتبہ وہ خاتون ایک اہم فیصلہ کر چکی تھیں۔ اسی بنا پر انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو بڑی گہری نگاہوں سے دیکھا۔

محمد ﷺ کی بڑی بڑی آنکھوں میں بے پناہ گہرائی اور نور موجود تھا۔ ان کے سر کے بال کندھوں تک پھیلے ہوئے تھے اور وہ اس زمانے کی رسم کے مطابق بالوں میں مانگ بھی نکالتے تھے۔ چونکہ گفتگو کرتے ہوئے اکثر اوقات تبسم فرماتے لہٰذا موتی جیسے دانت نمایاں ہوتے اور ان کے ہونٹوں کی خوبصورت تراش دیکھنے والے کے دل میں خود بخود محبت کا احساس اجاگر کرتی تھی۔

حسن و جمال کے علاوہ محمد ﷺ کے بدن سے ہمہ وقت ایک دل پذیر خوشبو

پھوٹتی رہتی تھی اور اسی بنا پر اکثر لوگ ان کے ساتھ ملاقات کرنے کے خواہشمند رہتے تھے۔

اس زمانے میں عرب باشندے وافر مقدار میں عطر کا استعمال کرتے تھے اور مکہ و مدینہ میں بدن کے علاوہ خانہ کعبہ اور دوسرے سکونت والے گھروں کو بھی مختلف خوشبوؤں سے معطر کرنے کا رواج قائم تھا۔ حضرت محمد ﷺ کو عطر کی خوشبو بہت پسند تھی اور عرب مؤرخین لکھتے ہیں کہ محمد ﷺ ایسے عطر استعمال کرتے تھے جن کی خوشبو تیز اور چبھنے والی نہ ہو۔

محمد ﷺ ہمیشہ آہستگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ گفتگو کرتے اور اس انداز میں کلمات کو زبان پر لاتے کہ سننے والا اگر چاہتا تو ان کے ادا کئے ہوئے الفاظ کو باآسانی گن سکتا تھا۔ محمد ﷺ کے کلام کی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ جو بھی کہتے سننے والے کے دل میں اتر جاتا اور وہ اسے ہرگز فراموش نہیں کرتا تھا۔

بہرحال جب محمد ﷺ نے تجارت سے حاصل شدہ آمدنی کو حضرت خدیجہؓ کے سپرد کر دیا تو انہوں (خدیجہؓ) نے چند بالواسطہ سوالات کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کی کہ آیا حضرت محمد ﷺ شادی کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں یا نہیں۔ حضرت محمد ﷺ نے جو جواب دیئے ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فی الحال شادی کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ دوسری جانب حضرت خدیجہؓ بھی فطری حیا کے باعث اپنے طور سے شادی کی بات نہیں کر سکتی تھیں۔

حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کی شادی کی راہ میں تین رکاوٹیں حائل تھیں۔

پہلی رکاوٹ یہ کہ حضرت خدیجہؓ ایک چالیس سالہ بیوہ خاتون تھیں اور ان کا ایک بڑا لڑکا اور لڑکی بھی تھے جبکہ اس وقت حضرت محمد ﷺ کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ دوسرے یہ کہ حضرت خدیجہؓ ایک مالدار خاتون تھیں اور ان کے مقابلے میں حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وسلم بہت نادار اور غریب تھے۔ تیسری رکاوٹ یہ تھی کہ دیرینہ رسم کے مطابق فریقین کے قبیلے یعنی حضرت خدیجہؓ کا قبیلہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ اس شادی کے سلسلے میں اپنی رضامندی ظاہر کریں اور حضرت خدیجہؓ کا قبیلہ اس بارے میں یقیناً دلچسپی کا اظہار نہ کرتا۔

حضرت خدیجہؓ نے، جو خود بلاواسطہ شادی کے بارے میں گفتگو نہیں کر سکتی تھیں، اپنے غلام "میسرہ" کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان کے ساتھ اس سلسلے میں گفت و شنید کرے۔

میسرہ نے بلا تامل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آیا تم جانتے ہو کہ میری مالکہ خدیجہؓ ایک بیوہ عورت ہے اور کیا تم ان سے شادی کرنا پسند کرو گے؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، میسرہ کی اس بات سے بہت حیران ہوئے اور بولے کہ حضرت خدیجہؓ ایک مالدار خاتون ہیں اور میں ایک غریب انسان ہوں۔ میرے اور ان کے رشتے میں کیا تناسب؟ دوسرے یہ کہ میں نے سنا ہے کہ مکہ کے امیر تاجر حضرت خدیجہؓ سے شادی کے خواہشمند ہیں اور انہوں نے ابھی تک کسی کی درخواست کو قبول نہیں کیا۔ پس کیونکر وہ خاتون مجھ جیسے بے بضاعت کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہوگی۔

میسرہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریات خدیجہؓ تک پہنچا دیئے اور بولا کہ آخرکار میں نہیں سمجھا کہ وہ آپ کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہیں یا نہیں؟

دوسری بار خدیجہؓ نے "نفیسہ" نامی ایک عورت کو یہ مہم سونپی کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا جھجک گفتگو کرے۔

"نفیسہ" کا تعلق "مولدہ" نامی طبقے سے تھا یعنی اس کے ماں باپ عرب نہیں تھے۔ لہٰذا اسی بنا پر گفتگو کے دوران وہ عربوں کے آداب و رسوم کو مدنظر نہیں رکھتی تھی۔ یعنی وہ کسی کنایہ یا پردہ پوشی کے بغیر اپنی بات کو دوسروں تک پہنچا دیتی تھی۔

نفیسہ نے ایک گلی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور فوراً ان کے پاس پہنچ کر بولی:

"یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ ایک خوبصورت اور خوب سیرت جوان ہیں' آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟"

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا "اس لئے کہ بہت بے بضاعت ہوں اور بیوی بچوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔"

نفیسہ نے کہا "یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ ایک محنت کش انسان ہیں اور محنت مزدوری کرکے اپنی بیوی بچوں کے اخراجات کو پورا کر سکتے ہیں۔"

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا "میرے ایک چچا ہیں ابو طالبؓ جو اب کافی بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کی مالی حالت بھی اچھی نہیں۔ جب میں چھوٹا تھا تو انہوں نے میری پرورش کی اور اب جبکہ میں بڑا ہو گیا ہوں تو میرا فرض بنتا ہے کہ ابو طالبؓ اور ان کے خاندان کو تنگ دستی میں بے سہارا نہ چھوڑوں لہٰذا جو کچھ کماتا ہوں انہیں دے دیتا ہوں۔"

نفیسہ نے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا اور بولی یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اگر آپ یہ رشتہ پسند کر لیں تو حضرت خدیجہؓ کی رضامندی پہلے ہی حاصل ہو چکی ہے۔

نفیسہ کی باتیں سن کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوچوں میں ڈوب گئے اور نفیسہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے مزید اضافہ کیا "یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ ہمہ گیر شخصیت کے حامل ہیں اور خدیجہؓ کے دل میں آپ کے لئے نیک جذبات موجود ہیں۔ آپ کو ان کا دل نہیں توڑنا چاہئے۔"

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ علم ہوا کہ حضرت خدیجہؓ ان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے پر رضامند ہیں تو انہوں نے نفیسہ سے کہا کہ میں خود اس بارے میں حضرت خدیجہؓ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

اگلے دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے ملاقات کی اور نفیسہ کی باتوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے نفیسہ کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق کرتے ہوئے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

اگرچہ حضرت خدیجہؓ ایک دوشیزہ نہ تھیں اور ان کی عمر کی چالیس بہاریں گزر چکی تھیں لیکن پھر بھی عربوں کی رسم کے مطابق شادی سے پہلے ان کے قبیلے کی رضامندی حاصل کرنا ضروری تھا۔ حضرت خدیجہؓ کا تعلق قبیلہ اسد سے تھا۔

قبیلہ اسد کے سربراہ عمرو بن اسد نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ محمد ﷺ امین اور دیانت دار ہیں لیکن وہ مالی اعتبار سے بہت بے بضاعت ہیں۔ جب دوسرے قبیلوں کو یہ پتہ چلے گا کہ (حضرت) خدیجہؓ ایک نادار شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے تو وہ ہمیں طعنے دیں گے، برا بھلا کہیں گے اور چرچا کریں گے کہ آیا مکہ میں شوہروں کا قحط پڑ گیا تھا جو (حضرت) خدیجہؓ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟!"

حضرت محمد ﷺ کے چچا حضرت ابوطالبؓ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو عمرو بن اسد اور اس کے قبیلے کے دوسرے افراد کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا اور جب ضیافت ختم ہو گئی تو حضرت ابوطالبؓ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"اگرچہ حضرت محمد ﷺ غریب ہے لیکن اس کی نیک نامی میں کوئی شبہ نہیں اور ہاشمی خاندان سے تعلق رکھنے کی بنا پر اگر اس کا حسب و نسب قبیلہ اسد سے برتر نہ ہو تو اس سے کمتر بھی نہیں۔ اس کے علاوہ وہ جوان ہے اور خوبصورت و خوب سیرت بھی، جوانی اور خوب سیرتی بھی ایک سرمایہ ہے اور اگر تو اے عمرو بن اسد! اس رشتے کی مخالفت کرے گا تو نہ صرف حضرت محمد ﷺ بلکہ (حضرت) خدیجہؓ کے دل کو بھی توڑنے کا سبب بنے گا۔ ہو سکتا ہے (حضرت) خدیجہؓ کے لئے ایک مالدار شوہر مل جائے لیکن حضرت محمد ﷺ جیسا نیک نام اور خوبرو جوان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔"

ابوطالبؓ کی باتیں عمرو بن اسد کے دل میں گھر کر گئیں اور اس نے شادی کے سلسلے میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

عربوں میں یہ رسم ہے کہ شوہر کو شادی کے موقع پر مہر ادا کرنا ہوتا ہے اور حضرت محمد ﷺ نے جو مہر حضرت خدیجہؓ کو ادا کیا وہ پانچ سو درہم تھا۔ اس رقم سے حتیٰ کہ دو

اونٹ بھی نہیں خریدے جا سکتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کچھ عرب مصنفوں نے کس بنا پر یہ لکھا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے مہر کے طور پر بیس اونٹ ادا کئے تھے جبکہ تاریخ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا مہر پانچ سو درہم ہی تھا۔

حضرت محمد ﷺ کی شادی کے موقع پر ان کا دایہ حلیمہؓ صحرا سے مکہ آئیں تو حضرت خدیجہؓ نے انہیں پانچ اونٹوں کا تحفہ پیش کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حلیمہؓ دوبارہ مکہ آئیں تو انہوں نے اپنے رضاعی بیٹے یعنی حضرت محمد ﷺ سے ایک اونٹ اور چالیس بھیڑیں دریافت کیں اور جب تک حلیمہؓ زندہ تھیں حضرت محمد ﷺ نے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا اور ہمیشہ ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے کے بعد جب حضرت محمد ﷺ کی مالی حالت قدرے بہتر ہو گئی تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چچا زاد بھائی علی بن ابی طالبؓ کو اپنی زیر نگرانی لے لیا اور دوسرے یہ کہ ایک عیسائی غلام "زید بن حارث" کو جس کا تعلق شام سے تھا اور جسے حضرت خدیجہؓ نے انہیں بخش دیا تھا' آزاد کر دیا لیکن زید بن حارثؓ نے آزاد ہو جانے کے باوجود حضرت محمد ﷺ سے جدا ہونا گوارا نہ کیا۔

زید بن حارثؓ کے ماں باپ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کا بیٹا زندہ ہے لہٰذا انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ وہ بقید حیات ہے تو اسے اپنے ہمراہ شام لے جانے کے لئے مکہ پہنچے لیکن حضرت زیدؓ نے اپنے والدین کے ہمراہ جانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے حضرت محمد ﷺ اپنے ماں اور باپ سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

حضرت محمد ﷺ جو رفتہ رفتہ تنگ دستی سے نجات حاصل کر چکے تھے جب تک زندہ رہے یہی کوشش کرتے رہے کہ غریبوں اور مسکینوں کی ہر ممکن مدد کریں اور انہیں فقر اور غربت سے نجات دلائیں۔ دنیا کی کسی بھی آسمانی کتاب میں محتاجوں اور تنگ دستوں

کی مدد کرنے کے لئے اتنی تاکید نہیں کی گئی جتنی کہ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن میں کی گئی ہے۔

زندگی کے آخری دن تک حضرت محمد ﷺ کا نصب العین یہی تھا کہ دنیا میں کوئی بھی بے سہارا اور بھوکا نہ رہے۔

کچھ مغربی مصنفوں نے جنہیں اسلام سے پہلے جزیرۃ العرب کے باشندوں کی طرز زندگی کا علم نہیں، یہ لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے شادی کرنے کے بعد حضرت محمد ﷺ کی زندگی کا معیار بدل گیا اور ان میں تجملات نے جگہ بنا لی لیکن حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں آخری دن تک شان و شوکت کا شائبہ تک نہ تھا اور ان کے بعد خلفائے راشدینؓ کی زندگی بھی سادگی اور قناعت کا نمونہ تھی البتہ بنو امیہ کے زمانے سے بادشاہوں جیسی شان و شوکت اور ظاہری آن بان اسلامی خلافت میں داخل ہو گئی۔

حضرت محمد ﷺ قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرنا جانتے تھے اور فطری طور پر کھانے پینے میں صرفہ جوئی سے کام لیتے تھے۔

اس زمانے کے عام لوگوں کی طرح حضرت محمد (ﷺ) کا یکتا تجمل (اگر اسے تجمل کہا جائے) عطر کا استعمال تھا تاہم اس زمانے میں کچھ عرب باشندے پانی کو بھی معطر کر کے پیتے تھے۔

ایک بدوی عرب اپنی غذا اونٹ سے یعنی اس کے دودھ سے حاصل کرتا ہے۔ اگر جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں اونٹ نہ ہوتا تو عرب قبائل کی زندگی کا جاری رہنا ممکن نہ تھا۔

صحرا کے مشکل حالات میں ایک اونٹ نہ صرف اپنی حیات کو جاری رکھ سکتا ہے بلکہ اپنے مالک کی زندگی کا ضامن بھی بنتا ہے۔ اونٹ ایک ایسا جانور ہے جو گرمیوں کے موسم میں جزیرۃ العرب کے دہکتے ہوئے صحراؤں میں (جن پر سورج کی سوزان شعائیں ہمہ وقت برستی رہتی ہیں) پانی پیئے بغیر اور تھکن کا احساس کئے بغیر دس دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔

ہم انسانوں کے بدن سے ایک گھنٹے میں چالیس گرام پسینہ خارج ہوتا ہے اور اگر ایک یورپی باشندہ (جسے صحرا میں رہنے کی عادت نہیں) گرمیوں کے موسم میں جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں سفر کرے تو اس کے بدن سے پسینہ بہنے کی شرح ایک گھنٹے میں ایک ہزار دو سو گرام یعنی ایک لیٹر سے کچھ زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یورپ کے رہنے والے جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں سفر کے دوران بہت جلد نڈھال ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمارے جسم کا پانی بڑی تیز رفتاری سے پسینے کی صورت میں ضائع ہو جاتا ہے۔

اگر پسینہ آنے کی صورت میں ہمارے بدن کا پانی پانچ فیصد کم ہو جائے تو ہماری آنکھوں کے سامنے سیاہی چھانے لگتی ہے اور اگر بدن کے پانی کے کم ہونے کی شرح بڑھ جائے تو ہم شدید بخار اور ہذیان گوئی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور چنانچہ ہمارے بدن کا بارہ فیصد پانی ضائع ہو جائے تو ہم پر بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے اور ایسی حالت میں اگر پانی میسر نہ ہو تو ہم جلد ہی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

لیکن ایک اونٹ کے بدن سے شدید ترین گرمی میں اگر پچیس فیصد تک پانی کم ہو جائے تو بھی وہ کمزوری یا نقاہت کا شکار ہوئے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے اور حتیٰ کہ اس کے ہوش و حواس میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اونٹ پانی پیئے بغیر دس شب و روز تک صحرا میں سفر کر سکتا ہے اور صرف کافی ہے کہ اس کا مالک ہر دو دن میں ایک بار اسے تھوڑی مدت کے لئے آزاد چھوڑے تاکہ وہ صحرا میں اگنے والے خار مغیلاں سے اپنا پیٹ بھر سکے۔ دس شب و روز کے طویل اور متواتر سفر کے بعد بھی اونٹ سوتا نہیں بلکہ آرام کرنے کی غرض سے صرف بیٹھ جاتا ہے اور اگر اسے اٹھایا نہ جائے تو جب تک اسے بھوک اور پیاس کا احساس نہ ہو تو اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں۔

ایک صحرا نشین عرب کچھ اس طرح اونٹ کی خصوصیات اور عادات سے مانوس ہوتا ہے کہ انسان یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اونٹ کی شکیبائی اور بردباری زیادہ ہے یا صحرا میں رہنے والے ان لوگوں کی جو اونٹوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

حضرت محمد ﷺ اپنی طفولیت اور حتیٰ کہ جوانی کے زیادہ تر حصے میں جتنا عرصہ بیابان میں گزارتے تو وہاں ان کی واحد غذا اونٹنی کا دودھ ہی ہوتی تھی اور انہیں نان و خرما (روٹی اور کھجوریں) میسر نہ ہوتا مگر شہر میں واپس آنے کے بعد۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے تصور کے برعکس جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں کھجوروں کی کثرت نہیں کیونکہ ہر جگہ نخل (کھجور کا درخت) نہیں اگتا لہٰذا جزیرۃ العرب کے بڑے حصے میں کھجور کے درخت نہیں پائے جاتے۔

کھجور کا درخت اپنا پھل دینے کے لئے دو چیزوں کا محتاج ہے ایک سورج، دوسرا پانی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر جزیرۃ العرب کے ساحلی کناروں سے اس کے مرکزی صحراؤں کی طرف سفر کیا جائے تو آپ دیکھیں کہ وہاں کھجوروں کے درخت نہیں پائے جاتے کیونکہ جزیرۃ العرب کے مرکزی صحراؤں میں بارش نہیں ہوتی۔

آج جبکہ سعودی عربیہ سے تیل کا پائپ خلیج فارس (Persian Gulf) سے لے کر بحیرۂ روم تک پھیلا ہوا ہے اور جب یہ پائپ سعودی عربیہ کے صحراؤں سے گزرتا ہے تو اس کے کنارے کھجوروں کے درخت دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ امریکیوں نے جنہوں نے یہ کام پایہء تکمیل تک پہنچایا ہے، تیل کے پائپ کے ساتھ ساتھ پانی کا پائپ بھی بچھایا تاکہ ان لوگوں کے لئے جو اس علاقے میں رہتے ہیں پانی فراہم ہو سکے لیکن اگر تیل کے پائپ کی حدود سے دور ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ جزیرۃ العرب کے بقیہ صحرا میں کھجوروں کے درخت یافت نہیں ہوتے مگر ان جگہوں پر جہاں پانی موجود ہو اسی بنا پر ایک صحرانشین عرب سوائے جزیرۃ العرب کے ساحلی کنارے اور ان نقاط کے جہاں بلندی کی بنا پر بارش ہوتی ہے کھجوروں کا استعمال نہیں کرتا اور اس کی روزمرہ کی غذا اونٹنی کے دودھ پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔

اس زمانے میں بھی حضرت محمد ﷺ جب تک صحرا میں بسر کرتے تو اونٹنی کے دودھ پر ہی گزارا کرتے اور صرف مکہ واپس آنے کے بعد خرما و نان تناول فرماتے تھے لیکن

وہ کبھی بھی نان اور خرما کو یکجا استعمال نہیں کرتے تھے۔ یعنی حضرت محمد ﷺ یا خالی روٹی کھاتے یا صرف کھجوریں۔ ان کا کہنا تھا کہ پیٹ بھرنے کے لئے ان دو میں سے صرف ایک چیز کافی ہے اور اگر دوسری کو تناول کیا جائے تو یہ اسراف ہو گا۔

حضرت محمد ﷺ اپنی زندگی کے آخری دن تک صرف ایک غذا پر اکتفا کرتے اور کھانا کھانے کی غرض سے ہمیشہ زمین پر بیٹھتے تھے۔ ان کا دسترخوان ایک چٹائی پر مشتمل ہوتا تھا اور یہ چٹائی کھجور کے درخت کی چھال سے بنائی جاتی تھی۔

حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ روایت پہلے بھی ذکر ہو چکی ہے کہ پیغمبر ﷺ کی زندگی میں ان کے گھر میں ایک چھلنی تک موجود نہ تھی کہ جس کے ذریعے آٹا چھان سکتے اور اس کی بھوسی کو علیحدہ کر سکتے۔

البتہ روٹی اور کھجوروں کے علاوہ حضرت محمد ﷺ کے گھر میں ایک اور غذا بھی پکائی جاتی تھی جسے گندم اور عدس سے تیار کیا جاتا تھا۔ گندم اور عدس (مسور کی دال) کو پانی میں ابالنے سے حلیم جیسی ایک غذا تیار ہوتی اور جس دن حضرت محمد ﷺ وہ غذا تناول کرتے تو نہ روٹی کھاتے اور نہ ہی کھجوریں۔

حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں گوشت ایک نادر و کمیاب غذا سمجھی جاتی تھی اور ان کے ہاں سال بھر میں صرف ایک بار گوشت پکایا جاتا تھا۔ مکہ میں رواج یہ تھا کہ صرف کعبہ کی زیارت کے موقع پر جب قربانی کی جاتی تو گوشت کا استعمال ہوتا اور سال کے دوسرے حصے میں گوشت تناول نہیں ہوتا تھا۔ حضرت محمد ﷺ بھی اپنی قناعت پیشہ عادت کے مطابق ایسی ہی زندگی بسر کرتے تھے اور گوشت کے مہنگا ہونے کے سبب اس کا استعمال کم کرتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کے گھر میں میز اور کرسی نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ وہ ہمیشہ چٹائی پر بیٹھتے اور اسی پر آرام کی غرض سے لیٹ بھی جاتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ کے بعد خلفائے راشدین بھی ایسی ہی زندگی بسر کرتے تھے وہ بھی ہمیشہ یک نوع (ایک قسم کی) غذا پر اکتفا کرتے تھے اور یہ وہی زمانہ تھا کہ جب اسلام

نے صرف دس سال کے مختصر عرصے میں دنیا کی تین عظیم سلطنتوں ایران، شام اور مصر کا تختہ الٹ دیا اور ان تین وسیع و عریض ملکوں کو اسلام کے قلمرو میں داخل کرلیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت خدیجہؓ سے شادی کرنے سے پہلے بھی تجارت کی غرض سے دور دراز کے سفر پر جاتے تھے اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی بنا پر وہ جزیرۃ العرب کے مختلف قبیلوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے اور جس جگہ کا بھی نام لیا جاتا تو وہ اس کے متعلق معلومات فراہم کردیتے تھے۔



گھریلو زندگی کا زمانہ

حضرت خدیجہؓ حضرت محمد ﷺ کے لئے تین بیٹے لائیں اور پیغمبر اسلام نے اپنے پہلے فرزند قاسم کے نام کو اپنی کنیت کے طور پر منتخب کر لیا۔ اسی بنا پر انہیں "ابوالقاسم" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

قاسم کم سنی میں فوت ہو گئے اور حضرت محمد ﷺ کے دو دوسرے بیٹے بھی جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھے، کم سنی ہی میں چل بسے تھے۔

حضرت خدیجہؓ حضرت محمد ﷺ کے لئے چار بیٹیاں بھی لائیں جن کے نام یہ ہیں۔ حضرت رقیہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ۔ ان میں سے پہلی تین لڑکیوں کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور صرف حضرت فاطمہؓ صاحب اولاد ہو سکیں۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے کے بعد حضرت محمد ﷺ ان کے خاندان کا ایک عضو (رکن) بن گئے اور ان کے

قبیلے کے مختلف مردوں سے ان کا میل جول بڑھ گیا۔

حضرت خدیجہؓ کے قبیلے کے افراد اخلاق و کردار اور خلوص عمل کے لحاظ سے جانے پہچانے لوگ تھے اور ان کا شمار طبقہ "حنیف" میں ہوتا تھا۔

"حنیف" دراصل ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اگرچہ بت پرستی کی مذمت تو نہ کرتے تاہم بتوں پر خاص یقین بھی نہ رکھتے تھے۔ وہ لوگ شب و روز حقیقت کی تلاش میں رہتے اور کوشش کرتے تھے کہ ایسے مبداء کی پرستش کریں جس کی حقیقت میں کوئی شک و شبہ موجود نہ ہو۔

ایسے لوگوں میں سے ایک شخص "ورقہ بن نوفل" تھا جو حضرت خدیجہؓ کا چچا زاد بھائی کہلاتا تھا۔ حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کی شادی کے بعد "ورقہ بن نوفل" حضرت محمد ﷺ کا دوست بن گیا۔ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ واقفیت پیدا کرنے والے دوسرے اشخاص میں عبداللہ بن جحش' عثمان بن حواریہ اور زید بن عمر بھی شامل تھے۔ یہ لوگ اور حضرت خدیجہؓ کے قبیلے کے دوسرے افراد جب بھی حضرت محمد ﷺ سے ملاقات کرتے تو ان کے ساتھ مذہبی امور پر گفتگو کرتے اور اپنی طرف سے حضرت محمد ﷺ کو ترغیب دیتے کہ وہ بھی "حنیفوں" کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔

وہ مذاکرات جو حضرت محمد ﷺ نے اپنی زوجہ کے قبیلے کے افراد (یعنی حنیفوں یا مواحدوں) کے ساتھ انجام دیئے ایک مؤرخ کے نقطہء نظر سے بہت اہمیت اور دلچسپی کے حامل ہیں۔ افسوس کہ ہمیں ان مذاکرات کا علم نہیں مگر بہت مختصر طور پر عرب مؤرخین جیسے "ابن سعد" اور عینی نے ان بعض جملات کو جنہیں حضرت محمد ﷺ نے حنیفوں سے مذاکرات کے دوران ادا کیا تھا تاریخ کے لئے ثبت کیا ہے۔

اگر ہمیں ان مذاکرات سے تفصیلی طور پر آگاہی حاصل ہو جاتی جو تقریباً دس سال (یعنی جب پیغمبر ۲۵ سال سے ۳۵ سال کے ہوئے) کے عرصہ میں انجام پذیر ہوئے تو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی کہ حضرت محمد ﷺ کے افکار میں کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے وہ پندرہ سال یعنی حضرت خدیجہؓ سے شادی کرنے سے پیغمبر بننے تک' ان کے افکار کے تکوین کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

وہ مباحثے جو حضرت محمد ﷺ نے حنیفوں (یا مواحدوں) کے ساتھ انجام دیئے بڑی دلچسپی کے حامل ہیں لیکن افسوس کہ سوائے چند جملوں کے جنہیں ابن سعد اور عینی نے نقل کیا ہے ہمیں ان مباحثوں کے سلسلے میں مزید اطلاعات حاصل نہیں ہوئیں۔

ان دونوں مؤرخین کی روایت کے مطابق جب بھی وہ لوگ حضرت محمد ﷺ سے یہ کہتے کہ وہ بھی حقیقت کو پہچاننے کی جستجو کریں تو حضرت محمد ﷺ جواب میں کہتے کہ "لا الہ الا اللہ" یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

ایک مرتبہ حضرت محمد ﷺ نے ان لوگوں سے یہ بھی کہا کہ حقیقت اپنے وقت پر نمایاں ہو جائے گی اور جسے بھی چاہے اپنا چہرہ دکھا دے گی۔

اگرچہ حضرت محمد ﷺ مالی اعتبار سے حضرت خدیجہؓ کے مقابلے میں بے بضاعت تھے لیکن اس باوفا بیوی نے کچھ اس طرح اپنے شوہر کا خیال رکھا کہ مشہور مؤرخ ابن سعد حضرت آدمؑ کی زبانی یوں لکھتا ہے۔

"حضرت آدم علیہ السلام نے بہشت میں حوا سے کہا کہ سب سے بڑی نعمت جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو عطا کی وہ یہ تھی کہ انہیں حضرت خدیجہؓ جیسی زوجہ نصیب ہوئی جس نے اللہ کی مشیت اور اس کے احکام کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کے لئے حضرت محمد ﷺ کی ہر ممکن مدد کی جبکہ حوا اس بات کا سبب بنی کہ میں بہشت میں احکام خداوندی کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہو جاؤں"۔

سن ۶۰۵ عیسوی میں جبکہ حضرت محمد ﷺ پینتیس سال کے تھے تو مکہ میں دو ناگوار واقعے پیش آئے۔ پہلا یہ کہ خانہ کعبہ میں آگ لگ گئی اور دوسرا یہ کہ سیلاب اس کے کچھ حصوں کو بہا لے گیا۔ مکہ میں بارشیں بہت کم ہوتی تھیں لیکن کبھی کبھار ایسا بھی

ہوتا تھا کہ بارش کی وجہ سے سیلاب جاری ہو جاتا اور اس سال ایسا ہی ہوا جس کی بنا پر خانہ کعبہ کو خاصا نقصان پہنچا۔ قریش کے دس قبیلوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوگوں سے چندہ جمع کیا جائے اور عوامی چندے کی مدد سے خانہ کعبہ کی مرمت کی جائے۔

ایک طرف جبکہ مکہ میں چندہ جمع کرنے کی مہم جاری تھی تو دوسری طرف ایک کشتی جو کہ روم صغریٰ (یعنی آج کا ترکی) سے یمن کی طرف جا رہی تھی "شعیبش" کی بندرگاہ کے نزدیک جسے آج جدہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے سمندر میں غرق ہو گئی۔

یہ کشتی دراصل پانی میں ڈوبنے کی بجائے ریت میں دھنس گئی اور پھر رفتہ رفتہ ڈوبنا شروع ہو گئی۔

مذکورہ کشتی اس لئے یمن جا رہی تھی کہ وہاں ایک عظیم الشان کلیسا کی تعمیر کے لئے ضروری وسائل پہنچا سکے۔ اسی لئے اس کشتی میں بہت زیادہ مقدار میں سنگ مرمر' اینٹیں' ٹائلیں' لکڑی اور لوہے کے سامان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں جو سب عمارتی سامان پر مشتمل تھیں' موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ایک آزمودہ کار معمار بھی کلیسا کی تعمیر کے لئے یمن جا رہا تھا۔ جس کا نام "بکوم" (BACUM) تھا۔

عربوں نے "بکوم" سے جو کہ مسیحی تھا' کہا کہ ریت میں پھنسی ہوئی اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو باہر نکالنا ممکن نہیں اور بلاشبہ وہ سامان جو اس کشتی میں موجود ہے جلد ہی سمندر کی گہرائیوں میں چلا جائے گا۔ لہٰذا اگر تو اجازت دے تو ہم اس عمارتی سامان کو اتار کر خانہ کعبہ کی مرمت اور تعمیر کے لئے استعمال کریں۔ اس کے علاوہ چونکہ تو ایک ماہر معمار ہے لہٰذا اگر تجھے منظور ہو تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام بھی تجھے سونپ دیں۔ اس رومی معمار نے (روم سے مراد صغریٰ یا مشرقی روم ہے جس کا دارالخلافہ "بزنطین" تھا اور آج اسے استنبول کے نام سے پہچانا جاتا ہے) عربوں کی تجویز کو قبول کر لیا اور یوں عمارتی سامان کو ڈوبتی کشتی سے اتار کر مکہ کی جانب روانہ کر دیا۔

مکہ پہنچنے کے بعد بکوم نے خانہ کعبہ کی بقیہ عمارت کو ڈھانا شروع کر دیا تاکہ اس کی

تعمیر نو کی جا سکے۔ جماعت قریش نے جب یہ دیکھا کہ رومی معمار خانہ کعبہ کو مکمل طور پر ڈھانا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا کہ یہ گھر ویران نہیں ہونا چاہئے اور اگر تو اسے ویران کرے گا تو ہم سب پر ایسی بلا نازل ہو گی جو ہمیں مکمل طور پر صفحہ ہستی سے مٹا دے گی۔

بکوم نے جواب میں کہا کہ اس عمارت میں ایک دفعہ آگ لگ چکی ہے اور ایک مرتبہ سیلاب اس کے کچھ حصوں کو بہا لے گیا ہے لہٰذا ہر قسم کی مرمت بے فائدہ ہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ اسے مکمل طور پر ڈھا دیا جائے اور اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی جائے اور چونکہ ہمارا مقصد خانہ کعبہ کی تعمیر نو ہے لہٰذا اس کی ویرانی اس کی آبادی یعنی از سر نو تعمیر کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور میرے خیال میں عذاب نازل ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

لیکن قریش کے بزرگوں نے بکوم کی بات نہ مانی اور خانہ کعبہ کو ڈھانے کے سلسلے میں اپنی ممانعت جاری رکھی۔

کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ کے قریب ایک کنواں تھا جس میں کبھی کبھار ایک اژدھا باہر آتا اور اپنے بدن کو سینکنے کی غرض سے دھوپ میں لیٹ جاتا تھا۔

مکہ کے رہنے والے اگرچہ اس اژدھا سے بہت ڈرتے تھے لیکن اسے مار ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کرتے تھے۔

جب مشرقی روم سے آنے والے معمار نے جماعت قریش کے اصرار پر خانہ کعبہ کی تعمیر نو سے ہاتھ کھینچ لیا تو ایک دن وہ اژدھا کنوئیں سے باہر نکلا اور اپنے بدن کو گرم کرنے کی غرض سے دھوپ میں لیٹ گیا۔ اتفاق سے اسی لمحہ آسمان سے ایک عقاب ظاہر ہوا جس نے اژدھے پر اچانک حملہ کر دیا اور اسے اپنے پنجوں میں دبوچ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد مکہ کے بزرگوں نے یہ تاویل نکالی کہ عقاب کی طرف سے

اژدھے کا اٹھالیا جانا اور اس موذی جانور سے اہل مکہ کا نجات پالینا اس بات کی علامت ہے کہ خانہ کعبہ کے خدا نے اپنے گھر کو ڈھانے کی اجازت دے دی ہے تاکہ اس کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی جاسکے۔

جیسا کہ میں (یعنی کونستن ویرژیل) پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس تحقیق میں جو واقعہ بھی علم تاریخ کی حقیقت سے منطبق نہ ہوگا میں اسے "کہاوت" کے نام سے یاد کروں گا۔ لہٰذا خانہ کعبہ کے نزدیک کسی اژدھا کا موجود ہونا اور اس کے کنوئیں سے باہر نکلنا اور پھر عقاب کی طرف سے اٹھالیا جانا ایک کہاوت ہے تاریخ نہیں۔

تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قریش کے سرکردہ بزرگ آخرکار اس حقیقت سے واقف ہو چکے تھے کہ جب تک پرانے کعبہ کو ڈھایا نہ جائے تو اس کی مرمت کا کوئی فائدہ نہیں اور اسے ویران کرنے کا مقصد دراصل یہی ہے کہ خانہ کعبہ کو از سرنو آباد کیا جائے۔ لہٰذا قریش کے بزرگوں نے خانہ کعبہ کو ڈھانے کی منظوری دے دی اور رومی معمار نے بلاتوقف اپنا کام شروع کر دیا۔

جب عمارت مکمل ہو گئی تو بہشت سے آنے والے آسمانی پتھر "حجرالاسود" کو خانہ کعبہ کی نئی عمارت میں نصب کرنے کا مرحلہ آن پہنچا۔ جب خانہ کعبہ کو تعمیر کیا جا رہا تھا تو حجرالاسود کو اتار کر ایک علیحدہ جگہ پر رکھ دیا گیا تھا تاکہ خانہ کعبہ کی تکمیل کے بعد اسے دوبارہ اپنی جگہ پر نصب کر دیا جائے۔

لیکن حجرالاسود کو نصب کرنے کے موقع پر قریش کے دس قبیلوں کے درمیان شدید اختلاف پھوٹ پڑا کیونکہ ہر قبیلہ مدعی تھا کہ حجرالاسود کو خانہ کعبہ میں لگانے کا اعزاز صرف اسے حاصل ہونے چاہیے۔

قریش کے ان قبیلوں کے بزرگ اپنے اپنے گھروں سے خون سے بھرا پیالہ لے آئے اور اسے خانہ کعبہ کے سامنے رکھ کر اس میں اپنی انگلی ڈبوئی اور اس انگلی کو اپنی زبان پر پھیر کر یہ قسم اٹھائی کہ محال ہے ہم اپنے سوا کسی دوسرے کو یہ پتھر نصب کرنے کی

اجازت دیں۔

اس اختلاف کے پیش نظر قریب تھا کہ قریش کے دس قبیلوں کے درمیان خوفناک جنگ چھڑ جائے کہ اچانک حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ کی طرف آتے دکھائی دیئے۔

جب قریش کے بزرگوں نے انہیں دیکھا تو بولے کہ ہم حضرت محمدؐ امین کو اپنا ثالث اور منصف مقرر کرتے ہیں تاکہ وہ یہ فیصلہ دیں کہ کون سا قبیلہ حجرالاسود کو اٹھا کر خانہ کعبہ تک لے جائے اور وہاں نصب کرے۔

حضرت محمد ﷺ نے ایک کپڑا لانے کو کہا اور فوراً ہی ایک خیمے کی چادر کا کپڑا فراہم کر دیا گیا۔ حضرت محمد ﷺ نے کہا کہ حجرالاسود کو اس چادر پر رکھ دیا جائے اور قریش کے سبھی سرکردہ لوگ اس چادر کو چاروں طرف سے پکڑ کر اٹھائیں اور خانہ کعبہ کی دیوار تک لے جائیں۔ خود حضرت محمد ﷺ نے بھی اس چادر کا ایک کونہ اپنے ہاتھ میں تھاما اور قریش کے دوسرے لوگوں کی مدد سے حجرالاسود کو خانہ کعبہ تک پہنچا کر نصب کر دیا۔

حضرت محمد ﷺ کی اس حکمت عملی نے نہ صرف قبائل قریش کے دل موہ لئے بلکہ ان کی عزت و احترام میں مزید اضافہ ہوا اور قریش کے تمام قبیلے انہیں تحسین کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

لیکن اس کے بعد حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ دیکھنے کو نہیں ملتا مگر جب ۶۱۰ء میں جبکہ محمد ﷺ چالیس برس کے تھے اور انہوں نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی تھی۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ سن ۶۰۵ سے ۶۱۰ عیسوی تک حضرت محمد ﷺ کی مصروفیات کیا تھیں اور وہ پانچ سال ان پر کیسے گزرے۔

بہرحال خانہ کعبہ دوبارہ اپنی سابقہ شکل میں مکمل ہو گیا اور جزیرۃ العرب کے تمام مذاہب کے مختلف بتوں اور تصاویر کو پہلے کی طرح خانہ کعبہ میں نصب کر دیا گیا۔ عکاظ کا بازار بھی ہر سال منعقد ہوتا اور اس بازار میں شاعروں کی غزل سرائی بھی حسب معمول

جاری رہتی۔

لیکن تاریخ مذکورہ پانچ سالوں میں حضرت محمد ﷺ کی مصروفیات سے بے خبر ہے اور صرف یہ بتاتی ہے کہ وہ بسا اوقات غار حرا کی طرف جاتے تھے اور وہاں تنہائی میں غور و فکر کیا کرتے تھے۔

غار حرا میں

مکہ کے شہر میں کسی غار کی طرف جانا اور وہاں تنہائی میں وقت بسر کرنا کوئی عجیب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

جیسا کہ قدیم ہندوستان میں جب کوئی مرد صاحب اولاد ہو جاتا تو اپنے خاندان سے جدا ہو کر جنگل کی طرف نکل جاتا اور اپنا کچھ وقت وہاں بسر کرتا اس مدت میں وہ کسی سے ملاقات نہ کرتا اور پر اسرار خلقت کے بارے میں سوچتا رہتا تھا' اسی طرح مکہ میں بھی کچھ مرد جب شادی شدہ اور صاحب اولاد ہو جاتے تو ایک ماہ کے لئے اپنے بیوی بچوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے اور مکہ کے نزدیک کسی غار کی طرف نکل جاتے اور عرصہ ایک ماہ اسی غار میں تنہا بسر کرتے تھے۔

ایک ماہ کا عرصہ یا بقول عربوں کے "واحد" وہ عرصہ سمجھا جاتا تھا جو ایک ہلال کے نکلنے سے دوسرے ہلال تک کا درمیانی عرصہ ہوتا تھا اور چونکہ یہ عرصہ تقریباً" ثابت رہتا لہٰذا وہ لوگ اسی مدت کو غار میں گوشہ نشینی کے لئے منتخب کرتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ سے پہلے ان کے جد (حضرت) عبدالمطلبؓ بھی ہر سال ایک ماہ کا عرصہ اسی غار حرا میں گزارتے تھے اور کچھ دوسرے موحد بھی جب عمر رسیدہ ہو جاتے تو مکہ کے نزدیک کسی غار میں پناہ لے کر کچھ عرصہ تنہائی میں بسر کرتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ کی یہ عادت تھی کہ رمضان کے مہینے میں غار حرا کی طرف جاتے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ماہ رمضان میں ایک رات ایسی ہے جسے "شب قدر" کہتے

ہیں اور اس رات میں انسان جو بھی چاہے اسے حاصل ہو سکتا ہے۔

ایک ترک محقق "اسد بیگ" جس نے حضرت محمد ﷺ کی زندگی پر تحقیقی کتاب تحریر کی ہے، لکھتا ہے:

"عرب باشندوں کا یہ عقیدہ تھا کہ شب قدر میں خدا کی ساری کائنات آرام کرتی ہے یا سو جاتی ہے۔ دریاؤں کا پانی ٹھہر جاتا ہے، ہوائیں چلنا بند ہو جاتی ہیں اور ساری دنیا پر ایسا سکوت طاری ہو جاتا ہے کہ انسان ایک پودے کے زمین سے سر اٹھانے اور غنچے کے کھلنے کی آواز کو بھی سن سکتا ہے اور وہ لوگ جنہیں شب قدر کو پانے کی سعادت حاصل ہو اور اس رات کو جاگتے ہوئے گزاریں تو وہ جو بھی چاہیں انہیں نصیب ہو جائے گا"۔

میں (یعنی کونسٹن ویرژیل) کچھ عرصہ کے لئے جزیرۃ العرب (سعودی عربیہ) میں رہا ہوں اور میں نے غار حرا کا مشاہدہ بھی کیا ہے لہٰذا وہاں کی صورت حال کو یہاں بیان کر رہا ہوں۔

مکہ ایک ایسا شہر ہے جس کے اردگرد متعدد ٹیلے موجود ہیں۔ عرب باشندے ان ٹیلوں کو پہاڑ یا "کوہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان میں سے ایک پہاڑ کا نام ہے "جبل النور" اور غار حرا اسی پہاڑ یا ٹیلے پر واقع ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں یہاں سے ان کے گھر کا فاصلہ ڈیڑھ کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔

غار حرا پہاڑ کے پتھروں کی بڑی بڑی سلوں کے گرنے سے وجود میں آئی ہے اور اس کے تینوں ضلعے اور چھت انہی پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ غار کی بلندی اتنی ہے کہ اس کی چھت سے سر ٹکرائے بغیر ایک انسان با آسانی وہاں کھڑا ہو سکتا ہے۔

غار کی لمبائی بھی اتنی ہے کہ انسان وہاں لیٹ سکتا ہے اور چونکہ غار کا مدخل (دھانہ) کعبہ کی سمت ہے لہٰذا وہاں داخل ہونے کے بعد خانہ کعبہ کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

غار کا فرش اس کی دیواروں اور چھت کے برعکس تقریباً صاف اور مسطح ہے لہٰذا اس پر کوئی چادر یا چٹائی بچھا کر آسانی سے بیٹھا یا لیٹا جا سکتا ہے۔

آج غار کے مدخل کی صورتحال یہ ہے کہ اس تک پہنچنے کے لئے پتھروں میں کھدی ہوئی سیڑھیوں کو عبور کرنا پڑتا ہے تاکہ غار میں قدم رکھا جاسکے۔ عربی لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں یہ سیڑھیاں موجود نہیں تھیں۔

غار حرا میں انسان چاہے بیٹھے یا لیٹے بہر صورت خانہ کعبہ کا نظارہ کر سکتا ہے اور حضرت محمد ﷺ اس غار سے خانہ کعبہ کے علاوہ اپنے گھر کو بھی دیکھ سکتے تھے۔

کوئی یہ نہیں جانتا کہ حضرت محمد ﷺ اس غار میں کن خاص موضوعات کے بارے میں غور و فکر کیا کرتے تھے لیکن جیسا کہ خود انہوں نے ابن ہشام کی تحریر کے مطابق، حضرت خدیجہؓ کو بتایا کہ وہ اس غار میں دنیوی امور کے بارے میں بالکل نہیں سوچتے تھے۔

ایک رات جب حضرت محمد ﷺ غار حرا میں اپنی قبا اوڑھے لیٹے ہوئے تھے اور ان پر غنودگی یعنی "نہ نیند نہ بیداری" کی حالت طاری تھی تو ایک شخص نے انہیں جگایا اور ابن ہشام کی تحریر کردہ کتاب کے مطابق ایک کپڑا انہیں دکھایا۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ وہ ایک ریشمی کپڑے کا ٹکڑا تھا جس پر سنہرے حروف میں کچھ الفاظ لکھے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور جس شخص نے حضرت محمد ﷺ کو جگایا تھا اس کے بدن سے نور منتشر ہو رہا تھا۔

جب حضرت محمد ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے تو اس شخص نے ریشمی کپڑا ان کی نگاہوں کے سامنے لاتے ہوئے کہا، "اقراء" یعنی "پڑھو"۔

اس شخص کے ہاتھوں کے دباؤ نے کچھ اس طرح حضرت محمد ﷺ کو تکلیف میں مبتلا کر دیا کہ قریب تھا وہ درد کی شدت سے بے ہوش ہو جائیں تاہم انہوں نے کہا "مجھے پڑھنا نہیں آتا"۔

حضرت محمد ﷺ کو نیند سے اٹھانے والے شخص نے کہا "اقراء باسم ربک الذی خلق" یعنی پڑھ اس رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

یہ ضروری نہیں کہ انسان حضرت محمد ﷺ کی جگہ غار حرا میں ہو تو تبھی اس جملے کے اثرات کو محسوس کر سکے۔ اس جملے کا اثر اتنا زیادہ ہے کہ انسان جب بھی اس کلام کو پڑھے تو اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ عربی زبان کو بخوبی سمجھتا ہو۔

عربی زبان پر عبور حاصل کئے بغیر اللہ کے اس کلام اور دوسری قرآنی آیات کے اثرات کو سمجھنا مشکل ہے

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے وہ ترجمے جو انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی اور دوسری بہت سی زبانوں میں ہوئے ہیں پڑھنے والے کے دل پر اتنا اثر نہیں کرتے اور ان لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں عرب باشندے کیونکر اس کلام کو سن کر پیغمبر پر ایمان لے آتے تھے۔ خاصا یہ کہ قرآن بھی دوسری آسمانی کتابوں کی طرح ایک خاص طرز نگارش کا حامل ہے اور اس میں بعض کلمات اور حتیٰ کہ کچھ جملات بار بار دہرائے گئے ہیں جبکہ ایک فرانسیسی یا انگریزی پڑھنے والے کے نقطہء نظر میں مختلف جملوں کی تکرار اس کے اثرات کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ لیکن جو بھی عربی زبان کو سمجھتا ہو جب اس جملے کو، جو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بعد قرآن کی چھیانویں سورۃ "العلق" کی پہلی آیت ہی پڑھتا یا سنتا ہے تو فوراً" سمجھ جاتا ہے کہ ان الفاظ میں کتنا اثر اور کتنی گہرائی موجود ہے۔

جب حضرت محمد ﷺ نے ان کلمات کو سنا تو انہیں اپنے "ذہن" میں محفوظ کر لیا اور اس شخص کے کہنے پر انہیں دھرایا بھی۔ سارے مسلمان دانشور اور مفکر اس بات پر متفق القول ہیں کہ "اقراء باسم ربک الذی" سے مراد یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ جب بھی اللہ کے کلام کو زبان پر لانا چاہیں تو اس سے پہلے اللہ کا نام لیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید کی تمام سورتوں (سوائے سورہ توبہ) کے آغاز میں اللہ کا نام یعنی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ذکر ہوا ہے۔

سورہ ''العلق'' انیس (۱۹) آیات پر مشتمل ہے اور تمام اسلامی دانشوروں کی تصدیق کے مطابق یہ قرآن کی پہلی سورۃ ہے جو غار حرا میں حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی اور معنی اور مفہوم کے لحاظ سے قرآن کی مشہور اور برجستہ سورتوں میں سے ایک ہے۔

اس سورۃ کی دوسری آیہ میں کہا گیا ہے ''خلق الانسان من علق'' یعنی اللہ نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے خلق کیا اور چوتھی آیت میں آیا ہے ''الذی علم بالقلم'' یعنی اللہ نے انسان کو قلم کے ساتھ علم دیا۔

اور پانچویں آیت کہتی ہے ''علم الانسان مالم یعلم'' یعنی انسان جو نہیں جانتا تھا وہ اللہ نے اسے سکھایا۔ حضرت محمد ﷺ نے اس سورۃ کی انیس آیات کو جب سنا تو انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

ان آیات کا ایک بار سننا کافی تھا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے ذہن میں محفوظ ہو جاتیں جبکہ حضرت محمد ﷺ امی تھے یعنی پڑھنا جانتے تھے نہ لکھنا۔ اگرچہ حضرت محمد ﷺ امی تھے لیکن ان پر نازل ہونے والی پہلی ہی آیات میں علم و قلم یعنی لکھنے اور لکھانے، علم حاصل کرنے اور علم پھیلانے کا ذکر ہوا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی دین حصول علم کے لئے اتنی اہمیت کا قائل نہیں اور آپ کو اسلام کے سوا کوئی اور دین ایسا نہیں ملے گا جس کی ابتدا ہی میں علم و معرفت کو اتنی اہمیت اور فوقیت حاصل ہوئی ہو۔

میں مسلمانوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کے دین کے آغاز ہی میں حصول علم کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ کچھ مسلمان علماء نے اسی سورۃ کو مدنظر رکھتے ہوئے علم حاصل کرنے کو دین کے واجبات میں شمار کیا ہے اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ جیسا کہ ایک مسلمان پر نماز پڑھنا اور روزے رکھنا فرض ہے اسی طرح علم کا حاصل کرنا بھی اس پر واجب ہے۔

بہرحال..... جس نے سورہ ''العلق'' کی انیس آیات حضرت محمد ﷺ کو سنائیں وہ کچھ دیر کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"طبری" نے حضرت محمد ﷺ کے قول کے مطابق جسے انہوں نے حضرت خدیجہؓ کو نقل کیا تھا، اپنی کتاب میں لکھا ہے: "جب وہ شخص چلا گیا تو میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے زانو اتنے سست اور بے جان ہو چکے تھے کہ میں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا اور دوبارہ زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں بیٹھا رہنے کے بعد جب میرے گھٹنوں میں کچھ قوت پیدا ہوئی اور میں کھڑا ہونے کے قابل ہوا تو اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن میرے کندھے ابھی بھی لرز رہے تھے۔ ابھی میں نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ مجھے ایک آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی "یا محمدؐ! تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبرائیل ہوں۔"

"یہ آواز آسمان سے آ رہی تھی۔ میں نے اپنا سر بلند کیا اور دیکھا کہ وہ شخص جس کے رخسار انسان جیسے ہیں آسمان پر کھڑا ہوا ہے اور آواز دے رہا ہے "یا محمدؐ! تم اللہ کے رسول ہو اور میں اس کا فرشتہ جبرائیل ہوں۔"

"میرے قدم منجمد ہو گئے اور میں اسے مبہوت نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں نہ تو آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ ہی پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ میں نے اپنی نگاہوں کو دوسری طرف پھیر لیا لیکن وہاں بھی جبرائیل کو اسی حالت میں کھڑا پایا۔ پھر میں نے آسمان میں دوسری طرف نظر اٹھائی تو وہاں بھی جبرائیل کو موجود پایا۔"

"بہرحال میں جس طرف بھی نظر اٹھاتا اسے (یعنی جبرائیل) کو موجود پاتا۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد مجھ پر تھکن کا احساس طاری ہو گیا اور میں بڑی مشکل سے گھر تک پہنچ سکا۔"

حضرت خدیجہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب حضرت محمد ﷺ گھر پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ چکا ہے اور وہ اتنے خستہ حال دکھائی دیتے ہیں کہ دیوار سے ٹیک لگائے آہستہ آہستہ میری جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

اس رات کو، جو ماہ رمضان کی ایک رات تھی، حضرت محمد ﷺ پر طاری ہونے

والے احساس خستگی پر حیرت نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اللہ کا کلام سننا انسان کے لئے ایک بہت بڑا واقعہ ہے اور وہ لمحہ ایسا ہے جب اس پر بے پناہ دباؤ پڑتا ہے اور اسے تھکن سے چور کر دیتا ہے۔

دراصل جو چیز بھی انسان کی قوت برداشت سے باہر ہو وہ اسے خستہ کر دیتی ہے چاہے وہ اللہ کی آواز سنے یا بہت تیز رفتاری سے دوڑ لگائے۔

فطرت نے انسان کے لئے کچھ حدود کا تعین کیا ہے لہٰذا انسانی جسم کی ہڈیاں اور عضلات ایسے دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتے جو مذکورہ حدود سے باہر ہو۔

اگرچہ آج جدید علم اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ہم لوگ ایسی چیزیں بنا سکتے ہیں جو پرندوں سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکیں۔ آج بھی ہمارے عضلات اس بات پر قادر نہیں کہ ہم بذات خود گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے دوڑ سکیں یا پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ سکیں۔

اللہ کی کلام یعنی ایسی ہستی کی کلام سننا انسان کی تاب و تواں سے باہر ہے جو مکان کا پابند ہے نہ زمان کا' جس کا آغاز ہے نہ انجام اور جو قوت جاذبہ (کشش زمین) کا نہ صرف تابع نہیں بلکہ خود اس کو وجود میں لانے والا بھی ہے۔

جب ہم زلزلے کی گڑگڑاہٹ یا آسمانی بجلی گرنے کی تیز آواز سنتے ہیں تو ہم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے حالانکہ یہ ہمارے اپنے ماحول کی آوازیں ہوتی ہیں اور حتیٰ کہ ہم ان کے علمی قوانین سے بھی واقفیت رکھتے ہیں کہ کس بنا پر بجلی کڑکتی ہے یا زمین ہلتی ہے یا آسمان سے بجلی گرتی ہے۔

لہٰذا ایسی صورت میں ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ جبرائیل کی آواز سننے کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لرزہ طاری ہو گیا ہو اور اس کے چلے جانے کے بعد ان پر بے پناہ تھکن نے غلبہ کر لیا ہو۔



اللہ کا پیغام

جب حضرت خدیجہؓ نے حضرت محمد ﷺ کو اس حال میں دیکھا تو ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے سہارا دیا اور پوچھا:

"آپؐ کو کیا ہو گیا ہے جو اتنے تھکے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے بیمار ہوں؟"

حضرت محمد ﷺ نے اپنے اوپر گزرنے والے واقعے کو بیان کیا اور بولے "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

حضرت خدیجہؓ نے پوچھا۔ "آپ کو کس سے ڈر لگ رہا ہے؟"

یہاں دو مختلف روایات کا ذکر ہوا ہے۔

کچھ علمائے اسلام کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو بتایا کہ مجھ پر خوف طاری ہے اور جو آواز میرے کانوں میں پڑی ہے وہ مجھ پر اتنا اثر کر گئی ہے کہ مجھے قرار حاصل نہیں لہٰذا مجھے کہیں چھپا دو یا مجھے کچھ اوڑھا دو۔

کچھ دوسرے اسلامی مصنّفین جن میں ابن ہشام اور سہیلی بھی شامل ہیں، لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ جو اکثر اوقات غار حرا میں اکیلے بسر کرتے اور غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے اس لمحہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئے کہ جو آواز انہیں سنائی دی ہے مبادا وہ ان کے اپنے تخیل کی آواز ہو۔

تاہم بالائے ذکر دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ وہ انہیں کچھ اوڑھا دیں اور حضرت خدیجہؓ نے ایک "دثار" (ایک قسم کی چادر جسے گلیم بھی کہتے ہیں) حضرت محمد ﷺ پر ڈال دی تاکہ وہ آرام کر سکیں اور اپنے خوف پر غلبہ پا کر سکون حاصل کر سکیں۔

اگر حضرت محمد ﷺ خوف کے احساس کے بعد تردد میں مبتلا ہو گئے ہوں تو یہ بھی تعجب کی بات نہیں کیونکہ جنہوں نے بھی پہلی بار اللہ کی آواز کو سنا ہے وہ خوف میں مبتلا ہونے کے علاوہ تردد کا شکار بھی ہوئے ہیں کہ شاید جو آواز انہیں سنائی دی ہے وہ اللہ کی آواز نہ ہو۔

سینٹ ٹریز (Saint Tres) جو عیسائی مذہب کا مشہور عالم دین ہے کہتا ہے:

"جب اللہ کی آواز آدمی کے کانوں تک پہنچتی ہے تو اسے یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی کی آواز ہے کیونکہ اس آواز کا لحن اور طرز بیان اس کی اصالت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہنے دیتا تاہم جب ایک دن گزر جائے تو شک و تردید شروع ہو جاتی ہے اور مذکورہ آواز کو سننے والا اپنے آپ سے پوچھنے لگتا ہے کہ جو آواز اسے سنائی دی ہے آیا حقیقت میں وہ اللہ کی آواز ہے یا اس کے اپنے تخیل کی ایجاد یا پھر شیطان نے اس آواز کی نقل کی ہے۔ لہٰذا انسان یہ آرزو کرتا ہے کہ اے کاش ایک بار پھر اس آواز کو سنے تاکہ اس کا شبہ دور ہو جائے"۔

بہرحال حضرت محمد ﷺ جو "دثار" یعنی گلیم اوڑھے ہوئے لیٹے تھے نہ تو سو

سکتے تھے اور نہ ہی انہیں قرار حاصل تھا۔

کچھ عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ اسی رات جبرائیل دوبارہ حاضر ہوئے اور حضرت محمد ﷺ کے لئے اللہ کا پیغام لائے۔

بعض علمائے اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اس واقعہ کے تین دن بعد جبرائیل دوبارہ حاضر ہوئے اور وہ سورۃ جو آج قرآن کی ۷۴ ویں سورۃ ہے۔ حضرت محمد ﷺ پر نازل کی۔

مذکورہ سورۃ کی پہلی آیت یہ ہے "یا ایھا المدثر قم مانذر" یعنی اے گلیم پوش اٹھ اور لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھا۔

وہ آیات جنہیں جبرائیل ادا کرتے حضرت محمد ﷺ کے ذہن میں محفوظ ہوتی گئیں اور اس وقت انہیں یقین ہو گیا کہ جس آواز کو وہ سن رہے ہیں وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور ان کلمات کو اس انداز میں ادا نہیں کر سکتا۔

بعد میں حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو اپنے چچا زاد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو کہ ایک حنیف تھا۔ (حنیف کسے کہتے ہیں اس بارے میں گزشتہ ابواب میں ذکر ہو چکا ہے)

جب حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ ورقہ بن نوفل کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ اور اس کی بہن انجیل پڑھنے میں مصروف تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے غار حرا میں پیش آنے والے واقعے اور اس کے بعد "یا ایھا المدثر" کے نازل ہونے کی حکایت بیان کی تو ورقہ بن نوفل نے کہا کہ اللہ کا یہ کلام بلاشبہ وہی "ناموس" ہے جو اس سے پہلے حضرت موسیٰؑ پر بھی نازل ہوا تھا کچھ اسلامی مؤرخین کے مطابق ورقہ بن نوفل نے یہ بھی کہا کہ یا محمدؐ بلاشبہ تو وہی "ناموس" ہے جس کے آنے کی خبر حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔

لغوی اعتبار سے "ناموس" اللہ کے ان احکام کا نام ہے جو بنی نوع انسان کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ اس کلمے کو "ناموس" بھی کہا گیا ہے۔

بعد میں ورقہ بن نوفل نے حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو اس کی بنا پر لوگ تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اے کاش میں اتنا زندہ رہوں کہ دشمنوں کے مقابلے پر تمہاری مدد کر سکوں کیونکہ مجھے خوف اس بات کا ہے کہ جب تم اپنے دین کی منادی شروع کرو تو لوگ تمہیں ٹھکرا دیں یا جلا وطن کر دیں۔

جلا وطن ہو جانا یعنی جزیرۃ العرب میں کسی قبیلے کی طرف سے ٹھکرا دیا جانا ایک ایسی مصیبت سمجھی جاتی تھی جو کسی فرد پر نازل ہو سکتی ہو۔

جب کوئی شخص اپنے قبیلے کی طرف سے ٹھکرا دیا جاتا تو اس کا خون مباح تھا یعنی اگر کوئی اسے قتل کر دیتا تو قاتل سے پوچھ گچھ نہ ہوتی اور جو کوئی بھی چاہتا اسے پکڑ کر اپنا غلام یا بردہ بنا سکتا تھا۔ لہٰذا قبیلے کی طرف سے ٹھکرائے جانے والے شخص کی حیثیت اس پتھر سے مختلف نہیں ہوتی تھی جسے جو بھی چاہے اٹھا لے یا اٹھا کر دور پھینک دے۔

دور جاہلیت کے ایک شاعر نے اپنے اشعار میں اسی بات کا ذکر کیا ہے جس کا مضمون کچھ یوں ہے:

"مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ قضا و قدر کے ہاتھوں میرا واسطہ ناسازگار لوگوں سے پڑ جائے اور مجھے خوف اس بات کا ہے کہ جو بھی مجھے دیکھے راستے کا پتھر سمجھ کر ٹھکرا دے"۔

لہٰذا جو شخص اپنے قبیلے کی طرف سے ٹھکرا دیا جاتا اس کی مثال عرب شاعر کے بالائے ذکر شعر کی سی ہوتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے شخص کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہوتا تھا۔

لیکن خود حضرت محمد ﷺ کو، جو اللہ کی آواز پہچان چکے تھے، جلاوطن ہونے یا قبیلے سے باہر نکال دیئے جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔

اس رات کے بعد حضرت محمد ﷺ دوبارہ جبل النور کی طرف گئے لیکن وہ شخص (یعنی جبرائیل) جس نے انہیں پہلی رات کو بیدار کیا تھا۔ اس مرتبہ حاضر نہ ہوا۔

دوسری رات حضرت محمد ﷺ پھر غار حرا میں گئے لیکن اس بار بھی حضرت

جبرائیل دکھائی نہ دیئے۔
حضرت محمد ﷺ کا یہ معمول بن گیا کہ جب تاریکی چھا جاتی تو وہ حضرت خدیجہؓ سے رخصت ہو کر غار حرا کی طرف روانہ ہو جاتے اور وہاں اس امید پر بیٹھے رہتے کہ شاید حضرت جبرائیل کو دیکھ سکیں لیکن وہ نظر نہ آتے۔
رفتہ رفتہ ایک نامعلوم غم و اندوہ کی کیفیت ان پر طاری ہونے لگی اور حضرت خدیجہؓ جتنی بھی کوشش کرتیں انہیں تسلی و تشفی دینے میں کامیاب نہ ہوتی تھیں۔
بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ جب حضرت محمد ﷺ اپنے گھر سے نکل کر شب بھر غار حرا میں قیام کرتے تو اگلے دن اور اگلی رات بھی وہیں ٹھہرے رہتے اور دوسرے دن جب صبح کے وقت گھر لوٹتے تو پہلے سے زیادہ خستہ اور ملول نظر آتے تھے۔
ایک رات جب حضرت محمد ﷺ غار حرا میں گئے تو بہت اداس تھے۔ وہ اپنی قبا اوڑھے خواب و بیداری کے عالم میں تھے کہ حضرت جبرائیل کی مانوس آواز سنائی دی جو کہہ رہے تھے ''یا محمدؐ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرائیل ہوں۔'' حضرت محمد ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ جبرائیل شاید کچھ اور کہیں لیکن انہوں نے مزید کچھ نہ کہا۔
اگلی صبح جب حضرت محمد ﷺ گھر واپس لوٹے تو حضرت خدیجہؓ نے دیکھا کہ وہ بہت ہشاش بشاش ہیں۔ حضرت محمد ﷺ نے بتایا کہ گزشتہ شب وہ ایک بار پھر حضرت جبرائیل کی آواز سننے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اس بات پر خوش ہیں کہ اللہ کی نظروں سے گرے نہیں۔
اس کے بعد تین سال تک حضرت محمد ﷺ راتوں کو غار حرا میں جاتے رہے اور وہاں صبح تک غور و خوض میں ڈوبے رہتے اور دائم اللہ کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی جبرائیل کی آواز بھی سنائی دیتی جو صرف یہ کہتے کہ ''یا محمدؐ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں اس کا فرشتہ جبرائیل ہوں۔''

لیکن اس کے علاوہ جبرائیل کوئی اور بات نہ کہتے تھے۔
اس اثناء میں کوئی رات ایسی نہ تھی کہ حضرت محمد ﷺ شب تا سحر اللہ کے بارے میں غور و فکر نہ کریں اور ہر شب ان آیات کو جو ان پر نازل ہوتی تھیں دہراتے رہتے تھے۔
اس تین سالہ مدت کو مسلمانوں نے "دورانیہ فترت" یا "فترت الوحی" کے نام سے پکارا ہے۔ یعنی وہ مدت جس میں قرآنی آیات کا نازل ہونا موقوف ہو گیا تھا۔
مسلمانوں کا نظریہ یہ ہے کہ فترت الوحی اس لئے پیش آئی کہ حضرت محمد ﷺ اپنے عظیم مشن کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کے لئے مزید غور و خوض کر سکیں اور ان تین سالوں میں ان کی معنوی اور روحانی نشوونما مکمل ہو جائے۔

رسالت کا آغاز

تین سال کے بعد ایک رات جبرائیل غار میں حضرت محمد ﷺ کے پاس آئے اور سورۃ الضحیٰ کی صورت میں جو کہ آج قرآن کی ترانویں (۹۳) سورۃ ہے، اللہ کا پیام لائے۔ سورہ الضحیٰ وہ دوسری سورت ہے جو پہلی سورت کے تین سال بعد نازل ہوئی۔
دور فترت یا فترت الوحی کے بارے میں اسلامی مفکرین کے درمیان اختلاف رائے موجود ہے۔
کچھ کہتے ہیں کہ فترت کا دورانیہ صرف چند روز اور زیادہ سے زیادہ دس دنوں پر مشتمل تھا۔ بعض محققین کے مطابق دوران فترت دس ماہ پر محیط تھا جبکہ کچھ دوسرے علماء جن میں "طبری" "بیہقی" اور "بخاری" شامل ہیں اس بات کے قائل ہیں کہ "فترت الوحی" تین سال تک جاری رہی تھی۔
فترت کے زمانے میں حضرت محمد ﷺ ایک نبی تھے اور مسلمانوں نے اس مدت کو "دور نبوت" کا نام دیا ہے لیکن سورہ والضحیٰ کے نازل ہونے کے بعد حضرت محمد

ﷺ کی زندگی میں رسالت کا آغاز ہو گیا۔
دوران نبوت میں حضرت محمد ﷺ صرف ایک "نبی" ہیں جبکہ سورۃ والضحیٰ کے نازل ہونے کے بعد وہ "رسول" بن گئے اور رسول یعنی اللہ کا بھیجا ہوا یا اللہ کا نمائندہ۔
نبی یعنی وہ جو خبر یا بشارت دے اور رسول یعنی وہ جو اللہ کے لکھے ہوئے قانون کو انسانوں تک پہنچائے۔
مغربی دانشور نبوت اور رسالت کے درمیان فرق کو نہیں سمجھتے اور ان دو لفظوں کا ایک ہی مطلب نکالتے ہیں لیکن اسلامی علماء ان دو کے درمیان فرق کے قائل ہیں اور دوران رسالت سے پہلے کا زمانہ سمجھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ نبی وہ ہے جو اطلاع یا بشارت دے لیکن رسول اسے کہتے ہیں جو اللہ کے لکھے ہوئے قانون کو لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے۔
سورۃ الضحیٰ جو فترت الوحی کے بعد حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی' ایک ایسی مسرت بخش سورۃ ہے جس میں اللہ نے اپنے پیغمبر سے محبت کا اظہار کیا ہے۔
اللہ جو یہ جانتا تھا کہ فترت کے تین سالوں (یا دس دنوں یا دس مہینوں) میں حضرت محمد ﷺ بہت غمگین اور افسردہ رہے ہیں اور حتیٰ کہ بسا اوقات اس تردد میں بھی مبتلا ہوئے ہیں کہ مبادا اللہ کی ناراضگی کا شکار ہو گئے ہوں' تو اس بار اس نے حضرت محمد ﷺ کو اپنی بے پناہ محبت سے نوازا اور سورہ "والضحیٰ" کی پہلی آیت میں اپنے پیغمبر کے لئے قسم اٹھاتے ہوئے کہا۔
"والضحیٰ۔ والیل اذاسجیٰ"۔
اس طرح کی قسم اٹھانا سوائے قدیم مصر کی مذہبی کتابوں یا ہندوستان کی مذہبی کتب "وید" کے' جو ولادت مسیح ؑ سے چار یا پانچ ہزار سال پہلے کی ہیں' ماقبل اسلام بے سابقہ تھا اور جب قسموں کا ذکر ہندوستان کی مذہبی کتاب وید میں ہوا ہے ان میں قرآن جیسی لطافت' سادگی اور فصاحت موجود نہیں ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے لئے دو چیزوں کی سوگند اٹھائی ہے۔ ایک طلوع آفتاب کی دوسرے تاریکی شب کے چھا جانے کی! لیکن ان دو قسموں میں بے پناہ لطافت موجود ہے اور جب انسان اس آیہ کو پڑھتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ موسم بہار کی دلنشیں صبح کو سبزے سے بھری ہوئی ایسی سرزمین پر جہاں تمام شگوفے کھل اٹھے ہوں سورج کے طلوع ہونے کا نظارہ کر رہا ہو۔

ایک مغربی قاری جو عربی زبان کو نہیں جانتا "والضحیٰ" کو طلوع آفتاب کے طور پر ترجمہ کرے گا لیکن عربی زبان میں والضحیٰ کا مطلب صرف یہی نہیں بلکہ اس کے مجازی معنی بہت وسیع ہیں۔

عربی زبان میں "والضحیٰ" کا مفہوم یہ ہے: قسم اس وقت کی جب سورج کی شعاعیں افق سے نمودار ہوں اور رفتہ رفتہ یوں پھیلنے لگیں کہ زمین کا گوشہ گوشہ سورج کی روشنائی سے چمک اٹھے اور پھر ساری کائنات آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے سورج کے نور سے منور ہو جائے۔

(وضاحت: قارئین محترم! اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ الفاظ ایک مسیحی دانشور کے ہیں جو اس کتاب کا مصنف ہے۔ مذکورہ مصنف کو عربی زبان پر بھی عبور حاصل ہے اور اس نے یورپی باشندوں کو کلام الٰہی کی فصاحت اور بلاغت سے آگاہ کرنے کی خاطر یہ تمثیل پیش کی ہے جس کا مقصد یہی ہے کہ یورپی پڑھنے والے قرآنی الفاظ کی گہرائی کو سمجھ سکیں۔ یہ الفاظ قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں ہیں۔ جہاں کہیں بھی کونسٹن ویرژیل نے قرآنی آیات کا ترجمہ پیش کیا ہے تو زیادہ تر ان کا مفہوم بیان کیا ہے تحت الفظی ترجمہ نہیں)

"واللیل اذا سجیٰ" اس آیہ کی دوسری سوگند ہے۔ پہلی سوگند کی طرح اس کے مجازی معنی بھی بہت وسیع ہیں اور وہ مفہوم جو ایک عربی زبان سے آشنا اقتباس کرتا ہے کسی یورپی باشندے کے ذہن میں نہیں سما سکتا۔

ایک یورپی جب دوسری قسم کو کسی یورپی زبان میں ترجمہ کرنا چاہے تو یوں ترجمہ

کرے گا"اور قسم رات کی جب سب جگہ تاریکی چھا جائے"۔

لیکن "واللیل اذا سجی" کا مطلب یہ نہیں بلکہ اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

"قسم اس وقت کی جب تاریکی چھا جاتی ہے اور دنیا تاریکی میں ڈوب جاتی ہے اور اس جہاں پر طاری ہونے والا سکوت اتنا گہرا ہوتا ہے کہ کہیں دور سے اٹھنے والی ہلکی سی آواز بھی بہت قریب سے سنائی دیتی ہے"۔

حتیٰ کہ یہ ترجمہ بھی حق مطلب کو پورا نہیں کرتا اور ایک عرب باشندہ جب اس سوگند کو پڑھتا ہے تو اس کے سامنے رات کی تاریکی میں جزیرۃ العرب کا کوئی بیابان مجسم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے تصور میں دیکھتا ہے کہ سارے صحرا میں تاریکی چھائی ہوئی ہے اور یہ آسمان جو کسی وسیع و عریض خیمے کی چھت کی طرح چاروں طرف سے افق پر بندھا ہوا ہے' کتنا روشن ہے۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے اور جزیرۃ العرب کے صاف آسمان پر ان کی درخشندگی اتنی زیادہ ہے کہ انسان کو یہ گمان گزرتا ہے کہ اگر ہاتھ بڑھائے تو ستاروں کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اور تاریکی میں ڈوبے صحرا میں ستاروں بھرے آسمان تلے کبھی کبھی بہت دور سے کوئی آواز کانوں تک پہنچتی ہے اور چونکہ ہوا بے حرکت اور ماحول پر خاموشی طاری ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ آواز بہت قریب سے آ رہی ہو۔ ایسے بیابانوں میں جب انسان اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے تو کچھ اس طرح احساس تنہائی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ گویا آغاز خلقت سے اب تک اس کے اور خاموش بیابان کے علاوہ کوئی اور چیز وجود میں نہیں آئی۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے افکار جو "واللیل اذا سجی" کو پڑھنے کے بعد ذہن میں ابھرتے ہیں اگر میں ان کے بارے میں مزید گفتگو کروں تو ڈر ہے کہ پڑھنے والے مجھے خیال پرست تصور کریں گے لیکن میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان دو قسموں کے مفہوم کے طور پر ہے ان کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں نہیں کیونکہ ان دو قسموں کی فصاحت کو سمجھنے کے لئے انسان یا تو عرب ہو یا عربی زبان کو جانتا ہو۔

مذکورہ سورۃ کی تیسری آیت میں اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے "ماودعک ربک وماقلگی" اس آیت کے مجازی معنی بھی پہلی آیت کی طرح اس کے ظاہری معنی سے کہیں زیادہ ہیں۔

اللہ نے اس آیت میں حضرت محمد ﷺ کے ذہن میں ابھرنے والی تشویش کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ آپ پریشان تھے اور یہ تصور کر رہے تھے کہ اللہ نے اپنی شناسائی کے بعد آپ کو اکیلا چھوڑ دیا ہے اور آپ سے اپنی دوستی اور محبت واپس لے لی ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں اور اللہ نے آپ کو چھوڑا نہیں اور آپ بدستور اللہ کے محبوب ہیں۔

مندرجہ بالا سورۃ میں اللہ نے حضرت محمد ﷺ کی تشویش کو دور کر دیا اور انہیں آسودہ خاطر بنا دیا کہ وہ اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان برقرار ہونے والی محبت میں کسی قسم کی تردید نہ کریں۔



یتیموں اور فقیروں کی فکر

اس سورۃ میں باوجود اس کے کہ یہ قرآن کی دوسری سورۃ ہے جو پیغمبر ﷺ پر نازل ہوئی اللہ نے یہ تاکید کی ہے کہ یتیموں اور فقیروں کی طرف سے غافل نہ ہوا جائے۔ اللہ یہ جانتا تھا کہ حضرت محمد ﷺ خود یتیم تھے اور بچپن میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو جانے کے باعث انہوں نے کتنے رنج اور دکھ اٹھائے ہیں۔ وہ طفولیت کی تمام مدت میں جزیرۃ العرب کے خار مغیلان سے بھرے اور لاوے کی طرح دہکتے ہوئے بیابانوں میں برہنہ پا سفر کرتے تھے اور اکثر اوقات بھوکے ہی رہتے تھے۔

اگر حضرت محمد ﷺ کو یتیموں اور فقیروں کی فکر نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ فترت کے تین سال کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ میں انہیں یہ تاکید نہ کرتا کہ یتیموں اور مسکینوں کے حال سے غافل نہ رہیں۔

سورہ "والضحیٰ" کی دسویں آیت میں اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو اور درحقیقت

ان کی زبان سے دوسرے انسانوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ "واما السائل فلاتنهر" یعنی اگر کوئی سائل تیرے پاس آئے تو اپنی پیشانی پر بل مت ڈال اور اسے مت دھتکار۔

آج کے دور میں بھیک مانگنے کو اخلاقی طور پر ایک ناشائستہ عمل سمجھا جاتا ہے اور بھیک مانگنے والے کو معاشرے کا نالائق ترین عضو تصور کیا جاتا ہے۔

آج لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص گدائی کرتا ہے وہ یا تو اپنا کاہل ہے کہ کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتا یا اتنا نالائق اور فاسد ہے کہ کسی کام کو انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اس کا برا اخلاق اور ناپسندیدہ عادتیں (جیسے شراب نوشی یا منشیات کا استعمال) اس کے لئے کام کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

چودہ سو سال پہلے جزیرۃ العرب میں بھی بھیک مانگنا عار سمجھا جاتا تھا اور اس وسیع سرزمین میں کوئی شخص گدائی نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے کے لوگ مالی لحاظ سے بے بضاعت ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود لوگ بھیک نہیں مانگا کرتے تھے۔ البتہ ناگہانی طور پر ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے تھے کہ لوگ دوسروں سے امداد کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

جب صحرائی لٹیرے کسی مسافر کو بیابان میں لوٹ لیتے تو اس بدنصیب کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا کہ ہاتھ پھیلائے اور دوسروں سے مدد کی درخواست کرے۔

جب کوئی قصبہ سیلاب کی نذر ہو جاتا اور وہاں کے رہنے والوں کی ہستی و نیستی نابود ہو جاتی تو ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ دوسروں سے سوال کریں کیونکہ اس زمانے میں نہ تو ریڈ کراس جیسی کوئی تنظیم موجود تھی جو سیلاب سے متاثرہ افراد کی مدد کرے اور نہ ہی فلاح و بہبود کا کوئی ادارہ تھا جو مصیبت زدہ افراد کو کپڑے اور خوراک فراہم کر سکے۔

حضرت محمد ﷺ کی رسالت میں ایسی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں جو ایک بے طرف ناظر یا نقاد کے نقطہ ء نظر سے بہت دلچسپ اور قابل توجہ ہیں۔

حضرت محمد ﷺ کی رسالت صرف ایک مذہبی رسالت نہ تھی بلکہ ایک سماجی اور معاشی تحریک بھی سمجھی جاتی ہے۔

چودہ سو سال پہلے، جزیرۃ العرب کی سرزمین میں ایسے جاہلانہ رسم و رواج کے مقابلے میں جن کا ذکر مختصر طور پر ہو چکا ہے، ایک سماجی اور معاشی تحریک کا آغاز ایک عدیم المثال واقعہ تھا اور حضرت محمد ﷺ نے اس عظیم الشان اور پر خطر رسالت کو انجام تک پہنچانے کا فرض سنبھال لیا تھا۔

اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے کہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت ایک مذہبی رسالت نہ تھی بلکہ ایک سماجی اور معاشی تحریک بھی تھی، قرآن کی چھ ہزار دو سو چھتیس آیتوں میں کئی بار اس مطلب کو دہرایا گیا ہے اور اگر میں ان کی تفصیل بیان کروں تو شاید پڑھنے والوں کے لئے، جو مغربی باشندے ہیں، خستگی یا کسالت کا سبب بنے کیونکہ وہ لوگ مسلمانوں کی طرح قرآنی آیات سے آشنائی بھی نہیں رکھتے۔

میں نے دو فرانسیسی دانشوروں سے، جو دونوں عربی زبان کے استاد ہیں اور عربی ادب کے ماہر بھی، یہ سنا ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو صرف مذہبی قوانین کا مبلغ سمجھتے ہیں جبکہ یہ سراسر ناانصافی اور غلط فہمی ہے۔

حضرت محمد ﷺ مذہبی قوانین کے مبلغ ضرور تھے لیکن وہ ایک عظیم سماجی اور معاشی تحریک کے پیشوا بھی تھے لہٰذا اسی لئے جو قوانین اللہ کی طرف سے مرتب ہوتے وہ ان پر مرحلہ بہ مرحلہ نازل ہوتے تھے۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کیونکہ حضرت محمد ﷺ سے پہلے جتنے بھی آسمانی قوانین آئے وہ یک لخت نازل ہوتے تھے مرحلہ وار نہیں۔

حضرت محمد ﷺ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آئے وہ اپنے قوانین کو ایک مرتبہ اور ایک ہی وقت میں لاتے تھے جبکہ حضرت محمد ﷺ جو قوانین لائے وہ ۲۳ سال کے عرصے میں ۶۱۰ء سے ان کی رحلت تک بتدریج نازل ہوئے۔

قرآن کے بتدریج نازل ہونے کی وجہ جیسا کہ قرآن کی پچیسویں سورہ "الفرقان" کی بتیسویں (۳۲) آیت میں ذکر ہوا ہے یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ قرآنی آیات کو حفظ کر سکیں اور انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ قرآنی آیات مختلف عوامل کے پیش نظر اور وقت کی ضرورت کے تحت نازل ہوتی تھیں۔

حضرت محمد ﷺ سے پہلے جو پیغمبر آسمانی کتاب لائے وہ امی نہیں تھے لہٰذا کتاب آسمانی ان پر ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتی تھی لیکن حضرت محمد ﷺ امی تھے اور اسی بنا پر قرآنی آیات ان پر بتدریج نازل ہوتی تھیں تاکہ وہ انہیں اپنے ذہن میں اچھی طرح محفوظ کر سکیں۔

حضرت محمد ﷺ کی سربراہی میں شروع ہونے والی مذہبی' معاشی اور سماجی تحریک نے مسلمانوں کو ایسا جذبہ اور ولولہ عطا کیا کہ ابھی ہجرت کو آدھی صدی بھی نہ گزری تھی کہ انہوں نے دنیائے قدیم کی تین عظیم سلطنتوں (ایران' مصر اور شام) کو حکومت اسلام کے قلمرو میں داخل کر لیا اور وہاں کے باشندوں کو مسلمان بنا لیا۔

دنیا میں اور کوئی دین ایسا نہیں جو اتنی تیز رفتاری سے پھیلا ہو اور اگر حضرت محمد ﷺ کے قوانین صرف مذہبی ہوتے تو اسلام اتنی تیزی سے ساری دنیا میں مقبول نہ ہوتا۔ اسلام کی پیش روی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سماجی اور معاشی تحریک کا علمبردار بھی تھا۔

حضرت محمد ﷺ کی سماجی تحریک میں ایک ایسا بنیادی اصول دیکھنے کو ملتا ہے کہ گویا آج ساری دنیا اسی کی تلاش میں ہے اور وہ اصول ہے تمام انسانوں میں وحدت اور یکجہتی!

قرآن کہتا ہے کہ تمام انسان ایک امت واحدہ ہیں اور دنیا کی مختلف قوموں میں جو اختلافات اور بدگمانیاں موجود ہیں وہ خود ان کے ظلم و ستم اور بے انصافی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں۔

جس آیت میں مندرجہ بالا مفہوم کا ذکر ہوا ہے وہ قرآن کی دوسری سورہ "البقرہ" کی حسب ذیل دو سو تیرہویں آیت ہے "کان الناس امتہ واحدہ...." آخر تک۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ کا نصب العین اسلامی معاشرے میں بنی نوع انسان کے لئے وحدت اور یکجہتی برقرار کرنا تھا اور اسی بنا پر اللہ نے ان کے دین کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ کے دین پر رکھی۔

حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے نہ مسیحی اور نہ ہی بت پرست بلکہ وہ ایک "حنیف" مانے جاتے تھے اور خدائے یکتا کی پرستش کرتے تھے لیکن اس کے باوجود یہودی بھی انہیں مانتے ہیں یعنی انہیں پیغمبر سمجھتے ہیں اور مسیحی بھی۔

حضرت محمد ﷺ کے دین کو اس لئے دین ابراہیم پر استوار کیا گیا کہ یہودی اور مسیحی قومیں ان کے دین کو بلا تردید قبول کرلیں یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی رسالت کا آغاز کیا تو کسی بھی توحیدی مذہب کی مخالفت نہیں کی لیکن انہیں یہ دعوت ضرور دی کہ وہ حلقہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا نظریہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی مذہب کے پیروکاروں نے ان احکامات کو جو اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئے تھے صحیح طور پر تعبیر نہیں کیا اور چونکہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں نے ان دو پیغمبروں کے احکامات کو درست طریقے سے نہیں سمجھا تو اسی وجہ سے یہودی اور عیسائی قومیں ہدایت نہ پا سکیں اور اگر وہ "اسلام" کو قبول کرلیں تو انہیں بھی دین اور دنیا کی بھلائی نصیب ہو گی۔

"اسلام" عربی زبان کے خوبصورت کلمات میں سے ایک ہے اور اسی طرح قرآن کا لفظ بھی عربی زبان کے برجستہ اور دلنشین لفظوں میں شمار ہوتا ہے۔ جہاں تک روایات کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ سے پہلے صرف ایک بار "اسلام" کا تذکرہ کیا ہے اور وہ اس وقت تھا جب حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی راہ میں اپنے فرزند کی قربانی

دینے کا فیصلہ کیا تاہم اللہ نے ان کے بیٹے کی قربانی کو بخش دیا تھا۔

روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد اللہ نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کا بیٹا حضرت اسماعیلؑ "اسلما" ہو گئے یعنی انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے ارادے کے سامنے تسلیم کر دیا اور "اسلام" یعنی مشیت الٰہی کے سامنے تسلیم ہو جانا اور مسلمان اسے کہتے ہیں جو اللہ کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

قرآن بھی، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں عربی زبان کے خوبصورت کلمات سے ایک ہے اور اسے "فرقان" کا نام بھی دیا گیا ہے۔

"فرقان" کا مطلب ہے "علیحدہ علیحدہ" اور قرآن کو فرقان کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے مختلف حصے یکایک نازل نہیں ہوئے بلکہ علیحدہ علیحدہ مختلف وقفوں میں نازل ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کا مطلب سچ کو جھوٹ سے جدا کرنے والے کے بھی ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عربی زبان کے کچھ کلمات بنیادی طور پر دوسری زبانوں سے اقتباس شدہ ہیں اور یہ کلمات اسلام سے صدیوں پہلے عربی زبان میں اور اس کے بعد قرآن میں داخل ہوئے اور خود قرآن کا لفظ بھی ایسے ہی کلمات میں سے ایک ہے۔

لفظ "قرات" کہ قرآن بھی اسی سے ماخوذ ہے دراصل سریانی زبان سے عربی زبان میں داخل ہوا اور قرآن کا مطلب ہے قرات یا مقدس کلام کا پڑھنا۔ اسی لئے عام کلام کے پڑھنے کو قرآن نہیں کہا جا سکتا اور چونکہ قرآن اسم خاص (اسم معرفہ) یعنی ایسے کلام کا مجموعہ جو اللہ کی طرف سے حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا، اس لئے کسی اور کلام کو قرآن کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

کچھ اسلامی مفکرین کی رائے یہ ہے کہ تیسری سورۃ جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی سورہ "قیامت" ہے جو چالیس آیات پر مشتمل ہے۔

حضرت محمد ﷺ قرآنی آیات کو جو ان پر نازل ہوتی تھیں، بڑی عجلت اور شتاب کے ساتھ پڑھتے تھے کیونکہ انہیں خوف تھا کہ کلام اللہ کو کہیں فراموش نہ کر بیٹھیں لیکن

اللہ تعالیٰ نے سورہ "القیمہ" میں دوسری آیات کے ضمن میں یہ آیت بھی نازل کی اور فرمایا "لا تحرک بہ لسانک لتجعل بہ" یعنی اے میرے رسول! جب قرآن کو پڑھو تو اپنی زبان کو تیزی سے حرکت میں نہ لاؤ یعنی قرآن کو عجلت اور شتاب کے ساتھ مت پڑھو۔

اسی سورۃ کی سترھویں آیت میں آیا ہے:

"ان علینا جمعہ و قرانہ" یعنی ہم قرآن کو تمہارے ضمیر میں جمع کر دیں گے اور قرآن کو تمہارے لئے آسان بنا دیں گے۔

اٹھارویں آیت میں ذکر ہوا ہے: "خاذا قراناہ فاتبع قرانہ"..... یعنی صبر کرو کہ ہم قرآن کی آیات کو تمہارے لئے پڑھیں اور جب ہم پڑھ چکیں تو پھر تم پیروی کرو اور پڑھو اور یقین رکھو کہ قرآن کو حفظ کر لو گے۔

انیسویں آیت کہتی ہے: "ثم ان علینا بیانہ" یعنی اگر قرآن کو حفظ کرنے کے بعد کسی چیز کے سمجھنے میں مشکل پیش آئے تو ہم خود اس کی وضاحت کر دیں گے۔

مذکورہ بالا آیات کے نازل ہونے کے بعد حضرت محمد ﷺ قرآن کو تیزی سے نہیں پڑھتے تھے بلکہ آرام اور سکون کے ساتھ تلاوت کرتے تھے۔

جیسا کہ ہم گزشتہ سطور میں بیان کر چکے ہیں کہ قرآن ۲۳ سال کی مدت میں بتدریج نازل ہوا اور اگر "فترت الوحی" کی مدت کو تین سال (یا کچھ علماء کے بقول چند روز یا چند ماہ) تصور کریں تو سوائے اس سورۃ کے جو غار حرا میں نازل ہوئی' تمام قرآنی آیات کے نازل ہونے کی کل مدت بائیس یا تیئس سال سمجھی جا سکتی ہے۔

آج جبکہ عرب قوم کی تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بدو عرب اسلام سے پہلے کس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے تو ہم قرآن کے بتدریج نازل ہونے کی وجہ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ اگر چھ ہزار دو سو چھتیس آیات یکایک نازل ہو جاتیں تو اس زمانے کے جاہل' بے اطلاع اور سادہ لوح باشندے کچھ اس طرح الجھن کا شکار ہو

جاتے کہ انہیں کچھ بھی بجھائی نہ دیتا۔

حتیٰ کہ آج جبکہ بیسویں صدی کا زمانہ ہے اور علم و دانش کی ترقی اور بین الاقوامی تعلقات کی وسعت کے پیش نظر عام لوگوں کا ذہنی معیار چودہ سو سال پہلے کے مقابلے میں بہت ترقی کر چکا ہے لیکن اس کے باوجود آج بھی کوئی حکومت اپنے باشندوں کے لئے سینکڑوں قوانین کو یک لخت لاگو نہیں کر سکتی لہٰذا اس زمانے کے لوگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے چودہ سو سال پہلے کی تو بات ہی علیحدہ ہے' اگر قرآن یکبارگی نازل ہو جاتا تو چونکہ اس وقت کے لوگوں کا حافظہ اور ان کے دماغ اتنے عظیم کلام کو اپنے اندر سمونے کی گنجائش نہیں رکھتا تھا لہٰذا ممکن تھا کہ وہ بے رغبتی کا شکار ہو جاتے اور یوں قرآن کے نزول کا مطلوبہ اثر حاصل نہ ہو سکتا۔ لہٰذا قرآن کے نازل ہونے کا فطری اور شعوری طریقہ یہی تھا کہ وہ بتدریج نازل ہو تاکہ لوگ رفتہ رفتہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام سے مانوس ہوں' اسے سمجھ سکیں اور پھر اس پر عمل کر سکیں۔



پہلے مسلمان

پیغمبر پر ایمان لانے والی پہلی شخصیت ان کی زوجہ حضرت خدیجہؓ تھیں اور اس کے بعد ان کے چچا کے بیٹے حضرت علیؓ ابن ابی طالب مسلمان ہوئے جنہیں حضرت محمد ﷺ نے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا تھا۔

تیسرے مسلمان حضرت محمد ﷺ کے غلام زیدؓ تھے، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے آزاد کر دیا تھا لیکن وہ اپنے والدین کے پاس جانے پر رضامند نہ ہوئے اور انہوں نے کہا تھا کہ میں حضرت محمد ﷺ کو اپنے ماں باپ سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کے بعد کوئی اور شخص حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوا۔

تین سال کی مدت میں یعنی سن ۶۱۰ء سے ۶۱۳ء تک مسلمانوں کی تعداد خود حضرت محمد ﷺ کے علاوہ، انہی تین افراد پر مشتمل تھی۔ اس سال حضرت ابوبکرؓ بھی مسلمان

ہو گئے اور یوں مسلمانوں کی تعداد چار ہو گئی لیکن حضرت محمد ﷺ دوسروں کو مسلمان بنانے کی جتنی بھی کوشش کرتے' کامیاب نہ ہوتے تھے۔ مکہ کے رہنے والے اگرچہ حضرت محمد ﷺ کے نئے دین کو تسلیم نہ کرتے تاہم ابتداء میں اس کی مخالفت بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگ جب یہ دیکھتے کہ حضرت محمد ﷺ دوسروں کو اسلام کی دعوت دے رہے ہیں تو وہ دشمنی کا مظاہرہ نہ کرتے تاہم ان کی باتوں پر توجہ بھی نہیں دیتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ روایات کے مطابق جزیرۃ العرب کی سرزمین میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گزرے ہیں جن میں سے کئی سو کے نام اور ان کی زندگی کے واقعات تاریخ میں درج ہیں جبکہ اکثر کا نام و نشان تک معلوم نہیں لہٰذا عرب لوگ نسل در نسل پیغمبر دیکھنے کے عادی تھے اور وہ لوگ جب کسی پیغمبر کو تبلیغ کرتے ہوئے دیکھتے تو حیرت نہیں کرتے تھے اور ان میں تجسّس کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ جب مسلمان ہو گئے تو ان کے ہاں ایک لڑکی نے جنم لیا جس کا نام حضرت عائشہؓ رکھا گیا۔ حضرت عائشہؓ وہ پہلی ہستی ہیں جنھوں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا میں قدم رکھا کیونکہ ان کے والد مسلمان تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد حضرت محمد ﷺ پر قرآن کی چھبیسویں (۲۶) سورۃ کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دین اسلام کی دعوت دیں۔ وہ آیہ درج ذیل ہے۔

"وانذر عشیرتک الاقربین" یعنی اپنے عزیز و اقارب کو اسلام کی دعوت دیں کہ وہ اسلام کو قبول کر لیں۔

روایت ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضرت محمد ﷺ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ ان کے سبھی چچاؤں اور ان کی اولاد کو کھانے کی دعوت پر مدعو کریں۔ اس روایت میں یہ ذکر ہوا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے انہیں دین اسلام کی دعوت دی تو ان میں سے کسی نے بھی رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کیا

سوائے حضرت علیؓ کے یعنی حضرت علیؓ اپنی جگہ سے اٹھے اور بولے "یا محمد (ﷺ) میں آپ کی دعوت کو قبول کرتا ہوں اور آپ پر ایمان لاتا ہوں"۔

اس روایت کا آخری حصہ کچھ اسلامی دانشوروں کے نظریات کے مطابق نہیں کیونکہ حضرت علیؓ مذکورہ ضیافت سے بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد وہ دوسرے شخص ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان لائے۔ لہٰذا تاریخ اور دیگر حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ درج ذیل ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں تو پیغمبر خدا ﷺ نے اپنے عزیز و اقارب کے اخلاق و کردار، ان کے طرز افکار اور ان کی ذہنی نفسیات کے بارے میں غور و خوض کرنا شروع کر دیا انہوں نے سب سے پہلے اپنے چچا حضرت ابو طالبؓ کے بارے میں سوچا اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ حضرت ابو طالبؓ ایک شریف اور نیکو کار انسان ہیں لیکن وہ اپنی کہن سالی اور پرانی روایات پر سختی سے کاربند ہونے کی بنا پر اپنے آبا و اجداد کے دین کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

حضرت ابو طالبؓ کے بعد ان کے قبیلے کا عالی مرتبہ شخص "ابی لہب" تھا جو حضرت ابو طالبؓ کا بھائی بھی تھا (یعنی پیغمبرؐ کا چچا) ابی لہب مکہ کا ایک مالدار تاجر تصور ہوتا تھا۔ اسے مذہبی مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی مگر صرف اس حد تک کہ مذہبی اعتقادات کے ذریعے تجارتی مفاد حاصل کر سکے۔

قریش کے دوسرے تاجر بھی ایسے ہی تھے اور وہ مذہب سے صرف اس لئے لگاؤ رکھتے تھے کہ اس میں انہیں اپنا مفاد نظر آتا تھا۔ ان کے لئے مذہب کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہر سال چار مہینوں کے لئے جنگ و جدال اور لوٹ مار پر پابندی ہوتی تھی تاکہ مختلف کارواں آزادانہ طور پر رفت و آمد کر سکیں اور مکہ کا مشہور بازار "عکاظ" منعقد ہو سکے۔

حضرت محمد ﷺ کو جس طرح یہ توقع نہ تھی کہ ان کے چچا حضرت ابو طالبؓ مسلمان ہو جائیں گے اسی طرح وہ ابی لہب کے بارے میں بھی یہ امید نہیں رکھتے تھے کہ وہ اللہ کے دین کو قبول کرلے گا۔

ابی لہب کی بیوی ایک پڑھی لکھی مالدار عورت تھی جس کا نام جمیلہ تھا۔ جمیلہ ابوسفیان کی بہن تھی اور ابوسفیان کا شمار بھی مکہ کے ثروت مند تاجروں میں ہوتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ اور ابی لہب کے درمیان چچا اور بھتیجے کے علاوہ ایک اور رشتہ بھی موجود تھا۔ ابی لہب اور جمیلہ کے دو لڑکوں نے حضرت محمد ﷺ کی دو لڑکیوں سے شادی کی تھی اور یوں ابی لہب کے دو لڑکے حضرت محمد ﷺ کے داماد بھی بنتے تھے۔

ابی لہب کی بیوی جمیلہ شاعری کا ذوق رکھتی تھی اور ہجو کہنے میں تو اسے خاص مہارت حاصل تھی۔

جب حضرت محمد ﷺ نے دین اسلام کی تبلیغ شروع کی تو جمیلہ اپنے ہجو آمیز اشعار کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کا مضحکہ اڑاتی اور دوسروں کو ان کے خلاف بھڑکاتی تھی۔

ابی لہب اور اس کی بیوی دین اسلام کو ماننے پر تیار نہیں تھے اور نہ ہی مذہبی عقائد پر کوئی خاص یقین رکھتے تھے۔ ابی لہب اس جہان کو صرف کاروبار کے دریچے سے دیکھتا تھا اور اس کی ساری کائنات صرف خرید و فروخت اور مالی نفع و نقصان پر مشتمل تھی۔

حضرت عبدالمطلبؓ کے تیسرے بیٹے جو حضرت محمد ﷺ کے قریبی رشتہ دار تھے اور اللہ کے حکم کے مطابق انہیں بھی اسلام کی دعوت دینا ضروری تھا' وہ حضرت حمزہؓ کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

حضرت حمزہؓ ایک نامی گرامی پہلوان تھے۔ وہ مختلف کھیلوں کے شوقین تھے اور ان کی ساری توجہ اس بات مبذول رہتی تھی کہ مختلف مقابلوں میں شرکت کریں اور اعزاز و مقام حاصل کریں۔ وہ اس زمانے کے اکثر کھلاڑیوں کی طرح ایسے لوگوں کو بادیدہ تحقیر دیکھتے تھے

جو کھیلوں کے شوقین نہ ہوں یا مختلف مقابلوں میں شرکت نہ کریں۔ لیکن اس کے باوجود وہ دل کے سچے اور قول کے پکے انسان تھے۔ حضرت محمد ﷺ کو ان کے بارے میں بھی یہ فکر لاحق تھی کہ شاید وہ بھی مسلمان نہ ہوں کیونکہ انہیں بھی ظاہراً" مذہبی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

حضرت عبدالمطلبؓ کے چوتھے فرزند کا نام حضرت عباسؓ تھا۔ ان کا پیشہ صرافی اور ساہوکاری تھا۔ وہ مکہ' مدینہ اور طائف کے ساتھ مل کر کاروبار کرتے تھے۔

حضرت عباسؓ کی دنیا بھی دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک قرضہ دینے والا اور دوسرا قرضہ لینے والا یعنی مقروض۔ حضرت عباسؓ کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اپنے مقروضوں سے ربا (سود) دریافت کریں اور حتیٰ کہ کسی وثیقے یا ضمانت کے بغیر کسی ضرورت مند کو قرض نہیں دیتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ نے جب حضرت عبدالمطلب کے بیٹوں کو اپنی نظر سے گزارا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ حضرت ابوطالبؓ ایک ناتواں اور عمر رسیدہ شخص ہیں' ابولہب ایک مال پرست سوداگر ہے۔ حضرت حمزہؓ بھی کھیل کود کے شوقین ہیں اور حضرت عباسؓ ایک سود خور تاجر اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے دین سے سچی محبت ہو بلکہ ان کا مذہبی لگاؤ زیادہ تر دنیوی معاملات سے وابستہ ہے۔

حضرت محمد ﷺ اگرچہ یہ جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی کلام اللہ کو سننے کے لئے آمادہ نہیں لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کے حکم سے روگردانی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ حکم نازل ہو چکا تھا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دین اسلام کی دعوت دیں۔

حضرت محمد ﷺ کو جب یہ احساس ہوا کہ ان کے کلام کی گرمی ان کے رشتہ داروں کی مردہ روح کو حیات نو نہ بخش سکے گی تو سوچوں میں ڈوب گئے اور اتنے اندوہ گین ہوئے کہ یہی غم انہیں بستر بیماری تک لے آیا۔

ان کے دوسرے چچاؤں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے دور کے رشتہ داروں کو اسلام کی

دعوت دیں تاکہ شاید وہ لوگ نئے دین کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

لیکن حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو دین حق کی دعوت دوں اور میں اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔

آخر کار حضرت محمد ﷺ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے چالیس افراد کو جن میں حضرت عبدالمطلب کے چار لڑکے بھی شامل تھے' اپنے گھر کھانے کی دعوت دیں۔

اس ضیافت میں حضرت علیؓ نے میزبانی کے فرائض سنبھالے کیونکہ حضرت محمد ﷺ' حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کو اپنی اولاد جیسا سمجھتے تھے اور جیسا کہ روایت ہے مذکورہ ضیافت کی تفصیل کچھ یوں ہے: حضرت علیؓ مختصر سی غذا لائے اور اسے مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنے مہمانوں سے کہا کہ وہ اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کریں۔

جو کچھ مہمانوں کے سامنے رکھا گیا وہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہ لوگ جتنا بھی کھاتے' کھانا ختم نہیں ہوتا تھا اور جب سب مدعوین نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا تو اس کے باوجود بڑی مقدار میں غذا باقی بچ گئی۔

اس کے بعد حضرت محمد ﷺ نے مہمانوں کے لئے پانی لانے کو کہا اور حضرت علیؓ پانی کا ایک پیالہ لائے جس کا پانی صرف اتنا تھا کہ اس سے صرف ایک شخص کی پیاس بجھ سکتی تھی۔ لیکن جب پہلے شخص نے جی بھر کر پانی پی لیا تو بھی پانی کی مقدار میں کمی واقع نہیں ہوئی اور حتیٰ کہ جب ضیافت میں شامل سبھی لوگوں نے اپنی پیاس بجھالی تو بھی اس پیالے کا پانی بدستور موجود تھا۔ حاضرین کو اس واقعہ پر بہت حیرت ہوئی اور ابی لہب یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ حضرت محمد ﷺ نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔

اس کے بعد دوسرے مہمان بھی اٹھ کر چلے گئے اور حضرت محمد ﷺ کو یہ موقع نہ مل سکا کہ ان لوگوں کے ساتھ اللہ اور اس کے احکام کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔

مذکورہ ضیافت کے بارے میں دوسری روایت یہ ہے کہ جب کھانے کی دعوت اختتام کو پہنچی تو حضرت محمد ﷺ نے اللہ اور اس کے احکام کے بارے میں گفتگو کرنا چاہی لیکن مدعوین ان کی بات سنے بغیر اٹھ کر چلے گئے اور حضرت محمد ﷺ ان لوگوں کو یہ نہ بتا سکے کہ اس دعوت کا مقصد کیا تھا۔



مشرکوں کی ایذا رسانیاں

جیسا کہ ایک بار پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ جو واقعات بھی روایت پر مبنی ہوں گے میں اس بارے میں یہی کہوں گا کہ "ایسا روایت کرتے ہیں"۔

ایک مغربی مورخ جب اس واقعہ کو سنے گا تو اس کی وجہ جاننا چاہے گا کہ کیونکر مذکورہ دعوت میں شرکت کرنے والے جتنا بھی کھاتے وہ کھانا ختم نہ ہوتا اور جتنا بھی پانی پیتے تو اس کے باوجود پانی ختم نہیں ہوتا تھا۔

میں نے (یعنی کونسٹن ویرژیل) اس روایت کو اس لئے نقل نہیں کیا کہ علم تاریخ کی رو سے اس پر بحث کروں بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لئے صرف ایک بار ضیافت دی اور وہ آخری تھی! اس کے بعد حضرت محمد ﷺ اپنے خاندان کے افراد کو کسی ایک دعوت میں اکٹھا نہ کر سکے کیونکہ مذکورہ ضیافت کے بعد ان کے قریبی رشتہ دار ان سے ملنے جلنے سے کترانے لگے اور

ابولہب کی بیوی جمیلہ کی ہجو سرائی بھی تیز تر ہو گئی۔

حضرت محمد ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ قریبی رشتہ داروں کے بارے میں اللہ کے حکم پر عملدر آمد نہیں ہو سکا تو انہوں نے یہ سوچا کہ اہل مکہ کو "کوہ صفا" پر جمع ہونے کی دعوت دیں۔

کوہ صفا بھی جبل النور اور مکہ کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے دوسرے پہاڑوں کی طرح ایک بڑا ٹیلہ تھا جسے عرب لوگ "جبل" یعنی کوہ کے نام سے پکارتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ نے یہ سوچا کہ اگر وہ اہل مکہ کو "کوہ صفا" پر اکٹھا ہونے کی دعوت دیں تو لامحالہ ان کے خاندان کے افراد بھی وہاں آئیں گے اور یوں وہ ان لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دے سکیں گے۔

اسی بنا پر انہوں نے تمام لوگوں کو پیغام دیا کہ وہ مقررہ دن کوہ صفا پر جمع ہوں کیونکہ وہ ایک اہم بات ان تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

سبھی لوگ جن میں حضرت محمد ﷺ کے قریبی رشتہ دار بھی شامل تھے کوہ صفا پر جمع ہو گئے۔ حضرت محمد ﷺ نے ایک بلندی پر کھڑے ہو کر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے لوگو! اگر میں کوئی اہم بات تمہارے لئے بیان کروں تو کیا تم اسے قبول کرو گے یا نہیں؟"

حاضرین نے یک صدا ہو کر جواب دیا "اے محمد (ﷺ) ہمیں تمہاری بات پر یقین ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تم راست گو ہو اور کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتے"۔

حضرت محمد ﷺ نے کہا "اے لوگو! اللہ نے مجھے رسالت کے لئے منتخب کر لیا ہے اور میں اس کی طرف سے مامور ہوں کہ تمہیں احکام خداوندی کو ماننے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کی دعوت دوں اور اگر تم لوگ اللہ کی اطاعت سے منہ پھیرو گے تو تم پر اس کا غضب نازل ہو گا"۔

"طبری" اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ نے ان کلمات کو ادا

کیا تو ابی لہب نے چلاتے ہوئے کہا کہ "یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا تو نے یہی باتیں سنانے کے لئے ہمیں یہاں بلایا تھا؟ اور کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ ان باتوں کی اتنی اہمیت نہیں کہ ہم اپنا کاروبار چھوڑ کر یہاں چلے آئیں"۔

پھر ابی لہب وہاں موجود لوگوں پر غراتے ہوئے بولا "اس کی باتوں پر کان مت دھرو اور اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو اپنی عقل کھو بیٹھا ہے"۔ لوگ متفرق ہو گئے اور اپنے گھروں کو واپس چلے گئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صرف دو لوگ رہ گئے۔ ایک حضرت علیؓ اور دوسرے حضرت زیدؓ۔

اس واقعہ کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی رشتہ داروں نے ان کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی اور انہیں طعن و تمسخر کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

جب جماعت قریش اور خاص طور پر ابی لہب اور اس کی بیوی جمیلہ نے یہ دیکھا کہ ان کی زبان کے تیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بظاہر اثر انداز نہیں ہو رہے تو وہ لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے پر اتر آئے۔ اگرچہ ابی لہب اور اس کی بیوی کا تعلق مکہ کے "مہذب" طبقے سے تھا لیکن وہ دونوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پتھر پھینکتے تھے جس کے باعث ان کے گھر کی کھڑکیاں جو لکڑی سے بنی ہوئی تھیں ٹوٹ جاتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ پیسے دے کر آوارہ بچوں کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پر پتھراؤ کرواتے اور مردہ جانوروں کی لاشیں اور ان کی گندگی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں پھینکواتے تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی گھر سے باہر نکلتے تو جمیلہ اور ابی لہب کے اکسانے پر گلی کوچوں کے بچے اور دوسرے آوارہ لوگ انہیں پتھروں کا نشانہ بناتے اور کبھی کبھی وہ پتھر کچھ اس طرح ان کے سر اور چہرے پر پڑتے کہ خون جاری ہو جاتا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دامن سے خون پونچھتے اور جب گھر واپس لوٹتے تو حضرت خدیجہؓ انہیں اس حال میں دیکھ کر دکھ بھرے لہجے میں پوچھتیں: "یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آج بہت رنج اٹھایا

ہے؟" حضرت محمد ﷺ جواب میں کہتے "اے خدیجہؓ! جب انسان یہ جان لے کہ وہ کس مقصد کے لئے اور کس کی خاطر رنج اٹھا رہا ہے تو اسے دکھ اور درد کا احساس نہیں رہتا"۔

اس بات کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ ابی لہب کی بیوی حضرت محمد ﷺ کے راستے میں نوکیلے کانٹے بچھاتی تھی تاکہ وہ ان کے پاؤں میں چبھ جائیں اور جب حضرت محمد ﷺ گھر پہنچ کر اپنے پاؤں سے کانٹے نکالتے تو خون جاری ہو جاتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ کے خاندان والوں نے انہیں اتنی تکالیف پہنچائیں کہ ایک دن دلبرداشتہ ہو کر اللہ کے حضور شکایت بھرے لہجے میں یہ کہنے لگے کہ "اے اللہ! تو بہتر جانتا ہے ان میں سے کوئی بھی تیرے دین کو قبول کرنے پر تیار نہیں"۔

اس شکوہ کے بعد حضرت جبرائیل حاضر ہوئے اور حضرت محمد ﷺ پر چند آیات نازل کیں جو آج قرآن کی پندرہویں سورہ حجر میں شامل ہیں اور اسی سورہ کی ۹۴ ویں آیت ہے۔ "فاصدع بما تومرو و اعرض عن المشرکین"۔ یعنی جو اللہ کی طرف سے حکم ہوا ہے اسے آشکارا کر اور مشرکوں کی ایذا رسانی پر توجہ مت دے۔

سورہ حجر کی ۹۵ ویں آیت میں آیا ہے "انا کفینک المستھذین"۔ یعنی جو تیرا مضحکہ اڑاتے ہیں انہیں ہم پر چھوڑ دے اور ہم ان کے لئے کافی ہیں۔ اس آیت، کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ مشرکوں کو اللہ پر چھوڑ دیں اور اللہ خود ان کا حساب چکا دے گا۔

اسی سورہ کی ۹۷ ویں آیت میں اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے۔

"ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون" یعنی ہم جانتے ہیں کہ تمہارا سینہ ان لوگوں کے گفتار اور آزار سے تنگ ہو جاتا ہے یعنی ہم تمہارے اندرونی درد و رنج سے آگاہ ہیں جو قریش کی جانب سے تم پر وارد ہوتا ہے۔ اللہ نے سورہ حجر کی آخری

آیت میں جو پہلی آیت کا لب لباب ہے فرمایا ہے۔

"واعبد ربک حتی یاتیک الیقین" یعنی اے محمد ﷺ اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تیری زندگی اختتام کو پہنچے۔ عبادت سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ نے اپنے پیغمبر (ﷺ) کو یہ تاکید کی ہے کہ وہ تمام مصائب اور مشکلات کے باوجود اپنی زندگی کے آخری دن تک اپنی رسالت کو پایہء تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوشش کرتے رہیں۔

بالائے ذکر آیات کے نازل ہونے کے بعد کہ جن میں اللہ نے اپنے پیغمبر کو یہ اطمینان دلایا کہ وہ مشرکوں کو فائق نہ ہونے دے گا' حضرت محمد ﷺ کو قلبی تسکین حاصل ہوئی اور اس کے بعد انہوں نے کفار کی طرف سے پہنچائی جانے والی تکالیف کو بڑی بردباری اور حوصلہ مندی سے برداشت کیا۔

ایک دن حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی دونوں بیٹیاں جو ابی لہب کی بہوئیں تھیں اپنا سامان لئے گھر میں داخل ہوئیں اور انہوں نے اپنے والدین کو بتایا کہ ان کے شوہروں نے انہیں طلاق دے دی ہے اور انہیں اپنے ماں باپ کے گھر بھیج دیا ہے۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنی بیٹیوں سے پوچھا کہ تمہیں طلاق کیوں ہوئی ہے؟

لڑکیوں نے جواب دیا کہ ہمارے شوہروں نے ابولہب اور اس کی بیوی جمیلہ کے کہنے پر ہمیں طلاق دی ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ابولہب کے بیٹوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ان کی بیویاں "محمدؐ" جیسے شخص کی بیٹیاں ہوں کیونکہ آج محمد ﷺ تمام لوگوں کی نفرت اور مذمت کا شکار ہے اور ایسے شخص کے ساتھ تعلقات رکھنا مکہ میں شرم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت خدیجہؓ اس واقعہ سے بہت دلبرداشتہ ہوئیں لیکن حضرت محمد ﷺ نے

انہیں تسلی دیتے ہوئے صبر کی تلقین کی۔

حضرت محمد ﷺ بھی ایک باپ تھے اور دوسرے تمام والدین کی طرح انہیں بھی اپنی بچیوں کا گھربار اجڑ جانے پر صدمہ پہنچا تھا لیکن خاندانی دشمنی اور طرح طرح کے نفسیاتی دباؤ کے باوجود ان کے قدم نہ ڈگمگائے اور انہوں نے اللہ کے دین کی تبلیغ میں حتیٰ کہ ایک لحظہ بھی فروگزاشت نہیں کیا۔

دوسری طرف ان کے دشمن بھی' جو بدوی عرب تھے اپنے کہن افکار پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے اپنے آباو اجداد کے دین کے سلسلے میں انتہائی تعصب کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ایک بدوی عرب کسی یورپی باشندے کی طرح "آئیڈیالوجی" کا عادی نہیں ہوتا۔

یورپی باشندوں کو یونانی تہذیب کے زمانے سے "آئیڈیالوجی" کی عادت ہو گئی ہے۔ ایک یورپی کے دماغ میں ہو سکتا ہے بہت سے افکار سما جائیں لیکن ایک بدوی عرب کے دماغ میں سمانے والے افکار لامحدود نہیں ہوتے۔ کیونکہ ایک بدوی عرب کسی یورپین کی طرح گوناگوں افکار میں مبتلا نہیں ہوتا لہٰذا جب وہ کسی عقیدے پر کاربند ہو جائے تو کسی بھی طور اس سے اس کا عقیدہ واپس نہیں لیا جا سکتا مگر کسی دوسرے مضبوط اور موثر عقیدے کے ذریعے۔ یہ بات جزیرۃ العرب میں کچھ اس طرح صادق ہے کہ آج جبکہ تیل کا پائپ جزیرۃ العرب کی سرزمین کے بیچ میں سے گزر رہا ہے اور کوئی دن اور رات ایسا نہیں کہ وہاں ہوائی جہاز کی آواز سنائی نہ دے تو آج بھی ایک بدوی عرب رنگا رنگ آئیڈیالوجی کا تابع نہیں اور آج بھی کسی بدو عرب کے ذہن میں دو یا تین سے زیادہ باتیں نہیں سماتیں لیکن جب اس کے افکار کسی عقیدے کا روپ دھار لیں تو محال ہے کہ وہ کسی بھی طور اپنے عقیدے سے دستبردار ہو جائے۔

بدوی عربوں کے تعصب کی مثال کے طور پر قدیم عرب شاعر "شنفرہ" کی شرح زندگی بڑی دلچسپی کی حامل ہے۔ "شنفرہ" نہ صرف اپنی زندگی میں بہت مشہور تھا بلکہ

سعودی عرب کے بدو باشندوں کو آج بھی اس کے کچھ اشعار زبانی یاد ہیں اور وہ لوگ شنفرہ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شنفرہ ایک دن جزیرۃ العرب کے بیابان سے گزر رہا تھا کہ قبیلہ "بنو سلیمان" کے کچھ افراد نے اس کا مذاق اڑایا اور اس کی توہین کی۔ شنفرہ نے اس وقت کے بدوی قانون کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ وہ بنو سلیمان کے قبیلے سے انتقام لے کر رہے گا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جزیرۃ العرب میں ہرگز کسی ایک قصور وار شخص کو سزا نہیں دی جاتی تھی بلکہ اس کا پورا قبیلہ انتقام کا مستحق قرار پاتا تھا لہٰذا "شنفرہ" نے بھی عہد کیا کہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے قبیلہ بنو سلیمان کے ایک سو افراد کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ اس دن کے بعد شنفرہ نے اپنے قبیلے اور دیار کو خیرباد کہا اور تیرو کمان لے کر قبیلہ بنو سلیمان کے افراد کی تاک میں نکل پڑا..... اور پندرہ سال کی طویل مدت کے بعد وہ اپنے دشمن قبیلے کے ننانوے افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم ایک دن جب وہ ایک کنوئیں سے پانی کھینچنے میں مشغول تھا تو کچھ صحرائی لٹیرے اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

شنفرہ کی لاش صحرائی جانوروں کا لقمہ بن گئی اور جلد ہی اس کے جسم سے سوائے ہڈیوں کے کوئی اور چیز باقی نہ بچی اور پھر وہ ہڈیاں بھی ادھر ادھر بکھر گئیں لیکن اس کے جمجمے یعنی سر کی ہڈی کنوئیں کے پاس پڑی رہ گئی یہاں تک کہ ایک دن قبیلہ بنو سلیمان کے کچھ لوگ وہاں سے گزرے اور پانی پینے کی غرض سے کنوئیں کے پاس پہنچے۔

اس وقت تیز آندھی چل رہی تھی اور آندھی کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ شنفرہ کے سر کی ہڈی اڑتی ہوئی قبیلہ بنو سلیمان کے ایک فرد کے پاؤں پر پڑی جس سے ایک گہرا زخم بن گیا اور بعد میں یہی زخم اتنا بڑھا کہ مذکورہ شخص کی موت کا سبب بن گیا۔ یوں شنفرہ مرنے کے بعد بھی اپنی قسم کو نہیں بھولا اور اس نے اپنے جمجمے کی ہڈی سے بنو سلیمان کے قبیلے کے ایک اور شخص کو موت کے گھاٹ اتار کر مقتولین کی تعداد "ایک سو" تک پہنچا

دی۔

واضح ہے کہ اس سرگذشت کا آخری حصہ ایک افسانہ ہے اور ایک مؤرخ اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک بادیہ عرب کچھ اس طرح تعصب کا شکار ہوتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اسے فراموش نہیں کرتا اور حتیٰ کہ اسے اپنی اولاد کو منتقل کر دیتا ہے۔

جب اللہ نے آپ ﷺ کو پیغمبری کے لئے منتخب کر لیا تو چونکہ انہیں اپنے اللہ اور اس کے دین پر پختہ یقین تھا للہذا رشتہ داروں اور اہل قبیلہ کے ستانے' ڈرانے اور دھمکانے کے باوجود ان کا یقین متزلزل نہیں ہوا اور نہ ہی انہوں نے پسپائی اختیار کی بلکہ اللہ کے دین کو رواج دینے کے لئے ان کا عزم پہلے سے زیادہ پختہ اور قوی ہو گیا۔

جب حضرت محمد ﷺ کو یہ یقین حاصل ہو گیا کہ وہ اللہ کے منتخب شدہ پیغمبر ہیں اور ان پر اللہ کے دین کو پھیلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو اگر انہیں جان سے مارنے کی کوشش بھی کی جاتی تو بھی وہ اپنی رسالت سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوتے۔

بہرحال بعثت کے چوتھے سال تک ان کے قریبی رشتہ دار اور قبیلہ قریش کے دوسرے افراد انہیں مختلف قسم کی اذیتیں پہنچانے پر ہی اکتفا کرتے رہے لیکن اس کے بعد انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو اپنے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت محمد ﷺ نے عملی طور پر اپنے دین کی منادی شروع کر دی اور وہ اپنے رشتہ داروں اور قبیلہ قریش کے دوسرے افراد سے یہ کہتے تھے کہ وہ رنگا رنگ خداؤں کو جو خود ان کے اپنے ہاتھوں سے بنائے گئے ہیں پرستش کرنا چھوڑ دیں اور صرف اس اللہ کی عبادت کریں جس کا کوئی شریک نہیں اور جو ساری کائنات کا مالک ہے۔

حضرت محمد ﷺ کے قریبی رشتہ دار اور قبیلہ قریش کے دوسرے افراد ان سے یہ پوچھتے کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم ان خداؤں کی پوجا کرنا چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے؟

حضرت محمد ﷺ جواب میں کہتے کہ ہاں ان کی پرستش کرنا چھوڑ دو اور کہو "لا الہ الا اللہ" تاکہ ہدایت پا سکو۔

یہ جواب سن کر قریش کا غصہ و غضب شدت اختیار کر گیا اور انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت محمد ﷺ کی یہ عادت تھی کہ وہ دن کے وقت اپنے گھر سے نکل کر خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہوتے اور وہاں پہنچ کر اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔

قریش نے، جو یہ سمجھ چکے تھے کہ محمد ﷺ ہر روز خانہ کعبہ جانے کا شوق رکھتے ہیں، ان پر یہ پابندی عائد کر دی کہ انہیں "بیت" میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔

"بیت" کے معنی گھر کے ہیں لیکن مکہ میں اس کا اطلاق خانہ کعبہ پر ہی ہوتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے قریش کو جواب دیا کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے اور مجھے اللہ کے گھر میں داخل ہونے کے لئے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔

ایک دن جب حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ میں سجدے کی حالت میں اللہ کی عبادت کر رہے تھے تو ابو جہل اپنے قبیلے کے کچھ دوسرے افراد کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔

ابو جہل کے ہاتھ میں اونٹ کی اوجڑی تھی جس میں کثیف خون اور دوسری گندگیاں بھری ہوئی تھیں۔

جزیرۃ العرب میں کسی کو سزائے موت دینے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ پانی یا خون یا دوسری گندگیوں سے بھری ہوئی اونٹ کی اوجڑی کو اس کے سر پر اس طرح چڑھا دیتے تھے کہ محکوم کا سر اور چہرہ اوجڑی کے اندر پھنس جاتا اور پھر اوجڑی کے نچلے حصے کو کسی تھیلے کے منہ کی طرح مضبوطی سے اس کی گردن میں باندھ دیا جاتا تھا۔ اس طرح چونکہ محکوم شخص کی ناک اور منہ مکمل طور پر اوجڑی کے اندر پھنس جاتے تھے لہٰذا وہ سانس نہیں لے سکتا تھا اور دم گھٹنے کے باعث جلد ہی اس کی موت واقع ہو جاتی تھی۔

اس روز ابو جہل اور اس کے دوسرے ساتھی یہ فیصلہ کر کے آئے تھے کہ وہ حضرت

محمد ﷺ کو اوجڑی کے ذریعے ہلاک کر دیں گے۔ ابوجہل اور اس کے ساتھی جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو حضرت محمد ﷺ اس کی آمد سے باخبر نہ ہو سکے کیونکہ ایک تو وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر عبادت میں مشغول تھے اور دوسرے یہ کہ ان کے خون کے پیاسے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے تاکہ ان کے قدموں کی آہٹ تک سنائی نہ دے سکے۔

ابوجہل جیسے ہی وہاں پہنچا تو اس نے پلک جھپکتے ہی اونٹ کی اوجڑی حضرت محمد ﷺ کے سر پر رکھ دی اور جلد ہی پیغمبر کا سر اور چہرہ اس میں پھنس گیا۔ پھر ابوجہل نے بڑی پھرتی کے ساتھ اوجڑی کے دوسرے سرے کو ایک تھیلی کی طرح حضرت محمد ﷺ کی گردن میں باندھ دیا۔ حضرت محمد ﷺ کو جیسے ہی یہ احساس ہوا کہ کوئی چیز ان کے سر پر رکھ دی گئی ہے تو انہوں نے اٹھ کر اپنے آپ کو نجات دلانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

جو لوگ حضرت محمد ﷺ کے آس پاس موجود تھے وہ انہیں اپنی رہائی کے لئے تگ و دو کرتا ہوا دیکھ رہے تھے اور انہیں بخوبی یہ احساس تھا کہ سانس رکنے کے باعث محمد ﷺ جلد ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

حضرت محمد ﷺ کی بے قراری اور بے تابی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ سوچا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے چہرے اور سر سے اوجڑی کا غلاف اتار دیں لیکن انہیں ابوجہل کا خوف تھا اور وہ جانتے تھے کہ اگر وہ محمد ﷺ کی مدد کریں گے تو ابوجہل جیسے خوفناک شخص کی دشمنی مول لے بیٹھیں گے۔

لہٰذا انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی رہائی کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ تاہم قریش کی ایک عورت جو وہاں موجود تھی وہ اس کربناک منظر کی تاب نہ لا سکی اور دوڑی ہوئی حضرت محمد ﷺ کے گھر پہنچی اور ان کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے کہا جتنا جلدی ہو سکے وہ اپنے باپ کی مدد کے لئے خانہ کعبہ پہنچے اور اگر دیر ہو گئی تو وہ انہیں زندہ نہ پا

سکیں گی۔ حضرت رقیہؓ سراسیمہ حالت میں روتے ہوئے خانہ کعبہ تک پہنچیں۔ ابو جہل اور دوسرے لوگوں نے جب حضرت رقیہؓ کو آتے دیکھا تو پیچھے ہٹ گئے اور حضرت رقیہؓ نے بلا تاخیر حضرت محمد ﷺ کے چہرے اور سر کو اوجڑی کی گرفت سے آزاد کیا اور اپنے دامن سے ان کے چہرے کو صاف کیا تاکہ وہ آسانی سے سانس لے سکیں۔

لیکن حضرت محمد ﷺ دم گھٹنے کے باعث ایک گھنٹے تک حرکت کرنے کے قابل نہ ہو سکے اور اس کے بعد اپنی بیٹی کے سہارے کھڑے ہوئے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچ کر حضرت محمد ﷺ نے حضرت رقیہؓ کی مدد سے اپنے چہرے اور سر سے خون اور دیگر کثافات کو صاف کیا' کپڑے تبدیل کئے اور حضرت رقیہؓ نے اپنے والد کے کپڑے دھو کر سکھانے کے لئے دھوپ میں ڈال دیئے۔

اگلے دن حضرت محمد ﷺ گزشتہ روز کے واقعہ سے خوفزدہ ہوئے بغیر' جیسے کوئی خاص بات پیش نہ آئی ہو' دوبارہ خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ حضرت محمد ﷺ ایک با استقامت اور قوی ارادہ انسان تھے اور جب انہیں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ انہوں نے حقیقت کو پا لیا ہے تو پھر کوئی دوسرا انہیں ڈرانے' دھمکانے حتیٰ کہ قاتلانہ حملہ کرنے سے ان کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن ان کے مخالفین بھی انتہائی لجاجت پیشہ اور متعصب تھے اور انہوں نے جب یہ دیکھا کہ حضرت محمد ﷺ دوبارہ خانہ کعبہ میں داخل ہو گئے ہیں تو انہوں نے ایک بار پھر انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

اس مرتبہ عقبہ نامی شخص جو ایک چادر اٹھائے ہوئے تھا برہنہ خانہ کعبہ میں داخل ہوا۔ اگرچہ وہ ننگے پاؤں تھا لیکن اس کے باوجود پنجوں کے بل چل رہا تھا تاکہ اس کے قدموں کی آواز سنائی نہ دے سکے۔

دوسری طرف حضرت محمد ﷺ کی توجہ کچھ اس طرح اپنے اللہ کی طرف مبذول

تھی کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی خبر نہیں تھی اسی لئے وہ عقبہ کے نزدیک آنے کی آواز نہ سن سکے۔

جب حضرت محمد ﷺ سجدے میں گئے تو عقبہ نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی چادر ان پر ڈال دی اور اتنا شدید حملہ کیا کہ پیغمبرؐ کی ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔

عقبہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ سجدے میں سر اٹھانے سے پہلے ہی وہ پے در پے وار کر کے محمد ﷺ کا خاتمہ کر دے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس مرتبہ حضرت محمد ﷺ اپنے آپ کو حملہ آور کے ہاتھوں سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے اور خون آلود چہرے کے ساتھ گھر واپس لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے اپنا چہرہ صاف کیا لیکن اپنے ہونٹوں پر کوئی شکایت نہ آنے دی کیونکہ جیسا کہ وہ خود کہتے تھے کہ انسان کو صرف اسی وقت درد و رنج کا احساس گراں محسوس ہوتا ہے جب اسے یہ علم نہ ہو کہ وہ کس کے لئے تکالیف اٹھا رہا ہے لیکن جب وہ یہ جان لے کہ یہ مصائب کس نصب العین کی راہ میں اس پر ٹوٹ رہے ہیں تو اسے درد و رنج کا خوف نہیں رہتا اور نہ ہی اس کے ہونٹوں پر کوئی شکایت آتی ہے۔

یورپی قارئین جو ان سطور کو پڑھ رہے ہیں ہو سکتا ہے یہ سوال اٹھائیں کہ آیا یہ ماننے کی بات ہے کہ ابوجہل حضرت محمد ﷺ کو سر عام قتل کرنے کی کوشش کرے اور وہاں پر موجود قبیلہ قریش کے دوسرے افراد صرف تماشائی بنے رہیں اور ان کی نجات کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائیں؟

میں (یعنی کونسٹن ویرژیل) ان کے جواب میں یہی کہوں گا کہ جی ہاں اس زمانے میں یہ واقع رونما ہوا ہے جیسا کہ آج بھی جبکہ بیسویں صدی کا زمانہ ہے اس قسم کے واقعات بغیر کسی ترحم کے جزیرۃ العرب میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ یمن میں ایک چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور ایک دفعہ یہ بھی دیکھا کہ ایک راہزن کی گردن سر عام اڑا دی گئی لیکن وہیں موجود

تماشائیوں کے چہرے پر کسی قسم کے ترحم یا ہمدردی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرب اور خاص طور پر ایک بدوی عرب کی نظر میں "ترحم" کا مطلب وہ نہیں ہوتا جیسا کہ ہم یورپ کے رہنے والے سمجھتے ہیں۔



عہد جاہلیت کے عربوں کی نفسیاتی اور اخلاقی خصوصیات

عربوں میں عصر جاہلیت یعنی اسلام سے پہلے کی رسومات میں سے ایک جو آج بھی باقی ہے وہ ہے "مہمانِ نوازی" (تاہم صحراؤں میں، شہروں میں نہیں) جزیرۃ العرب کے بادیہ نشین باشندوں کا بنیادی آئین ایک کلمے پر مشتمل ہوتا تھا اور وہ تھا "مروت"۔

۱۔ مہمان نوازی
۲۔ کسی مظلوم کو پناہ دینا
۳۔ قبیلے کے قوانین کا احترام

یہ ایسے فرائض تھے جنہیں ایک بادیہ نشین عرب دوسروں کے مقابلے میں انجام دیتا تھا اس کی انفرادی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ وہ ہمیشہ بہادر رہے، کسی لڑائی میں پسپائی اختیار نہ کرے یعنی دشمن کو پیٹھ نہ دکھائے اور اتنی پائیداری اور استقامت کا مظاہرہ کرے کہ یا تو جان کی بازی لگا دے یا فاتح ہو کر ہی واپس لوٹے۔

"ترحم" کا وہ مفہوم جو ہم یورپی لوگوں کے ذہن میں موجود ہے وہ جزیرۃ العرب میں بالکل بے معنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرعام کسی کی گردن اڑا دی جاتی یا ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تو کسی کا بھی دل مذکورہ شخص کی حالت زار پر نہیں کڑھتا تھا۔

صحرا نشین عربوں کے آئین میں "ترحم" نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی تاہم کسی مظلوم کو پناہ دینا ان کے آئین کا ایک رکن تھا اور دوسرا رکن یہ تھا کہ قبیلے کے قوانین کا بے چون و چراں احترام کیا جائے اور اس کی پیروی کی جائے۔

جو لوگ خانہ کعبہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دم گھٹنے کا منظر دیکھ رہے تھے وہ اپنے زعم میں انہیں "مظلوم" نہیں سمجھتے تھے اور شاید ان میں سے کچھ کا خیال یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (نعوذ باللہ) "واجب القتل" ہیں کیونکہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو قبیلے کے قانون یعنی بدوی عرب کے بنیادی آئین کے بالکل منافی ہیں۔

بدوی عرب مہمان نواز تھا اور مظلوم کو پناہ بھی دیتا تھا لیکن "رحم" کے جذبے سے نہیں بلکہ مردانگی اور دلیری کی صفات کی بنا پر۔ جزیرۃ العرب کے سوزاں صحراؤں میں ایک عرب باشندہ اپنی قوت لایموت، یعنی زندہ رہنے کے لئے کم سے کم ضروریات زندگی کے حصول کے لئے اتنی محنت اور مشقت اٹھاتا تھا کہ اس کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔

آج بھی جزیرۃ العرب کے ان خطوں میں جہاں تیل کی آمدنی سے لوگوں کی طرز زندگی میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی، وہاں اب بھی وہی سینکڑوں سال پہلے کی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے۔

دنیا کی مختلف قوموں میں پیدا ہونے والے گوناگوں خصوصیات اور صفات میں ان کی طرز زندگی، جغرافیائی صورتحال اور ماحولیاتی حالات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ فرانس کے مشہور دانشور ارنسٹ رنان نے زمانہ جاہلیت کے تمدن کے بارے میں جو تحقیقات انجام دی ہیں وہ بہت قابل توجہ ہیں۔ ارنسٹ رنان نے بادیہ نشین عربوں میں مروت نامی چیز کے پیدا

نہ ہونے کو جزیرۃ العرب کے جغرافیائی ماحول کے اثرات کا نتیجہ سمجھا ہے۔

جزیرۃ العرب کے دہکتے ہوئے صحراؤں میں اگر کوئی بھوکا اور پیاسا مسافر کسی کے خیمے پر دستک دیتا اور اس خیمہ نشین کی مہمان نوازی اسے حاصل نہ ہو سکتی تو وہ مسافر بھوک اور پیاس کی شدت سے ہلاک ہو سکتا تھا۔

اسی طرح اگر کوئی مسافر صحرائی لٹیروں کے ہاتھوں بچ نکلتا اور کسی خیمہ نشین تک پہنچ کر اس کی پناہ اور حمایت حاصل نہ کر سکتا تو اس کی موت کا ٹلنا محال ہوتا تھا۔

قبیلے سے جلا وطنی کا مسئلہ تو پہلے بھی بیان کر چکا ہوں لہٰذا اسے دہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر کوئی عرب باشندہ اپنے قبیلے سے ٹھکرا دیا جاتا تو یہ صورت حال ایسی تھی جیسے اس کی موت کا حکم صادر کر دیا گیا ہو۔

"رنان" کے اس نظریئے کی تصدیق کرتے ہوئے کہ بادیہ نشین عربوں کی اخلاقی خصوصیات میں ان کے جغرافیائی ماحول اور موسمی اثرات کا بڑا عمل دخل ہے' میں اس نکتے کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ عربوں کی سخاوت اور دلیری میں وہاں کے ماحولیاتی حالات کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔

کیونکہ ایسے علاقوں میں جہاں حصول معاش دشوار ہوتا ہے (مثال کے طور پر یورپ کے پہاڑی علاقے) تو وہاں کے رہنے والے اتنی بچت اور صرفہ جوئی کے عادی ہو جاتے ہیں کہ بسا اوقات یہ صرفہ جوئی بخل اور کنجوسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کوئی اس بات پر تیار نہیں ہوتا کہ کسی اجنبی مہمان کی خاطر اپنے آپ کو خسارے میں ڈالے۔

لیکن جزیرۃ العرب کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں جہاں معاش کا حصول یورپ کے کوہستانی علاقوں میں کہیں زیادہ دشوار تھا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک بادیہ نشین عرب نے اپنے اکلوتے اونٹ کو' جو اس کا واحد ذریعہ معاش بھی ہوتا تھا' قربان کر کے اس کا گوشت اپنے مہمان کے سامنے رکھ دیا تاکہ اس کا مہمان بھوکا نہ رہے۔

فرانسیسی دانشور ارنسٹ رنان نے اپنی کتاب "صحرا کا تمدن" میں لکھا ہے کہ دنیا کی

تاریخ تمدن میں کوئی چیز بھی زمانہ جاہلیت کے بادیہ نشین عربوں کی طرز زندگی سے زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ نہیں۔

لیکن اسی معاشرے میں جہاں دلیری اور سخاوت (ازراہ مہمان نوازی) پوری قوت سے حکم فرما تھی وہاں نہ تو رحم کا جذبہ موجود تھا اور نہ ہی خون بہانے سے نفرت کا احساس۔ ان لوگوں کی نظروں میں گردن اڑا دینا اور ہاتھ کاٹ دینا ایک عام سی بات ہوتی تھی لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ لوگ مظلوم کی حمایت کرتے تھے تاہم ان کے ذہن میں مظلوم کا تصور کچھ اور ہوتا تھا۔

جب کوئی "مظلوم" صحرا میں کسی خیمہ نشین کے ہاں پناہ لے لیتا تو اس خیمے کا مالک ضرورت کے وقت پناہ لینے والے کی حمایت اور حفاظت کی خاطر تلوار کے استعمال سے بھی دریغ نہ کرتا اور جب تک وہ خود قتل نہ ہو جاتا تو اس وقت تک کوئی بھی اس کے مہمان کو گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن قبیلہ قریش کی نگاہ میں حضرت محمد ﷺ ایک "مظلوم" نہیں تھے اور یہی وجہ تھی کہ جب انہیں خانہ کعبہ میں دوبار قتل کرنے کی کوشش کی گئی، تو کوئی بھی ان کی حمایت میں آگے نہیں بڑھا۔

آپ پوچھیں گے کہ کیا وہ لوگ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے تھے کہ حضرت محمد ﷺ کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ میں جواب میں کہوں گا کہ کیوں نہیں، لیکن اس زمانے کے عربوں کی نظروں میں "مظلوم" ایسے شخص کو سمجھا جاتا تھا جو اجنبی ہو اور ایک ناشناس قبیلے سے کسی دوسرے قبیلے (مثلاً قریش) میں پناہ لے۔

اگر کسی غیر قبیلے کا کوئی فرد مکہ میں داخل ہوتا اور قریش سے پناہ مانگتا اور یہ کہتا کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے تو وہ لوگ ایسے پرائے شخص کی حمایت میں اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتے تھے لیکن وہ لوگ حضرت محمد ﷺ کو ایک اجنبی یا بیرونی پناہ کنندہ تصور نہیں کرتے تھے۔

جن لوگوں نے حضرت محمد ﷺ پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہوتے دیکھا اور ان کی

حمایت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا وہ اپنے زعم اس عمل کو مشروع اور قانونی تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے مستحق ہیں (نعوذ باللہ)

بادیہ نشین عربوں کے نزدیک "مظلوم" ایک ایسا شخص سمجھا جاتا تھا جو اجنبی ہو اور دشمن کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گیا ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص خود اپنے ہی قبیلے کی طرف سے آزار و اذیت میں مبتلا کیا جاتا تو اسے مظلوم نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ آئین مروت کی رو سے ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ کوئی قبیلہ اپنے افراد پر ظلم و ستم روا نہیں رکھتا اور اگر کوئی شخص اپنے قبیلے کی طرف سے ایذا و آزار کا نشانہ بنے تو یہ درحقیقت وہی سزا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔

بادیہ نشین عربوں کے اس نظریے پر ہمیں حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ آج بھی یورپی باشندے فرانس جیسے ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کے علمبردار ملک میں اسی قسم کے نظریات اور عقائد پر کاربند ہیں۔

آج بھی جب فرانس کی عدالت کا کوئی جج یہ حکم نافذ کرتا ہے کہ فلاں مجرم کا سر "گیوٹین" کے ذریعے اس کے بدن سے جدا کر دیا جائے تو کوئی بھی شخص اس جج کو قاتل نہیں سمجھتا اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں قاضی جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ (وضاحت: اس کتاب کا مصنف کونستن ویرژیل دراصل رومانیہ کا باشندہ ہے جس نے بعد میں فرانس کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ شاید اسی بنا پر اس نے فرانسیسی قوانین کی مثال پیش کی ہے اور مذکورہ کتاب بھی فرانسیسی زبان میں ہی لکھی گئی ہے۔ مترجم)

بادیہ نشین عربوں میں قبیلے کا قانون دوسری تمام طاقتوں سے بالاتر ہوا تھا اور جو شخص کسی قبیلے سے منسوب ہوتا تو وہ اپنے قبیلے کی طرف سے سزا نہ پاتا مگر یہ کہ اس کا مستحق قرار دیا جاتا۔

صرف چار لوگ ایسے تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ترحم کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ تھے چار مسلمان یعنی حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ اور حضرت ابوبکرؓ اور اگر

حضرت ابوبکرؓ کی خرد سال بچی (جو کہ مسلمان کی حیثیت سے دنیا میں قدم رکھنے والی پہلی ہستی ہے) کو بھی ان چار افراد میں شامل کر لیا جائے تو بھی حضرت محمد ﷺ پر ہونے والے قاتلانہ حملوں اور گوناگوں مظالم کی روک تھام نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن بعثت کے چار سال بعد حضرت محمد ﷺ کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا کیونکہ کچھ ایسے لوگ جو حقیقی خدا کی تلاش میں تھے حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

یہ لوگ زیادہ تر ایسے تھے جو سیاہ فام تھے' غلام تھے' اجنبی سمجھے جاتے تھے یا اپنے قبیلے کی طرف سے دھتکار دیئے گئے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے ایسے لوگ بھی جنہیں "الناس" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

آج ہم یورپی لوگوں کے لئے "الناس" کا مطلب ہے "عام انسان" یا "عوام" لیکن عربی زبان میں اس کلمے کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ "ایسے لوگ جن کے پاس دفاع کا وسیلہ نہ ہو" اور ایسے لوگوں کی تعداد ہر زمانے میں ان لوگوں سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے جن کے پاس وسائل ہوتے ہیں (وضاحت: وسائل سے مراد ہر طرح کی ضروریات زندگی کا فراہم ہونا مدنظر ہے) "الناس" کے زمرے میں آنے والے لوگ دراصل سیاہ فام غلاموں' قبیلے یا دیار سے ٹھکرائے ہوئے لوگوں اور بے بضاعت اور بے آسرا لوگوں کے ایک عظیم طبقے پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اسلام سے پہلے یہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ بھی دوسروں سے برابری کر سکیں گے اور معاشرتی مساوات کے حقدار قرار پائیں گے۔ لیکن حضرت محمد ﷺ نے پیغمبر بننے کے بعد اعلان کیا کہ تمام انسان ایک امت واحدہ ہیں اور ان میں آپس میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک ہی مادے سے جس کا نام مٹی ہے تخلیق کیا ہے اور یہ بات قرآن کی سورۃ نمبر ۵۵ "الرحمٰن" کی آیت نمبر ۱۴ میں بیان کی گئی ہے۔

"خلق الانسان من صلصال کالفخار"!

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی غلاموں اور سیاہ فاموں کو پہلی بار یہ علم ہوا کہ جس چیز سے انہیں بنایا گیا ہے وہی "اعلیٰ طبقے" اور دولت مند لوگوں کی تخلیق میں بھی استعمال ہوئی ہے اور یہ دونوں انسانی طبقے مٹی سے بنائے گئے ہیں ان کے رنگ اور شکل و شمائل میں جو فرق موجود ہے وہ اس لئے ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔

پہلا غلام جو حضرت زیدؓ کے بعد (جنہیں پیغمبر نے آزاد کر دیا تھا) حلقہ اسلام میں داخل ہوا وہ ایک سیام فام بردہ تھا جس کا نام تھا "بلالؓ"۔

جزیرۃ العرب میں تین چیزیں کسی انسان کے لئے مکمل تیرہ بختی کی علامت سمجھی جاتی تھیں ایک، اجنبی یا بیگانہ ہونا۔ دوسرے، غلام یا بردہ ہونا اور تیسرے، سیاہ فام ہونا..... اور بیچارے بلالؓ میں یہ تینوں چیزیں موجود تھیں۔

حضرت بلالؓ مکہ کے ایک دولت مند شخص کے، جس کا تعلق امیہ بن خلف جمعی نامی خاندان سے تھا، غلام تھے۔ جب ان کے مالک کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت بلالؓ مسلمان ہو گئے ہیں تو وہ انہیں مکہ سے باہر لے گئے اور ان کے کپڑے اتروا کر انہیں دہکتے ہوئے سورج کے نیچے تپتی ہوئی ریتلی زمین پر لٹا کر ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور ان سے کہا کہ یا تو اسلام کو چھوڑ دے یا تپتی ہوئی ریت پر اتنی دیر پڑا رہ کہ تیری جان نکل جائے۔

حضرت بلالؓ جو یہ جانتے تھے کہ ان کا مالک اپنے کئے پر عمل کرے گا اور ان کے ہاتھ پیر نہیں کھولے گا چاہے ان کی جان چلی جائے لیکن انہوں نے دین محمدیؐ سے دستبردار ہونے کی بجائے موت سے ہم آغوش ہونا گوارا کر لیا اور مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

لیکن اسی دوران عبداللہ بن عثمان جو حضرت ابوبکرؓ کے نام سے مشہور تھے، حضرت بلالؓ کو نجات دلانے کی غرض سے ان کے مالک کے پاس پہنچے اور اس کے سامنے حضرت بلالؓ کو خریدنے کی تجویز پیش کر دی۔

حضرت بلالؓ کے مالک نے جب یہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ اس کے غلام کو بہت مناسب قیمت پر خرید رہے ہیں تو اس نے انہیں بیچنے پر رضامندی ظاہر کر دی اور حضرت

ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو خریدنے کے بعد آزاد کر دیا۔

بعد میں پیغمبر اسلام ﷺ نے حضرت بلالؓ کو مؤذن بنا دیا اور عربی زبان میں مؤذن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کے کانوں تک کوئی بات پہنچائے تاہم اسلام میں مؤذن کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جو اونچی آواز سے لوگوں کو عبادت کی دعوت دے۔

جب معاشرے کے محروم طبقے نے یہ دیکھا کہ ایک سیاہ فام شخص لوگوں کو اسلام کی دعوت دے رہا ہے تو ان میں جرات پیدا ہوئی اور دو عورتیں جو دونوں حضرت عمرؓ کی لونڈیاں تھیں، حلقہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔ ان میں سے ایک کا نام "لبینہ" اور دوسری کا نام "زنیرہ" تھا۔

حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کے مالک کی طرح شقی القلب نہ تھے کہ ان کنیزوں کو بندھوا کر تپتی ہوئی زمین پر پھینک دیں بلکہ انہوں نے ان دونوں کو کوڑوں کی سزا کا مستحق سمجھا اور ان سے کہا کہ میں اس وقت تک تم پر کوڑے برساتا رہوں گا کہ تم یا تو محمد (ﷺ) کے دین کو چھوڑ دو یا تمہاری جان نکل جائے۔

اگرچہ ان دونوں کنیزوں کا بدن لہولہان ہو چکا تھا لیکن انہوں نے حضرت محمد (ﷺ) کے دین کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

یہاں ایک بار پھر حضرت ابوبکرؓ ان لونڈیوں کی مدد کو آگے بڑھے اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ وہ ان کنیزوں کو ان کے ہاتھوں فروخت کر دیں۔

حضرت عمرؓ نے دونوں کنیزوں کو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور انہوں نے بھی خریداری کے بعد ان دونوں کو فوری طور پر آزاد کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کی تعداد سات تک پہنچ گئی جس میں تین عورتیں بھی شامل تھیں۔

چوتھی عورت جو اسلام لائی وہ صحرا میں رہنے والی ایک خاتون تھی جس کا نام تھا "غزیہ" غزیہؓ کنیز نہیں تھی۔ وہ مکہ آنے کے بعد مسلمان ہو گئی اور پھر کھلے عام لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگی۔

صحرا نشین عورتیں بھی بدوی مردوں کی طرح بے باک اور نڈر ہوتی تھیں لہٰذا وہ خاتون بھی اہل قریش کے ڈرانے دھمکانے سے قطعاً خوفزدہ نہ ہوتی تھی۔

قبیلہ قریش کے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ حضرت غزیہؓ کسی طور بھی اسلام کی تبلیغ سے دستبردار نہیں ہو رہی تو وہ اسے اغوا کرکے مکہ سے باہر جانے والے ایک قافلے کے پاس لے گئے اور اسے ایک اونٹ پر بٹھاکر مضبوطی سے رسیوں سے باندھ دیا اور قافلے والوں کے سپرد کرتے ہوئے بولے کہ اس عورت کو پانی اور غذا بالکل نہ دینا تاکہ یہ بھوک اور پیاس کی شدت سے ہلاک ہو جائے اور جب تمہیں یہ یقین حاصل ہو جائے کہ یہ مر چکی ہے تو اس کی لاش کو اونٹ سے اتار کر صحرا میں پھینک دینا تاکہ وہ صحرائی جانوروں کا لقمہ بن جائے اور اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت غزیہؓ کہتی ہیں کہ تین دن کی بھوک اور پیاس نے مجھے بالکل نڈھال کر دیا تھا لیکن چوتھے دن مجھے اپنے ہونٹوں پر ٹھنڈے پانی کی نمی محسوس ہوئی اور میں نے بے اختیار ہو کر پانی پینا شروع کر دیا اور اتنا پیا کہ میری پیاس مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ اگلے دن قافلے والوں نے، جو یہ تصور کر رہے تھے کہ میں بھوک اور پیاس کی شدت سے ہلاک ہو چکی ہوں، جب مجھے ہشاش بشاش پایا تو انہیں بہت حیرت ہوئی اور جب میں نے انہیں گزشتہ رات کے واقعہ سے آگاہ کیا تو وہ اپنے کئے پر نادم ہوئے اور انہوں نے میری رسیاں کھول دیں اور مجھ سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔

ایک اور روایت کے مطابق وہ سارے قافلے والے مسلمان ہو گئے۔

یہاں اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ جب قریش کے لوگوں نے حضرت غزیہؓ کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو حضرت ابوبکرؓ ان کی اس سازش سے بے خبر تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ لوگ اس خاتون کو اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ورنہ یقینی طور پر انہیں ایسا کرنے سے روک دیتے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری دولت اور جائیداد کچھ اس طرح اسلام کی راہ میں لٹا دی

کہ وہ خود تہی دست ہو گئے لیکن انہیں اپنے تہی دست ہونے کا ذرا بھی ملال نہیں تھا اور جب بھی کوئی کنیز یا غلام مسلمان ہو جاتا اور اس کے نتیجے میں اپنے مالک کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتا تو حضرت ابو بکرؓ اس غلام یا کنیز کو خرید کر آزاد کر دیتے تھے خواہ اس کے لئے انہیں کتنی ہی بھاری رقم کیوں نہ ادا کرنا پڑتی



اسلام کی راہ میں شہید ہونے والی پہلی عورت

ابو جہل کی ایک کنیز تھی جس کا نام تھا سمیہؓ

سمیہؓ کا لفظ کلمہ "سما" سے مشتق ہے اور سما کا مطلب ہے مشہور اور معروف۔ سمیہؓ ابو جہل کی کنیز ہونے کے علاوہ "تقرۃ" کا کام بھی انجام دیتی تھیں، یعنی حاملہ عورتوں کے وضع حمل میں ان کی فکری مدد بھی کرتی تھیں۔ جو عورت "تقرۃ" کرتی وہ اس عورت سے مختلف ہوتی تھی جسے آج ہم "قابلہ" یا دایہ کے نام سے پہچانتے ہیں۔

"تقرۃ" کا مطلب ہے حاملہ عورتوں کو مشورہ دینا یا ان کا مشاور بننا۔

چونکہ سمیہؓ "تقرۃ" کا کام انجام دیتی تھیں اسی لئے مسلمان ہونے سے پہلے ابو جہل کے گھر میں ان کی عزت دوسری اور کنیزوں سے کہیں زیادہ تھی، لیکن جیسے ہی ابو جہل کو یہ علم ہوا کہ سمیہؓ مسلمان ہو گئی ہیں تو اس نے انہیں بلا کر یہ حکم دیا کہ فوری طور پر نئے دین سے دستبردار ہو جاؤ۔

سمیہؓ نے جواب میں کہا کہ میں محمد (ﷺ) کے دین کو نہیں چھوڑ سکتی۔

ابو جہل نے طیش میں آکر اپنی ناتواں کنیز پر تازیانے برسانے شروع کر دیئے اور انہیں اتنا مارا کہ وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر گئیں اسی دوران ابو بکرؓ اس واقع سے مطلع ہو گئے اور ابو جہل کے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ سمیہؓ ابھی تک بے جان حالت میں زمین پر پڑی ہوئی ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے ابو جہل سے کہا کہ میں اس کنیز کو خریدنا چاہتا ہوں۔

ابو جہل بولا کہ میں اسے نہیں بیچنا چاہتا۔

حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ اے ابو جہل اگر تو سمیہؓ کو فروخت کرنے پر رضامند ہو جائے تو میں تجھے ایک سو دینار ادا کرنے پر تیار ہوں۔ ابو جہل غرایا کہ میں اسے نہیں بیچوں گا۔ حضرت ابو بکرؓ نے قیمت بڑھا دی اور بولے کہ میں تمہیں سمیہؓ کے بدلے ڈیڑھ سو دینار دینے کو تیار ہوں' لیکن ابو جہل کی ضد برقرار رہی اور وہ بولا کہ میں سمیہؓ کو بیچنے پر آمادہ نہیں۔

حضرت ابو بکرؓ قیمت بڑھاتے رہے لیکن ہر بار ابو جہل کا جواب یہی ہوتا کہ میں اپنی لونڈی کا سودا نہیں کرنا چاہتا۔

حضرت ابو بکرؓ نے' جو اپنی ساری دولت اسلام کی راہ پر خرچ کر چکے تھے' جب یہ دیکھا کہ ابو جہل کسی طور بھی سمیہؓ کو فروخت کرنے پر تیار نہیں تو انہوں نے ایک نئی تجویز پیش کی اور ابو جہل سے کہا کہ اگر تو سمیہؓ کو میرے ہاتھوں فروخت کرنے پر راضی ہو جائے تو میں تجھے "ابل قاضیہ" دینے کو تیار ہوں۔

"ابل قاضیہ" بادیہ نشین عربوں کی مخصوص اصطلاح کا نام تھا اور اس کا اطلاق دراصل ان اونٹوں پر ہوتا تھا جو کسی کے قتل کے بدلے میں ان کے لواحقین کو دیئے جاتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں "ابل قاضیہ" اس خون بہا کا نام تھا جو مقتول کے وارثین کو ادا کیا جاتا تھا اور اس عنوان سے منہ مانگی رقم طلب کی جا سکتی تھی۔

ابوجہل کے دل میں حضرت محمد ﷺ اور اسلام کے بارے میں اتنی کدورت اور عداوت موجود تھی کہ وہ حتیٰ "ابل قاضیہ" کے بدلے میں بھی اپنی کنیز کو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں فروخت کرنے پر رضامند نہ ہوا۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اس دن تک چھ بردوں کو خرید کر آزاد کر دیا تھا جن میں دو مرد اور چار عورتیں شامل تھیں لیکن اس بار وہ سمیہؓ کو رہائی دلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جب قریش کی عورتوں نے یہ سنا کہ سمیہؓ ہر روز ابوجہل کے گھر میں تازیانے کھاتی ہے لیکن اسلام کو چھوڑنے پر تیار نہیں تو وہ ابوجہل کے پاس سفارش لے کر گئیں اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس عورت کو تازیانے مارنا بند کر دے جس نے قریش کی بے شمار عورتوں کی مدد کی ہے لیکن ابوجہل نے ان کی درخواست کو بھی ٹھکرا دیا۔

ابوجہل نے سمیہؓ پر اتنے کوڑے برسائے کہ ان کا سارا بدن لہولہان ہو گیا اور ان میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ رہی لیکن اس کے باوجود وہ یہی کہتی رہیں کہ میں محمد ﷺ کے دین سے کبھی بھی روگردانی نہیں کر سکتی۔

جب ابوجہل اپنی کنیز کے ایمان کو بدلنے میں ناکام ہو گیا تو اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک دن سمیہؓ کو خانہ کعبہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور جب اہل مکہ وہاں جمع ہو گئے تو ابوجہل نے اتمام حجت کے طور پر سمیہؓ سے پوچھا کہ آیا تو اب بھی محمد (ﷺ) کے دین کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں؟

سمیہؓ نے جواب دیا "میں محمد (ﷺ) کے دین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔"

ابوجہل نے جھلا کر کہا کہ "پھر میں تجھے یہیں اور اسی وقت موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔" اس کے بعد ابوجہل نے اہل مکہ کی آنکھوں کے سامنے اپنا نیزہ اتنی قوت سے سمیہؓ کے سینے میں گھونپ دیا کہ نیزے کا سر اس ناتواں عورت کی پیٹھ سے باہر نکل آیا اور یوں سمیہؓ نے اسلام کی راہ میں شہید ہونے والی پہلی عورت کا رتبہ حاصل کر لیا۔

روایت ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ، سمیہؓ کی رہائی کے سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ کی جدوجہد سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے ابو بکرؓ کے حق میں دعا کی کہ "حیا اللہ قہبلک" یعنی اللہ تیرے چہرے کی درخشندگی کو برقرار رکھے یا دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تیری عظمت اور وقار میں اضافہ کرے۔

سمیہؓ کے قتل کے بعد قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے چار افراد نے جن میں، ابو سفیان، ابولہب اور اس کی بیوی جمیلہ شامل تھے، یہ پابندی لگادی کہ مکہ کا رہنے والا کوئی شخص آج کے بعد اپنے غلام یا لونڈی کو ابو بکرؓ کے ہاتھوں فروخت نہیں کرے گا۔ وہ لوگ یہ جان چکے تھے کہ اسلام کو غریب طبقہ اور خاص طور پر غلاموں میں تیزی سے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور جو غلام بھی مسلمان ہو جاتا ہے ابو بکرؓ اسے خرید کر آزاد کر دیتے ہیں لہٰذا انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی طرف سے غلاموں کی خریداری پر پابندی عائد کر دی تاکہ اسلام کو وسعت حاصل نہ ہو سکے۔

لیکن اس ممانعت کے بعد کچھ لوگ جو آزاد تھے (یعنی بردہ یا غلام نہیں تھے) مسلمان ہو گئے جن میں عثمان بن عفانؓ جو عبدالمطلب کے بھتیجے تھے، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ حضرت آمنہؓ کے بھتیجے اور طلحہؓ بن عبیداللہ اور سعد بن عمروؓ شامل تھے جن کا تعلق مکہ کے اونچے اور معزز خاندانوں سے تھا۔

مسلمانوں کی تعداد میں اضافے سے قبیلہ قریش میں وحشت اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ خاصا یہ کہ نو مسلمانوں کا شمار مکہ کے جانے پہچانے اور ممتاز لوگوں میں ہوتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو ایذا پہنچانے اور پریشان کرنے کے لئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ کو خانہ کعبہ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ دوسری طرف کچھ اوباش لوگ محمد ﷺ کی راہ میں کمین لگا کر بیٹھ جاتے اور جیسے ہی آپؐ خانہ کعبہ جانے کے لئے اپنے گھر سے باہر قدم نکالتے یا کہیں اور جانے کا

ارادہ کرتے تو وہ لوگ ان پر پتھر برساتے اور ان کے لباس کو گندگی سے آلودہ کر دیتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ جانے کے لئے جب بھی اپنے گھر سے باہر نکلتے تو ان کی جان خطرے میں ہوتی تھی لیکن وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہو جاتے تاکہ وہاں پہنچ کر اللہ کی عبادت کر سکیں۔

روایات کے مطابق خانہ کعبہ روئے زمین پر وہ پہلی عبادت گاہ ہے جو انسان کے ہاتھوں تعمیر ہوئی اور ایک دوسری روایت کی رو سے خانہ کعبہ کی بنیاد حضرت آدمؑ نے رکھی اور حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تکمیل کی اور جب طوفان نوح شروع ہوا تو حضرت نوحؑ نے کشتی میں بیٹھ کر سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا تھا۔

بہرحال کوئی دن ایسا نہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ سے واپسی کے بعد لہولہان نہ ہوں کیونکہ قریش کے کارندے کسی ترحم کے بغیر ان پر پتھر برساتے رہتے تھے۔

قبیلہ قریش کے افراد حضرت محمد ﷺ کے ساتھ دشمنی میں اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کا احترام بھی پس پشت ڈال دیا۔

دیرینہ رسوم کے مطابق' خانہ کعبہ کا علاقہ "حرم" سمجھا جاتا تھا یعنی اس علاقے میں کسی کو بھی کسی دوسرے پر دست اندازی کی اجازت نہیں تھی لیکن دونوں مرتبہ جب حضرت محمد ﷺ پر قاتلانہ حملہ ہوا' وہ خانہ کعبہ ہی میں ہوا اور پہلا مسلمان مرد جو اسلام کی راہ میں شہید ہوا وہ بھی خانہ کعبہ ہی میں قتل کیا گیا (توجہ فرمایئے پہلی مسلمان خاتون جو اسلام کی راہ میں شہید ہوئی وہ خانہ کعبہ کے سامنے ہی موت کے گھاٹ اتاری گئی۔ خلیل)۔

خانہ کعبہ میں پہلے مسلمان مرد کی شہادت کا قصہ درج ذیل ہے:

ایک دن جب حضرت محمد ﷺ خانہ کعبہ سے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے تو قریش کے افراد نے اس شدت سے ان پر پتھراؤ کیا کہ جب وہ گھر پہنچے تو نڈھال ہو کر گر پڑے اور شدید زخمی ہو جانے کے باعث اگلے دن خانہ کعبہ نہ جا سکے۔

اس روز جب دوسرے مسلمان عبادت کی غرض سے خانہ کعبہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ آج پیغمبر ﷺ خانہ کعبہ نہیں آ سکتے لہٰذا انہوں نے اپنے طور سے عبادت شروع کردی اور جب وہ لوگ سجدے میں گئے تو قبیلہ قریش کے اجیر شدہ افراد نے ان پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس حملے کے نتیجے میں کئی مسلمان شدید زخمی ہو گئے اور ان میں سے ایک نے جس کا نام حارثؓ تھا' خانہ کعبہ ہی میں دم توڑ دیا۔ حارثؓ حضرت خدیجہؓ کے فرزند اور حضرت محمد ﷺ کے سوتیلے بیٹے تھے۔

حارثؓ وہ پہلے مرد ہیں جو اسلام کی راہ میں شہید ہوئے اور انہیں خانہ کعبہ میں سجدے کی حالت میں قتل کیا گیا۔

اس واقعہ کے بعد قبیلہ قریش کے افراد شب و روز خانہ کعبہ کی نگرانی کرنے لگے تاکہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے پیروکاروں کو خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے روک سکیں۔

حضرت محمد ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ اب وہ اپنے اصحاب کے ساتھ خانہ کعبہ میں عبادت نہیں کر سکتے تو انہوں نے مکہ سے باہر جنگل کی شکل میں ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو اطراف کی زمینوں سے کچھ فرو رفتہ (گہرائی میں) تھی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دن میں دو بار نماز پڑھنے کے لئے وہاں جانے لگے۔

اس جگہ' جو بیابان میں واقع تھی نماز پڑھنے کا طریقہ کار یہ تھا کہ سیاہ فام بلالؓ اذان کہتے یعنی مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتے اور جب نماز ختم ہو جاتی تو حضرت محمد ﷺ مسلمانوں کو قرآنی آیات کا درس دیتے تھے۔ اس وقت تمام نو مسلمان جنہیں اپنے شہر میں عبادت کرنے کی آزادی نہیں تھی' نماز باجماعت ادا کرنے کی غرض سے بیابان کی راہ اختیار کرنے پر مجبور تھے۔

اس دوران حضرت محمد ﷺ کی مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص ایسا تھا جو حضرت محمد ﷺ سے انتہا درجے کی دشمنی رکھتا تھا اور وہ تھا ابوسفیان! ابوسفیان پیغمبر

اسلام ﷺ کا "برادر رضاعی" محسوب ہوتا تھا کیونکہ اس نے اور حضرت محمد ﷺ کے ایک ہی دایہ کی چھاتی سے دودھ پیا تھا۔ ابوسفیان کا کہنا تھا کہ قریش کو حضرت محمد ﷺ سے جو خطرہ لاحق ہے وہ صرف اسی صورت میں ٹل سکتا ہے کہ انہیں یکسر نابود کر دیا جائے۔ (نعوذ باللہ)

وہ قارئین (مراد یورپی قارئین ہیں۔ مترجم) جو اس بحث میں اب تک ہمارے ساتھ رہے ہیں ہو سکتا ہے یہ سوال اٹھائیں کہ قبیلہ قریش کو حضرت محمد ﷺ سے اتنی دشمنی کیوں تھی جبکہ مذہبی لحاظ سے مکہ ایک بین الاقوامی شہر سمجھا جاتا تھا۔ مکہ ایسی جگہ تھی جہاں جزیرہ عرب کے تمام مذاہب کے ماننے والے آزادی کے ساتھ رفت و آمد کرتے تھے اور خانہ کعبہ میں کئی حجرے موجود تھے جن میں ایک یا چند بتوں کو رکھا جاتا تھا۔

ہر شخص کو چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہوتا' خانہ کعبہ میں آنے جانے کی اجازت تھی تاکہ وہ اپنے دین کے مطابق عبادت کر سکے اور بتوں کے سامنے رکوع و سجود کر سکے۔ لہٰذا مکہ کے رہنے والوں کو حضرت محمد ﷺ کے نئے دین سے دشمنی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ اتنے بے شمار مذاہب کے درمیان یہ نیا دین مکہ والوں کے لئے کون سی مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دوسرے ادیان کے ماننے والے جو مکہ میں تھے یا وہاں رفت و آمد کرتے تھے' وہ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کے لئے مزاحمت ایجاد نہیں کرتے تھے۔ یعنی گوناگوں مذاہب کے درمیان' جن کے بت خانہ کعبہ میں موجود تھے مکمل طور پر بے طرفی اور غیر جانبداری حکم فرما تھی لیکن جب حضرت محمد ﷺ نے اپنی رسالت کا برملا اظہار کیا اور اسلام کی تبلیغ شروع کی تو انہوں نے تمام بتوں کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور یہ اعلان کر دیا کہ سارے بتوں کو منہدم کر دیا جائے اور سب لوگ "اللہ" کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں۔

اہل مکہ نے جب یہ دیکھا کہ اگر محمد ﷺ کی باتوں پر عملدر آمد ہو اور بتوں کو

خانہ کعبہ سے ہٹا دیا جائے اور بت پرستی کا خاتمہ ہو جائے تو ان لوگوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا کیونکہ مکہ کا بین الاقوامی بازار جو سال میں چار مہینے تک جاری رہتا تھا پھر کبھی منعقد نہ ہو سکے گا۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ مکہ کا شہر زراعت سے محروم تھا یعنی کھیتی باڑی نہیں ہوتی تھی اور وہاں کے باشندے دو طریقوں سے معاشی ضروریات پوری کرتے تھے ایک تجارت دوسرے مویشیوں کی پرورش اور خاص طور پر اونٹوں کی پرورش کے ذریعے۔ خانہ کعبہ کو' دور جاہلیت یعنی اسلام سے پہلے جزیرۃ العرب کا سب سے بڑا بت خانہ سمجھا جاتا تھا اور جیسا کہ آج کعبہ کو تمام مسلمان فرقوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اسی طرح اس زمانے میں بھی یہ گھر جزیرۃ العرب کے گوناگوں مذاہب کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

مذہبی طور پر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے سبب سال کے دوسرے حصوں میں (یعنی ماہ حرام کے علاوہ)--- بھی لوگ مکہ آتے تھے تاکہ بتوں کی زیارت کر سکیں اور اگر خانہ کعبہ بتوں سے خالی ہو جاتا تو کوئی بھی بتوں کی زیارت کی غرض سے مکہ نہ آتا اور یوں عکاظ کا بین الاقوامی بازار جو چار ماہ تک جاری رہتا تھا وہ بھی منعقد نہ ہو سکتا۔ لہٰذا مکہ کے رہنے والے اپنی اقتصادی اور معاشی بقا کو دین محمدی ﷺ کے سامنے خطرے میں دیکھ رہے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ اگر حضرت محمد ﷺ کو پیش رفت حاصل ہو گئی تو وہ اقتصادی نقطہ نظر سے ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے۔

اہل مکہ کی حضرت محمد ﷺ کے ساتھ دشمنی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ نے بت پرستی کی مخالفت شروع کی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ عربوں کے آبا و اجداد پر بالواسطہ حملہ کر رہے ہیں اور ان کے عقائد کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ دراصل قریش کے تمام آبا و اجداد بت پرست تھے لہٰذا جب حضرت محمد ﷺ نے یہ کہا کہ بت پرستی کا خاتمہ ہونا چاہئے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ قبیلہ قریش کے بزرگوں کے تمام عقائد بھی جھوٹے تھے' لیکن اس زمانے میں بادیہ نشین عرب اپنے اجداد کے عقائد کا بہت احترام

کرتے تھے بلکہ یوں کہیں کہ وہ اپنے اجداد کو بھی بتوں کی طرح پوجتے تھے اور جزیرۃ العرب میں قدیم مذہبی اصولوں پر کاربند رہنا انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔

ایک بنیادی اصول جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں دیکھنے کو ملا ہے اور حتیٰ کہ آج بھی موجود ہے وہ یہ ہے کہ عام لوگ مذہب کی ظاہری رسومات کو لوگوں کے باطنی عقیدے سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں کوئی یہ نہیں جاننا چاہتا کہ کسی ایمان والے کا باطنی عقیدہ کیا ہے اور وہ جس مذہب کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس پر یقین بھی رکھتا ہے یا نہیں بلکہ یہی کافی سمجھتا ہے کہ ظاہر رسومات پر عملدر آمد ہو اور مذاہب کے ظاہری قوانین کی پیروی کی جائے۔

مذہب کی ظاہری رسومات اجداد سے اخلاف تک پہنچتی ہے اور ہر نسل کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مذکورہ رسومات کو کسی تبدیلی کے بغیر آنے والی نسلوں کو منتقل کر دے۔ جزیرۃ العرب میں بھی بت پرستی کی رسم اجداد سے اخلاف تک پہنچی تھی اور پوری قوت سے باقی تھی۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ آباؤ اجداد کے نظریات کو تنقید کا نشانہ بنائے یا یہ کہے کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے اور ان کا راستہ غلط تھا لیکن حضرت محمد ﷺ بڑی جرات کے ساتھ ایسا کہتے تھے اور اسی وجہ سے مکہ کے رہنے والے ان کی جان کے دشمن تھے۔

بہرحال قبیلہ قریش کے افراد کو جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے پیروکار عبادت کی غرض سے کہاں جمع ہوتے ہیں تو انہوں نے دور افتادہ بیابان میں بھی مسلمانوں کے اجتماع اور عبادت کرنے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں۔

سعد بن ابی وقاصؓ جو مسلمان ہو چکے تھے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہم لوگ (یعنی نو مسلمان) عبادت کی غرض سے خانہ کعبہ میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا کسی ایک مسلمان کے گھر میں اکٹھا ہو کر عبادت کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن قریش کی ہمہ وقت نگرانی اور سراغرسانی کے باعث یہ بھی ممکن نہ رہا کیونکہ کسی مسلمان

کے گھر میں اجتماع کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ہم اس کے گھر میں داخل ہوں اور اگر محلے والے ہمیں وہاں داخل ہوتے دیکھ لیتے تو ہم پر حملہ آور ہو جاتے اور ہمیں قتل کر سکتے تھے۔ اسی بنا پر ہم لوگ ایک ایک کر کے کچھ اس طرح مکہ سے باہر نکلتے کہ کسی کی توجہ ہماری جانب مبذول نہ ہو اور پھر کسی دور دراز جگہ پر اکٹھا ہو کر عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ عبادت کرنے کے بعد اگلے دن کے لئے کسی نئی جگہ کا انتخاب کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ افراد قریش کچھ اس طرح ہماری ٹوہ میں لگے رہتے تھے کہ اگر ہم مسلسل دو دن تک کسی ایک جگہ جمع ہوتے تو وہ لوگ با آسانی ہماری جگہ کی نشاندہی کر لیتے تھے۔

ایک دن ہم لوگ "ابو دوب" نامی گھاٹی میں اکٹھے ہوئے اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ابھی ہم آدھی عبادت ہی کر پائے تھے کہ قریش کے کچھ لوگوں نے جن میں ابوسفیانؓ اور اخنس بن شریف جیسے برجستہ لوگ شامل تھے' نماز کی حالت میں ہم لوگوں پر حملہ کر دیا اور ہمیں بھی اپنے دفاع پر مجبور ہونا پڑا۔ میں نے اپنے بچاؤ کی خاطر اونٹ کی ایک بڑی ہڈی جو وہیں قریب ہی پڑی ہوئی تھی اٹھا کر حملہ کرنے والے ایک شخص پر دے ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور وہ شخص خون آلود چہرے کے ساتھ الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اسی طرح اسلام کی راہ میں کسی کافر کا خون بہانے والا پہلا شخص میں ہی ہوں"۔

اس زمانے میں جبکہ مسلمان چاروں طرف سے دباؤ کا شکار تھے تو ایسے حالات میں صرف ایک شخص موت کا خوف کئے بغیر اپنے گھر سے باہر نکلتا تھا اور وہ خود پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات تھی۔ دوسرے مسلمان اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر یہ صبح کے جھٹپٹے میں یا رات کی تاریکی میں جبکہ مکہ والے گہری نیند سو رہے ہوتے تھے یعنی دوسرے مسلمان کچھ اس طرح اپنے گھروں سے باہر نکلتے کہ دوسرے انہیں دیکھ نہ پائیں یا جو لوگ انہیں پہچانتے ہیں وہ ان کی شناخت نہ کر سکیں۔

لیکن اس خوف و وحشت کے باوجود مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا جا رہا تھا تاہم

اس کی رفتار بہت ست تھی۔ حلقہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو غلام تھے یا محنت کش مزدور یا ایسے لوگ جو مکہ کے اشرافی خاندان اور اعلیٰ طبقہ میں "اچھی" نگاہوں سے نہیں دیکھے جاتے تھے، لیکن حضرت محمد ﷺ ان لوگوں کو خواص و اشراف کے دریچہ نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ جب بھی کسی کے سابقہ کردار کے بارے میں تحقیق کرتے تو یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ اس مرد یا عورت کا کردار واقعی برا ہے یا صرف مکہ کے اشراف جو وہاں کے حکمران بھی ہیں اسے بد سابقہ سمجھتے ہیں۔ دنیائے مسیحیت میں بھی کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں جنہیں اس وقت کے حکمران بدکردار کہتے ہیں اور حتیٰ ان کا خون بہانا بھی جائز سمجھتے تھے لیکن فرق ہے ایسے لوگو میں جنہیں خواص و اشراف بد سابقہ یا تباہ کار جانیں یا کوئی حقیقت میں بد سابقہ یا بدکار ہو!

حضرت محمد ﷺ جب بھی کسی ایسے "بد سابقہ" شخص کو پاتے جو حلقہ اسلام میں داخل ہونے کا خواہش مند ہوتا تو دو صورتیں پیش آ سکتی تھیں یا تو وہ شخص مکہ کے دولت مند اور حکمران لوگوں کی نظر میں بد سابقہ ہوتا تو ایسی صورت میں شبہ کی گنجائش باقی رہتی تھی کہ آیا وہ واقعی بد سابقہ ہے یا نہیں؟ اور وہ اگر حقیقت میں بد سابقہ نہ ہوتا تو محمد ﷺ اسے دین اسلام میں داخل کر لیتے تھے۔

یا پھر مذکورہ شخص تمام لوگوں کی نظروں میں برا ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر محمد ﷺ یہ سمجھتے کہ وہ اپنے کئے پر نادم ہے اور صدق دل سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو اسے دین اسلام میں داخل کر لیتے تھے۔ اس سلسلے میں قبیلہ غفار کے ابوذرؓ کی داستان حیات ایک روشن اور برجستہ مثال ہے:

مکہ کے شمال میں ایک خطہ زمین ایسا ہے جسے میں دنیا کی خوفناک ترین سرزمین سمجھتا ہوں۔ اس علاقے میں ایک قبیلہ زندگی بسر کرتا تھا جس کا نام "غفار" تھا۔ اس قبیلے کے افراد کا مشغلہ راہزنی اور غارت گری تھا۔ وہ علاقہ جہاں قبیلہ غفار رہتا تھا چودہ سو سال پہلے کی طرح آج بھی موجود ہے۔ یہ علاقہ سنگلاخ چٹانوں اور گرم و سوزان زمین پر مشتمل ہے

جہاں کوئی بھی چیز حتیٰ کہ خار مغیلاں تک نہیں اگتے اور نہ ہی کوئی جانور حتیٰ کہ صحرائی سوسمار بھی زندگی بسر نہیں کرتے۔ جو شخص اس علاقے سے عبور کرے وہ ایسے کم ارتفاع پہاڑوں کو اپنے سامنے پائے گا' جن کا دامن کسی تیز دھار کلہاڑے کی مدد سے عمودی طور پر کاٹ دیا ہو اور جس کے نتیجے میں خشک اور بھیانک گھاٹیاں وجود میں آئی ہوں۔ جب کوئی مسافر ان پہاڑوں کے اوپر سے ان کے دامن میں نظر دوڑائے تو ان گہرے دروں میں پڑے ہوئے سیاہ' ہرے اور زرد رنگ کے ناہموار پتھروں کا منظر دیکھ کر اس کا بدن خوف کی شدت سے لرزنے لگے گا۔

جب میں (یعنی کونستن ویرژیل) اس علاقے کو عبور کر رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خلقت کے آغاز کو دیکھ رہا ہوں یا چاند کی سطح پر کھڑا ہوا ہوں کیونکہ وہاں کی زمین کا منظر بھی چاند کی سطح کی طرح آشفتہ اور درہم برہم دکھائی دیتا تھا۔ کچھ نقاط تارکول کی طرح سیاہ اور کچھ علاقے بالکل زرد دکھائی دیتے تھے۔

گرمیوں کے موسم میں جب سورج کی شعاعیں اس صحرا کے بڑے بڑے اور چپٹے پتھروں پر پڑتیں اور منعکس ہوتی ہیں تو زمین اور ہوا کی گرمی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ ایسے صحرا میں صرف چند گھنٹے کسی سرپناہ یا سائے کے بغیر بسر کرنا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ قبیلہ غفار کے افراد جن میں ابوذرؓ بھی شامل تھے ایسی ہی جگہ پر زندگی بسر کرتے تھے اور ان کا ذریعہ معاش چپاول اور غارت گری تھا۔ قبیلہ غفار کے نزدیک چپاول کرنا نہ صرف برا نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ہرگاہ یہ عمل کامیابی سے ہمکنار ہوتا تو اہل قبیلے کے لئے فخر و مباہات کا سبب بھی بنتا تھا۔



حضرت ابوذر غفاری

عربوں کی دیرینہ رسم کے مطابق لوٹ مار کا منصوبہ مخفی طور پر بنایا جاتا تھا تاکہ غارت گری کا نشانہ بننے والا قافلہ یا قبیلہ غفلت میں مارا جائے اور اپنے بچاؤ کی ترکیب نہ سوچ سکے۔ تاہم وہ لوگ کہتے تھے کہ لوٹ مار کے دوران کسی کا خون نہیں بہانہ چاہئے اور نہ ہی لوٹ مار کے نام پر عورتوں اور بچوں پر حملہ کرنا جائز ہے۔ بادیہ نشین عربوں کی رسم کے مطابق سال میں چار مہینے کے لئے غارت گری اور ڈکیتی حرام ہوتی تھی اور ان مہینوں کو ماہ حرام کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی طرح مکہ کی زیارت پر جانے والے افراد پر حملہ کرنے کی ممانعت بھی تھی۔

لیکن قبیلہ غفار کے ارکان جو مکہ کے شمال میں سکونت پذیر تھے' مذکورہ رسومات اور قوانین کی پابندی نہیں کرتے تھے وہ ماہ حرام میں قافلوں پر لوٹ مار کی غرض سے حملہ کرتے اور مکہ کی زیارت پر جانے والوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ذیقعد کے مہینے

میں (جو ماہ حرام کا ایک مہینہ ہے) قبیلہ غفار کے لوگوں نے ایک ایسے قافلے پر حملہ کر دیا جو ان کی حدود سے گزر رہا تھا۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قافلے میں شامل مردوں کا قتل عام کرنے کے علاوہ عورتوں کو بھی حملے کا نشانہ بنا دیا اور انہیں بھی موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔

ابوذرؓ نے' جو اس کے ایک رکن تھے' جب زخمی عورتوں کے آہ و نالے سنے اور بچوں کو اپنی ماں کے جنازوں پر بلکتے ہوئے دیکھا تو انہیں شدید ندامت اور پریشانی کا احساس ہوا اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنا قبیلہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ابوذرؓ نے اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کو ساتھ لیا اور قبیلے سے باہر نکل کر سلگتے ہوئے بیابانوں میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جزیرۃ العرب میں کسی شخص کا اپنے قبیلے کو چھوڑ دینا یا قبیلے کی طرف سے ٹھکرا دیا جانا اس کی موت کے حکم کے مترادف ہوتا تھا خاصہ یہ کہ اس شخص کا تعلق قبیلہ غفار سے بھی ہو۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسرے عرب قبائل قبیلہ غفار کے تمام افراد کو مستوجب قتل سمجھتے تھے اور انہیں جب بھی کوئی ایسا شخص نظر آتا یا مل جاتا جس کا تعلق قبیلہ غفار سے ہوتا تو وہ اسے بلا تامل قتل کر دیتے تھے کیونکہ قبیلہ غفار کے افراد نہ تو عربوں کی دیرینہ رسومات اور قوانین کی پیروی کرتے تھے اور نہ ہی بہادری اور مردانگی کے اصولوں پر کاربند رہتے تھے۔

ابوذرؓ کچھ دنوں کا سفر طے کرنے کے بعد ایک ایسی جگہ پہنچے جو ان کی ماں کے رشتہ داروں کی رہائش کا مقام تھا۔ انہوں نے اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کو وہاں چھوڑا اور خود اکیلے ہی بیابان کی طرف چل نکلے۔

وہ بدوی شخص (یعنی ابوذرؓ) جزیرۃ العرب کے بیابانوں میں کسی وسیلہ معاش کے بغیر کئی ماہ تک اکیلا بسر کرتا رہا اور آخر کار ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا جہاں صحرائی سوسمار اور

نباتات کے ذریعے اپنا پیٹ بھر کر اپنی زندگی کو جاری رکھ سکتا تھا۔

سوائے بدوی اعراب کے کوئی اور شخص سوسمار اور صحرائی نباتات کھا کر گزارا نہیں کر سکتا تھا لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس زمانے کے بدوی عرب بھوک اور پیاس سے کچھ اس طرح مانوس تھے گویا بھوکا اور پیاسا رہنا ان کی فطرت کا ایک حصہ ہو۔

سر "رچارڈ بانٹ" جو ایک انگریز ہے اور جس نے ۱۸۵۰ء میں جزیرۃ العرب کا دورہ کیا تھا (اور اس وقت جزیرۃ العرب میں آج کی طرح سڑکیں موجود نہ تھیں) اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ "ایک بدوی عرب کی نظر میں جو چیز انسان کی موت کا سبب بنتی ہے وہ پیٹ کا بھرنا ہے بھوک نہیں! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جب تک کوئی بادیہ نشین شخص صحرا میں بھوکا بسر کرتا رہے تو اس کی صحت برقرار رہتی ہے لیکن جیسے ہی وہ شہر پہنچ کر وہاں کی گوناگوں غذاؤں کا استعمال کرے تو اس کی تندرستی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور ایک دو سال کے اندر ہی چل بستا ہے!"

بہرطور۔ ابوذرؓ بھوک اور پیاس سے مقابلہ کرتے ہوئے کئی مہینوں تک اکیلے ہی صحرا میں بھٹکتے رہے۔ وہ صحرا کی پرسکون راتوں میں چاند اور ستاروں کی روشنی میں کچھ اس طرح سوچوں میں ڈوب جاتے تھے جیسے کوئی اہم فیصلہ کرنا چاہتے ہوں..... اور آخرکار انہوں نے مکہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ پہنچ کر تیس دن تک وہاں ٹھہرے رہے لیکن انہوں نے اپنی شناخت نہ ہونے دی یعنی کوئی یہ نہ جان سکا کہ ان کا تعلق قبیلہ غفار سے ہے۔

ان تیس دنوں میں ابوذرؓ نے پیغمبر اسلام ﷺ کا نام سنا اور یہ جانا کہ وہ لوگوں کو یکتا خدا کی طرف بلاتے ہیں اور انہیں برے کاموں سے پرہیز کرنے اور شرک کو ترک کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

تیس دن کے بعد ابوذرؓ نے پیغمبر اسلام ﷺ سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک راہ گیر سے پوچھا کہ حضرت محمد ﷺ کا گھر کہاں ہے؟ اس شخص نے تعجب خیز نگاہوں سے ابوذرؓ کی طرف دیکھا اور پھر اونچی آواز سے چلانے لگا:

"اے لوگو ادھر آؤ اسے پکڑو اور مار ڈالو کیونکہ یہ ایک مسلمان ہے جو آج ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے"۔

پلک جھپکتے ہی لوگوں نے ابوذرؓ پر حملہ کر دیا اور بوکھلا کر اپنی جان بچانے کی خاطر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن قریش نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور ان پر پتھروں کی بارش کر دی۔ ابوذرؓ خود کہتے ہیں کہ مجھ پر اتنے پتھر برسائے گئے کہ میں نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا اور مکہ والوں نے یہ سمجھ کر کہ میں مر گیا ہوں' مجھے وہیں پڑا چھوڑ دیا اور خود واپس چلے گئے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میرا سارا بدن خون سے بھرا ہوا ہے اور جب رات کی تاریکی چھا گئی تو دو آدمی آئے اور مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان دو میں سے ایک ابوبکر صدیقؓ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے سنگسار کئے جانے کی اطلاع ابوبکرؓ کو مل گئی تھی لہٰذا رات کی تاریکی میں وہ آئے اور ایک دوسرے مسلمان کی مدد سے ابوذرؓ کو اٹھا کر لے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ابوذرؓ مسلمان نہیں بلکہ وہ محمد ﷺ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے دن ابوذرؓ نے حضرت محمد ﷺ سے ملاقات کی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کا نام پوچھنے کے بعد سوال کیا کہ تم کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو۔ ابوذرؓ نے جواب دیا کہ میرا تعلق قبیلہ غفار سے ہے۔ مجھے اپنے قبیلے کے شرمناک اعمال سے نفرت ہو گئی ہے اور میں نے اسے ترک کر کے صحرا کی راہ اختیار کی اور کچھ عرصہ بھٹکنے کے بعد آخر کار مکہ پہنچا اور یہاں جب میں نے یہ سنا کہ آپ ﷺ لوگوں کو خدائے یکتا کی طرف بلا رہے ہیں تو میں نے یہ عزم کر لیا کہ آپؐ سے ملاقات کروں تاکہ آپؐ کی وساطت سے خدائے واحد و لاشریک کو پہچان سکوں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے پوچھا: "کتنے دنوں سے مکہ میں ہو؟" ابوذرؓ نے جواب دیا: "گزشتہ روز مجھے یہاں آئے ہوئے تیس دن ہو چکے تھے"۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے سوال کیا: "آیا تمہارے پاس کوئی ذریعہ معاش بھی تھا؟" ابوذر بولے: "نہیں"۔

حضرت محمد ﷺ نے پوچھا: "پھر تم کیسے گذارا کرتے رہے؟" ابوذرؓ نے جواب دیا: "تیس دن صرف زمزم کا پانی پی کر زندہ رہا"۔ حضرت محمد ﷺ نے پھر سوال کیا: "آیا ان تیس دنوں میں تمہیں کھانے کے لئے کوئی چیز میسر نہ آئی؟" ابوذرؓ نے جواب دیا: "بالکل نہیں"۔

آج ہمیں اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان اگر تیس دن تک کچھ نہ کھائے لیکن اسے پانی میسر ہوتا رہے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ ایسے انسان کا وزن کم ہونا شروع ہو جائے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ذخیرہ شدہ چربی خوراک کی کمی کو پورا کرنا شروع کر دے گی۔ جن لوگوں کو بھوکا رہنے کی عادت ہے وہ تیس دن تک کچھ کھائے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں بشرطیکہ انہیں پانی مہیا ہوتا رہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ اگرچہ یہ جانتے تھے کہ ابوذرؓ ایک غفاری یعنی راہزن ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ابوذرؓ کو حلقہ اسلام میں داخل کر لیا کیونکہ انہیں یہ اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ ابوذرؓ اپنے کئے پر نادم ہیں اور صدق دل سے توبہ کرکے سچائی کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں ابوذرؓ کا شمار صدر اسلام کے نامور مسلمانوں میں ہونے لگا اور انہوں نے اپنے پورے قبیلے کو مسلمان بنا لیا۔ ان کا قبیلہ جو اس دن سے صرف لوٹ مار کے ذریعے زندگی گذارتا تھا اپنے نفرت انگیز اعمال سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو گیا۔

ابوذرؓ کی مثال بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ ایسے لوگ جو عوام کی نظروں میں بدسابقہ ہوتے لیکن خلوص نیت سے توبہ کر لیتے تو حضرت محمد ﷺ انہیں حلقہ اسلام میں داخل کر لیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مکہ کے باشندے کچھ اس طرح محمد ﷺ کے دشمن بن گئے تھے کہ اگر کوئی ان کے گھر کا پتہ پوچھتا تو اسے قتل کرنے پر اتر آتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پتہ پوچھنے والا یا تو کوئی مسلمان ہے یا پھر مسلمان ہونا چاہتا ہے تبھی تو حضرت محمد ﷺ کے گھر کا پتہ پوچھ رہا ہے!

جزیرۃ العرب کی مقتدر شخصیت "عمرؓ بن خطاب" کیسے مسلمان ہوئے

تعجب کی بات ہے کہ ایسے موقع پر جبکہ سارا مکہ حضرت محمد ﷺ کا دشمن بنا ہوا تھا تو انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو کیونکر قتل نہیں کیا۔

مکہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کے قتل نہ کئے جانے کی وجہ درج ذیل ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ قریش کا طائفہ یا قبیلہ دس مختلف خاندانوں میں بٹا ہوا تھا اور ان میں سے ایک خاندان کا نام تھا "ہاشم"۔ حضرت محمد ﷺ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

اگر قبیلہ قریش کے بقیہ نو خاندان حضرت محمد ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش کرتے تو دیرینہ قانون کے مطابق یا تو انہیں ہاشمی خاندان کو خون بہا ادا کرنا پڑتا یا پھر انتقامی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ لہٰذا اسی بنا پر وہ لوگ حضرت محمد ﷺ کو قتل کرنے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔

جیسا کہ قرآن میں ذکر ہوا ہے کہ قریش کے افراد حضرت محمد ﷺ سے یہ کہتے تھے کہ تو (ہمارے مقابلے میں) ناتواں ہے اور اگر تیرا خاندان تیری حمایت نہ کرتا تو ہم تجھے سنگسار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔

لیکن دوسری طرف خود ہاشمی خاندان کے افراد نے جب دو مرتبہ پیغمبر اسلام ﷺ پر قاتلانہ حملہ کیا اور کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت محمد ﷺ کو ایک طاقتور حامی میسر آ گیا تھا۔

اس سے پہلے جب بھی حضرت محمد ﷺ گھر سے باہر نکلتے تو اہل مکہ ان کی طرف پتھراؤ کرتے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے تھے۔

ایک دن جب کچھ لوگ ابوجہل کے اکسانے پر حضرت محمد ﷺ کی طرف پتھر پھینک رہے تھے تو اس منظر کو دیکھنے والا ایک شخص پیغمبر اسلامؐ کے ایک چچا "حمزہؓ" کے

پاس پہنچا جو اپنے وقت کے مشہور پہلوان سمجھے جاتے تھے۔

حمزہؓ حال ہی میں شکار سے واپس لوٹے تھے۔ اس شخص نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اے حمزہؓ! تیری غیرت اور حمیت یہ کیونکر گوارا کرتی ہے کہ لوگ تیرے بھتیجے کو سنگسار کریں، نہ سزا سنائیں، برا بھلا کہیں اور تو جو دلیروں اور بہادروں میں شمار ہوتا ہے اس کی کوئی مدد نہ کرے؟!"

حضرت حمزہؓ کو اس دن تک حضرت محمد ﷺ کے دین میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ محمد ﷺ کا دین ان کے آبا و اجداد کے عقائد و نظریات کے بالکل مخالف ہے لہٰذا دیگر افراد کی طرح وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ دیرینہ اور کہن سال عقائد کا بے چون و چراں احترام کرنا انتہائی ضروری اور واجب ہے۔

لیکن جب انہوں نے یہ سنا کہ لوگ حضرت محمد ﷺ کو پتھروں سے مارتے ہیں، انہیں زدوکوب کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لوگ حضرت محمد ﷺ کو دشنام بھی دیتے ہیں تو ان کی حالت دگرگوں ہو گئی اور انہوں نے اس شخص سے پوچھا کہ میرے بھتیجے کو جو دشنام دیئے جاتے ہیں وہ کیا ہیں؟

اس شخص نے چند ایسے برے الفاظ کو دہرایا جنہیں حضرت محمد ﷺ کے دشمن ان کے لئے استعمال کرتے تھے۔ حضرت حمزہؓ نے جب یہ سنا کہ ان کا بھتیجا کس طرح سے لوگوں کی دشنام گوئی کا نشانہ بنا ہوا ہے تو وہ کچھ اس طرح منقلب ہو گئے کہ ان کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

بادیہ نشین عربوں کے نزدیک زبان سے نکلی ہوئی بات کی بڑی اہمیت ہوئی تھی چاہے وہ بات اچھی ہو یا بری۔ عرب قبائل میں دشنام گوئی کرتے وقت کسی قریبی رشتہ دار کا نام لینا ایک ناقابل بخشش جرم سمجھا جاتا تھا اور چونکہ وہ لوگ زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو انتہائی اہمیت اور وقعت دیتے تھے لہٰذا اگر کوئی اپنی زوجہ کو یہ کہہ دیتا کہ "آج سے تو میری ماں جیسی ہے" تو وہ عورت اس مرد کے لئے حرام ہو جاتی تھی۔

دوسرے یہ کہ کسی قبیلے کے کسی بھی فرد کو برا بھلا کہنا ایسا تھا جیسے پورے قبیلے کو توہین کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی قبیلے کے تمام ارکان آپس میں خون کے رشتے میں منسلک ہوتے تھے۔

بہرحال حضرت حمزہؓ نے اپنی تلوار اٹھائی اور ابو جہل کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ پر پتھر پھینکنے اور انہیں دشنام دینے والوں کا سرغنہ ابو جہل ہی ہے۔ وہاں پہنچ کر ابو جہل کی بری طرح پٹائی کر دی اور اس سے کہا۔

"اے ابو جہل! تو سمجھتا ہے کہ محمد ﷺ بے آسرا ہے اور اس کا کوئی نہیں اور اسی لئے تو اس پر پتھر برساتا ہے اور اسے دشنام دیتا ہے؟ لیکن اب جان لے کہ میں آج سے محمد ﷺ کے دین میں داخل ہو گیا ہوں اور آج کے بعد جو کوئی بھی محمد ﷺ کو دشنام دے گا تو اس کا واسطہ مجھ سے ہو گا۔"

حضرت حمزہؓ کا مسلمان ہو جانا پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے بڑا خوش آئند تھا کیونکہ حمزہؓ کا شمار مکہ کے نامور دلیروں (یا بقول عربوں کے برز" میں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود قریش کے افراد پیغمبر اسلام ﷺ کو پریشان کرنے اور ایذا پہنچانے سے باز نہ آئے اور اگرچہ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کے چچا حمزہؓ مسلمان ہو گئے ہیں لیکن جب بھی انہیں موقع ملتا تو وہ لوگ حضرت محمد ﷺ پر حملہ کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد حضرت محمد ﷺ اور دیگر مسلمان عبادت کی غرض سے ایک ایسے گھر میں جمع ہونے لگے جو "صفا" نامی پہاڑی پر واقع تھا۔ وہ گھر خانہ کعبہ کے بالکل روبرو تھا اور میں نے اس گھر کو دیکھا ہے جو آج ایک مدرسے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جب مسلمان عبادت کے لئے اس گھر میں جمع ہوتے تو ان میں سے کچھ تلوار اٹھائے نگرانی کے فرائض سنبھال لیتے تھے کیونکہ ہر آن ممکن تھا کہ قریش کے کارندے ان پر حملہ آور ہو جائیں اور ان کا قتل عام کر ڈالیں۔

حضرت محمد ﷺ مسلمانوں سے دقیق نظم و ضبط چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ

عبادت کے لئے سب لوگ حاضر ہوا کریں۔ خاص طور پر نماز باجماعت میں شرکت کرنے کی تاکید کرنے اور اس سلسلے میں کسی قسم کا عذر یا بہانہ قبول نہیں کرتے تھے مگر یہ کہ حاضر نہ ہونے والا کچھ اس طرح بیمار ہو کہ زمین سے نہ اٹھ سکے۔

پیغمبر ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد کچھ اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے اور یوں مسلمانوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہو گئی۔ مکہ کے رہنے والے اور خاص طور پر قبیلہ قریش کے افراد اسلام کو پھیلتا دیکھ کر مزید تشویش میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے "دارلندو" یعنی مکہ کی مجلس شوریٰ میں جمع ہو کر مشورہ کرنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ کے دین کو کیونکر نابود کیا جا سکتا ہے لیکن وہ لوگ اپنے مذاکرات سے کوئی خاص نتیجہ اخذ نہ کر سکے۔

مکہ کے بزرگوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کا نام تھا عمرؓ! جب دارلندو کا اجلاس ختم ہوا اور شرکت کرنے والے واپس جانے لگے تو انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خود ہی محمد ﷺ کو قتل کر کے اہل مکہ کو اس "مشکل" سے نجات دلا دوں گا۔

قریش کے سبھی سرکردہ لوگ حضرت محمد ﷺ کی موت (نعوذ باللہ) کے خواہاں تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی انہیں قتل کرنے کی جرات نہیں رکھتا تھا لیکن اس دن حضرت عمرؓ نے اکیلے ہی اس کام کو انجام دینے کا بیڑہ اٹھا لیا۔

حضرت عمرؓ ایک انتہائی جری اور مضبوط ارادے کے مالک انسان تھے اور اتنے بلند قامت تھے کہ ان جیسا کوئی دوسرا شخص مکہ میں موجود نہ تھا۔ ان کا قد اتنا بلند تھا جب مدینہ میں (ہجرت کے بعد) مسجد بنائی گئی اور حضرت عمرؓ اس میں داخل ہوئے تو ان کا سر مسجد کی چھت سے ٹکرا گیا۔

مکہ والے بخوبی جانتے تھے کہ جو بات حضرت عمرؓ کی زبان سے نکلے اسے واپس نہیں لیا جا سکتا۔ جب وہ یہ کہہ دیں کہ کسی کو قتل کر دیں گے تو بلاشبہ اسے مار کر ہی دم لیں گے اور دوسرے لوگ مذکورہ شخص کو مرا ہوا ہی تصور کریں۔ جس دن عمرؓ بن خطاب نے پیغمبر

اسلام ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ دن سن ۶۱۴ء اور ہجرت سے آٹھ سال پہلے کا ایک دن تھا۔ اس دن حضرت محمد ﷺ اور دوسرے مسلمان اسی گھر میں موجود تھے جو صفا کی پہاڑی پر واقع تھا اور جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو قتل کرنے کی غرض سے عمرؓ پہلے اپنے گھر گئے اور تلوار اٹھا کر کوہ صفا کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں نعیمؓ بن عبداللہ نے جو چوری چھپے ایمان لا چکے تھے اور جنہوں نے اپنے دین کو آشکارا نہیں کیا تھا، عمرؓ کو تیز تیز قدموں سے کہیں جاتے دیکھا تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "اے عمرؓ! کہاں جا رہے ہو؟"

عمرؓ نے جو اپنی عادت کے مطابق بلند آواز میں بات کرتے تھے جواب دیا "یا نعیم! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی نے ہمارے اجداد کی اتنی توہین کی ہو جتنی محمد (ﷺ) کرتا ہے اور ہمارے بڑے سے بڑے دشمن بھی اس انداز میں ہماری ہتک کرنے کی جسارت نہیں رکھتے۔ اس شخص (یعنی پیغمبر اسلام ﷺ) نے اپنے نئے دین کی وجہ سے تمام اہل مکہ کا چین و آرام تباہ کر ڈالا ہے اور وہ ہمارے تمام آباو اجداد کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور ہمارے بزرگوں کے دین کو ٹھکراتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں اپنے خداؤں کی پرستش چھوڑ دینی چاہئے۔ ہم آج تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اور وہ بھی صرف اس بنا پر کہ محمد (ﷺ) قریش کا ایک فرد ہے۔ لیکن اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور میں جا رہا ہوں کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دوں اور مکہ والوں کو ہمیشہ کے لئے "فتنہ انگیزیوں" سے نجات دلا دوں۔"

یہ کہنے کے بعد عمرؓ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کوہ صفا کی طرف روانہ ہو گئے۔

نعیمؓ بن عبداللہ بخوبی یہ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ ایک سادہ اور شریف لیکن ارادے کے اٹل انسان ہیں اور ان کا فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہ ان سے ایسی بات کہی جائے جو مدلل اور عقل و انصاف کے مطابق ہو تو صرف ایسی صورت میں ان کا ارادہ بدل

سکتا ہے اور چونکہ وہ سچے اور شریف انسان تھے اور لجاجت یعنی ضد یا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ یہی جانتے ہوئے نعیمؓ، عمرؓ کے پیچھے دوڑے اور انہیں آواز لگائی "یا عمرؓ! ٹھہرو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

عمرؓ چلتے چلتے ٹھہر گئے اور جب نعیمؓ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ عمرؓ کا قد اتنا بلند ہے کہ ان کا سر حضرت عمرؓ کے سینے تک بھی نہیں پہنچتا۔ عمرؓ کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی تلوار کو نیام سے باہر نہ نکالتے مگر جنگ کے موقع پر اور اگر دوسرے عام مواقع پر اگر کسی کو سزا دینا چاہتے تو کوڑے کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس دن انہوں نے اپنی عادت کے خلاف تلوار اٹھائی تاکہ پیغمبر اسلام ﷺ کو قتل کر سکیں۔

جب عمرؓ رک گئے تو نعیمؓ نے ان سے کہا۔ "یا عمرؓ! تم محمد (ﷺ) کے دین سے نالاں ہو اور کہتے ہو کہ ان کے دین نے اہل مکہ کا جینا دوبھر کر دیا ہے لیکن اس سے پہلے کہ تم مکہ کے شہر کی فکر کرو، کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اپنے گھر میں جھانکو اور اس کے بارے میں کچھ سوچو؟!"

حضرت عمرؓ نے متحیر ہو کر پوچھا: "تمہارا مطلب کیا ہے؟"

حضرت نعیمؓ نے جواب دیا کہ تمہارے قریبی اور خونی رشتہ رکھنے والے دو لوگ مسلمان ہیں اور تمہارے گھر میں رہ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تمہاری بہن فاطمہ اور دوسرا اس کا شوہر سعیدؓ بن زید ہے اور اس سے پہلے کہ تم اہل مکہ کی زندگی سدھارنے کی سوچو، بہتر یہی ہے کہ اپنے گھر کی فکر کرو۔

حضرت عمرؓ نے جب یہ باتیں سنیں تو چونکہ وہ ایک منطقی انسان تھے لہٰذا انہوں نے نعیمؓ کی بات مان لی اور کہا کہ "اے نعیم! تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اسلام کو مکہ سے ریشہ کن کروں، اسے خود اپنے گھروں میں پنپنے سے روکوں تو اچھا ہے۔" یہ کہنے کے بعد عمرؓ نے کوہ صفا کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب حضرت عمرؓ گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بہن فاطمہؓ ان کے شوہر سعیدؓ بن زید اور ایک دوسرے شخص جس کا نام خبابؓ تھا اور جو مسلمان ہو چکا تھا قرآنی آیات کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ غصے میں بے قابو ہو گئے اور اپنی بہن کو کوڑوں کی زد میں لے لیا اور ان پر اتنے کوڑے برسائے کہ ان کے بدن کے مختلف حصوں سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ عمرؓ نے اپنی بہن کو پر زور حکم دیا کہ محمد ﷺ کے دین کو چھوڑ دے۔ لیکن فاطمہؓ نے جواب دیا کہ اگر تم مجھ پر اتنے کوڑے برساؤ کہ میری جان نکل جائے تو بھی میں محمد ﷺ کے دین کو نہیں چھوڑوں گی اور اگر تم بھی قرآن کی تلاوت کرو تو جان جاؤ گے کہ یہ دین سچا اور برحق دین ہے۔

یہاں دو روایات نقل ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ عمرؓ بن خطاب نے قرآن کو سعیدؓ بن زید کے ہاتھوں سے لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔

دوسری روایت یہ کہتی ہے کہ عمرؓ نے اپنی بہن کے خاوند سے کہا کہ وہ قرآن کو پڑھیں تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ قرآن میں کیا اثر ہے جو ان کی بہن کہتی ہے کہ اگر تم بھی قرآن پڑھو تو جان لو گے کہ محمد (ﷺ) کا دین برحق اور سچا ہے۔

پہلی روایت یہ کہ عمرؓ نے "قرآن" کو سعیدؓ بن زید کے ہاتھوں سے لیا علم تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس زمانے میں جو ہجرت سے آٹھ سال پہلے کا زمانہ تھا "قرآن" حالیہ شکل میں موجود نہیں تھا اور حتیٰ کہ نبوت کی ساری مدت میں بھی قرآن جیسا کہ آج ہے موجود نہیں تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں قرآن کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا گیا تھا جو اسی شکل میں آج بھی باقی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے دورہ حیات میں قرآن مختلف آیات کی صورت میں مسلمانوں کے پاس موجود تھا اور اکثر مسلمانوں کو قرآنی آیات زبانی یاد تھیں اور صرف

معدود افراد ان آیات کو لکھ کر اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اکثر مسلمان پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے کہ قرآنی آیات کو تحریری شکل میں اپنے پاس محفوظ کر سکیں۔

مسلمہ طور پر قرآن جس شکل میں آج موجود ہے وہ اس زمانے میں نہیں تھا کیونکہ قرآنی آیات کی نہ تو جمع آوری ہوئی تھی اور نہ ہی ان آیات کی تکمیل ہوئی تھی۔ قرآن کا کچھ حصہ مکہ میں اور کچھ مدینہ میں ہجرت کے بعد نازل ہوا تھا اور جب عمرؓ گھر میں داخل ہوئے اور اپنی بہن پر کوڑے برسائے تو ہجرت کے شروع ہونے میں ابھی آٹھ سال باقی تھے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ قرآن کی بعض آیات کو کچھ مسلمان لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے تاکہ فراموش نہ کریں اور ان تین افراد کے پاس ایسی ہی تحریر کردہ آیات موجود تھیں جو عمرؓ کے ہاتھ لگ گئیں (وضاحت: میرے خیال میں مصنف نے جس روایت کا ذکر کیا ہے اس میں قرآن سے مراد قرآنی آیات ہیں مکمل قرآن نہیں تاہم اس سلسلے میں مسیحی مصنف کی نکتہ سنجی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مترجم)

بہرکیف' جب عمرؓ نے قرآنی آیات کو پڑھا (یا سنا) تو وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی بہن کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے اس سے معافی مانگی اور بولے کہ میں بلا تامل مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔

اسی آن وہ تینوں افراد حضرت عمرؓ کے ساتھ کوہ صفا کی طرف روانہ ہو گئے جہاں پیغمبر اسلام ﷺ دیگر مسلمانوں کے ہمراہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے پہاڑی کی چوٹی پر سے جب عمرؓ کو اس حالت میں آتے دیکھا تو وہ یہ سمجھے کہ عمرؓ انہیں قتل کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں آسودہ خاطر کرتے ہوئے کہا کہ میں آیا ہوں تاکہ حلقہ بگوش اسلام ہو جاؤں اور یوں عمرؓ بن خطاب مسلمانوں کی صف میں شامل ہونے والے چالیسویں فرد تھے۔

حضرت عمرؓ کے اسلام لے آنے سے مسلمانوں کو بہت تقویت حاصل ہوئی اور سچ تو

یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا مسلمان ہو جانا تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کا ایک انتہائی اہم اور سرنوشت ساز موڑ تصور ہوتا ہے۔

عمرؓ بن خطاب دنیائے قدیم کے برجستہ ترین چہروں میں سے ایک تھے۔ یہ تو پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ عمرؓ ایک بلند قامت اور قوی الجثہ انسان تھے لیکن ان کی آواز بھی اتنی رسا تھی کہ جب وہ بانگ لگاتے تو ان کی آواز ہزار قدموں کی دوری سے بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ حضرت عمرؓ دوسرے تمام عربوں کی مروجہ برائیوں میں ہرگز دلچسپی نہ لیتے اور ایک اصیل عرب کی طرح کھانے پینے میں صرفہ جوئی سے کام لیتے تھے۔

وہ بلند قامت اور قوی الجثہ شخص ہر کھانے میں صرف پانچ لقموں پر اکتفا کرتا اور اس سے زیادہ نہیں کھاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا کہ وہ پندرہ دن تک شب و روز کام کرتے رہتے لیکن انہوں نے کبھی بھی تھکن طاری ہونے کی شکایت نہیں کی۔ حضرت عمرؓ بن خطاب کسی مجرم کی سزا سے ہرگز صرف نظر نہ کرتے اور اس کی سزا میں تخفیف یا رعایت کے قائل نہ تھے لیکن یہ محال تھا کہ وہ کسی بے گناہ کو بھولے سے بھی سزا دیں۔

حضرت عمرؓ دس سال تک مسلمانوں کے خلیفہ رہے اور اس کوتاہ مدت میں انہوں نے دنیا کی تین عظیم اور طاقتور سلطنتوں کو اسلام کے لئے فتح کیا اور وہ سلطنتیں ایران، مصر اور شام تھیں۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری دن تک جبکہ دنیائے قدیم کے بڑے حصے پر اِن کا حکم چلتا تھا وہ چٹائی بچھا کر زمین پر ہی بیٹھتے اور ہر کھانے میں صرف پانچ نوالوں پر اکتفا کرتے تھے۔

بہرحال..... اس دن جب عمرؓ صفا کی پہاڑی پر ایمان لائے تو انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ اور دیگر مسلمانوں سے کہا کہ خانہ کعبہ کی طرف چلیں اور یوں مسلمان پہلی بار من حیث المجموع، یعنی ایک جلوس کی صورت میں مکہ کی گلیوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے خانہ کعبہ تک پہنچے اور وہاں نماز ادا کی۔

ابوجہل' ابوسفیان' ابولہب اور قریش کے دوسرے سرکردہ لوگ خانہ کعبہ کے باہر موجود تھے لیکن انہیں خانہ کعبہ میں داخل ہونے کی ہمت نہ ہو سکی۔ جب نماز ختم ہو گئی اور مسلمان خانہ کعبہ سے باہر نکل آئے تو حضرت عمرؓ نے بزرگان قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ آج کے بعد اگر تم لوگوں کو محمد ﷺ اور دین اسلام پر کوئی اعتراض اٹھانا ہو تو میرے پاس آؤ کیونکہ میں آج سے مسلمان ہو گیا ہوں"۔

قریش کے بزرگ کچھ اس طرح عمرؓ بن خطاب سے خائف تھے کہ وہ انہیں جواب دینے کی ہمت نہ کر سکے اور حضرت محمد ﷺ اور دوسرے مسلمان خانہ کعبہ سے نکلنے کے بعد بغیر کسی خوف کے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دن عمرؓ بن خطاب' پیغمبر اسلام ﷺ کو ان کے گھر تک پہنچانے گئے اور اہل مکہ میں سے کسی کو بھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ گزشتہ کی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کو ناسزا کہیں یا ان کی طرف پتھر پھینکیں۔

بزرگان قریش نے جب یہ دیکھا کہ عمرؓ نے محمد ﷺ کی حمایت کرنے کا عہدہ سنبھال لیا ہے تو انہیں حضرت حمزہؓ کی پشتی بانی سے زیادہ حضرت عمرؓ کی حمایت سے خطرہ لاحق ہونے لگا۔ حضرت حمزہؓ جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے' ایک پہلوان یا بقول عربوں کے ایک "برز" تھے اور ان کا شمار مکہ کے دلیر اور بہادر لوگوں میں ہوتا تھا لیکن قبیلہ قریش کے لوگ حمزہؓ کے مقابلے میں حضرت عمرؓ کی شخصیت سے بہت ہراساں تھے کیونکہ وہ ان کی بہادری' وفاداری اور چٹان جیسے مضبوط ارادے سے بخوبی واقف تھے اور مکہ میں یہ مشہور تھا کہ حتیٰ ابلیس بھی عمرؓ بن خطاب سے دور بھاگتا ہے۔

لیکن اسلام کے دشمن بھی انتہائی سخت جان اور اپنی بات کے اٹل تھے اور وہ اپنے عقائد اور اجداد کے دین میں شدید تعصب کا شکار تھے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ محمد ﷺ ان کے دین کو جو ان کی اجداد سے ان تک پہنچتا تھا بالکل مسترد کر دیں اور ان کے آباؤ اجداد کے دین کو ہمیشہ کے لئے غلط قرار دیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ایک بار پھر مشورہ کرنے کے لئے جمع ہوئے اور اس مشورت کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت محمد ﷺ کے چچا ابوطالب کے پاس جایا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے بھتیجے کو اپنے خاندان سے باہر نکال دیں تاکہ قریش کے افراد انہیں باآسانی قتل کر سکیں۔ جب تک محمد ﷺ کا تعلق ہاشمی خاندان سے رہتا تو قریش کے افراد انہیں قتل نہیں کر سکتے تھے لیکن اگر ابوطالب' حضرت محمد ﷺ کو اپنے خاندان سے نکالنے پر رضامند ہو جاتے تو ان کا خون مباح ہو جاتا یعنی ان کو قتل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہتی۔

حضرت محمد ﷺ جب تک قبیلہ قریش سے وابستہ رہتے تو ان کے خون کی ایک قیمت تھی یعنی انہیں قتل کرنے والے کو ان کا خون بہا ادا کرنا پڑتا یا پھر انتقام کے لئے آمادہ ہونا پڑتا۔ لیکن اگر ابوطالبؓ' حضرت محمد ﷺ کو قبیلہ بدر کرنے کی منظوری دے دیتے تو اس وقت کے قانون (یعنی آئین مروت) کے مطابق قریش کے لوگ خون بہا ادا کئے بغیر یا انتقام کا خطرہ مول لئے بغیر پیغمبر اسلام ﷺ کو قتل کر سکتے تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے چند افراد کو خاندان بنو ہاشم کے سربراہ حضرت ابوطالبؓ کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان سے مذاکرات کریں اور یہ تجویز پیش کریں کہ وہ محمد ﷺ کو اپنے قبیلے سے جلا وطن کر دیں اور ان کی جگہ قریش کے کسی دوسرے قبیلے سے ایک یا دو نوجوان افراد کو اپنے خاندان میں شامل کر لیں۔

یہاں پڑھنے والے شاید تعجب کریں کہ کیونکر قریش کے لوگ ابوطالب سے یہ چاہتے تھے کہ وہ محمد ﷺ کو اپنے قبیلے سے باہر نکال دیں اور ان کی جگہ دوسرے افراد کو اپنے قبیلے میں داخل کر لیں۔

اس مطلب کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ اسلام سے پہلے جزیرۃ العرب میں قتل نفس یعنی انسانی جان کے قتل پر معنوی سزا کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ جب کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تو اسے پشیمانی کا احساس نہ ہوتا اور نہ ہی دوسرے لوگ قاتل کو معنوی یا

اخروی سزا کا مستحق سمجھتے تھے (یعنی قتل کرنا کوئی گناہ تصور نہیں ہوتا تھا)

معنوی اور اخروی کیفریا عذاب کا تصور اسلام کے بعد وجود میں آیا وگرنہ اس سے پہلے اگر کوئی بادیہ نشین عرب دس افراد کو یکجا موت کے گھاٹ اتار دیتا تو اسے نہ تو گناہ کا احساس ہوتا اور نہ ہی دوسرے اسے معنوی سزا کا مستحق سمجھتے تھے۔ جزیرۃ العرب کے قبیلوں میں انسان کی حیثیت ایک مادی شے کی طرح ہوتی تھی اور اگر وہ قتل کر دیا جاتا تو اس کے خون کی قیمت ادا کرنے کے بعد قاتل کے ذمہ کوئی معنوی ذمہ داری نہیں رہتی تھی (یعنی اسے گناہ کا احساس اور اخروی عذاب کا خطرہ محسوس نہ ہوتا تھا) بسا اوقات یہ بھی ہوتا کہ مقتول کے خون کی قیمت ادا کرنے کی بجائے قاتل کے قبیلے کا ایک فرد مقتول کے قبیلے میں منتقل کر دیا جاتا تاکہ توازن برقرار رہے۔

چونکہ بادیہ نشین عرب ایک قبیلے کے افراد کو مادی سرمایہ تصور کرتے تھے لہٰذا ان کا خیال یہ تھا کہ ایک شخص کے قتل ہو جانے سے ان کے قبیلے میں جو کمی واقع ہوئی ہے اسے دوسرے شخص کے حاصل کرنے سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ یوں انسانی توازن برقرار رہے گا اور مقتول کا قبیلہ بھی نقصان میں نہیں رہے گا۔ لہٰذا کچھ ایسے ہی افکار کے پیش نظر قریش کے سرکردہ افراد نے حضرت ابوطالبؓ کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر وہ اپنے بھتیجے کو قبیلہ بدر کر دیں اور ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص لے لیں تو نہ صرف انہیں کوئی نقصان نہ ہو گا بلکہ ہرگاہ انہیں ایک کی بجائے دو افراد مہیا کر دیئے جائیں تو وہ فائدے میں بھی رہیں گے۔



عتبہ بن ربیعہ

قریش کے نمائندے حضرت ابوطالب کے پاس پہنچے اور ان سے اپنا مدعا بیان کیا اور اپنی تجویز ان کے سامنے پیش کر دی۔ حضرت ابوطالب نے کہا کہ میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں گا اور اپنے اجداد کے دین پر قائم رہتے ہوئے موت کو لبیک کہوں گا لیکن میں اپنے بھتیجے کو قبیلہ بدر نہیں کر سکتا کہ تم اسے قتل کر ڈالو البتہ یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے گفتگو کروں گا۔ شاید اسے نئے دین کو چھوڑنے پر آمادہ کر سکوں۔ تم لوگ اگلے دن میرے پاس آنا۔ میں تمہیں نتیجے سے آگاہ کر دوں گا۔

حضرت ابوطالب نے اسی دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنے گھر بلوایا اور ان سے کہا کہ قریش نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ تمہیں اپنے خاندان سے باہر نکال دوں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا دین ہرگز قبول نہیں کروں گا لیکن چونکہ وہ میرا بھتیجا ہے لہٰذا میں اسے قبیلہ بدر بھی نہیں کر سکتا۔ تاہم اس سے گفتگو ضرور کروں گا تاکہ

شاید اسے منع کر سکوں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا : "چچا جان آپ مجھے کس چیز سے منع کرنا چاہتے ہیں؟"

حضرت ابو طالب نے جواب دیا کہ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ تمہارے ساتھ گفتگو کروں کہ تم نئے دین کی تبلیغ چھوڑ دو اور دوبارہ اس قسم کی باتیں زبان پر مت لاؤ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "اے چچا جان! میں نے جس دن اپنی رسالت کا آغاز کیا تو سوائے اللہ کے کسی اور پر بھروسہ نہ کیا اور آج بھی اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور پر آسرا نہیں رکھتا۔ اگر آپ مجھے قبیلے سے نکالنا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں"۔

لیکن حضرت ابو طالب نے اپنے بھتیجے کو قبیلہ بدر نہیں کیا کیونکہ وہ اس عمل کو اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے قریش کو جواب دیا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قبیلہ بدر نہیں کر سکتا لیکن جب تک میں زندہ ہوں اس کے دین کو تسلیم نہیں کروں گا۔

قریش نے جب یہ دیکھا کہ حضرت ابو طالب اور ان کے بھتیجے کی باہمی گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تو انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بلاواسطہ ملاقات کرنے اور ان کے ساتھ مذاکرات انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے ایک شخص کو جو متانت' بردباری اور آداب معاشرت میں دوسروں سے برتر تھا' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا اور اس شخص نے قریش کی نمائندگی کرتے ہوئے کچھ اس طرح گفتگو کا آغاز کیا۔

"یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے جب سے آپ کو پہچانا ہے امین اور صادق پایا ہے۔ سب ہی آپ کے حسن و اخلاق کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کی جانب سے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچی ہو لیکن آج آپ کی باتوں اور کاموں نے اس شہر کی حالت بدل دی ہے اور کوئی بھی آسودہ خاطر نہیں آتا۔ آپ سر عام اس شہر کے باسیوں کے دیرینہ مذہبی عقائد کو جھٹلا رہے ہیں اور ہمارے معزز بتوں کو ناحق سمجھتے ہیں۔ اور یہ

کہتے ہیں کہ ہمارے آبا و اجداد کا دین جھوٹا تھا حالانکہ آپ بھی ہم میں سے ایک ہیں اور آپ کا تعلق بھی ہمارے آبا و اجداد سے ہے لہٰذا کیونکر آپ ہمارے بزرگوں کی توہین کرنا پسند کرتے ہیں؟"

"یا محمد (ﷺ)! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ کے دل میں ہے مجھے بتا دیں تاکہ ہم آپ کا مطمع نظر جان سکیں۔ اگر آپ کو دولت چاہئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اتنی دولت آپ کے قدموں میں لا ڈالیں گے کہ آپ سب چیزوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو عورت چاہئے تو یقین جانئے کہ قریش اپنی حسین و جمیل لڑکیاں آپ کو دینے کو تیار ہیں اور اگر آپ جاہ و مقام کے طالب ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ مکہ کی حکومت آپ کے ہاتھ میں آجائے تو ہم آپ کی یہ آرزو بھی پوری کرنے کو تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اپنی موجودہ روش کو بدل دیں اور ہمارے عقائد کو باطل قرار نہ دیں اور یہ مت کہیں کہ ہمارے خدا ناکارہ پتھر ہیں کیونکہ ہم اس قسم کی توہین برداشت نہیں کر سکتے اور یا محمد (ﷺ) جان لو کہ تمہارا ایک ایک لفظ کسی زہر آلود تیر کی طرح ہمارے سینے میں اترتا ہے اور ہماری قوت برداشت ختم ہوتی جا رہی ہے"۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے بڑی متانت اور بردباری کے ساتھ قریش کے نمائندہ کی باتیں سنیں اور جب اس کی بات ختم ہو گئی تو اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی جانب سے نہیں کہتا بلکہ اللہ کی طرف سے کہتا ہوں۔ وہ کلمات جو اللہ مجھ پر نازل کرتا ہے وہ (اتفاق سے) عربی زبان میں ہیں جنہیں تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور ان پر عمل کر سکتے ہو اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ تمہارے آبا و اجداد کا دین باطل ہے اور تم لوگ مشرک ہو تو دراصل اللہ کے کلام کو زبان پر لاتا ہوں۔ مجھے جو رسالت سونپی گئی ہے میں اسے انجام کو پہنچا کر ہی دم لوں گا اور تمہارا لالچ یا دھونس مجھے اپنی رسالت سے نہیں روک سکتا..... اور میں تمہیں بھی یہی کہوں گا کہ سیدھا راستہ اختیار کرو، شرک کرنا چھوڑ دو اور اللہ کے دین کی پناہ میں آجاؤ۔ اللہ کا فرمان ہے۔

"یا محمد (ﷺ) انہیں (یعنی مشرکین سے) کہہ دو کہ میں بھی تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں لیکن اس تفاوت کے ساتھ کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے تاکہ تمہیں بتاؤں کہ تمہارا اللہ ایک ہے۔ اس کی طرف منہ موڑو اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور مان لو کہ مشرکین جہنم کے "ویل" نامی کنوئیں میں ڈال دیئے جائیں گے"۔

(مندرجہ بالا الفاظ قرآن کی اکتالیسویں سورۃ "حم السجدہ" کی ساتویں آیت کا ترجمہ ہیں)

قبیلہ قریش کے ایلچی نے جب حضرت محمد ﷺ کا جواب دریافت کر لیا تو وہ قریش کے پاس لوٹ آیا اور ان سے کہا کہ مجھ سے مزید کچھ نہیں ہو سکتا اور تم لوگ محمد (ﷺ) کے ساتھ جیسا بھی سلوک کرنا چاہو کر سکتے ہو۔

وہ شخص جس نے قبیلہ قریش کے سفیر کی حیثیت سے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مذاکرات انجام دیئے تھے اس کا نام تھا "عتبہ"۔

(وضاحت) اسلامی مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب عتبہ بن ربیعہ اپنی قوم میں واپس آیا تو ان سے کہنے لگا "قسم رب کی میں نے ایسا کلام آج تک نہیں سنا۔ یہ کلام نہ تو جادو ہے اور نہ ہی نجومیوں کی لن ترانی اور آج جو کلام میں نے سنا ہے اس کا اثر بہت جلد ظاہر ہونے والا ہے لہٰذا میرا مشورہ مانو تو محمد (ﷺ) کی راہ میں دیوار نہ بنو اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دو"۔ لیکن قریش نے یہ کہہ کر عتبہ بن ربیعہ کی بات مسترد کر دی کہ محمد (ﷺ) نے اس پر جادو کر دیا ہے (خلیل)

پہلی بار جب مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے

اسلامی تذکرہ نویسوں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی متعدد زوجات تھیں، لیکن ان میں سے اکثر یہ لکھنا بھول گئے ہیں کہ جب تک خدیجہؓ بقید حیات تھیں تو حضرت محمد ﷺ نے دوسری شادی نہ کی اور عرصہ پچیس سال تک ان کے ساتھ وفاداری سے نبھاتے رہے۔

جس دن حضرت محمد ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تو ان کی عمر پچیس سال تھی اور وہ عنفوان شباب پر تھے لیکن جب حضرت خدیجہؓ اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات بامشقت کے پچاس سال گزر چکے تھے۔ حضرت محمد ﷺ متواتر پچیس سال تک حضرت خدیجہؓ کے ساتھ مہر و وفا کے سائے تلے زندگی بسر کرتے رہے اور اس مدت میں انہوں نے حتیٰ کہ ایک بار بھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔

حضرت خدیجہؓ ایک زوجہ ہونے کے علاوہ حضرت محمد ﷺ کی مشیر خاص بھی تھیں۔ جب بھی حضرت محمد ﷺ اپنے کاموں کے بارے میں ان سے گفتگو کرتے تو حضرت خدیجہؓ اپنی نظر میں آنے والا بہترین لائحہ عمل پیش کرتیں اور حضرت محمد ﷺ بھی اکثر اوقات ان کے نظریات سے استفادہ کرتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ وہ پہلی ہستی ہیں جو حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائی۔ اگرچہ وہ ایک تاجرہ تھیں اور عام طور پر تاجر طبقے کو اپنے سود و زیاں کے علاوہ کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی لیکن حضرت خدیجہؓ نے جس دن یہ سنا کہ حضرت محمد ﷺ پیغمبری کے لئے مبعوث ہو گئے ہیں تو اسی دن ان پر ایمان لے آئیں اور اس کے بعد اپنی ساری دولت کچھ اس طرح اسلام کی راہ میں نچھاور کر دی کہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو بالکل تہی دست ہو چکی تھیں۔

اسلام کے ابتدائی دور میں دو ہستیاں ایسی ہیں جنہوں نے مالی لحاظ سے بہت قربانیاں دیں۔ ان میں سے ایک حضرت خدیجہؓ اور دوسرے حضرت ابوبکرؓ تھے۔ اسلام سے پہلے یہ دونوں افراد مکہ کے تونگروں میں شمار ہوتے تھے لیکن جب یہ دونوں اس دنیا سے رخصت ہوئے تو بالکل تہی دست تھے کیونکہ انہوں نے اپنی ساری دولت اسلام کی راہ میں قربان کر دی تھی۔

ہم حضرت خدیجہؓ کے بارے میں جنہوں نے اسلام کے آغاز میں پیغمبر اسلام

ﷺ کی بے پناہ حمایت اور مدد کی، آئندہ صفحات میں بھی تذکرہ کریں گے لیکن بحث جاریہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک انتہائی اہم واقعہ کی طرف اشارہ کریں اور وہ ہے ایک دوسرے ملک "حبشہ" کی جانب مسلمانوں کی ہجرت کا واقعہ!

جب حضرت عمرؓ بن خطاب مسلمان ہو گئے تو انہوں نے نہ صرف اپنے اہل خاندان کو اسلام کی دعوت دی بلکہ ان کے قبیلے "بنی عدی" کے متعدد افراد بھی مسلمان ہو گئے۔ قریش نے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتے دیکھا تو وہ مزید تشویش کا شکار ہو گئے اور چونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ بن خطاب پیغمبر اسلام ﷺ کی بہت حمایت کرتے تھے لہٰذا وہ انہیں گزشتہ کی طرح گزند بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اسی بات کے پیش نظر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نئی چال کے ذریعے (جسے قرآن نے "فتنہ" کے نام سے پکارا) مسلمانوں کو اسلام سے روگردانی پر مجبور کریں۔

کچھ لوگ جو اسلام لائے، وہ ابتدائی مسلمانوں اور بالخصوص پیغمبر اسلام ﷺ کی طرح با استقامت نہ تھے اور گوناگوں مصائب یا مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ قریش کی جماعت نے بھی پیشتر از پیشتر مسلمانوں کو ستانا شروع کر دیا۔

انہوں نے یہ پابندی لگا دی کہ مسلمانوں سے نہ تو کوئی چیز خریدی جائے اور نہ ہی انہیں کوئی چیز بیچی جائے (یعنی معاشی بائیکاٹ) اور کوئی انہیں لڑکی دے اور نہ ہی ان سے لڑکی لے (یعنی سماجی بائیکاٹ)۔

مکہ کی سرزمین میں جہاں لوگوں کا ذریعہ معاش تجارت اور سوداگری تھا، یہ پابندی مسلمانوں کی زندگی کو مفلوج کرنے لگی اور اسی بنا پر کچھ لوگ جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے پائیداری نہ کر سکے اور اسلام سے دستبردار ہو گئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو شدت سے یہ احساس تھا کہ اگر فوری طور پر کوئی چارہ جوئی نہ کی گئی تو ہو سکتا ہے قریش کے شدید دباؤ کے تحت کچھ اور لوگ بھی اسلام سے ہاتھ کھینچ لینے پر مجبور ہو جائیں۔

اسی بنا پر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ اس وقت تک کسی اور پیغمبر

نے اپنے پیروکاروں کے لئے ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ نے یہ عزم کر لیا کہ وہ خود مکہ میں ٹھہرے رہیں اور استقامت و پائیداری کریں، چاہے قتل کر دیئے جائیں لیکن مسلمانوں کو ایک دوسرے ملک حبشہ کی طرف روانہ کر دیں۔

حبشہ میں ایک ایسے بادشاہ کی حکمرانی تھی جو کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کو ایذا نہیں پہنچاتا تھا یعنی وہاں مذہب کی مکمل آزادی تھی بشرطیکہ دوسرے مذاہب کے لئے مزاحمت ایجاد نہ کی جائے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ کو چھوڑ دیں اور حبشہ کی طرف نکل جائیں اور اس وقت تک وہاں ٹھہرے رہیں جب تک کہ مکہ میں صورت حال معمول پر نہ آ جائے۔

حبشہ روانگی کے موقع پر پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ لوگ کچھ اس انداز میں مکہ سے خارج ہوں کہ قریش کی جماعت ان کے ارادے سے مطلع نہ ہو سکے۔ حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں سے یہ بھی کہا کہ اگر تم لوگ اجتماعی طور پر حبشہ کی طرف روانہ ہو گے تو لامحالہ قریش کو اس کی خبر ہو جائے گی اور وہ تمہارا راستہ روک لیں گے لیکن اگر تم لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں مکہ سے نکلو تو قریش یہ نہ جان سکیں گے کہ مسلمان ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں۔

جن لوگوں نے پہلی مرتبہ مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کی ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جعفرؓ بن ابی حضرت طالب اور ان کی بیوی "اسماءؓ" جو کشتی میں سوار ہو کر بحیرہ قلزم سے گزرے اور حبشہ پہنچے۔ اسی بنا پر اسماءؓ کو "بحریہ" کا لقب دیا گیا یعنی "بحر پیما خاتون"۔ حضرت ابوطالب کے دو بیٹے تھے ایک علیؓ جن کی پرورش پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی نگرانی میں کی اور دوسرے جعفرؓ جنہیں پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا عباسؓ نے اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔

۲۔ عثمانؓ بن عفان، محمد ﷺ کے داماد اور حضرت رقیہؓ کے شوہر تھے۔ جیسا کہ ہم

جانتے ہیں کہ رقیہؓ پیغمبر اسلام ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔ جب ابولہب کے بیٹے نے انہیں طلاق دی تو ان کا نکاح عثمانؓ سے ہو گیا۔

۳۔ زبیرؓ بن العوام، عبداللہؓ بن مسعود، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابوحذیفہؓ سہلہ دختر سہیل بن عمر، عامرؓ بن ربیعہ اور ان کی زوجہ لیلیٰ بنت ابو خیشہ، حاطبؓ بن عمر، سہیلؓ بن بیضا، مصعبؓ بن عمیر، ابوسلمہؓ اور ان کی بیوی، ام سلمہ بنت امیہ، عثمانؓ بن مظعون۔

بالائے ذکر افراد خفیہ طور پر مکہ سے نکل کر سمندر کے کنارے پہنچے اور کشتی پر سوار ہو کر حبشہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ مسلمانوں کا پہلا دستہ تھا جو حبشہ کی طرف روانہ ہوا اور اس کے بعد دوسرے مسلمان بھی چوری چھپے مکہ سے نکل کر حبشہ کی سمت روانہ ہو گئے۔

میں (یعنی کونسٹن ویرژیل) نے کچھ کتابوں میں پڑھا ہے کہ جعفرؓ پہلے گروہ کی بجائے اس دوسرے گروہ میں شامل تھے جو حبشہ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حبشہ پہنچنے کے بعد جب بھی مسلمانوں کو حبشہ کے بادشاہ سے گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو جعفرؓ بن ابی طالب نے ہی مسلمانوں کی طرف سے مذاکرات انجام دینے کا عہدہ سنبھالا اور ہمیشہ وہی مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے بادشاہ کے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔

جب مسلمان حبشہ کے دارالخلافہ پہنچے تو جعفرؓ کی زوجہ اسماءؓ نے (جنہیں بحریہ کے نام سے پہچانا جاتا تھا) اپنی آمد کے پہلے ہی دن ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اتفاق سے اسی دن حبشہ کی ملکہ نے بھی وضع حمل کیا اور ایک نرینہ اولاد کو جنم دیا۔ اسماءؓ نے رضاکارانہ طور پر بادشاہ کے بیٹے کو دودھ پلانے کی تجویز پیش کی جو منظور ہو گئی۔ اس طرح عربوں کے رواج کے مطابق جعفرؓ بن ابی طالب کا بیٹا اور حبشہ کے بادشاہ کا فرزند آپس میں رضاعی بھائی بن گئے۔

ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی پہلی جماعت کے بعد دوسرے مسلمان گروہ بھی مکہ سے حبشہ کی طرف روانہ ہو گئے اور مجموعی طور پر ایک سو نو (۱۰۹) مسلمان حبشہ میں جمع ہو گئے۔ یہ سب لوگ کشتی کے ذریعے حبشہ پہنچے تھے۔

آخرالامر جماعت قریش کو یہ علم ہو گیا کہ کچھ مسلمان حبشہ کی طرف نکل گئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے عمرو بن العاص اور عمارۃ بن ولید نامی دو افراد کو یہ مہم سونپی کہ وہ حبشہ جائیں اور وہاں کے بادشاہ سے کہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے حوالے کر دے تاکہ انہیں واپس مکہ لایا جا سکے۔ عمرو بن العاص جب عمارۃ بن ولید کے ہمراہ نجاشی کے دربار میں حاضر ہوا تو اس نے کہا۔

"اے حبشہ کے بادشاہ! جن لوگوں کو تو نے پناہ دے رکھی ہے ان کا شمار "مفسدین" میں ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے آبا و اجداد کے دین کو ترک کر دیا ہے۔ وہ ہمارے اجداد پر تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا دین جھوٹا تھا اور ہمارے بزرگ باطل کی پیروی کرتے تھے۔ اے شاہ حبشہ! جو لوگ آج تیری پناہ میں ہیں وہ کل تیری رعیت کے دین کو بھی بدل دیں گے لہٰذا تیری بہتری اسی میں ہے کہ انہیں ہمارے سپرد کر دے تاکہ ہم انہیں مکہ واپس لے جائیں اور انہیں ان کے اہل خاندان کے حوالے کر دیں کیونکہ ان کے گھر والوں نے ہم سے یہی مطالبہ کیا ہے۔"

حبشہ کے بادشاہ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کو اس کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ جب مسلمان حاضر ہو گئے تو نجاشی نے کہا۔ "یہ دو افراد مکہ سے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم لوگ خطاکار ہو لہٰذا تم سب کو واپس مکہ بھیج دینا چاہئے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تمہارے اہل خاندان تمہاری واپسی کے منتظر ہیں۔ تم لوگ اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہو گے۔"

جعفرؓ بن ابی طالب آگے بڑھے اور کچھ اس طرح سخن کا آغاز کیا۔ "اے حبشہ کے بادشاہ! ان دونوں سے پوچھو کہ آیا ہم لوگوں نے مکہ یا جزیرۃ العرب کے کسی اور حصے میں کوئی چوری کی ہے، ڈاکہ ڈالا ہے یا کسی کو قتل کیا ہے یا کوئی اور خلاف ورزی ہم سے سرزد

ہوئی ہے؟"

شاہ حبشہ نے قریش کے ایلچیوں سے سوال کیا اور انہوں نے کہا کہ ان لوگوں نے کوئی چوری یا قتل نہیں کیا۔

جعفرؓ بن ابی طالب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اے شاہ حبشہ! ماضی میں ہم لوگ بت پرست تھے اور ہماری زندگی لہوولعب میں گزرتی تھی۔ ہم ہر طرح کا برا کام انجام دینے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ کمزوروں اور تنگ دستوں پر ظلم و ستم روا رکھنا ہماری عادت بن چکا تھا۔ ہم اندھیروں میں بھٹک رہے تھے کہ ہمارے درمیان ایک پیغمبر محمدؐ بن عبداللہ پیدا ہوا اور اس نے ہمیں ہدایت کی راہ دکھائی اور ہم سے کہا کہ بت پرستی چھوڑ دو۔ ہمارے پیغمبرؐ نے ہمیں خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے کا رستہ دکھایا اور ہمیں یہ درس دیا کہ ہم پتھر سے بنی ہوئی مورتوں کی پوجا نہ کریں' برے کاموں سے توبہ کرلیں اور مسکینوں پر ظلم و ستم روا نہ رکھیں۔

ہم لوگ اس پر ایمان لے آئے مگر اے حاکم حبشہ! یہ لوگ جو ہمیں گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں یہ دراصل بت پرست ہیں اور پتھر یا لکڑی کی بنی ہوئی مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں' معاشرے کے ناتواں لوگوں پر ستم ڈھاتے ہیں اور جب سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیغمبری کے لئے مبعوث ہوئے ہیں تو یہ لوگ اور ان کے قبیلے کے دوسرے افراد جو قریش کے نام سے مشہور ہیں' ہمارے پیغمبرؐ کو ایذا پہنچانے' سنگ مارنے اور دشنام دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔"

حبشہ کے بادشاہ نے فریقین کے اظہارات سننے کے بعد حکم دیا کہ عمرو بن العاص اور عمارۃ بن ولید کے لائے ہوئے تحائف واپس کر دیئے جائیں اور پھر قریش کے نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ "جو لوگ میرے ملک میں پناہ لینے آئے ہیں وہ میرے بہت قریب ہیں کیونکہ وہ بھی میری طرح خدائے یکتا کی پرستش کرتے ہیں اور میں تمہیں اے قریش کے سفیرو! اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ انہیں اپنے ہمراہ لے جاؤ اور وہاں

لے جا کر اذیت و آزار کا نشانہ بناؤ۔"

جب قریش کے دونوں سفیر چلے گئے تو نجاشی نے جعفرؓ بن ابی طالب سے کہا کہ وہ اسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مزید کچھ بتائیں۔ جعفرؓ نے حبشہ کے بادشاہ اور اس کے دربار میں حاضر دوسرے لوگوں کے سامنے قرآن کی ان آیات کی تلاوت کی جو آج قرآن کی انیسویں سورۃ میں موجود ہیں۔ ان آیات میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تذکرہ ہوا ہے۔

نجاشی نے، جو خود مسیحی تھا جب ان آیات کو سنا تو بے اختیار رو پڑا اور اس کے دربار میں موجود دوسرے افراد بھی رونے لگے۔ نجاشی نے کہا کہ "تمہارا پیغمبرؐ ایک عظیم اور سچا انسان ہے۔ تم لوگ جب تک چاہو میرے ملک میں آزادی سے رہ سکتے ہو اور کوئی تمہیں اس ملک سے نہیں نکال سکتا"۔

جو مسلمان مکہ سے حبشہ پہنچے وہ وہاں آسودہ خاطر تھے اور انہیں قریش کی ایذا رسانی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن انہیں وہاں کچھ اور طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، جن میں سے ایک یہ تھا کہ مسلمانوں میں سے دو افراد حبشہ پہنچنے کے بعد وہاں کے کلیساؤں کی عظمت اور شان و شوکت دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ اسلام کو چھوڑ کر حلقہ مسیحیت میں داخل ہو گئے۔

ان دو میں سے ایک کا نام عبیداللہ بن جحش تھا جو اپنی زوجہ ام حبیبہؓ کے ہمراہ حبشہ پہنچا تھا اور ام حبیبہؓ ابوسفیان جیسے مشہور شخص کی بیٹی تھیں۔ عبیداللہ، اسلام لانے سے پہلے ایک حنیف شمار ہوتا تھا۔ یعنی اس نے اپنی زندگی حق و حقیقت کی جستجو میں صرف کی تھی اور جب اسلام لایا تو وہ حقیقت پا لینے کے زعم میں مسلمان ہو گیا لیکن حبشہ پہنچ کر اسلام سے دستبردار ہو گیا۔

دوسرا مسلمان جو حبشہ میں دین مسیحیت میں داخل ہو گیا اس کا نام تھا "سکران بن عمرو" اس شخص نے بھی اپنی زوجہ سودہؓ کے ہمراہ حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ سودہؓ نے

جب یہ دیکھا کہ ان کا خاوند اسلام سے روگرداں ہو گیا ہے تو وہ حبشہ سے مکہ چلی آئیں اور جیسا کہ اگلے صفحات میں ہم ذکر کریں گے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زوجیت میں داخل ہو گئیں تاہم حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد۔

بہرکیف جماعت قریش نے جب یہ دیکھا کہ کچھ مسلمان ان کے ہاتھوں سے بچ نکلے ہیں اور حبشہ میں جا بسے ہیں تو انہوں نے انتقامی کارروائی کے طور مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ مسلمانوں کے دشمنوں کا سرغنہ ابوجہل تھا۔ اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں سے فرداً فرداً ملاقات کرنے کی ٹھانی۔

اگر کسی مسلمان کا تعلق مکہ کے اشراف یعنی معزز طبقے سے ہوتا تو ابوجہل اسے ملامت اور سرزنش کرنے کے انداز میں کہتا کہ آیا تجھے شرم نہیں آتی کہ تو نے اپنے آباد اجداد کے دین کو ٹھکرا دیا ہے اور اپنے بزرگوں کے دین کو باطل سمجھتا ہے۔ آخر تو کیونکر ایسی سرزمین پر سانس لے سکتا ہے جہاں تیرے اجداد رہتے تھے اور جو ''لات'' و ''منات'' و ''عزیٰ'' پر پختہ یقین رکھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے! لات و منات و عزیٰ، خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تین عظیم بتوں کا نام تھا جنہیں اہل مکہ بہت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اگر مسلمان ہونے والا کوئی شخص تاجر یا سوداگر ہوتا تو ابوجہل اس کے پاس جاتا اور اسے مرعوب کرنے کی خاطر کہتا کہ آج کے بعد اس شہر میں کوئی بھی تجھ سے نہ تو کوئی چیز خریدے گا اور نہ ہی تجھے کوئی چیز فروخت کرے گا اور جو لوگ تیرے مقروض ہیں وہ تیرا ادھار ادا نہیں کریں گے۔

جب تک کوئی انسان خود تاجر نہ ہو اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس قسم کی دھمکی ایک تاجر پر کتنا اثر کرتی ہے لہٰذا کچھ تو مسلم تجارت پیشہ لوگ جو حضرت محمد ﷺ کی طرح پختہ عزم کے مالک نہ تھے اپنے آپ کو سختیوں اور مشکلات سے نمٹنے کے لئے آمادہ نہ کر سکے اور ان کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ اسی طرح کچھ دوسرے سوداگر بھی

جو اسلام کی طرف راغب ہو رہے تھے وہ ابوجہل کی دھمکی کے پیش نظر بذبذب کا شکار ہو گئے۔

اگر کسی نومسلم کا تعلق عام طبقے سے ہوتا (جنہیں عرب باشندے "الناس" کے نام سے پکارتے تھے یعنی ایسے لوگ جن کے پاس دفاع کا وسیلہ نہ ہو) تو ابوجہل انہیں اتنے تازیانے مارتا کہ وہ لوگ درد کی شدت سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

ابوجہل کی پیدا کردہ صورتحال سے اہل مکہ کے دلوں میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی اور جو لوگ مسلمان ہونا چاہتے تھے وہ قریش کے ڈر سے پیغمبر اسلام کے ساتھ ملحق ہونے سے کترانے لگے۔

مکہ کے تاجروں میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو اپنی ہستی کے فنا ہونے کا خوف کئے بغیر برملائے عام محمد ﷺ اور دین اسلام کی حمایت کرتا تھا اور وہ شخص کوئی اور نہیں تھا سوائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے!

قریش نے، آج کی اصطلاح کے بقول ان کے سارے کھاتے (Credits) بند کر دیئے اور کوئی بھی ان کی ہنڈی (Bill Of Exchange) کو ادا نہیں کرتا تھا اور جو بھی ان کا مقروض تھا اس نے اپنا قرض ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن ایسی سخت پابندیوں نے بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ ابوبکرؓ کی وفاداری میں کمی نہ آنے دی اور اس باوفا شخص نے کسی ریاء یا دکھاوے کے بغیر اپنا سب کچھ اسلام کے لئے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی تو ان کے سفر کے تمام اخراجات کو حضرت ابوبکرؓ نے ہی برداشت کیا تھا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں ابوبکرؓ اسلام کے یکتا خزانہ دار تھے۔ دوسرے خزانوں کو تو مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل ہوتی مگر اسلام کے خزانے کی کوئی آمدنی نہ تھی اور ابوبکرؓ اسلام کے تحفظ اور ترقی کے لئے سارے اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور اس قربانی کے صلے میں انہیں حتیٰ کہ ایک دینار کے حصول کی توقع بھی نہ تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے دوسرے مسلمانوں کی طرح حبشہ کی جانب ہجرت نہ کی کیونکہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ابوبکرؓ جس دن مسلمان ہوئے تو اس کے بعد انہوں نے ایک پل بھی اپنے پیغمبر ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا اور ہمیشہ ان کی حمایت اور طرفداری کرتے رہے۔ لیکن ایسا وقت بھی آگیا جب حضرت محمد ﷺ کو یہ احساس ہونے لگا کہ اگر ابوبکرؓ مکہ میں رہے تو قتل کر دیئے جائیں گے۔ لہٰذا پیغمبر اسلام ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ مکہ چھوڑ دیں اور ابوبکرؓ انتہائی غم و اندوہ اور ناچاری کے عالم میں پیغمبر اسلام ﷺ سے جدا ہوئے اور جزیرۃ العرب کے جنوب میں واقع ایک ایسے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے جسے آج ملک یمن کہا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ جماعت قریش کو لاعلمی میں رکھتے ہوئے مکہ سے نکلے اور جزیرۃ العرب کے جنوب کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیئے راستے میں وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں ایک بہت بڑا قبیلہ زندگی بسر کرتا تھا اور جس کے سربراہ کا نام "رفاعی" تھا۔

"رفاعی" نے جب یہ سنا کہ ابوبکرؓ چوری چھپے مکہ سے نکلنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ وہ انہیں پہچانتا تھا اور جانتا تھا کہ ابوبکرؓ مکہ کے مشہور و معروف تاجر ہیں۔ اسی بنا پر اس نے تعجب آمیز لہجے میں پوچھا:

"یا ابوبکرؓ! کیا تم اپنے شہر سے بھاگ نکلے ہو؟!"

ابوبکرؓ نے جواب دیا "دراصل بات یہ ہے کہ میں نے نیا دین قبول کر لیا ہے لہٰذا قریش مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اسی لئے میں اپنی جان بچانے کی خاطر مکہ سے باہر نکل آیا ہوں"۔

رفاعی نے کہا "یا ابوبکرؓ میں تجھے اپنے ساتھ لئے چلتا ہوں اور قریش سے کہوں گا کہ میں نے تجھے "حق جوار" دے دیا ہے لہٰذا وہ لوگ تجھے نقصان نہیں پہنچا سکیں گے"۔

رفاعی نے اپنے وعدے پر عمل کیا اور وہ ابوبکرؓ کو اپنے ہمراہ مکہ لے گیا اور قریش سے کہا کہ یہ شخص میری پناہ میں ہے اور میرے "حق جوار" سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لہٰذا جو

کوئی بھی اسے ایذا پہنچائے گا تو اس کا واسطہ مجھ سے ہو گا۔

"حق جوار" یا پناہ دینے کا حق بادیہ نشین عربوں کی ایک دیرینہ رسم تھی۔ اس کے مطابق اگر کوئی قبیلہ کسی شخص کی حمایت کرنا چاہتا تو کہتا کہ فلاں شخص میری پناہ میں ہے لہٰذا کوئی دوسرا فرد پناہ گزین شخص کو ایذا پہنچاتا یا قتل کرنے کی سوچتا تو اسے "حق جوار" دینے والے قبیلے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

رفاعی کا قبیلہ ایک ستیزہ کار قبیلہ تھا اور اس کے سارے افراد انتہائی بے باک، نڈر اور جنگجو تھے۔ اس قبیلے کی رہائش بھی مکہ سے زیادہ دور نہ تھی لہٰذا قریش نے یہ سوچتے ہوئے کہ قبیلہ رفاعی کی دشمنی مول نہ لی جائے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

ابوبکرؓ نے جب اپنے آپ کو اہل مکہ کی ایذا رسانی سے محفوظ پایا تو انہوں نے اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی مسجد کی بنا ڈالی اور ہر شب کو اونچی آواز اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنے لگے۔ جہاں تک علم تاریخ کا تعلق ہے تو حضرت ابوبکرؓ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے باصدائے بلند اور خوش بیانی سے قرآن کی تلاوت کی ہے۔ ان سے پہلے دیگر مسلمان قرآن ضرور پڑھتے تھے لیکن بلند آواز سے نہیں کیونکہ انہیں اسلام کے دشمنوں کا خوف تھا لیکن ابوبکرؓ رفاعی کی حمایت کے پیش نظر اور اس بنا پر بھی کہ ان کی آواز بہت دلنشین تھی اونچی آواز میں قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

وہ تمام حضرات جنہیں عربی زبان پر عبور حاصل ہے یہ جانتے ہیں کہ قرآن شعر نہیں، لیکن اس کی چند آیات موزوں ضرور ہیں خاص طور پر قرآن کی وہ مختصر آیات جو مکہ میں نازل ہوئیں۔ مثال کے طور پر سورۃ اخلاص، سورۃ احد، العلق، سورۃ تبت، سورۃ کافرون، سورۃ کوثر، قریش، الفیل، العصر، تکاثر، القارعہ، زلزلہ، التین، الم نشرح، والضحیٰ، والیل، والشمس، والبلد، الفجر، غاشیہ، الطارق، ابروج وغیرہ۔ یہ تمام سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں اور موزوں آیات پر مشتمل ہیں اور کچھ سورتوں میں وزن کے علاوہ قافیہ بھی موجود ہے۔

چونکہ مکہ میں نازل ہونے والی آیات مقفی قافیہ دار (Rhymed) تھیں لہٰذا ابوبکرؓ بھی انہیں دلنشین انداز میں پڑھتے اور جو بھی ان کے گھر کے پاس سے، گزرتا وہ چاہے اسلام کا دشمن ہی کیوں نہ ہوتا وہاں ٹھہر جاتا تھا اور کان لگا کر قرآنی آیات کو سننے لگتا تھا۔

بادیہ نشین عرب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خوبصورت اور دلنشین پیرائے میں ادا کئے گئے کلام سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ کلمان ہو آرٹ (Colman Hort) ایک یورپی دانشور کہتا ہے کہ فطرت نے بادیہ نشین عرب کو چار چیزوں سے نوازا ہے۔ پہلی اونٹ، دوسری خیمہ، تیسری تلوار اور چوتھی شعر! شعر یعنی موزوں اور مسجگی کلام جو بادیہ عرب کے لئے واجبات زندگی جیسی اہمیت رکھتا ہے اور اگر کوئی کلام مناسب پیرائے اور دلنشین انداز میں ادا کیا جائے تو بلاشبہ بادیہ عرب کو مجذوب کر سکتا ہے۔

وہ پہلا ترانہ جسے صحرائی عرب باشندوں نے ایجاد کیا "حدی" کے نام سے مشہور ہے۔ حدی کو اونٹ پر سفر کرنے والوں نے ایجاد کیا اور انہوں نے اس ترانے کی تخلیق میں اونٹوں کے قدم اٹھانے کے انداز سے الہام لیا تھا۔

جب کوئی انسان اونٹ پر بیٹھے اور صحرا میں سفر پر نکلے تو اونٹ کی موج در موج حرکت اس کے سارے بدن کو ہلا لے گی۔ اونٹ کے چلنے سے پیدا ہونے والے یکسانی ہچکولے بہت تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ایسے لوگ جنہیں اونٹ کی سواری کی عادت نہیں ہوتی بہت جلد ابکائیوں اور الٹیوں کا شکار ہو جاتے ہیں بالکل ایسے ہی جیسے کچھ لوگ سمندر میں سفر کرتے ہوئے کشتی کے اوپر نیچے ہونے کی وجہ سے سمندری علالت (Sea Sickness) یا جی متلانے کے عارضہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

بادیہ نشین عرب جب اونٹ پر بیٹھ کر سفر کو نکلتا تو شعر گنگناتا تھا۔ اونٹ کے چلنے کا یکساں انداز اس بات کا سبب بنا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی آواز کو اونٹ کے قدموں کی آہٹ پر منطبق کرے اور اس انطباق سے وہ مشہور آہنگ یا ترانہ وجود میں آیا جسے آج "حدی" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

شروع میں بادیہ نشین عرب صرف اس لئے کہ تھکن کا احساس مٹا سکیں حدی کو گاتے تھے لیکن بعد میں ان پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ جب حدی کو ترنم کے ساتھ گایا جائے تو قطار میں چلنے والے اونٹ بھی فرط مسرت سے اپنا سر اوپر اٹھا لیتے ہیں اور یوں ان میں بھی تھکن کا احساس مٹ جاتا ہے۔ لہٰذا شتربان یہ جان گئے کہ ان کا گانا خود ان پر ہی نہیں بلکہ اونٹوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور وہ بھی "حدی" سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

آج بھی چودہ سو سال پہلے کی طرح حدی کا ترانہ اونٹوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان میں نشاط پیدا کرتا ہے۔ میں (کونسٹن ویرژیل) نے خود اس بات کو آزمایا ہے اور میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آج بھی جبکہ سعودی عرب کی فضا میں ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ گونجتی ہے اور ان کے تیل کا پائپ ایک بڑے جال کی طرح سب جگہ پھیلا ہوا ہے اور وہاں کے باشندے اب امریکہ کی بنی ہوئی لمبی چوڑی اور گراں قیمت گاڑیوں میں سفر کرتے تھے تو آج بھی رات کی تاریکی میں جب اونٹوں کا قافلہ جزیرۃ العرب کے صحرا سے گزرے تو حدی کا ترانہ سننے کو ملتا ہے اور یہ رسم آج بھی ختم نہیں ہوئی۔

بہرحال..... جیسے ہی رات کی تاریکی چھانے لگتی اور مکہ کا شہر خاموشی میں ڈوب جاتا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگتے تو حضرت ابوبکرؓ اپنی دلنواز آواز میں قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے تھے۔

ایک عرب مؤرخ ابن ہشام لکھتا ہے کہ جو کوئی بھی ابوبکرؓ کے گھر کے پاس سے گزرتا تو وہاں رک جاتا اور کان لگا کر قرآنی آیات کو سننے لگتا تھا۔ کبھی کبھی لوگوں کا اژدھام اتنا بڑھ جاتا کہ آمدورفت معطل ہو جاتی تھی۔

جماعت قریش نے جب یہ صورت حال دیکھی تو مختلف تحائف کے ساتھ قبیلہ رفاعی کے سربراہ کو پیغام بھیجا کہ اب جبکہ تو نے ابوبکرؓ کو اپنی حمایت میں لے رکھا ہے تو کم از کم اس سے کہہ کہ اونچی آواز میں قرآن مت پڑھے کیونکہ لوگ اس کے گھر کے اردگرد اکٹھا ہو جاتے ہیں اور لوگوں کا جم غفیر مکہ کے امن و امان میں خلل کا باعث بنتا ہے۔

رفاعی نے قریش کے تحائف کو وصول کرنے کے بعد ابوبکرؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ اونچی آواز میں قرآن پڑھنا ترک کر دیں اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان سے "حق جوار" کی رعایت واپس لے لی جائے گی یعنی اس کے بعد ابوبکرؓ قبیلہ رفاعی کی حمایت سے محروم ہو جائیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مذکورہ قبیلے کے سربراہ کو پیغام بھجوایا کہ میں اپنے دین سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اور نہ ہی بلند آواز میں قرآن پڑھنے کے لطف سے محروم ہونا چاہتا ہوں کیونکہ میری جان انہی آیات سے وابستہ ہے جنہیں میں اونچی آواز سے پڑھتا ہوں۔ اگر تو چاہے تو اپنی حمایت مجھ سے واپس لے سکتا ہے اور میں بعد ازاں اپنے آپ کو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح اللہ کی پناہ میں دے دوں گا۔



"شعب ابی طالب میں"

ورقہ بن نوفل نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا "اے کاش میں اس وقت زندہ ہوں اور تمہاری مدد کرسکوں جب قبیلے والے تمہارے دشمن ہو جائیں اور تمہیں جلاوطنی پر مجبور کردیں"۔

ورقہ بن نوفل نے یہ بات سن ۶۱۰ء میں کہی تھی اور اس کی پیش گوئی نے ۶۱۶ء میں حقیقت کا روپ دھار لیا لیکن اس وقت ورقہ بن نوفل زندہ نہ تھا جو اپنے کہے پر عمل کر سکتا۔

دراصل آج تک ایسے تمام افراد کا انجام' جو انسانیت اور معاشرے کی اصلاح اور فلاح کے لئے کوئی نئی چیز پیش کرتے ہیں یہی ہوتا رہا ہے کہ وہ یا تو جلاوطن کردیئے جائیں یا گوشہ ء زندان میں پڑے رہیں یا قتل کردیئے جائیں یا پھر زندہ آگ میں ڈال دیئے جائیں! کیونکہ جو شخص اپنے معاشرے کو سدھارنے اور اس میں اصلاحی تبدیلیاں لانے کے لئے

کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سالہ پرانی رسومات پر خط بطلان کھینچ دیتا ہے بلکہ ایسے لوگوں کے منافع اور اجارہ داری کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے جن کی گزر اوقات ہی فرسودہ رسومات اور بے ہودہ عقائد پر ہوتی ہے لہٰذا ایسے لوگ اپنی بقا کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے ضد اور مخالفت پر کمر باندھ لیتے ہیں اور جہاں تک بن سکے یہی کوشش کرتے ہیں کہ اصلاحی تبدیلیاں لانے والا شخص پیش رفت حاصل نہ کر سکے۔

جماعت قریش نے بھی جب یہ دیکھا کہ حبشہ کا بادشاہ مکہ سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو واپس کرنے پر آمادہ نہیں اور دوسری طرف مکہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے تو انہوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ حضرت محمد ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کو شہر بدر کر کے مکہ میں اسلام کی جڑیں ہی اکھاڑ پھینکیں! اسی منصوبے کے تحت انہوں نے خانہ کعبہ کی دیوار پر ایک "صحیفہ" لٹکا دیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ماننے والوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے اور آج کے بعد ان لوگوں کو مکہ میں رہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

"صحیفہ" دراصل ایسی عبارت کا نام ہے جسے ہم اپنی زبان میں "فرمان" "حکم" یا "اعلان" کا نام دیتے ہیں۔ مذکور صحیفہ کے ذریعے درج ذیل احکامات جاری کئے گئے تھے۔

۱۔ مکہ کے کسی شہری کو یہ اجازت نہیں کہ وہ کسی مسلمان (خواہ عورت یا مرد) سے گفتگو کرے۔

۲۔ مکہ کے کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی مسلمان کے بدن کو چھوئے (یعنی اس سے مصافحہ کرے) اور اگر ایسا کرے تو وہ پلید ہو جائے گا۔

۳۔ اہل مکہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مسلمان کو کوئی چیز فروخت کریں یا اس سے کوئی چیز خریدیں۔

۴۔ مکہ کے رہنے والے نہ تو مسلمانوں سے لڑکی لیں اور نہ ہی انہیں لڑکی دیں۔

۵۔ جو کوئی بھی مسلمان کا مقروض ہے تو وہ اپنا قرض ادا کرنے سے اجتناب کرے۔
٦۔ اور یہ احکامات اس وقت تک باقی ہیں کہ جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دین سے "توبہ" نہ کرلیں یا بنو ہاشم اس کی حمایت سے دستبردار نہ ہو جائیں۔

٦١٦ء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے تمام مسلمانوں کو مکہ سے نکال دیا گیا لیکن اس موقع پر بھی بنوہاشم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت ترک نہ کی اور وہ بھی دوسرے مسلمانوں کے ہمراہ مکہ سے باہر نکل آئے۔ جبکہ ان میں سے کچھ منجملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت ابوطالب کی غیرت اور حمیت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو بے یارومددگار چھوڑ دیں حالانکہ انہوں نے دین اسلام کو قبول نہیں کیا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلے کے افراد میں صرف "ابی لہب" ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنے قبیلے کا ساتھ نہ دیا جبکہ بقیہ افراد "عصبیہ" یعنی قبائلی تعصب اور خاندانی وفاداری کی بنا پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مکہ سے باہر نکل آئے اور شعب نامی گھاٹی میں جو کہ ابی طالب کی ملکیت تھی، قیام پذیر ہو گئے۔

اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ "شعب" کیا ہے تو ہمیں قدرے وضاحت کی ضرورت ہو گی۔

"شعب" کے لغوی معنی اس شگاف کے ہیں جو کسی پتھر میں ایجاد ہوا ہو تاہم مجازی طور پر ایسے درے یا گھاٹی کو "شعب" کے نام سے پکارا جاتا ہے جو قدرتی طور پر کسی پہاڑ میں ایجاد ہو گئی ہو۔

قریش کے دس قبیلوں میں سے ہر قبیلہ مکہ کے گردونواح میں پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں اپنے لئے ایک مخصوص "شعب" کا مالک ہوتا تھا۔ جب کوئی اجنبی شخص قریش کے کسی قبیلے سے پناہ مانگتا تو وہ قبیلہ اسے پناہ ضرور دیتا لیکن اس کے ٹھہرنے کا بندوبست اپنی مخصوص شعب یا گھاٹی میں ہی کرتا تھا۔ بادیہ نشین عربوں میں یہ رسم نہیں تھی کہ کسی پناہ گزین شخص کو اپنے قبیلے کا فرد تصور کریں لہٰذا ایک اجنبی کسی طور بھی قبیلے کا عضو نہیں

بن سکتا تھا اور اسی بنا پر اسے پناہ دینے والے قبیلے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حق نہیں پہنچتا تھا۔

صحرائی طرز زندگی کے مطابق ایک قبیلے کے خیمے کچھ اس انداز میں نصب ہوتے تھے کہ اگر کوئی شخص کسی اونچی جگہ سے قبیلے کے رہائشی علاقے کا مشاہدہ کرتا تو پہلی نظر میں یہ جان لیتا تھا کہ قبیلے کے سربراہ اور اس کے اقربا کے خیمے کون سے ہیں۔ قبیلے کے سربراہ کا خیمہ ہمیشہ درمیان میں ہوتا اور اس کے دائیں بائیں اس کی نرینہ اولاد کے خیمے ہوتے تھے۔ اس کے بعد رئیس قبیلہ کے بھائیوں' لڑکیوں اور دامادوں کے خیمے نصب ہوتے تھے۔ اگر کوئی رشتے کے لحاظ سے قبیلے کے سربراہ سے دور ہوتا تو اس کا خیمہ بھی اسی نسبت سے سربراہ کے خیمے سے دور نصب ہوتا تھا۔

بہرحال شعب ابی طالب ایک ایسی پناہ گاہ تھی جسے اجنبیوں اور درماندہ لوگوں کو پناہ دینے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا نہ کہ خود ابی طالب وہاں قیام کریں یا ان کے قبیلے کے دوسرے افراد وہاں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ شعب ابی طالب صرف ایک چھوٹی سی پناہ گاہ تھی جہاں اتنے لوگوں کے ٹھہرنے کی گنجائش بھی نہ تھی اور نہ ہی گردونواح میں کوئی اور جگہ دیکھنے کو ملتی تھی کہ جہاں سکونت اختیار کی جا سکے بلکہ چاروں طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے یا درے ہی درے۔

کچھ عرب شاعروں نے اپنے اشعار میں مکہ کے اردگرد پھیلی ہوئی اراضی کا وصف بیان کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکہ کی سرزمین کی حالت چند سال پہلے تک (یعنی جب تیل کی درآمد سے' جزیرۃ العرب کی اقتصادی صورتحال میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی) کیا تھی؟ پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں مکہ کی اراضی اور اس کے نواح میں پھیلے ہوئے ٹیلوں پر حتیٰ کہ ایک درخت تو کیا سوکھی گھاس بھی دیکھنے کو نہیں ملتی تھی ماسوائے بڑے بڑے پتھروں کے جو دن کے وقت سورج کی تمازت سے یوں دہکتے تھے گویا ساری کائنات ایک بہت بڑے تنور میں بدل گئی ہو۔ اس علاقے میں سال بھر میں ایک پرندہ بھی پر نہیں

مارتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پرندے وہاں بسیرا کرتے ہیں جہاں درخت ہوں اور سبزہ پایا جائے۔ حتیٰ کہ اب جبکہ مکہ میں پانی کی فراہمی بہت بہتر ہے اور شہر کے مختلف حصوں میں سرسبز درخت اور چمن زار دیکھنے کو ملتے ہیں تو آج بھی اگر آپ شہر سے کچھ دور نکل جائیں تو آپ کو انہی سنگلاخ چٹانوں اور برہنہ ٹیلوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں موجود تھے۔

حضرت محمد ﷺ اور دوسرے مسلمان جب شعب ابی طالب میں پہنچے تو چونکہ مکہ سے ان کی روانگی انتہائی عجلت میں ہوئی تھی لہٰذا وہ لوگ مناسب مقدار میں اشیائے خورد و نوش اپنے ہمراہ نہ لا سکے اور اگر ایسا کر بھی سکتے تو بھی کھانے پینے کی چیزیں زیادہ دیر تک ان کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ مزید برآں قریش کے جاری کردہ فرمان میں یہ پابندی بھی عائد تھی کہ کوئی بھی شخص مسلمانوں کو نہ تو کوئی چیز فروخت کرے اور نہ ہی ان سے کوئی چیز خریدے لہٰذا مسلمان اہل مکہ سے اشیائے ضرورت خرید بھی نہیں سکتے تھے۔ دوسری طرف شعب ابی طالب بھی ایسے مقام پر واقع تھی جہاں سے کوئی قافلہ نہیں گزرا تھا کہ مسلمان اہل کاروان سے کھانے پینے کی چیزیں خرید سکیں۔

مسلمانوں نے اپنے پیغمبرؐ کے ہمراہ شعب ابی طالب میں انتہائی دردناک شکنجوں اور بھیانک مصیبتوں کا مقابلہ کیا اور صرف ایک چیز جو اس بات کا سبب بنی کہ وہ بھوک کی شدت سے ہلاک نہ ہوں یہ تھی کہ سال کے چار مہینوں میں جنہیں "ماہ حرام" کہتے تھے مسلمان شہر میں آتے اور اشیائے خورد و نوش فراہم کر سکتے تھے۔ وہ لوگ حتیٰ کہ قربانی کی کھالیں بھی اپنے ہمراہ لے جاتے تاکہ سال کے دوسرے مہینوں میں جب کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو جائیں تو انہیں ابال کر اپنا پیٹ بھر سکیں۔

انہی دنوں جب مسلمان شعب ابی طالب میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو ایک دن حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا اپنی پھوپھو کے لئے کچھ اشیائے ضرورت لے کر باہر نکلا کیونکہ حضرت خدیجہؓ بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ اسی گھاٹی میں قیام پذیر تھیں۔

قریش کے افراد نے جو اس بات کی نگرانی کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو کسی طور اشیائے خورد و نوش فراہم نہ ہو سکے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے کو مکہ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے اس کا تعاقب کیا اور پھر سارا سامان ضبط کرنے کے علاوہ اسے اتنا زدو کوب کیا کہ وہ بے چارہ تین دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔

کچھ اسلامی تذکرہ نویسوں نے حضرت محمد ﷺ کے احترام میں ان تین سالوں کی تاریخ کو جبکہ حضرت محمد ﷺ اپنی زوجہ اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شعب ابی طالب میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے، ناگفتہ رہنے دیا ہے یا کم از کم اس کی تفصیل بیان نہیں کی اور انہوں نے اپنے تئیں یہ تصور کیا ہے کہ اگر وہ یہ لکھ دیں کہ محمد ﷺ اور ان کے ہمراہیوں نے شعب ابی طالب میں شدید بھوک اور بے چارگی کا سامنا کیا تھا تو شاید یہ بات پیغمبر اسلام ﷺ کی شان کے خلاف ہو حالانکہ میرے (کونسٹن ویرژیل کے) خیال میں یہ واقعہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت کو دوبالا اور ان کے کردار کی عظمت کو نمایاں کرتا ہے کیونکہ ان تین سالوں میں مکہ کے کچھ بزرگوں نے مصالحت کی کوشش کی تھی اور قریش سے کہا تھا کہ وہ اجازت دیں کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی واپس چلے آئیں لیکن قریش کے بزرگوں نے جواب دیا تھا کہ "اگر محمد (ﷺ) اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں تو مکہ واپس آ سکتے ہیں اور ہمیں بھی اس سے کوئی سروکار نہیں..... لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو پھر وہیں پر اپنی موت کا انتظار کریں ہم انہیں مکہ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے"۔

پیغمبر اسلام ﷺ اگر ایک "ضعیف العزم" انسان ہوتے تو وہ ان مصائب سے گھبرا کر اپنے دین سے چشم پوشی کر لیتے یا کم از کم عارضی طور پر دکھاوے کے لئے ہی سہی اپنے دین کی تبلیغ ملتوی کر دیتے تاکہ جب قریش کا غصہ فروکش ہو جاتا اور ان کے غضب کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی تو مناسب موقع ملنے پر اپنے دین کی نئے سرے سے تبلیغ شروع کر دیتے لیکن چونکہ وہ مضبوط ارادے اور آہنی عزم کے مالک تھے اور انہیں پختہ یقین تھا کہ

وہ اللہ کے رسول ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے دین کو نہ چھوڑا اور اپنی رسالت کی حتیٰ کہ عارضی یا ظاہری طور پر بھی نفی نہیں کی..... انہوں نے ایسا نہ کیا اور عرصہ تین سال تک پہاڑ کے شگاف میں گرسنگی اور تشنگی سے نبھاتے رہے حتیٰ کہ چمڑا اور کھالیں ابال ابال کر گزر اوقات کر لی لیکن اپنی رسالت سے انکار نہیں کیا۔ شعب ابی طالب میں حضرت محمد ﷺ کا تین سالہ قیام ایک کڑی آزمائش تھی جس میں بحسن و خوبی پورے اترے اور بھوک و رنج و الم ان کے عزم و ارادے کو متزلزل نہ کر سکے۔

شعب ابی طالب میں مسلمانوں کے پاس کوئی "اثاث بیت" یعنی گھریلو سامان نہیں تھا اور مکہ کی سب سے زیادہ مالدار خاتون حضرت خدیجہؓ کے پاس صرف ایک ہانڈی اور مٹی کا پیالہ رہ گیا تھا اور ایک دن وہ پیالہ بھی ٹوٹ گیا۔ کچھ دنوں بعد جب برتن جوڑنے والا وہاں سے گزرا تو حضرت خدیجہؓ نے ٹوٹا ہوا پیالہ اس کے حوالے کیا تاکہ وہ اسے جوڑ لگا دے۔

میرے خیال میں شعب ابی طالب میں پیغمبر اسلام ﷺ کا تین سالہ قیام اس بات کا سبب بنا کہ بعد ازاں پیش آنے والے واقعات کے لئے ان کا عزم راسخ ہو جائے اور یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ یہ جلا وطنی پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے ایک "مکتب" کی شکل اختیار کر گئی جہاں انہوں نے اپنی قوت ارادی کو پختہ کیا اور یہ جان لیا کہ مستقبل میں پیش آنے والی مشکلات کا کیونکر مقابلہ کیا جائے۔

شعب ابی طالب میں مسلسل رنج اور دائمی بھوک کے علاوہ ایک اور حادثہ بھی رونما ہوا اور وہ یہ تھا کہ پیغمبر ﷺ کی زوجہ حضرت خدیجہؓ عسرت اور تنگ دستی کے باعث بیمار ہو گئیں اور چونکہ علاج معالجہ کے لئے ضروری دوا اور مناسب غذا موجود نہ تھی لہٰذا پیغمبرؐ کی زوجہ نے سن ۶۱۹ عیسوی میں' جسے مسلمانوں نے "عام الحزن" کا نام دیا ہے' اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

جب حضرت خدیجہؓ نے زندگی کو خیرباد کہا تو ان کی عمر ۶۵ برس تھی اور حضرت محمد

ﷺ کی زندگی کے پچاس سال گزر چکے تھے۔ حضرت محمد ﷺ اپنی زوجہ کی وفات پر مسلسل دو (۲) دن تک آنسو بہاتے رہے اور اس کے بعد زندگی کے آخری دن تک جب بھی انہیں حضرت خدیجہؓ کی یاد آتی تو ان کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں، دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی مرد، ایک ایسی عورت کو جو اس سے عمر میں پندرہ سال بڑی ہو، اس قدر چاہے کہ زندگی کی آخری سانس تک اسے فراموش نہ کر سکے! اگرچہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کی عمروں میں واضح اختلاف موجود تھا لیکن ازدواجی زندگی کی ابتدا سے انتہا تک ان دونوں کے مابین کوئی اختلاف پیش نہ آیا اور عرصہ پچّیس سال تک حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ ایک سچے محبوب کی طرح ایک دوسرے کا سہارا بنے رہے۔

جب حضرت خدیجہؓ نے شعب ابی طالب میں زندگی کو الوداع کہا تو حضرت محمد ﷺ یا دیگر مسلمانوں کے پاس ایک کفن بھی نہ تھا لہٰذا حضرت خدیجہؓ کو "صوقعہ" میں لپیٹ کر سپردِ خاک کر دیا گیا۔

"صوقعہ" دراصل ایسی لمبی چادر کو کہتے تھے جسے عرب خواتین اپنا سر ڈھانپنے کے لئے استعمال کرتی تھیں اور اس طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی زوجہ کو ان کی اپنی چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیا گیا۔

حضرت خدیجہؓ ایک سچی اور بے لوث مسلمان تھیں اور ایسے وقت میں جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ہاتھ بالکل خالی تھے تو ان کی مالی امداد و اعانت نے اسلام کی ترقی اور پیش روی میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ حضرت خدیجہؓ اسلام کے ابتدائی دور میں پیغمبر اسلامؐ کی یگانہ غمگسار اور رفیقہ جانثار تھیں جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کا قدم بہ قدم ساتھ دیا اور ان ایام میں جب حضرت محمد ﷺ پتھروں سے مجروح ہو کر گھر لوٹتے تھے تو یہ حضرت خدیجہؓ ہی تھیں جو ان کے زخموں کو دھوتیں، مداوا کرتیں، ان کے کپڑے تبدیل کرواتیں اور ان کا دکھ بانٹتی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے دو دن بعد مسلمانوں کو دوسرا صدمہ پہنچا اور پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا "ابی طالبؓ" چھیاسی سال کی عمر میں دار فانی کو وداع کر گئے۔ وہ بھی حضرت خدیجہؓ کی طرح بھوک و ناداری اور ضعف و بیماری کے باعث موت کی آغوش میں چلے گئے۔

یہ واضح رہے کہ حضرت ابوطالبؓ مسلمان نہ ہوئے اور انہوں نے آخری دن تک اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑنے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ جب ابی لہب کو یہ خبر ملی کہ اس کا بھائی قریب المرگ ہے تو وہ شعب ابی طالب پہنچا اور اپنے بھائی کے سرہانے کھڑا ہو کر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا "اے برادر قسم کھا کہ تو نے محمد (ﷺ) کے دین کو تسلیم نہیں کیا اور تو اپنے بزرگوں کے دین پر کاربند رہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے"۔

ابی طالبؓ نے نزاع کے عالم میں یہ سوگند کھائی کہ میں نے محمد (ﷺ) کے دین کو نہیں مانا اور اپنے اجداد کے مسلک پر قائم رہتے ہوئے اس دنیا کو چھوڑ رہا ہوں۔

اگر حضرت خدیجہؓ اور ابی طالبؓ پیغمبر اسلام ﷺ کے ہمراہ شعب ابی طالب میں نہ جاتے اور وہاں بھوک و پیاس کا رنج اور فقر و تنگ دستی کے صدمے برداشت نہ کرتے تو ممکن تھا کچھ اور دن زندہ رہ سکیں۔

حضرت محمد ﷺ کی راہ میں حضرت خدیجہؓ کا ایثار اور جانثاری اتنی تعجب آور نہیں کیونکہ حضرت محمد ﷺ ان کے شوہر بھی تھے اور پیغمبر بھی لیکن اپنے بھتیجے کی راہ میں ابی طالبؓ کی قربانیاں بڑی تعجب آور اور قابل تحسین ہیں کیونکہ اسلام پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی حضرت محمد ﷺ کو نبی مانتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے بھتیجے کی راہ میں جان قربان کر دی تاکہ اپنے "عصبیہ" کے فرض کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

"عصبیہ" یعنی "قبائلی تعصب" بادیہ نشین عربوں میں اتنا قوی تھا کہ حضرت ابوطالب

جیسا قبیلے کا سربراہ ایک ایسے شخص کی راہ میں، جس کی نبوت کو وہ مانتا بھی نہ تھا، اپنی آرام دہ اور پر سکون زندگی کو خیرباد کہہ دے اور کہن سالی کے باوجود صرف اس لئے پہاڑ کی گھاٹی میں مقید ہونا گوارا کر لے کہ اس کے خاندان کا کوئی فرد بے پناہ یا بے یارومددگار نہ رہ جائے۔ حضرت ابوطالبؓ کی وفات کے بعد قبیلہ بنو ہاشم کے ارکان ناچار ہو گئے کہ اپنے لئے ایک نیا سربراہ انتخاب کریں اور اس زمانے کے دستور کے مطابق حضرت ابوطالب کے بھائی "ابی لہب" کو قبیلے کی سرداری سونپ دی گئی اور "ابی لہب" وہ شخص تھا جو مکہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔

اتفاق سے انہی دنوں اہل مکہ نے یہ دیکھا کہ خانہ کعبہ میں لٹکے ہوئے فرمان کو دیمک نے چاٹ لیا ہے اور صرف یہ عبارت باقی رہ گئی ہے۔ "ساتھ تیرے نام کے' اے اس گھر کے مالک۔"

"اس گھر" سے مراد خانہ کعبہ ہے اور گھر کا مالک یعنی وہ اللہ جس کے نام سے قریش اپنے احکامات جاری کرتے تھے۔

"دیمک" گرم علاقوں منجملہ جزیرۃ العرب میں بکثرت پائی جاتی ہے اور کاغذ و لکڑی کھانے کا اسے بہت شوق ہے۔ اگر کوئی آج بھی مکہ میں کسی کتاب کو ایک جگہ رکھ دے اور اس کی جگہ تبدیل نہ کرے تو جب کچھ عرصہ بعد کتاب کو اٹھایا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کی صرف جلد ہی باقی رہ گئی ہے اور دیمک نے کتاب کے سارے صفحات کا صفایا کر دیا ہے۔

قریش نے جب یہ دیکھا کہ دیمک نے حضرت محمد ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کے شہربدر ہونے کے فرمان کو چاٹ لیا ہے اور صرف "خدا" کا نام باقی رہنے دیا ہے تو ان پر انجانا خوف طاری ہو گیا۔ اتفاق سے یہ واقعہ ٹھیک ایسے وقت پر پیش آیا کہ جب ابی طالبؓ انتقال کر چکے تھے اور ابی لہب نے بنو ہاشم کی سربراہی کا عہدہ سنبھالا تھا۔

جیسے ہی ابی لہب قبیلے کا سربراہ بنا تو چونکہ وہ بنو ہاشم میں اعلیٰ مقام پر فائز ہو چکا تھا

لہٰذا اس نے احساس برتری کے باعث یہ سوچا کہ محمد ﷺ کے بارے میں اپنی رائے میں تجدید نظر کرے تاکہ اپنے قبیلے اور خاندان کے مقابلے میں اپنی "ذمہ داریوں" سے عہدہ برآ ہو سکے۔ قریش مکہ بھی مذکورہ فرمان کے دیمک کی طرف سے کھائے جانے اور صرف "خدا" کا نام باقی رہ جانے کی بنا پر تشویش اور خوف میں مبتلا تھے لہٰذا جب "ابی لہب" نے یہ تجویز پیش کی کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو شعب ابی طالب سے مکہ واپس آنے کی اجازت دے دی جائے تو انہوں نے بلاتاخیر اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور یوں مسلمانوں نے تین سال کے بعد اپنے آبائی شہر مکہ میں قدم رکھا۔

واضح رہے کہ اس عرصہ میں مسلمانوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور خاص طور پر کاروباری لوگوں کی تو کمر ہی ٹوٹ گئی اور حضرت ابوبکرؓ جیسے شخص کے لئے، جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کی دولت قارون کے برابر ہے، صرف پانچ ہزار درہم باقی رہ گئے تھے۔

جب مسلمان شعب ابی طالب سے واپس لوٹے تو لامنقطع بھوک اور پیاس کے باعث بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے ہڈیوں کے ڈھانچے بن چکے تھے اور ان کے بدن کی کھال سورج کی تمازت سے بری طرح جھلس چکی تھی۔

جب ابی لہب سے یہ پوچھا گیا کہ محمد ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ہونے کے باوجود تو نے مسلمانوں کو شعب سے واپس آنے کی اجازت کیونکر دی تو ابی لہب نے جواب دیا "میں چونکہ اب بنو ہاشم کا سربراہ ہوں لہٰذا یہ میری ذمہ داری بنتی ہے کہ اپنے قبیلے کی، جس میں محمد (ﷺ) بھی شامل ہے، حمایت کروں لیکن میں اس کے دین کا سخت مخالف ہوں اور میری حمایت صرف اس وقت تک باقی رہے گی کہ جب تک محمد (ﷺ) قبیلے کے قوانین کا احترام کرے اور جب بھی اس نے ایسا نہ کیا تو میں اسے قبیلے سے باہر نکال دوں گا کیونکہ میں ابی طالب نہیں جو اس کی حمایت میں پہاڑ کی گھاٹی کا رخ اختیار کر لوں"۔

لیکن ابی لہب جو اسلام کی مخالفت سے باز نہیں رہ سکتا تھا ایک ایسے بہانے کی تلاش میں رہنے لگا کہ جس کی بنا پر وہ پیغمبر اسلام ﷺ کو قبیلہ بدر کر سکے اور جلد ہی اس نے

وہ بہانہ ڈھونڈ نکالا جس کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کی معنوی زندگی میں بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

ہوا یوں کہ ایک دن ابی الہب نے بنو ہاشم کے تمام افراد کو ایک ضیافت میں شرکت کی دعوت دی اور حضرت محمد ﷺ کو بھی مدعو کیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ابی لہب نے حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں چاہتا ہوں کہ بنو ہاشم کے تمام افراد کے سامنے تجھ سے تیرے جد عبدالمطلب کے بارے میں سوال کروں اور پوچھوں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ مشرکین جہنم میں جائیں گے تو تمہارے خیال میں عبدالمطلب جنت میں ہیں یا جہنم میں؟"

پیغمبر اسلام ﷺ نے ابی لہب کے جواب میں قرآن کی یہ آیت تلاوت کی جو آج سورہ توبہ کی ۱۱۳ ویں آیت ہے۔ ماکان للنبی منو ان یستغفر واللمشرکین....الی اخر

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر اور وہ لوگ جو ایمان لائے (یعنی مسلمان ہوئے) اللہ سے مشرکوں کے لئے مغفرت طلب نہ کریں چاہے وہ لوگ ان کے اقرباء میں سے ہوں۔

سارے علمائے اسلام متفق القول ہیں کہ اس آیت کے مطابق اگر کسی مسلمان کو یہ علم ہو کہ اس کا نزدیک ترین رشتہ دار مشرک ہے اور جہنم میں ہے تو اسے اس کے لئے بخشش طلب نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ایک مشرک جہنم ہی کی آگ میں جلنے کا مستحق ہے۔

اس کے بعد ابی لہب نے ابی طالبؑ کے بارے میں پوچھا اور کہا آیا میرا بھائی ابی طالب بخش دیا گیا ہے یا نہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا کہ ابی طالب جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو مسلمان نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے اجداد کے دین کو نہیں چھوڑا تھا لہٰذا ان کا معاملہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

پھر ابی لہب نے کچھ اور بزرگوں کا جو حضرت محمد ﷺ کے اجداد بھی تھے، نام لیا

اور پوچھا کہ آیا یہ لوگ بخش دیئے گئے ہیں یا نہیں؟ جواب میں پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک بار پر قرآنی آیت تلاوت کی اور کہا کہ اللہ کا حکم قطعی ہے اور اس میں تغیرو تبدل یا رعایت و مراعات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ سن کر حاضرین پر سناٹا چھا گیا اور کچھ دیر کے لئے کوئی کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ سب لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کی باتیں سن کر متحیرو مبہوت رہ گئے تھے۔

دراصل عربوں میں اجداد کی شروع ہی سے بہت اہمیت تھی۔ عرب قبائل میں آباد اجداد نہ صرف احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے بلکہ ان کے قوانین اور رسومات کا منشا بھی ان کے گزشتگان ہی ہوتے تھے۔ لہٰذا ہر گاہ جب کوئی ایسی مشکل پیش آتی جسے بادیہ نشین حل کرنے سے قاصر رہتے تو اپنے گزشتہ اجداد کی روش اور طریقہ کار کا مطالعہ کرتے کہ ایسے مشابہ مواقع پر وہ لوگ کیا قدم اٹھاتے تھے۔ چنانچہ ان کے گزشتہ اجداد کو تنقید کا نشانہ بنانا نہ صرف ان کی توہین بلکہ قبیلے کے تمام قوانین اور مروجہ رسومات سے بغاوت کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت تک اگرچہ حضرت محمد ﷺ اپنے دین کی منادی کرتے تھے اور اہل مکہ کو قبول اسلام کی دعوت دیتے تھے لیکن انہوں نے اتنی صراحت اور بے باکی سے گزشتہ اجداد پر تنقید نہیں کی تھی لیکن اس دن ابی لہب کی محفل میں انہوں نے قریش کے تمام اجداد کے عقائد کو باطل قرار دے دیا اور ان کی دیرینہ رسومات کی نفی کر دی۔

حضرت محمد ﷺ ایک حقیقت گو انسان تھے اور حق کی بات کہتے ہوئے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اگر وہ ظاہری مصلحت اور موقع پرستی سے کام لے سکتے تو اتنے رنج و مصائب اٹھانے سے محفوظ رہ سکتے تھے لیکن انہوں نے کسی خوف کے بغیر اپنے نظریات کر دیا اور اس بات کی قطعاً" پروانہ کی کہ قریش کا رد عمل کیا ہو گا۔

جب پیغمبر اسلام ﷺ نے ابی لہب کی محفل میں بنو ہاشم کے تمام سرکردہ لوگوں کے سامنے ان کے اجداد کو ملامت کا نشانہ بنایا تو قبیلے کے سربراہ ابی لہب نے وہاں موجود

لوگوں سے پوچھا کہ آیا مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ محمد (ﷺ) کو قبیلہ بنی ہاشم سے باہر نکال دوں؟ سب لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ قبیلے کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ محمد (ﷺ) کو قبیلہ بدر کر دے کیونکہ ہمارے خیال میں اس کا "جرم" ایسا نہیں جسے بخشا جا سکے! ابی لہب نے بھی اسی وقت اعلان کر دیا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو اپنے قبیلے سے نکال دیا ہے اور آج کے بعد ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس اعلان کے بعد مجلس ختم ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

پہلی مرتبہ جب حضرت محمد ﷺ "قبیلہ بدر" ہوئے تو قبیلہ قریش نے انہیں ترک کیا تھا اور جیسا کہ خاندان بنی ہاشم نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور حتیٰ کہ خاندان کے سربراہ ابی طالبؓ اپنے بھتیجے کی حمایت میں خود بھی مکہ چھوڑ کر پہاڑ کی گھاٹی میں محبوس ہو گئے اور انہوں نے وہیں پر کسمپرسی کے عالم میں اجل کو لبیک کہا تھا لیکن اس بار خود بنی ہاشم یعنی حضرت محمد ﷺ کے اپنے خاندان نے انہیں ترک کر دیا اور کہا کہ ہمارے خاندان میں محمد (ﷺ) ایسے شخص کی کوئی گنجائش نہیں!

جس گھڑی بنی ہاشم کے سربراہ نے یہ فیصلہ دیا کہ محمد ﷺ کو قبیلے سے نکال دیا جائے تو اسی لمحہ سے پیغمبر اسلام ﷺ ایک ایسے شخص میں تبدیل ہو گئے کہ برسوں بعد جس کے بارے میں فرانس کے انقلابیوں نے "قانون کے احاطے سے باہر" کی اصطلاح ایجاد کی تھی یعنی ایسا شخص جو قانون کی حمایت سے محروم کر دیا جائے لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کی صورتحال ان لوگوں سے بھی زیادہ ابتر اور دردناک تھی جنہیں انقلاب فرانس کے دوران "قانون کے احاطے سے باہر" تصور کیا جاتا تھا کیونکہ فرانس میں اگر کوئی ایسے راندہ شدہ فرد کو قتل کرتا تو سزا کا مستحق قرار پاتا تھا اور صرف انقلابی عدالتیں ہی راندہ شدہ افراد کے سلسلے میں کوئی حکم نافذ کر سکتی تھیں لیکن مکہ میں راندہ شدہ شخص کا خون مباح تھا اور جو کوئی بھی چاہتا اسے قتل کر سکتا تھا، پکڑ کر فروخت کر سکتا تھا یا غلام بنا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر راندے ہوئے فرد کو زندہ آگ میں ڈالا جاتا تو بھی پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہ ہوتا اور نہ

ہی مجرم کو سزا یا انتقام کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ جزیرۃ العرب میں جب کسی کو قبیلے سے نکال دیا جاتا تو اس کی حیثیت اتنی ناچیز ہو جاتی تھی کہ اسے قبائلی جرگہ میں انصاف کی درخواست کرنے کا حق بھی نہیں پہنچتا تھا۔ جزیرۃ العرب میں قبیلے سے خارج ہونے والا شخص تمام سماجی و معاشی حقوق سے محروم ہو جاتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اس سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جاتا تھا۔

ابی لہب نے حضرت محمد ﷺ کو قبیلے سے نکال کر انہیں یکدم ذی حیات کے زمرے سے خارج کر دیا اور مکہ کے خشک و سوزاں بیابانوں کے حوالے کر دیا۔

اس بار حضرت محمد ﷺ اکیلے رہ گئے..... بالکل اکیلے!

ماضی میں پیغمبر اسلام ﷺ جب بھی جسمانی یا روحانی تائم کا شکار ہوتے تو ان کی زوجہ حضرت خدیجہؓ ان کے زخموں کی مداوا کرتیں اور اپنے آرام بخش کلام سے ان کی روح کو تسکین پہنچاتی تھیں یا ان کے چچا ابی طالبؓ انہیں حوصلہ و دلداری دیتے تھے لیکن اب خدیجہؓ تھیں نہ ابی طالبؓ!

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا تو اپنے اللہ سے استعانت طلب کی اور اس بار اللہ نے انہیں نہ صرف اپنی محبت اور شفقت سے نوازا بلکہ انہیں اپنے پاس بھی بلا لیا یعنی پیغمبر اسلام ﷺ نے زمین سے آسمانوں کا سفر کیا اور اس سفر کو مسلمان ''معراج'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔



علمی نقطہ نظر سے معراج کی وضاحت

(قارئین محترم توجہ فرمائیں گے کہ رسول اللہ ﷺ کے آسمانی سفر یعنی "معراج" کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں قرآنی آیات سب سے مستند اور معتبر ہیں تاہم معراج النبیؐ کی کیفیت کے بارے میں خود علمائے اسلام کے نظریات میں اختلاف موجود ہے یعنی معراج کی حقیقت پر تو سب کو پختہ یقین ہے لیکن معراج کس انداز میں انجام پذیر ہوئی اس بارے میں دو مختلف نظریات موجود ہیں۔ اس کتاب کے مصنف نے جو ایک غیر مسلم دانشمند ہے' معراج کے بارے میں اسلامی کتب سے معلومات فراہم کی ہیں تاہم اس نے معراج کی حقیقت پر علمی نقطہ نظر سے جو روشنی ڈالی ہے وہ ہر اہل علم کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گی۔ جب قارئین کرام اس حصے کا غور سے مطالعہ فرمائیں گے تو مجھ حقیر کی گزارشات کو تسلیم کریں گے خاص طور پر اس بنا پر کہ مغربی مصنفوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں آج تک جو لکھا ہے وہ عموماً" مسلمانوں

کے جذبات کو مجروح کرنے کا سبب بنا ہے لیکن "کونسٹن ویرژیل" (اس کتاب کا مصنف) غالباً" وہ پہلا مغربی دانشور ہے جس نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس باب کے آخری جملے میری بات کی تائید کردیں گے۔ خلیل)

اس سے پہلے کہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی معراج کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں، یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کے نظریات کا خلاصہ پیش کروں۔

واقعہ معراج کو بیان کرنے کے لئے میں نے درج ذیل اسلامی مصنفوں کی کتابوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔

ابن ہشام، بخاریؒ، حمید اللہ، سہیلی، طبری، کتانی اور اسد بیگ۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ معراج رجب کے مہینے میں جو کہ ہجری سال کا ساتواں مہینہ ہے، وقوع پذیر ہوئی اور جس رات حضرت محمد ﷺ نے آسمانوں کا سفر کیا وہ اس مہینے کی ستائیسویں رات تھی۔

مسلمانوں کی روایات کے مطابق حضرت محمد ﷺ کا آسمانی سفر دو مرحلوں پر مشتمل تھا۔ پہلا مرحلہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ مکہ سے بیت المقدس پہنچے اور دوسرا مرحلہ بیت المقدس سے آسمانوں کی طرف سفر کرنے پر محیط تھا۔

اسلامی مؤرخین نے معراج کے واقعہ کے کچھ حصے کو خود پیغمبرؐ کی زبان کچھ یوں نقل کیا ہے۔

"میں اس رات مکہ میں سویا ہوا تھا اور ابھی مجھے عملی طور پر "قبیلہ بدر" نہیں کیا گیا تھا کہ میں نے دیکھا گھر کی چھت میں شگاف پڑ گیا اور وہاں سے جبرائیلؑ نیچے اترے۔ جبرائیلؑ نے میرا سینہ چاک کیا اور اسے زمزم کے پانی سے دھویا اور پھر ایک "ابریق" لائے جو حکمت اور دانائی سے بھری ہوئی تھی۔ جو کچھ اس ابریق میں تھا جبرائیل نے میرے سینے میں بھر دیا اور میری چھاتی سینے کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہا "اٹھو" پھر مجھے "براق"

پر بٹھادیا۔"

"براق" یعنی وہ مرکب جس پر حضرت محمد ﷺ سوار ہوئے دراصل ایک گھوڑے اور استر (خچر) کے درمیان کی سواری تھی جس کا سر ایک عورت کی شکل کا تھا اور جو بجلی کی سی تیز رفتاری سے حرکت کرتی تھی۔ جب حضرت محمد ﷺ براق پر سوار ہوئے تو وہ خواب اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ براق پر سوار جب روانہ ہوئے تو سب سے پہلے "جبرون" نامی شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں ابراہیم علیہ السلام کی قبر تھی۔ حضرت محمد ﷺ نے ان کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ براق پر سوار دوبارہ روانہ ہوئے اور اس مرتبہ "بیت اللحم" نامی جگہ پر توقف کیا۔ اس مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔ انہوں نے یہاں بھی دعا مانگی اور پھر "بیت المقدس" کی طرف روانہ ہو کر مسجد الاقصیٰ میں داخل ہو گئے۔

یہاں حضرت محمد ﷺ کے سفر کا پہلا حصہ اختتام کو پہنچا یعنی ان کا زمینی سفر ختم ہوا اور مسجد اقصیٰ سے سفر کا دوسرا مرحلہ یعنی آسمانوں کا سفر شروع ہو گیا۔

اس رات' اس سے پہلے کہ حضرت محمد ﷺ آسمانوں کی طرف روانہ ہوں انہوں نے بیت المقدس میں واقع "قبتہ الصخرۃ" یعنی پتھروں کے گنبد پر اپنے پائے مبارک کا نشان چھوڑا ایسے ہی جیسے ابراہیم علیہ السلام نے "مقام ابراہیم" پر اپنے قدموں کا نشان باقی چھوڑا تھا۔

حضرت محمد ﷺ براق پر سوار ہو کر آسمانوں کی طرف روانہ ہوئے اور پہلے آسمان پر پہنچے جو دوسرے آسمانوں کی نسبت زمین سے زیادہ نزدیک ہے۔

وہاں پیغمبر اسلام ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا اور مشاہدہ کیا کہ وہ انسانوں کے دو فریقوں کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں جو ابھی ابھی زمین سے یہاں پہنچے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ حضرت آدمؑ کے دائیں طرف کھڑے تھے' وہ بہشت میں

جانے والے تھے اور بائیں جانب کھڑے ہونے والوں کو دوزخ میں جانا تھا۔ حضرت آدمؑ جب دائیں جانب دیکھتے تو تبسم کرتے لیکن جب ان کی نگاہ بائیں طرف پڑتی تو رو دیتے تھے۔ چونکہ حضرت آدمؑ تمام انسانوں کے باپ ہیں لہٰذا ایک دلسوز باپ کی طرح اپنی اولاد کی خوش نصیبی پر انہیں خوشی ہوتی اور ان کی تیرہ بختی پر وہ رو دیتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ پہلے آسمان سے گزرے اور دوسرے آسمان پر پہنچے جہاں انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یوحنا سے ملاقات کی۔ پھر تیسرے آسمان کی طرف روانہ ہوئے اور دیکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہاں موجود ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے چوتھے آسمان پر ادریس علیہ السلام کو دیکھا۔ پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام، چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں پر جس سے اونچا کوئی آسمان نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی۔ حضرت ابراہیمؑ ساتویں آسمان پر ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا یہ فرشتوں کا گھر ہے۔ اس گھر کا نقشہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا خانہ کعبہ کا ہے۔

ساتویں آسمان کے بعد ایسا علاقہ شروع ہو گیا جو خانہ کعبہ کے گرد و نواح کی طرح "حرم" کہلاتا تھا۔ اس علاقے یعنی حرم کے آخری کنارے پر "سدرۃ المنتہیٰ" واقع تھا۔ سدرۃ المنتہیٰ درحقیقت اس درخت کا نام ہے جو کائنات کے آخری سرے پر واقع ہے۔ اس کے بعد "مجہول مطلق" (Absolutely Unknown) کی کیفیت طاری ہے۔ کوئی یہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا واقع ہے۔

اس مقام پر پیغمبر اسلام ﷺ اللہ کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ اس کے قلم کے چلنے کی آواز سن سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ انسانوں کے اعمال یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے قلم کی آواز سن رہے تھے لیکن انہیں اللہ نظر نہ آیا کیونکہ کوئی بھی اللہ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا، چاہے پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

اگرچہ حضرت محمد ﷺ ایک پیغمبر تھے پھر بھی وہ بلاواسطہ اللہ کی آواز نہیں سن

سکتے تھے اور اللہ کی آواز جبرائیلؑ کی وساطت سے ان تک پہنچ رہی تھی۔ اس مقام پر ذات باری نے حضرت جبرائیلؑ کے توسط سے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ گفتگو کی اور ان سے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ آپؐ کو آپؐ کے اہل خاندان نے ترک کر دیا ہے لیکن اے محمد (ﷺ)! آپ اپنی بردباری اور شکیبائی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور یہ جان لیں کہ آپ سے پہلے بھی کچھ پیغمبر ایسے تھے جنہوں نے بے شمار مصیبتیں جھیلیں اور ان میں سے کچھ مختلف اذیتوں کا شکار ہو کر اپنی جان تک گنوا بیٹھے۔

اس کے بعد اللہ نے پیغمبر اسلام ﷺ کی آئندہ ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو کی اور ان سے کہا: جیسا کہ موسیٰؑ نے اپنے پیروکاروں کو اکٹھا کیا اور مصر سے ہجرت کی اسی طرح آپ بھی اپنی امت کے ہمراہ ہجرت کریں اور مکہ سے نکل جائیں۔ تاہم واضح رہے کہ اس کام کے لئے مضبوط ارادے اور استقامت کی ضرورت ہے اور ہم نے اپنے پیغمبر کو اسی لئے آسمانوں پر بلایا ہے کہ اس کے ارادے اور عزم میں استقامت و پائیداری ایجاد کریں۔

جب حضرت محمد ﷺ بارگاہ الٰہی سے رخصت ہوئے کہ زمین پر لوٹیں تو انہوں نے بارہ احکام دریافت کئے (ایسے ہی جیسے حضرت موسیٰؑ نے دس فرمان دریافت کئے تھے) اور انہیں مسلمانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی۔ وہ احکام یہ تھے:

۱۔ مسلمان خدائے یکتا کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہ کریں۔

۲۔ اپنے ماں باپ کا احترام کریں۔

۳۔ صلہء رحمی سے کام لیں۔

۴۔ غریبوں، مسکینوں، پناہ گزینوں کی دستگیری کریں۔

۵۔ زیادہ روی اور اسراف سے کام نہ لیں۔

۶۔ کنجوسی سے پرہیز کریں۔

۷۔ زنا نہ کریں۔

۸۔ انسانی جان کے قتل کے مرتکب نہ ہوں۔
۹۔ دوسروں کے مال خاص طور پر یتیموں کے مال کو غصب نہ کریں۔
۱۰۔ تولتے وقت بے ایمانی سے کام نہ لیں۔
۱۱۔ خلاف عقل کاموں سے پرہیز کریں یعنی ایسے کام انجام نہ دیں جنہیں عقل تسلیم نہ کرتی ہو۔
۱۲۔ غرور سے کام نہ لیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے معراج سے واپسی پر ان تمام لوگوں کا تعارف کرایا جن سے انہوں نے مختلف آسمانوں پر ملاقات کی تھی اور یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ "دانتے" نے اپنی کتاب "خدائی کومیڈی" میں مختلف واقعات اور شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے اسی روش کو اپنایا ہے جسے حضرت محمد ﷺ نے معراج کے واقعات بیان کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔

(دانتے Alighieri Dante) قدیم اٹلی کا مشہور دانشور تھا جو سن ۱۲۶۰ء میں فلورنس میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے زمانے کے تمام علوم کا ماہر تھا تاہم وہ اپنی شاعری کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اس کی جس کتاب کا ذکر ہوا ہے وہ سن ۱۳۲۱ء میں مکمل ہوئی اور اس نے بھی اسی سال وفات پائی۔ خلیل)

معراج کے سفر میں حضرت محمد ﷺ کو تمام انبیاء اور بنی نوع انسان کے برجستہ لوگوں سے ملاقات کرنے اور انہیں پہچاننے کا موقع نصیب ہوا۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جو "اہل سیف و قلم" تھے یعنی جنگجو بھی تھے اور اہل قلم بھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسے تمام پیغمبروں اور اللہ کے نیک بندوں سے ملاقات کی جو صدیوں پہلے دنیا سے گزر چکے تھے۔ یہ بات ان کے لئے ایک بڑی کامیابی تصور ہوتی ہے کیونکہ انہیں ان لوگوں کو نزدیک سے دیکھنے اور پہچاننے کا موقع ملا۔

کچھ علمائے اسلام کہتے ہیں باوجود اس کے کہ حضرت محمد ﷺ سات آسمانوں پر

گئے اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور وہاں اللہ کے ساتھ ہمکلام ہوئے لیکن جب واپس لوٹے تو ان کے گھر کی کنڈی (جو جاتے وقت کھل گئی تھی) بدستور ہل رہی تھی۔

یہ بات جو آج آئن سٹائن (Einstein) کے مشہور عالم مفروضہ نسبیہ Hypothesis Of Relativity پر پوری اترتی ہے ہمارے لئے بالکل تعجب خیز نہیں کیونکہ مذکورہ مفروضے میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دو اجسام کے لئے جن میں ایک ساکن اور دوسرا متحرک ہو وقت یعنی ٹائم کی رفتار ایک جیسی نہیں ہوتی لہٰذا یہ بات علمی نقطہ نظر سے قابل قبول ہے کہ کوئی اپنے گھر سے نکلے اور آسمانوں کی طرف روانہ ہو اور جب واپس آئے تو اس کے گھر کی کنڈی بدستور ہل رہی ہو۔

مفروضہ نسبیہ کے بارے میں تفصیل سے بات ہو چکی ہے اور اکثر لوگ اس تھیوری سے آشنا ہیں لہٰذا میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

حضرت محمد ﷺ کی معراج میں مذکورہ بالا بات تعجب آور نہیں لیکن جو چیز عجیب ہے وہ یہ ہے کہ آیا پیغمبر اسلام ﷺ اس جسم کے ساتھ آسمانوں پر گئے جسے آج ہم گوشت، خون اور ہڈیوں کی شکل میں پہچانتے ہیں؟!

علمائے اسلام نے اس بارے میں دو مختلف نظریات پیش کئے ہیں کچھ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اسی جسم کے ساتھ آسمانوں پر گئے اور کچھ کا خیال ہے کہ ان کی روح مبارک نے آسمانوں کی سیر کی لیکن ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ پیغمبر اسلام ﷺ ''خواب'' یا ''رویا'' کی حالت میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تھے۔

وہ علماء جن کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ اسی جسم کے ساتھ آسمانوں پر گئے، یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ وہ پیغمبر تھے لہٰذا انہیں یہ قدرت حاصل تھی کہ اسی جسم کے ساتھ آسمانوں کی سیر کریں اور حتیٰ کہ ساتویں آسمان تک پہنچ جائیں۔

علمائے اسلام کا دوسرا دستہ یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ جسم خاکی کے ساتھ آسمانوں پر نہیں گئے اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی بلکہ انہوں نے اپنی روح کے ساتھ

آسمانوں کی سیر کی' سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور اللہ سے ہمکلام ہوئے۔
ان لوگوں کے نظریئے کے مطابق ہم معمولی انسان پیغمبر نہ ہوتے ہوئے بھی "خواب" کی حالت میں ایسی جگہ پہنچ سکتے ہیں جو ہم سے ہزاروں کلومیٹر دور ہو اور ایسے لوگوں سے گفتگو کر سکتے ہیں جو اس دنیا میں موجود نہ ہوں یعنی مر چکے ہوں۔ جب ہم مردوں سے بات کرتے ہیں تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مر چکے ہیں ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیں حیرت نہیں ہوتی اور ہماری نظر میں یہ ایک عام سی بات دکھائی دیتی ہے۔
جب ہم سو رہے ہوں تو ہمارا بدن قطعاً" حرکت نہیں کرتا اور یونہی بستر پر پڑا رہتا ہے جبکہ ہم اتنے سبکبار ہو جاتے ہیں اور جہاں بھی چاہیں جا سکتے ہیں۔ دراصل ایسی صورت میں ہماری روح ہمارے جسم سے نکل کر فضائے بیکراں میں تیرنے لگتی ہے اور دور دراز مقامات تک پہنچ جاتی ہے اور ایسے لوگوں سے ملاقات کرتی ہے جو ہم سے سینکڑوں سال پہلے گزر چکے ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان ملاقاتوں میں ہم ایسے لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں جو ہم سے پہلے دوسرے ملکوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں ہماری زبان کا علم نہیں ہوتا اور ہم ان کی زبان نہیں جانتے لیکن زبان سے ناواقفیت ہماری گفتگو میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ ہم ان کی زبان سے آشنا ہوتے ہیں اور وہ بھی ہماری بات سمجھ سکتے ہیں۔
یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ روح ہمارے بدن سے خارج نہیں ہوتی بلکہ ہمارے اندر (آج ہم کہتے ہیں کہ ہمارے دماغی خلیوں میں) ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہماری آنکھوں کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو ایسا شخص پاتے ہیں جو ہر جگہ کو پہچانتا ہے اور سب کے ساتھ آشنائی رکھتا ہے۔
بیداری کی حالت میں ہم ایسے نالے سے نہیں پھلانگ سکتے جو ذرا سا عریض ہو لیکن عالم خواب میں ہم دروں اور گھاٹیوں پر پرواز کر سکتے ہیں' پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر سکتے ہیں اور یہ پروازیں ہمیں اتنی معمولی دکھائی دیتی ہیں گویا اپنے شہر کی کسی سڑک کو عبور

کر رہے ہوں۔ یعنی خواب کی حالت میں بہت سے مشکل کام ہمارے لئے بالکل آسان ہو جاتے ہیں۔

نیند کی حالت میں ہم اپنے گھر میں رہ سکتے ہیں اور ایسی جگہ پر بھی جو ہمارے گھر سے ہزاروں کلومیٹر دور ہو لیکن اتنی دوری کے باوجود ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم دونوں جگہ موجود ہیں۔ عالم خواب میں ہم اجنبی زبانوں کو سمجھ سکتے ہیں اور حتیٰ کہ اس زبان میں تکلم بھی کر سکتے ہیں۔ جب خواب کی حالت میں ہم کسی اجنبی ملک میں داخل ہوں تو ہمیں یوں لگتا ہے جیسے پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں۔

عالم رویا میں ہمارے کچھ دوست بھی ہوتے ہیں اور کچھ دشمن بھی جن میں سے کسی کو بھی ہم بیداری کی حالت میں نہیں پہچانتے لیکن جیسے ہی نیند ہم پر غلبہ کرتی ہے تو وہ لوگ خواب کی دنیا میں ہمارے آس پاس جمع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مہربان ہوتے ہیں اور..... اور کچھ اتنے بھیانک کہ ہم انہیں دیکھتے ہی چیخنے لگتے ہیں اور خوف کے مارے ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔

خواب کی دنیا میں ہم آتش فشاں پہاڑ کے دھانے میں داخل ہو کر اس کے مرکز تک پہنچ سکتے ہیں اور واپس بھی آ سکتے ہیں لیکن ہمیں جلنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم شدید ترین ٹھنڈ کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ہمیں کچھ نہیں ہوتا۔ خواب کی حالت میں وقت کے پیمانے بدل جاتے ہیں اور اسے رائج شدہ اندازوں یعنی گھنٹوں، منٹوں، سیکنڈوں اور دنوں کے حساب سے نہیں ناپا جا سکتا۔

بہت سے لوگوں کے لئے یہ اتفاق پیش آیا ہے کہ انہوں نے خواب کی حالت میں اپنے آپ کو کسی دوسرے ملک میں پایا اور وہاں کئی دن نہیں بلکہ کئی سالوں تک رہے اور اس دوران جو واقعات رونما ہوئے ان کی مدت بھی اتنی ہی تھی لیکن جب آنکھ کھلی اور انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ تو چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں سوئے۔

یہ کچھ ایسے مسائل ہیں جنہیں ثابت کرنے کے لئے زیادہ بحث و مباحثے کی

ضرورت نہیں اور ہر کوئی اپنی زندگی میں اس کا تجربہ کر چکا ہے اور جانتا ہے کہ عالم رویا میں فاصلے مٹ جاتے ہیں' وقت ٹھہر جاتا ہے اور انسان ایک جگہ ہوتے ہوئے بھی سب جگہ موجود ہوتا ہے اور اجنبی زبان کو نہ صرف سمجھ سکتا ہے بلکہ اس زبان میں گفتگو بھی کر سکتا ہے۔

خواب کی دنیا میں ماضی' مستقبل اور حال ایک ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی مرضی سے ہزار یا دو ہزار سال پیچھے یا آگے جا سکتا ہے اور ایسے لوگوں سے ہمکلام ہو سکتا ہے جو ماضی میں پیدا ہوئے یا ابھی دنیا میں نہیں آئے۔

کچھ دانشوروں نے ایسے پیچیدہ مسائل کو جنہیں وہ بیداری کی حالت میں حل کرنے سے قاصر تھے خواب کی حالت میں حل کر لیا۔ گویا وہ گرفت جو بیداری کی حالت میں ہمارے دماغی اعصاب پر دباؤ ڈالتی ہے اور ہماری صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتی وہ خواب کی حالت میں خود بخود سست پڑ جاتی ہے یا بالکل زائل ہو جاتی ہے۔

لہٰذا مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں کیا یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی روح حتیٰ کہ بیداری کے عالم میں وہاں پہنچ جائے جسے آج ہم "عالم ملکوتی" کا نام دیتے ہیں؟

آیا یہ نہیں مانا جا سکتا کہ وہی کیفیت جو صرف خواب کی صورت میں ہمارے جسمانی اعصاب اور دماغی خلیوں پر طاری ہوتی ہے وہی کیفیت اللہ کے حکم سے بیداری کے عالم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو گئی ہو اور انہیں ایسی دنیا میں لے گئی ہو جس کی تعریف خود انہوں نے بیان کی ہے۔

چونکہ روح خواب کی حالت میں ہمارے جسم سے نکل کر دوسری دنیا کی طرف روانہ ہو جاتی ہے یا یہ کہ ہمارے جسمانی اعصاب اور دماغی خلیوں میں ایسا عمل رونما ہوتا ہے کہ ہم زمان و مکان (Time and Space) کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اپنے آپ کو ازلی و ابدی محسوس کرتے ہیں اور اس جہان کی سب چیزوں میں اپنے آپ کو شریک پاتے

ہیں اور حتیٰ کہ بعض اوقات جمادات و نباتات کی آواز بھی سن سکتے ہیں۔
اگر یہی کیفیت "بیداری" کے عالم میں حضرت محمد ﷺ پر طاری ہو گئی ہو تو نہ صرف عقلی لحاظ سے بلکہ بیسویں صدی کے علمی نقطہ نظر سے بھی ان کی معراج ایک تسلیم شدہ بات ہے اور حتیٰ کہ یہ بھی مانا جا سکتا ہے کہ ان کا سفر اتنی تیز رفتاری سے انجام پذیر ہوا کہ جب وہ واپس لوٹے تو ان کے گھر کی کنڈی بدستور ہل رہی تھی۔
لیکن کچھ علمائے اسلام معتقد ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی روح آسمانوں پر نہیں گئی بلکہ انہوں نے اسی جسم کے ساتھ بجلی کی سی تیز رفتاری سے آسمانوں کا سفر کیا اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔
اگر ان علماء کے نظریئے کا مطالعہ کیا جائے تو "علم طبیعات" کے نقطہ نظر سے دو سوال پیش آتے ہیں۔ ایک تو سفر کی رفتار کا مسئلہ ہے اور دوسرا یہ کہ ایک جسم کیونکر نور (Light) کی رفتار سے زیادہ تیزی سے حرکت کر سکتا ہے۔
اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کے سفر میں حضرت محمد ﷺ کی رفتار، نور کی رفتار یا قدرت جاذبہ کی لہروں کی رفتار سے زیادہ تھی۔ کیونکہ حضرت محمد ﷺ آن واحد میں اس فضائے بیکراں کے دور ترین نقطے پر پہنچے اور لوٹ آئے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ اس جہان کی وسعت اتنی ہے کہ آئن سٹائن کے مفروضے کے مطابق اس کا قطر تین ہزار ملین (یعنی تین ارب) شمسی سال کے برابر ہے یعنی اگر نور کی ایک شعاع جس کی رفتار تین لاکھ کلو میٹر فی ثانیہ ہے، اس جہان کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب حرکت کرے تو وہ تین ارب سال کے بعد دوسرے کنارے پر پہنچے گی۔
تاہم ایک ایسی رفتار بھی موجود ہے جو بالکل یک لخت (Sudden) ہے اور ایک ہی آن میں اس جہان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچ سکتی ہے، وہ ہے قدرت جاذبہ کی لہروں کا اثر۔
اگر اس لامحدود جہان کے کسی گوشے میں کوئی کہکشاں جو لاکھوں ستاروں پر مشتمل

ہوتی ہے دفعتاً" بکھر جائے اور لہروں میں تبدیل ہو جائے تو دنیا کی قدرت جاذبہ اتنی تیزی سے ردعمل ظاہر کرتی ہے کہ اس جہان کے نظام میں پلک جھپکتے ہی تعادل برقرار ہو جاتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو جس لمحہ کوئی کہکشاں ٹوٹے اور لہروں میں بدل جائے تو اسی وقت ہمارا نظام شمسی بھی درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

قوت جاذبہ کا اثر' جسے نیوٹن نے کشف کیا سارے جہان میں فوری طور پر ہوتا ہے اور اس کا عکس العمل بھی بالکل آناً" فاناً" ہوتا ہے۔ اسلامی مصنفین کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ کے مرکب یعنی براق کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ اسے نور کی رفتار سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ حضرت محمد ﷺ بیداری کے عالم میں اپنی روح کے ذریعے آسمانوں پر گئے تو علم فزکس کی بحث پیش نہیں آتی لیکن اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے جسم مطہر کے ساتھ آسمانوں کا سفر کیا تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ایک جسم آیا تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار برداشت کر سکتا ہے یا نہیں؟

لیکن کچھ علمائے اسلام یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اسی جسم کے ساتھ نور سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے سفر پر روانہ ہوئے اور اسی رفتار سے واپس لوٹ آئے اور اگرچہ آج علم فزکس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی تاہم میں (کونسٹن ویرژیل) چونکہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو بادیدہ احترام دیکھتا ہوں لہٰذا مذہبی طور پر اس نظریئے کو تسلیم کرتا ہوں کیونکہ ہم مسیحی لوگ بھی اپنے مذہب میں کچھ ایسے مسائل سے روبرو ہیں جنہیں علم فزکس کی رو سے ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم چونکہ اپنے مذہبی عقائد پر یقین رکھتے ہیں لہٰذا ان باتوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔



جب نظر نہ آنے والے ایمان لے آئے

جب حضرت محمد ﷺ نے آسمانی سفر یعنی معراج سے مراجعت کی تو اپنے آپ کو بدستور دشمنوں کے نرغے میں پایا اور وہ بھی ایسے دشمن جو اس مرتبہ کسی قصاص یا انتقام کے خدشے کے بغیر انہیں قتل کر سکتے تھے۔

اسی اثناء میں قبیلہ "بنو حنیفہ" کے کچھ لوگ خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ پہنچے اور قریش نے اس قبیلے کے ایک فرد کو پیغمبر اسلام ﷺ کو قتل کرنے کے لئے اجیر کر لیا۔ حضرت محمد ﷺ اس سازش سے باخبر ہو گئے اور چونکہ اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ مکہ سے نکل جائیں لہٰذا وہ راتوں رات مکہ سے نکل کر "طائف" کی طرف روانہ ہو گئے۔

"طائف" مکہ کے جنوب میں واقع ایک سرسبز شہر ہے۔ اس زمانے میں اونٹ کے ذریعے مکہ سے طائف پہنچنے میں دو دن لگتے تھے۔ اگر استر (خچر) پر سفر کیا جاتا تو یہ راستہ ایک دن میں طے ہو سکتا تھا۔

چونکہ طائف کا شہر سطح سمندر سے ایک ہزار آٹھ سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے اور وہاں پانی وافر مقدار میں موجود ہے اور بارشیں بھی ہوتی ہیں لہٰذا اسی وجہ سے یہ شہر انتہائی سرسبز و شاداب ہے۔ اس زمانے میں مکہ کے اکثر دولت مندوں کے باغات اور تفریح گاہیں وہاں موجود تھیں۔

آج بھی جب کوئی انسان جزیرۃ العرب کے خشک و سوزاں صحراؤں سے گزر کر طائف کے شہر میں قدم رکھتا ہے اور وہاں کے ہرے بھرے باغات کا مشاہدہ کرتا ہے اور وہاں کی ٹھنڈی ہوا میں سانس لیتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ کسی نئی دنیا میں قدم رکھ چکا ہو۔ طائف کے رہنے والے بہت مالدار تھے اور ان کا اصلی پیشہ "ربا" یعنی سود خوری تھا۔ وہ لوگ سو فیصد سود کے ساتھ ضرورت مندوں کو قرضہ دیتے تھے اور ان میں سے کچھ کے پاس غلاموں کی فوج ہوتی تھی جن سے وہ کھیتی باڑی کا کام لیتے تھے۔

اہل طائف کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ گندم کی روٹی استعمال کرتے۔ اسی بنا پر انہیں اونٹنی کے دودھ کو پہچاننے میں مہارت حاصل نہ تھی۔ ایک بادیہ نشین عرب' جس کی غذا اونٹنی کے دودھ پر مشتمل ہوتی تھی (اور ہے) جب دودھ کو منہ سے لگائے تو فوراً یہ بتا سکتا ہے کہ وہ اونٹنی جس سے دودھ دھویا گیا ہے کتنے سال کی ہے اور اس نے کس قسم کی گھاس یا جڑی بوٹیاں کھائی ہیں۔ میں (کونسٹن ویرژیل) نے خود اس بات کو آزمایا ہے اور ایک بدوی سے جو اونٹ کا دودھ پی رہا تھا جب اس سلسلے میں پوچھا تو اس نے بلا تامل دودھ دینے والی اونٹنی کی عمر بتا دی اور یہ بھی تعین کر دیا کہ وہ کس علاقے میں چری ہے کیونکہ صحرا کے کسی ایک علاقے میں جو گھاس پھونس اُگتی ہے وہ شاید دوسرے علاقے میں نہ پائی جائے اور بادیہ نشین عرب صحرا کے مختلف علاقوں میں اگنے والی گوناگوں جڑی بوٹیوں کو بخوبی پہچانتے ہیں۔

چونکہ طائف کے رہنے والے مالدار اور زندگی کی معاشی مشکلات سے فارغ البال تھے لہٰذا اپنے وقت کا کچھ حصہ علم و ہنر اور دیگر سرگرمیوں کے لئے وقف کر سکتے تھے۔

جزیرۃ العرب کے شمالی حصے کا یکتا طبیب (حکیم) طائف کے شہر میں رہتا تھا جس کا نام "حارث بن کلدہ" تھا۔ اس مشہور مؤرخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ مذکورہ حکیم نے طبابت کا علم ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں طب ایرانی بہت شہرت کی حامل تھی اور کئی نامی گرامی حکیم ایران میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جزیرۃ العرب کا یگانہ منجم جو علم نجوم کو علمی طور پر جانتا تھا اور ستاروں کی حرکات سے واقفیت رکھتا تھا' وہ بھی طائف کے شہر ہی میں رہتا تھا اور وہ عمرو بن امیہ کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

عربی زبان میں طائف کے لغوی معنی دیوار یا حصار کے ہیں اور طائف جزیرۃ العرب کا وہ واحد شہر تھا جس کے اردگرد حفاظتی دیوار موجود تھی۔ اس دیوار کو خود عربوں نے تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ کچھ ایرانی معماروں نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔

کہتے ہیں کہ شہر طائف کے ایک باشندے نے اس وقت کے شاہ ایران کے لئے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ ایران کے بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے پوچھا کہ اس خدمت کے بدلے تجھے کیا چاہیئے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ اے بادشاہ! میری تجھ سے صرف ایک درخواست ہے کہ اپنے آزمودہ کار معماروں کو جزیرۃ العرب بھیج دے تاکہ وہ ہمارے شہر "واج" کے گرد ایک حصار تعمیر کر دیں۔ واضح رہے کہ شہر طائف کے گرد حصار کھینچے جانے سے پہلے اس شہر کا نام "واج" تھا۔

شاہ ایران نے اس شخص کی درخواست قبول کر لی اور واج کے اردگرد حفاظتی دیوار تعمیر کر دی گئی جس کے بعد اس شہر کو "طائف" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ طائف کے شہر میں ایک پتھریلا ٹیلہ بھی تھا جس پر "لات" (جزیرۃ العرب کے تین مشہور بتوں میں سے ایک) کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہ ٹیلہ اور اس کے اردگرد کا علاقہ مقدس سمجھا جاتا تھا اور جو کوئی بھی اس علاقے میں داخل ہو جاتا چاہے زانی و قاتل ہی کیوں نہ ہوتا دوسروں کی دست برد سے محفوظ ہو جاتا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ طائف میں داخل ہونے کے بعد اپنے ایک رشتہ دار کے گھر

پہنچے جو درحقیقت حضرت عبدالمطلب کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس شخص نے جس کا نام "عبدیالیل" تھا جب یہ سنا کہ محمد ﷺ اس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو اس نے نہ صرف یہ کہ ملنے سے انکار کر دیا بلکہ اپنے نوکروں کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ محمد ﷺ پر پتھر برسانا شروع کر دیں کیونکہ "عبدیالیل" کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بنو ہاشم نے حضرت محمد ﷺ کو قبیلہ بدر کر دیا ہے۔ عبدیالیل کے ملازموں نے حضرت محمد ﷺ کا تعاقب شروع کر دیا اور اس شدت سے پتھر برسانا شروع کر دیئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ طائف کے ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ عبدیالیل کے نوکروں نے جب حضرت محمد کو کھو دیا تو وہ طائف کے گلی کوچوں میں انہیں ڈھونڈتے پھرے جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ اسی باغ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

اس باغ کے مالک دو بھائی تھے جو مکہ کے رہنے والے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ کو پناہ دیں لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ پتھروں سے لہولہان ہو گئے ہیں تو ان کے دل میں رحم آ گیا اور انہوں نے اپنے غلام سے کہا کہ وہ انگور کا ایک خوشہ حضرت محمد ﷺ کو پیش کرے۔

اس غلام نے جو ایک مسیحی تھا۔ انگور کی بیل سے ایک خوشہ توڑ کر حضرت محمد ﷺ کی طرف بڑھایا اور بولا "لو کھاؤ"۔ حضرت محمد ﷺ نے انگور کا خوشہ اس شخص کے ہاتھوں سے لے لیا لیکن اسے تناول کرنے سے پہلے "بسم اللہ" پڑھا۔

مسیحی غلام نے اس کلام کو سنا تو حیرت میں ڈوب گیا اور تعجب بھرے لہجے میں بولا "اے مردِ مجروح، کیا تم مسیحی ہو؟" حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا "نہیں"۔ مسیحی غلام نے کہا کہ یہ کلام جو تم اپنی زبان پر لائے ہو بالکل وہی ہے جسے ہم عیسائی لوگ کھانا کھانے سے پہلے زبان پر لاتے ہیں۔ اگر تم مسیحی نہیں تو پھر ان کلمات کو کیوں زبان پر لائے ہو؟"

حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور جس اللہ کی طرف

سے بھیجا گیا ہوں وہ وحدہ لاشریک ہے اور یہ لوگ اسی لئے مجھ پر پتھر برساتے ہیں کہ مجھے جان سے مار ڈالیں کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

عیسائی خدمتگار بولا کہ میں بھی خدائے یکتا کی پرستش کرتا ہوں کیونکہ میں حضرت عیسیٰؑ کا پیروکار ہوں۔

اس عیسائی غلام کا نام "عدس" تھا۔ اس کے اور حضرت محمد ﷺ کے درمیان انس و الفت کا رشتہ برقرار ہو گیا۔ عدس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ باغ جس میں ہم کھڑے ہیں دو بھائیوں کی ملکیت ہے۔ ان میں سے ایک کا نام عتبہ اور دوسرا شیبہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی ربیعہ کے بیٹے ہیں اور قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگرچہ میرے آقا عتبہ نے مجھے یہ کہا ہے کہ تمہیں انگور پیش کروں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں اس باغ میں پناہ نہیں دے گا لیکن میں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہیں آج رات اس باغ اور طائف کے شہر سے کچھ اس طرح باہر نکال لے جاؤں کہ جو لوگ گلی کوچوں میں تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں وہ تمہیں نہ پا سکیں اور نہ ہی تمہیں یہاں سے نکلتا ہوا دیکھ سکیں۔

مسیحی خدمتگار عدس نے اپنے وعدے پر عمل کیا اور راتوں رات پیغمبر اسلام ﷺ کو عتبہ اور شیبہ کے باغ اور پھر طائف کے شہر سے باہر لے آیا اور بولا "اے مرد خدا پرست! اس شہر سے دور نکل جاؤ کہ یہاں تمہاری جان خطرے میں ہے"۔ حضرت محمد ﷺ طائف سے نکلنے کے بعد دوبارہ مکہ کی جانب گامزن ہو گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے تمام اعضائے بدن درد میں مبتلا تھے اور ان کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ وہ بھوکے تھے اور پیاسے بھی لیکن اس کے باوجود ان کے ہونٹوں پر کوئی شکایت نہ تھی۔

عربی زبان کی ایک ضرب المثل ہے "الصبر مفتاح الفرج" اور یہ ضرب

المثل جزیرۃ العرب کے لوگ خود عرب باشندوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جس دن سے ایک عرب باشندہ اپنا برا بھلا سمجھنا شروع کرتا ہے وہ اس ضرب المثل کے مفہوم سے آشنا ہو جاتا ہے اور اس پر عمل درآمد کرنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ بھی جسمی اور روحی آلام کو صبر و شکیبائی کے ساتھ برداشت کرنا جانتے تھے کیونکہ انہیں اللہ کی ذات پر پختہ یقین تھا اور وہ اپنی رسالت کی راہ میں ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

حضرت محمد ﷺ صحرا میں پیدل چلتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچے جسے "بطن نخلہ" کہتے تھے۔ رات کا سماں تھا اور ساری کائنات خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر پیغمبر اسلام ﷺ نے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ قرآنی آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ قرآنی آیات کا اثر یہ ہوا کہ وہاں موجود جنوں کی ایک جماعت پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان لے آئی اور وہ سب مسلمان ہو گئے۔ قرآن کی چھیالیسویں سورۃ میں اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے:

"اور وہ وقت آن پہنچا جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو
تمہاری جانب بھیجا تاکہ وہ قرآن کی آیات کو سنیں اور جب
وہ حاضر ہو گئے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ
خاموش رہو اور کان لگا کر سنو..... الاحقاف"۔

جن سے مراد بیابان میں رہنے والے وہ لوگ ہیں جو رات کے وقت دکھائی نہیں دیتے یا دن کے وقت اہل شہر کو نظر نہیں آتے۔

سرزمین مشرق اور بالخصوص جزیرۃ العرب کے بیابانوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو گروہ رات کی تاریکی میں ایک ہی مقام پر ٹھہریں اور ایک دوسرے کو دیکھ نہ پائیں۔ اگر اونٹ کے گلے میں بندھی گھنٹی کی آواز نہ سنائی دے اور آگ نہ جلائی جائے یا قافلے کے کتے (اگر قافلے کے ساتھ کتے ہوں) نہ بھونکیں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دو مختلف قافلے

ایک دوسرے سے صرف چند گز کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالیں لیکن ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس نہ کر سکیں۔

اس رات حضرت محمد ﷺ اکیلے سفر کر رہے تھے اور جب بطن نخلہ پہنچے تو رات کا بڑا حصہ بیت چکا تھا اور جو لوگ اس علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ اس مسافر (یعنی حضرت محمد ﷺ) کو نہ دیکھ پائے لیکن ان کی آواز کے سوز و گداز سے اتنے متاثر ہوئے کہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اسلامی روایات سے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ لوگ جو جن تھے یعنی نظر نہیں آتے تھے، کسی کارواں کے مسافر تھے یا اسی جگہ یعنی بطن نخلہ کے رہنے والے تھے۔ بہرکیف مسلمہ طور پر وہ لوگ جو نظر نہ آئے اسی رات پیغمبر اسلام ﷺ کی سوزناک آواز میں قرآنی آیات کو سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ ان پر ایمان لے آئے۔

عربی زبان میں "جن" کے لغوی معنی اس شے کے ہیں جو آنکھوں سے پوشیدہ ہو اور نظر نہ آئے۔ اسی بنا پر ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچے کو جن کہتے ہیں اور زیادہ تر "جنین" کے نام سے پکارتے ہیں اور جنین کا کلمہ بھی درحقیقت جن ہی سے ماخوذ ہے۔

کلمہ جن عربی زبان میں بالائے ذکر مفہوم کے علاوہ ایک معنی اور بھی رکھتا ہے اور وہ ہے "وحشت" یعنی دوسروں کا خوف۔ اسی لئے عرب باشندے اس کلمے کو "انس" کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں۔

"انس" یعنی ایسے لوگ جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں اور ان میں انسیت کا رشتہ برقرار ہو اور جن وہ لوگ جو ایک دوسرے سے گریزاں ہوں۔

شہروں کے رہنے والے اپنے تمدن کے اعتبار سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ان میں باہمی روابط برقرار ہوتے ہیں لیکن قدیم اعراب شہروں میں رہنے والوں کو "انس" اور "بیابانوں" میں رہنے والوں کو جن کے نام سے پکارتے تھے۔ آج ہم ان دو لفظوں کو

"متمدن" اور "غیر متمدن" کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن اس بات پر توجہ کی ضرورت ہے کہ چودہ سو سال پہلے جن و انس (یا متمدن اور وحشی) کا جو تصور عربوں میں رائج تھا وہ ان دو انسانوں کے بارے میں ہمارے آج کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔

آج ہماری نظر میں غیر مہذب یا وحشی انسان وہ ہے جو کسی آبادی میں زندگی بسر نہ کرے، ہم جیسا لباس استعمال نہ کرے، موٹر کار پر سوار ہونا نہ جانتا ہو اور ٹیلی فون، ٹیلی گراف، ٹی وی اور بہت سی نئی ایجادات سے واقف نہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے معاشرتی نظام کی پیروی نہ کرے۔

لیکن چودہ سو سال پہلے مکہ کے شہر میں رہنے والوں اور صحرا میں رہنے والوں کی زندگی میں اتنا فرق نہ تھا کہ جتنا آج ایک متمدن اور غیر متمدن انسان کے درمیان موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سارے اعراب بنیادی طور پر بادیہ نشین تھے اور سبھی ایسے نظام کی پیروی کرتے تھے جو مختلف قبیلوں میں تقریباً ایک جیسا تھا۔

مکہ کے شہریوں اور صحرا میں بسر کرنے والوں کی زندگی میں جو واضح فرق موجود تھا وہ یہ تھا کہ اہل مکہ کبھی کبھار گوشت کھاتے اور گاہے انہیں گندم کی روٹی نصیب ہو جاتی تھی۔ وہ لوگ نئے کپڑے پہن سکتے تھے اور تجارت کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی سے قدرے آرام دہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔ تاہم ان باتوں سے قطع نظر اہل مکہ اور صحرا نشین عربوں میں مذہبی عقائد کے لحاظ سے کوئی اختلاف موجود نہ تھا۔

اہل مکہ، صحرا میں رہنے والوں کو غیر مہذب نہیں سمجھتے تھے کہ انہیں "وحشی" کے نام سے پکاریں لیکن چونکہ وہ لوگ انہیں عام زندگی میں نظر نہیں آتے تھے لہٰذا شہروں میں رہنے والے صحرا میں رہنے والوں کو "جن" کے نام سے پکارتے تھے اور ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ کوئی بدوی عرب کسی ضرورت کے تحت شہر میں داخل ہو۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ بالائے ذکر وضاحتیں ان قرآنی آیات سے مغایرت نہیں رکھتیں جنہیں کہا گیا ہے کہ "جن" ایک ایسی مخلوق ہے جو "نار" یعنی آگ

سے پیدا ہوئی ہے۔

آج کا جدید علم اس نظریئے کی تائید کرتا ہے کہ اس زمین کی بہت سی چیزیں آگ سے پیدا ہوئی ہیں اور یہ زمین بھی آگ کا گولہ تھی جو ایک طویل عرصے یعنی چار ارب پچاس کروڑ سال میں موجودہ شکل میں جو آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے مکمل ہوئی ہے۔

اگرچہ میرا (کونسٹن ویرژیل) یہ فرض نہیں بنتا کہ قرآنی آیات کی تفسیر کروں یا ان کا دفاع کروں تاہم میرا مقصد ان لوگوں کو سمجھانے کا ہے جنہیں عربی زبان پر عبور حاصل نہیں اور قرآن کو اس کی اصلی زبان میں نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے لوگ چونکہ قرآن کو ان ترجموں کے ذریعے پہچانتے ہیں جو مختلف یورپی زبانوں میں ہوئے ہیں اور اکثر مترجمین کیونکہ عربی زبان کی گہرائی اور رموز سے ناواقف ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اشتباہ کریں اور یہ پوچھیں کہ کیونکر "جن" پیغمبر ﷺ کی آواز پر کان دھر سکتے ہیں اور قرآنی آیات کو سن سکتے ہیں۔ ان کے شبہ کو برطرف کرنے کے لئے میں نے مندرجہ بالا وضاحتیں پیش کی ہیں۔

بہرحال..... پیغمبر اسلام ﷺ خستہ حالی کے باوجود مکہ کی جانب بڑھتے رہے اور آخرکار اس شہر کے قریب پہنچ گئے۔

اس دن سے دس سال پہلے حضرت محمد ﷺ اسی شہر میں ایک آرام دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں صاف ستھرے کپڑے، بھوک لگنے پر کھانا اور پیاس کی صورت میں پانی میسر تھا۔ لیکن اس لمحہ جب وہ مکہ کے پاس پہنچے تو ایک ایسے انسان میں بدل چکے تھے جو سراپا زخمی، بھوکا، غمزدہ اور نڈھال ہو۔

ہو سکتا ہے آپ یہ پوچھیں کہ جب مکہ والوں نے انہیں شہربدر کر دیا اور بنو ہاشم نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو پھر وہ کس لئے دوبارہ مکہ واپس چلے آئے۔

جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی شخص کا اپنے قبیلے کی حمایت یا پناہ کے بغیر زندہ رہنا محال تھا اور جب کوئی شخص قبیلہ بدر کر دیا جاتا تو وہ ناگزیر طور پر کسی دوسرے قبیلے میں

اپنے لئے جگہ بنانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے حکم سے مکہ سے باہر چلے گئے اور طائف کا رخ اختیار کیا تاکہ یہ جان سکیں کہ آیا وہ اور دوسرے مسلمان اس شہر میں آسودہ خاطر رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن وہاں پہنچ کر انہیں یہ احساس ہوا کہ طائف کا شہر مسلمانوں کی "پناہ گاہ" نہیں بن سکتا۔ اسی لئے وہ دوبارہ مکہ لوٹ آئے تاکہ دوسرے مسلمانوں کی نجات کے لئے کوئی اور راستہ تلاش کر سکیں۔

لیکن چونکہ انہیں ناگزیر طور پر کسی قبیلے سے منسلک ہونے کی ضرورت تھی لہٰذا انہوں نے ایک شخص کو قبیلہ زہرہ کے سربراہ "اخنس بن شریق" کے پاس بھیجا اور اس سے حق جوار (جس کی وضاحت گزشتہ ابواب میں ہو چکی ہے) طلب کیا۔ اخنس بن شریق نے جواب بھجوایا کہ اگرچہ اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ محمد (ﷺ) کو جوار (پناہ) دے لیکن وہ ایسا کرنے سے معذور ہے کیونکہ اس نے قبیلہ قریش کے ساتھ معاہدہ کر رکھا ہے لہٰذا جب کوئی کسی قبیلے سے عہد و پیمان باندھ لے تو اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے فریق کے راندہ شدہ شخص کو پناہ دے یا اس کی حمایت کرے۔

یہ جواب دریافت کرنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے سہیل بن عمرو کو پیغام بھجوایا اور اس سے کہا کہ وہ انہیں اپنے قبیلے میں جگہ دے۔

سہیل بن عمرو اگرچہ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کا رابطہ قریش کی اصلی شاخ سے نہ تھا بلکہ بہت دور کے رشتے سے منسلک تھا۔ اس کے باوجود اس نے حضرت محمد ﷺ کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ بدستور مکہ سے باہر بیابان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ان دنوں رجب کا مہینہ تھا اور جزیرۃ العرب کے مختلف قبائل خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ آئے ہوئے تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے مختلف قبائل کے سربراہوں سے رابطہ برقرار کیا تاکہ کسی قبیلے کی عضویت حاصل کر سکیں۔

حضرت محمد ﷺ جب بھی کسی قبیلے کے سربراہ سے رابطہ قائم کرتے تو اس سے کہتے کہ میری باتوں کو غور سے سنو اور ان پر عمل کرو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں تمہارے قدموں میں آ گریں گی لیکن قبائلی سرداروں میں سے کسی نے بھی نہ صرف یہ کہ ان کی باتوں پر توجہ نہ دی بلکہ ان میں سے کچھ ان کا مضحکہ اڑانے لگتے اور یہ تصور کرتے کہ حضرت محمد ﷺ (نعوذ باللہ) اپنی عقل کھو بیٹھے ہیں۔ البتہ اس تصور کی وجہ یہ تھی کہ ابی لہب' ابوسفیان اور ابوجہل نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ محمد ﷺ مجنوں ہو گئے ہیں لہٰذا ان کی باتوں پر توجہ نہ دی جائے۔

اگرچہ حضرت محمد ﷺ نے پندرہ قبیلوں کے سربراہوں سے نفی میں جواب دریافت کیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے سولہویں قبیلے کے سربراہ سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جس سربراہ سے حضرت محمد ﷺ نے ملاقات کی وہ اپنے قبیلے کے پانچ افراد کے ہمراہ یثرب (آج کا مدینہ) سے مکہ آیا ہوا تھا تاکہ خانہ کعبہ کی زیارت کر سکے۔

وہ شخص حضرت محمد ﷺ پر ہنسا نہیں بلکہ بڑے غور سے ان کی باتیں سنتا رہا اور جب پیغمبر اسلام ﷺ نے قرآنی آیات کی تلاوت شروع کی تو اس کی حالت متغیر ہو گئی۔ اس نے اپنے قبیلے کے دوسرے افراد کو آواز دے کر بلایا اور حضرت محمد ﷺ نے ان کے سامنے بھی قرآنی آیات ترتیل سے تلاوت کیں۔

بقیہ پانچ افراد بھی اپنے سربراہ کی طرح قرآنی آیات کے اثرات سے دگرگوں ہو گئے اور بلا تامل وعدہ کیا کہ وہ دوسروں کو بھی مسلمان بنانے کی کوشش کریں گے۔

کچھ دنوں کے بعد "نوفل" نامی قبیلے کے سربراہ نے جس کا قبیلہ قریش کے دس قبیلوں میں سے ایک تھا' حضرت محمد ﷺ کو اپنی حمایت میں لے لیا اور جیسے ہی کسی قبیلے نے حضرت محمد ﷺ کی حمایت کا اعلان کیا تو وہ مکہ میں داخل ہونے کے بعد اپنے گھر میں قدم رکھنے کے قابل ہو گئے۔

پھر کچھ عرصہ بعد انہوںؐ نے سودہؓ نامی خاتون کو اپنے نکاح میں لے لیا اور جیسا کہ

ذکر ہو چکا ہے کہ سودہؓ نے حال ہی میں حبشہ سے مراجعت کی تھی۔

سودہؓ جو مسلمان تھیں اپنے خاوند کے ہمراہ (جس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا تھا) دوسرے مسلمانوں کی معیت میں ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں۔ وہاں پہنچ کر سودہؓ کا خاوند اور ایک دوسرا شخص عبیداللہ حجش جو دونوں مسلمان تھے دین اسلام سے نکل کر حلقہ مسیحیت میں داخل ہو گئے۔

حضرت سودہؓ کو جب یہ احساس ہوا کہ اگر وہ حبشہ میں مزید ٹھہری رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کا خاوند ان پر مسیحی ہونے کے لئے دباؤ ڈالے لہٰذا انہوں نے طلاق لے لی اور مکہ کی طرف روانہ ہو گئیں جہاں پہنچ کر وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زوجیت میں داخل ہو گئیں۔

حضرت سودہؓ جوان تھیں نہ خوبرو۔ حضرت محمد ﷺ کہتے تھے کہ میں نے سودہؓ سے اس لئے نکاح کیا ہے کہ خدیجہؓ کے بے سرپرست بچوں کو ماں کا پیار نصیب ہو جائے۔

حضرت محمد ﷺ اور حضرت سودہؓ کا نکاح ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد ابوبکرؓ نے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے باوفا یاروں میں شمار ہوتے تھے پیغمبر اسلام ﷺ سے درخواست کی کہ وہ ان کی بیٹی عائشہ کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میری بیٹی وہ پہلی عورت ہے جس نے مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا میں قدم رکھا ہے اور اسے آپ کی زوجہ بننے کا شرف حاصل ہونا چاہئے۔

حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا کہ تمہاری بیٹی کمسن ہے اور ابھی اس کی عمر سات سال سے زیادہ نہیں۔

ابوبکرؓ نے کہا کہ آپ فی الحال یہ رشتہ قبول کرلیں بعد میں وہ آپ کے حلقہ ازدواج میں داخل ہو جائے گی۔

لہٰذا یہ نسبت ۶۲۰ء میں برقرار ہوئی اور مسلمان کی حیثیت سے دنیا میں قدم رکھنے والی پہلی خاتون پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب کر دی گئی۔



اسلام میں امت یعنی کیا؟

سرکار دو عالم ﷺ مزید ایک سال تک مکہ میں قریش کے جور و ستم برداشت کرتے رہے اور اگرچہ وہ موت کے خواہاں نہ تھے لیکن انہیں موت کا کوئی خوف بھی نہ تھا۔

قدیم عرب باشندے یہ کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں کہ جس دن ہمیں اس دنیا میں آنا تھا تو کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ آیا ہم دنیا میں آنے کی خواہش رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہم سے پوچھا جاتا کہ ہم دنیا میں آنا چاہتے ہیں یا نہیں تو شاید ہمارا جواب نفی میں ہوتا اور ہم کہتے کہ ہمیں دنیا میں آنے کی کوئی آرزو نہیں۔ اسی طرح جب ہمیں اس دنیا سے اٹھایا جاتا ہے تو کوئی ہم سے یہ نہیں پوچھتا کہ آیا ہم مرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟!

ہماری زندگی رب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب بھی چاہے ہمیں اس دنیا میں لاتا ہے اور جب بھی اس کی مشیت ہو ہمیں اس جہان سے اٹھا لیتا ہے۔ ہمیں یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنی پسند سے دنیا میں آئیں یا اپنی مرضی سے چلے جائیں+ یہاں شاید قارئین محترم

کے ذہن میں یہ شعر اجاگر ہو جائے کہ!!

؎ لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

زندگی دراصل ایسا سرمایا ہے جو اللہ نے ہمیں عطا کیا ہے۔ ہمیں صرف یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سرمایا کے "سود" سے فائدہ اٹھائیں اصلی سرمائے سے نہیں۔ کیونکہ اصلی سرمایہ ہمارا نہیں بلکہ اللہ کی امانت ہے۔ لہٰذا ہمیں کسی بھی حالت میں موت کا طالب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ موت ہمارے اختیار میں نہیں۔ لیکن جب موت آ جائے تو اس سے خوفزدہ بھی نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ موت کا خوف اسے ٹال نہیں سکتا۔

حضرت محمد ﷺ بھی حیات و ممات کے بارے میں ایسے ہی عقائد رکھتے تھے۔ انہیں موت کا کوئی خوف نہ تھا لیکن وہ موت کے طالب بھی نہ تھے اور تمام مصائب و مشکلات کے باوجود زندگی سے نبھا رہے تھے۔

اگلے سال یعنی سن ۶۲۱ء میں کعبہ کی زیارت کے دنوں میں اہل مدینہ کا ایک قافلہ مکہ پہنچا اور معلوم ہوا کہ اس مرتبہ کعبہ کی زیارت پر آنے والے مسلمانوں کی تعداد بارہ ہو گئی ہے۔ ان میں سے دس کا تعلق ایک ہی قبیلے اور بقیہ دو کا دوسرے قبیلے سے تھا۔

یہ بارہ افراد جب مکہ پہنچے تو انہوں نے "عقبہ" نامی گھاٹی میں پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ اسلام کی ترقی و پیش رفت کے بارے میں صلاح و مشورہ کیا۔

مذکورہ گھاٹی یعنی عقبہ مکہ اور منیٰ کے درمیان واقع ہے۔ قدیم زمانے میں اس مقام کو ابلیس اور دیگر شیطانی ارواح کی گزرگاہ تصور کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہا تو اسی مقام پر شیطان نے ان سے ملاقات کی اور ان کے ارادے کو متزلزل کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے فرزند کو اللہ کی راہ میں قربان نہ کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان کو بھگانے کے لئے اس کی طرف پتھر پھینکنا شروع کر دیئے اور آج جو لوگ حج کی

غرض سے مکہ جاتے ہیں جب اس مقام پر پہنچتے ہیں تو "رمی" کرتے ہیں یعنی اس جگہ پتھر مارتے ہیں جہاں شیطان کھڑا تھا۔

وہ بارہ مسلمان جو مدینہ سے آئے تھے جب مذکورہ گھاٹی میں جمع ہو گئے تو انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو اطلاع دی کہ پچھلے سال سے اب تک مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور اس افزائش کا سبب قرآنی تعلیمات ہیں۔

ان بارہ مسلمانوں اور مدینہ کے رہنے والے دوسرے مسلمانوں کو تاریخ اسلام میں "انصار" کے نام سے پہچانا گیا ہے۔

انصار نے بتایا کہ مدینہ کے یہودی بھی یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ عنقریب ایک پیغمبر آنے والا ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ایسا پیغمبر نصیب ہوا ہے جو ہم میں سے ہے۔ ہم لوگ اپنے آپ کو یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے خفیف اور سبک محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ اہل کتاب تھے اور ہم اس سے محروم۔ ہماری یہ تمنا تھی کہ کیا ہی اچھا ہو ہم بھی ان لوگوں کی طرح اہل کتاب ہو جائیں۔

لیکن آج ہم بہت خوش ہیں کہ ہمیں ایسا پیغمبر نصیب ہوا ہے جو قرآن جیسی کتاب لایا ہے اور وہ بھی ایسی کتاب جس کا کلام دلوں میں لرزہ طاری کر دیتا ہے اور انسان کی سوچوں کو تبدیل کر کے اس کی کایا پلٹ دیتا ہے۔

اس گفتگو کے بعد انصار نے، جن کی تعداد بارہ تھی، پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مدینہ کی سیاسی صورتحال کے بارے میں گفت و شنید کی۔ انہوں نے بتایا کہ مدینہ کے مختلف قبائل کے درمیان ایک بادشاہ کے انتخاب پر اختلاف پیش آگیا ہے اور اگرچہ ایک زرگر نے مدینہ کے ایک جانے پہچانے شخص عبداللہ بن ابی کے سر کا اندازہ لے لیا ہے تاکہ اس کے لئے تاج بنا سکے لیکن مدینہ کے کچھ قبیلے اس کی بادشاہت پر رضامند نہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ یا رئیس کی بجائے ہمیں اپنے اختلافات دور کرنے کے لئے ایک پیغمبر کی ضرورت ہے اور چونکہ آپ کا تعلق قبیلہ قریش سے ہے اور آپ کے والد عبداللہ

بھی مدینہ کے نزدیک دفن ہیں اور آپ پیغمبر بھی ہیں لہٰذا اہل مدینہ اپنے اختلافات دور کرنے کے لئے آپ کو مدینہ بلانے پر اتفاق رائے رکھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ایک پیغمبر کسی سلطان یا رئیس پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ پیغمبر کو اللہ کی مدد بھی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے انصار سے پوچھا "آیا تم لوگ میرے ساتھ "بیعت ثانی" کرنے پر آمادہ ہو؟"

"بیعت ثانی" دراصل وفاداری کے اس عہد کا نام تھا جسے کوئی قبیلہ کسی ایسے شخص کے ساتھ منعقد کرتا تھا جس کا کوئی قبیلہ نہ ہو اور مذکورہ قبیلہ اسے اپنا رکن بنانے پر رضامندی کا اظہار کرے۔ اس کے علاوہ دو یا دو سے زیادہ قبیلوں کے درمیان یکجہتی کے معاہدے کو بیعت ثانی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

اس گھاٹی میں مدینہ کے دو قبیلوں کے نمائندوں نے حضرت محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی یعنی ان کے ساتھ وفاداری کا پیمان باندھا۔ مذکورہ بیعت کو اس لئے بیعت النساء کہتے تھے کہ بیعت کرنے والا یہ قسم اٹھاتا تھا کہ جس شخص کے لئے اس نے وفاداری کا عہد کیا ہے اس کی راہ میں کچھ اس طرح جانثاری کرے گا گویا اپنے بال بچوں کے لئے کر رہا ہو۔

جب ان بارہ افراد نے بیعت کر لی تو حضرت محمد ﷺ نے ان سے کہا کہ اگر تم لوگ اپنی قسم پر قائم رہے تو تمہیں جنت نصیب ہو گی اور اگر مجھ سے بے وفائی کی تو یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ تمہیں سزا دے یا بخش دے۔

جب وہ لوگ واپس لوٹنے لگے تو پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ کے مسلمانوں میں سے ایک شخص ابن عمیرؓ کو ان لوگوں کے ہمراہ مدینہ روانہ کر دیا تاکہ وہ مدینہ میں مشرف بہ اسلام ہونے والے افراد کو قرآن کی تعلیم دے سکیں۔

ابن عمیرؓ ایک سالخوردہ شخص تھے لیکن ان کی گفتگو کا انداز بے حد دلنشین تھا اور وہ قرآن کو انتہائی خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد انہوں نے بہت سے مشرکوں کو حلقہ اسلام میں داخل کر لیا۔

اسلام کو مدینہ میں کچھ اس تیزی سے پیش رفت حاصل ہوئی کہ سن ۶۲۱ء کے اختتام تک سوائے یہودیوں کے سارے اہل مدینہ مسلمان ہو گئے۔

مدینہ کے یہودی جو اسلام لانے پر آمادہ نہ تھے انہوں نے بھی حضرت محمد ﷺ کی مدینہ آمد پر رضامندی ظاہر کردی کیونکہ اس طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی وساطت سے اپنے اختلافات حل کر سکتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ بھی مدینہ کی صورت حال کے پیش نظر اپنے آپ کو مکہ سے ہجرت کرنے پر آمادہ کر رہے تھے اور انہیں احساس تھا کہ وہ ایک انتہائی اہم قدم اٹھانے والے ہیں۔ اس وقت تک ان تمام مصائب کے باوجود جنہیں حضرت محمد ﷺ نے مکہ میں برداشت کیا' وہ اپنے قبیلے یعنی قریش سے جدا نہ ہوئے۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ جب بھی وہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو ان کا رابطہ اپنے قبیلے سے ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔ عربی زبان میں اس قسم کے ترک تعلقات کے لئے ایک خاص اصطلاح موجود ہے جسے عام طور پر اس کے اصلی مفہوم کی بجائے دوسرے معنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور وہ اصطلاح ہے "فتنہ"۔

عربی زبان میں "فتنہ" یعنی "رابطہ" اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا سب کچھ اپنے قبیلے یا خاندان سے جدا کر لے یعنی ترک تعلقات کر لے لیکن چونکہ عام طور پر اس اصطلاح کو دوسرے معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے لہٰذا عموماً" یہ تصور کیا جاتا ہے کہ فتنہ کا مطلب فساد پھیلانا یا تفرقہ ڈالنا ہے جبکہ لغوی اعتبار سے ایسا نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ یہ جانتے تھے کہ مکہ سے مدینہ کی طرف ان کی ہجرت یعنی ترک تعلقات۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ اس ہجرت کے نتیجے میں ایک ایسا نیا معاشرہ وجود میں آئے گا جو پرانے معاشرے سے بالکل مختلف ہو گا۔ نئے معاشرے میں' حسب و نسب' مال و دولت اور خاندانی برتری کی کوئی اہمیت نہ ہو گی۔ گورا و کالا' غنی و فقیر اور خاص و عام سبھی آپس میں برابر ہوں گے۔ انسانوں کے اس اجتماع کو "امت" کا نام دیا جائے گا یعنی

اس معاشرے میں امت کے سارے افراد آپس میں برابر ہوں گے کیونکہ وہ بھی مسلمان ہوں گے۔

نئے معاشرے یعنی امت کا سب سے اعلیٰ مقام اللہ ہے اور معاشرے میں اس کا نمائندہ پیغمبر ہو گا۔ جدید معاشرے یعنی امت کے تمام افراد ایک دوسرے کے مقابلے میں اور اللہ کی نظر میں برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ حتیٰ کہ نئے معاشرے میں عورت اور مرد میں کوئی امتیاز نہ ہو گا اور دونوں مساوی حقوق سے بہرہ مند ہوں گے۔

امت کسی قبیلے یا طائفے کی طرح نہیں کہ جس میں کوئی شخص حسب و نسب اور رنگ و نسل کی بنا پر دوسروں پر فوقیت رکھتا ہو یا دوسروں کے مقابلے میں معزز و ممتاز سمجھا جائے بلکہ جو چیز اسلامی امت کو دوسرے بنی نوع انسان سے جدا کرتی ہے وہ ہے اسلام کا قانون!

اسلامی امت اور دوسرے عام انسانوں کے درمیان ایک فاصلہ ہے جو وہی "قانون اسلام" ہے۔ لیکن یہ فاصلہ کسی بھی شخص، قوم یا قبیلے کے لئے غیر قابل عبور نہیں۔ جو بھی چاہے اسلامی امت میں داخل ہو سکتا ہے اور اللہ کے احکام کی پیروی کر سکتا ہے اور جونہی کوئی شخص اسلامی امت کا رکن بن جائے تو وہ اسلامی معاشرے کے بقیہ تمام افراد کی طرح برابری اور مساوات کا مستحق قرار پاتا ہے۔

اس لمحہ اور ان حالات میں صرف حضرت محمد ﷺ ہی یہ سمجھ سکتے تھے کہ ایسے معاشرے کی تشکیل جس میں حسب و نسب، قبیلہ و خاندان، رنگ و نسل اور مال و دولت کو برتری کی علامت نہیں سمجھا جائے گا۔ صرف جزیرۃ العرب بلکہ بعد میں ساری دنیا میں ایک عظیم الشان معاشرتی انقلاب کی پیدائش کا سبب بنے گا۔

وہ انقلاب جو حضرت محمد ﷺ اس زمانے میں لانا چاہتے تھے، وہ جزیرۃ العرب کی سماجی صورت حال، وہاں کی قدیم رسم و رواج اور قبائلی سرداروں کے نفوذ کے پیش نظر فرانس کے انقلاب سے کہیں زیادہ اہم اور عظیم تھا۔ فرانس کا انقلاب فرانسیسی باشندوں کو

مساوات نہ دے سکا لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے تمام مسلمانوں میں مساوات برقرار کر دی۔ انہوں نے ہر طرح کی خاندانی، طبقاتی اور رنگ و نسل کی برتری کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

(وضاحت: قارئین کرام توجہ فرمائیں گے کہ یہ کتاب جس کا ترجمہ وہ پڑھ رہے ہیں دراصل فرانسیسی زبان میں لکھی گئی ہے اور مصنف نے یہ مثال غالباً" اس لئے پیش کی ہے کہ فرانس والے آج بھی اپنے انقلاب کو دنیا کا سب سے عظیم انقلاب تصور کرتے ہیں جبکہ مصنف نے اسی ایک جملے میں ان کے انقلاب کی پول کھول دی ہے اور درحقیقت یہ اعتراف کیا ہے کہ دنیا کا کوئی انقلاب اسلام کے سماجی و معاشرتی نظام کے سامنے قدعلم نہیں کر سکتا۔ خلیل)

سن ۶۲۲ء میں اہل مدینہ ایک بار پھر کعبہ کی زیارت کے سلسلے میں مکہ آئے اور حضرت محمد ﷺ نے اسی گھاٹی یعنی عقبہ میں ان لوگوں سے رات کے وقت خفیہ طور پر ملاقات کی۔

اس موقع پر ان بارہ انصار کے علاوہ جنہوں نے ایک سال پہلے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ بیعت ثانی انجام دی تھی کچھ نئے مسلمان بھی مدینہ سے آئے تھے جن کی تعداد مجموعی طور پر ۷۵ تھی۔ ان میں تہتر مرد اور دو عورتیں شامل تھیں۔

جب سب لوگ مذکورہ گھاٹی میں جمع ہو گئے تو پیغمبر اسلام ﷺ نے چند قرآنی آیات کی تلاوت کی اور اس کے بعد ان افراد سے جو نئے آئے تھے اور جنہوں نے پچھلے سال کے مسافروں کی طرح بیعت انجام نہیں دی تھی اپنے ساتھ بیعت کرنے کو کہا۔ ان لوگوں نے بھی بیعت انجام دی یعنی یہ عہد کیا کہ وہ اپنی جان و مال کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کی حمایت کریں گے۔ بعد میں حضرت محمد ﷺ نے مدینہ کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں نے میرے ساتھ یہ بیعت کی ہے کہ اگر مجھے کوئی خطرہ لاحق ہوا تو تم لوگ اپنے خاندان کی طرح میرا دفاع کرو گے۔ لیکن ہو سکتا ہے ایسی

صورتحال پیش آ جائے کہ ہم لوگ اسلام کی ترقی یا حفاظت کے لئے جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں تو کیا تم لوگ اللہ کی راہ میں تلوار اٹھانے پر تیار ہو؟ اور آیا تم لوگ میرے ساتھ "بیعت حرب" کرنے پر آمادہ ہو؟ "بیعت الحرب" اور بیعت النساء میں ایک بنیادی فرق موجود ہے اور اگر ہم چاہیں کہ ان دو اصطلاحوں کو آج کی جاریہ اصطلاحات، کے ساتھ تشبیہ دیں تو یوں سمجھئے کہ بیعت الحرب ایک جنگی معاہدے کا نام ہے جبکہ بیعت النساء کو ایک دفاعی عہد نامہ کہا جا سکتا ہے۔

جب دو فریق آپس میں بیعت کرتے تھے تو اگر ان میں سے کوئی ایک فریق کسی پر حملہ کرنا چاہتا تو یہ ضروری نہ تھا کہ دوسرا فریق بھی اس کا ساتھ دے۔ تاہم اگر کوئی تیسرا فریق ان میں سے کسی ایک کو جارحیت کا نشانہ بناتا تو بیعت کرنے والا دوسرا فریق اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اپنے ہم عہد کا دفاع کرتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ جو مدینہ کے مسلمانوں سے بیعت الحرب چاہتے تھے دراصل انہیں یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ہو سکتا ہے ضرورت کے وقت مسلمانوں کو جنگ کے لئے پیش قدم ہونا پڑے۔ بیعت الحرب اپنے مفہوم کے لحاظ سے بیعت سے کہیں زیادہ اہمیت اور وسعت کی حامل تھی کیونکہ بیعت الحرب کرنے والے افراد ضرورت پڑنے پر دفاعی یا جارحانہ دونوں طرح کی حکمت عملی اختیار کر سکتے تھے۔

مدینہ کے مسلمانوں نے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ بیعت الحرب کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی یعنی ان کے ساتھ ایسا معاہدہ کرنے کو تیار ہو گئے جو دفاعی بھی ہو اور رزمی بھی۔ لیکن بیعت کرنے سے پہلے ان لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ جب آپ فاتح و کامیاب ہو جائیں تو ہمیں تنہا چھوڑ دیں واپس مکہ چلے آئیں!

یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ نے بھی اہل مدینہ کے ساتھ عہد باندھا اور کہا کہ اے مدینہ کے مسلمانو! تمہارا خون میرا خون اور میرا خون تمہارا خون ہے۔ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے۔ جو کوئی بھی تمہارے ساتھ لڑنا چاہے تو مجھے اپنے مقابل پائے گا اور تم

لوگ جب بھی اللہ کی راہ میں پکار کرو تو مجھے اپنے ہمراہ پاؤ گے۔

پھر ان تہتر مردوں نے جو وہاں موجود تھے حضرت محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پیغمبر اسلام ﷺ نے ان پچھتر افراد کے لئے (دو عورتوں سمیت) بارہ سربراہ منتخب کئے جن میں سے نو افراد ایک ہی قبیلے لیکن مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ بقیہ تین کا تعلق دوسرے قبائل سے تھا۔

اسلامی روایات کے مطابق حضرت محمد ﷺ نے ان بارہ افراد سے کہا کہ تم لوگ میرے نمائندوں کی حیثیت سے اہل مدینہ کو اللہ کے احکام سے آگاہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ تمام مسلمان آپس میں برابر و برادر ہیں اور کسی کو کسی دوسرے پر فوقیت یا برتری حاصل نہیں۔ اللہ کا فرمان ہے۔

"انما المومنون اخوۃ فاصلحو بین اخویکم"۔

یعنی مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اگر بھائیوں کے درمیان کوئی نزاع پیش آجائے تو دوسرے بھائی ان کی اصلاح کریں۔ بالائے ذکر آیت قرآن کی ۴۹ ویں "سورۃ حجرات" کی دسویں آیت ہے۔ یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی لہٰذا حضرت محمد ﷺ اس موقع پر اس آیت کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے تھے مگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اس وقت درج بالا آیت کے مضمون کو بیان کیا تھا نہ خود آیت کو۔

بہرکیف حضرت محمد ﷺ نے چاہے خود اس آیہ کو پڑھایا اس کے مفہوم کو بیان کیا یہ بات طے شدہ ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ہر قسم کی خاندانی' طبقاتی اور قبائلی برتری کو یکسر ختم کر دیا۔

سورہ الحجرات کی تیرہویں آیت کا مضمون درج ذیل ہے۔

"یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر والتگی و جعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا..... الی آخر۔"

یعنی اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد (یعنی آدم) اور ایک عورت (یعنی حوا) سے

پیدا کیا اور ہم نے تمہیں کنبے اور قبیلے میں بانٹ دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو اور اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو پرہیز گار ہے۔

ہر وہ شخص جسے عربی زبان پر عبور حاصل ہو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ بنی نوع انسان کا قبیلوں یا خاندانوں میں بٹ جانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان میں سے کچھ دوسروں کے سامنے فخر فروشی کریں اور اپنی برتری جتائیں بلکہ اس لئے ہے کہ انسانوں کے مختلف طبقے ایک دوسرے کے ساتھ بہتر طور پر معاشرت کر سکیں۔

عربی زبان جاننے والا ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "تعارفوا" کا جو کلمہ ذکر ہوا ہے اس کے مجازی معنی بہت وسیع ہیں۔ "تعارفوا" کا مطلب ایک دوسرے کی محض ظاہری شناخت ہی نہیں بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے احوال سے آشنائی پیدا کی جائے تاکہ یہ آشنائیت انسانی اپنائیت اور ہمدردی میں بدل کر ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سبب بنے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے منتخبہ نمائندوں کو بخوبی یہ سمجھا دیا کہ وہ لوگ ایک عظیم اور عدیم المثال مشن (تحریک) کے علمبردار ہیں اور انہیں اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔

اس دن تک حضرت محمد ﷺ ایک پیغمبر تھے لیکن اس کے بعد رسالت کے علاوہ انہیں ایک امت کی قیادت بھی سنبھالنا پڑ گئی۔ اسی بنا پر قرآن میں حضرت محمد ﷺ کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سر مشق لیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ایک باصلاحیت سربراہ تھے۔

وہ گھاٹی جہاں پیغمبر اسلام ﷺ نے متواتر دو سال تک مدینہ کے مسلمانوں سے بیعت لی آج موجود نہیں اور اس کی جگہ ایک مسجد بنا دی گئی ہے۔



ہجرت کا آغاز

بیعت الحرب رجب کے مہینے سن ۶۲۲ء میں انجام پذیر ہوئی جس کے بعد عربی زبان اور خاص طور پر مسلمانوں کی زبان میں دو نئی اصطلاحات کا اضافہ ہو گیا۔ ایک اصطلاح تھی "انصار" اور دوسری "مہاجرین"۔

"انصار" مدینہ کے ان مسلمانوں کو کہا گیا جنہوں نے متواتر دو سال تک یعنی ۶۲۱ء اور ۶۲۲ء میں پیغمبر اسلام ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور "مہاجرین" کا اطلاق ان مسلمانوں پر ہوا جو اپنے پیغمبر کے حکم پر قریش کی ایذا رسانی سے بچنے کی خاطر مکہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔

اسلامی تاریخ میں ان دو فریقوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں کیونکہ انصار اور مہاجرین دونوں نے اسلام کی راہ میں بے پناہ رنج اٹھائے اور شدائد کا مقابلہ کیا۔

شروع میں انصار کا لفظ مدینہ کے ان معدودے چند افراد کے لئے استعمال ہوا جنہوں نے مسلسل دو سال تک رجب کے مہینے میں سرکار دو عالم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی لیکن بعد میں مدینہ کے تمام مسلمان شہریوں کو انصار کے نام سے پکارا گیا۔

بیعت الحرب جو سن ۶۲۲ء میں انجام کو پہنچی اگرچہ خفیہ طور پر منعقد ہوئی تھی مگر پھر بھی قریش کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ آنحضورؐ اور مدینہ سے آنے والے بعض افراد کے درمیان کچھ گفت و شنید ہوئی ہے اور انہوں نے آپس میں کوئی معاہدہ بھی کر لیا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مدینہ کے شہریوں سے جو کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ آئے ہوئے تھے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ تم نے کب اور کہاں آنحضور ﷺ سے رابطہ قائم کیا۔ تم لوگوں نے کیا کہا اور جواب میں کیا سنا؟!

مدینہ کے زائرین جو بت پرست تھے اور بتوں کی پوجا کرنے مکہ آئے ہوئے تھے انہیں حضرت محمد ﷺ اور اپنے کچھ ساتھیوں کے درمیان ہونے والی ملاقات کا قطعاً علم نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اس سلسلے میں مکمل بے اطلاعی کا اظہار کیا۔

ان کا کہنا درست تھا کیونکہ مدینہ کے وہ پچھتر مسلمان جنہوں نے رات کی تاریکی میں پیغمبر اسلام ﷺ سے گفتگو کی تھی پو پھٹتے ہی مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے اور چونکہ انہیں خدشہ تھا کہ مکہ کے قریش ان کا تعاقب کریں گے لہٰذا وہ لوگ راستہ بدلتے ہوئے مدینہ کی طرف جا رہے تھے۔

ابھی ان لوگوں کو مکہ سے نکلے تین دن ہی گزرے تھے کہ قریش کو یہ علم ہو گیا کہ حضور ﷺ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان جنگی معاہدہ طے پا چکا ہے لہٰذا انہوں نے مدینہ جانے والے تمام مسلمانوں کو گرفتار کر کے مکہ لانے کا فیصلہ کر لیا۔

عام قافلے مکہ اور مدینہ کے درمیانی فاصلے کو گیارہ دن میں طے کرتے تھے جبکہ تیز رفتار سفید اونٹ یہی فاصلہ تین دن میں طے کر لیتے تھے۔ قبیلہ قریش کے ارکان نے کچھ سفید اونٹ فراہم کئے اور ان پر سوار ہو کر مسلمانوں کے تعاقب میں روانہ ہو گئے تاکہ

مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی ان لوگوں کو گرفتار کرکے مکہ لے آئیں۔ لیکن چونکہ مدینہ کے مسلمان اپنا راستہ بدلتے ہوئے سفر کر رہے تھے لہٰذا تیز رفتار اونٹ سوار بھی انہیں ڈھونڈنے میں ناکام رہے تاہم انہوں نے مدینہ کے ایک تاجر کو پکڑ لیا جو مسلمانوں کے کارواں میں شامل تھا اور کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا۔

گرفتار شدہ تاجر کو مکہ لایا گیا اور وہاں اس سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ اس نے بتایا کہ میں اہل مدینہ کے قافلے میں ضرور شامل تھا اور اپنے شہر کو لوٹ رہا تھا لیکن میں نے اہل قافلہ سے یہ نہیں سنا کہ انہوں نے مکہ میں آنحضور ﷺ سے ملاقات کی ہے اور ان کے ساتھ کوئی معاہدہ کرلیا ہے۔

مدینے کا تاجر سچ کہہ رہا تھا کیونکہ قافلے میں شامل مسلمانوں نے اپنا راز چھپائے رکھا اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ علاوہ ازیں مذکورہ تاجر خاصا مالدار تھا اور بقیہ اعراب کی طرح وہ بھی ایک قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر قریش اسے ایذا پہنچاتے یا شکنجے دیتے تو اس کے قبیلے کو اپنا دشمن بنا بیٹھتے۔ مزید برآں مکہ میں بھی اس شخص کے کئی دوست تھے لہٰذا قریش نے اسے رہا کر دیا اور اس کے بدلے دو جاسوس مدینہ روانہ کر دیئے تاکہ وہاں کے مسلمانوں سے چھان بین کر سکیں اور یہ جان سکیں کہ ان کے اور آنحضور ﷺ کے درمیان کس قسم کا معاہدہ طے پایا ہے۔

ہو سکتا ہے آپ یہ پوچھیں کہ قریش کے افراد نے خود پیغمبر اسلام ﷺ کو (جو بظاہر ان کی گرفت میں تھے) گرفتار کیوں نہ کیا اور ان سے پوچھ گچھ کیوں نہیں کی؟

جواب یہ ہے کہ محبوب خدا ؐ اس وقت ایک قبیلے کی حمایت میں تھے (جس کی سرگزشت گزشتہ باب میں بیان ہو چکی ہے) لہٰذا قریش انہیں گرفتار نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی یہ جاننے کے لئے دباؤ ڈال سکتے تھے کہ ان کے اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان کیا گزری ہے؟!

دوسری طرف مدینہ کے پچھتر مسلمان جیسے ہی اپنے شہر پہنچے تو حضرت محمد ﷺ

نے مکہ کے مسلمانوں کو ہدایات دیں کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی طرف نکل جائیں اور وہاں پہنچ کر انصار کے گھروں میں سکونت اختیار کریں۔

مکہ کے مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں اپنا آبائی شہر چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہونے لگے اور انہوں نے یہ احتیاط بھی رکھی کہ جماعت قریش ان کی ہجرت سے مطلع نہ ہو سکے لیکن مکہ جیسے شہر میں جہاں سب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے کچھ افراد کی اچانک غیر حاضری بہت جلد دوسروں کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ قریش کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئی کہ مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے نکلے جا رہے ہیں لہٰذا انہوں نے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا راستہ روکنے اور انہیں مکہ میں ہی رہنے پر مجبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ مسلمانوں میں سے تین افراد نے، جن میں ایک حضرت عباسؓ بن ربیعہ اور دوسرے دو بھائی حضرت امیہ اور حضرت ہاشم بن عاص تھے، یہ فیصلہ کیا کہ ایک ساتھ مکہ سے نکلیں لیکن جس رات ان لوگوں کو ہجرت کرنا تھی تو حضرت ہاشم بن عاص اچانک ناپید ہو گئے۔ بقیہ دو مسلمان ناچاری کے عالم میں ان کے بغیر ہی سوئے مدینہ روانہ ہو گئے اور اگلے دن تمام اہل مکہ کو پتہ چل گیا کہ حضرت ہاشم چونکہ مسلمان تھے اور مکہ سے بھاگنا چاہتے تھے لہٰذا قریش نے انہیں گرفتار کر لیا ہے۔

ان دنوں مکہ میں جیل نہیں تھی جزیرۃ العرب کا پہلا زندان پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے کئی سالوں بعد کوفہ میں تعمیر ہوا۔ اس زمانے میں جب کسی کو گرفتار کیا جاتا اور سزا دینا مقصود ہوتا تو اسے زنجیروں سے باندھ کر صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور حضرت ہاشمؓ کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا۔



سرکار دو عالمؐ کی سب سے بڑی قربانی

وہ بات جس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا یہ تھی کہ انہیں احساس ہو چلا تھا کہ آج کے بعد ان کا رابطہ اپنے خاندان، قبیلے اور آباؤ اجداد سے ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائے گا۔ جبکہ آباؤ اجداد جو مجموعی طور پر خاندانی شجرہ کی تکمیل کرتے ہیں اس زمانے کے جزیرۃ العرب میں ہمارے آج کے شناختی کارڈ سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔

اگر آج ہم اپنا شناختی کارڈ کھو دیں تو دوسرا حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس زمانے میں جب کسی کا رابطہ اپنے خاندانی شجرہ سے ٹوٹ جاتا تو گویا ایسا تھا جیسے وہ اپنی شناخت کے علاوہ اپنے تمام سماجی اور معاشی حقوق سے بھی محروم ہو چکا ہو۔ خاندانی شجرہ اور قبیلہ در حقیقت ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ جب کوئی شخص اپنے قبیلے سے ترک تعلق کر لیتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس دنیا میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا ہے۔

میں (کونسٹن ویرژیل) اس بات پر اس لئے بھی زیادہ زور دے رہا ہوں کہ میں نے

محسوس کیا ہے کہ اسلامی مؤرخین نے ہجرت کے موقع پر حضرت محمد ﷺ کی سب سے بڑی قربانی کی اہمیت کو صحیح طور پر درک نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے دین کی راہ میں حضرت محمد ﷺ کی سب سے بڑی قربانی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے قبیلے سے اپنے مشن کی خاطر ناطہ توڑ لیا اور مکہ جیسے شہر کو جہاں وہ پروان چڑھے تھے چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے دراصل ایک تبر ہاتھ میں تھاما اور اس کے مدد سے صرف اس لئے خاندانی رشتوں کو کاٹ ڈالا کہ اسلام کو ترقی اور عروج حاصل ہو۔ یعنی انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس درخت کو گرا دیا کہ جس کے بغیر اس دنیا کی دو لامحدود وسعتوں یعنی ایک صحرا کی بے پایاں وسعت اور دوسری آگ برساتے ہوئے آسمان کی وسعت کے درمیان ان کا بظاہر رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں خاندانی شجرہ کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ افراد کی شناخت ہی ان کے شجرہ سے ہوتی تھی۔ درحقیقت خاندانی شجرہ ہی وہ درخت تھا جس کے سائے میں ایک عرب زندگی گزارنے کے طور طریقے سیکھتا تھا اور اپنے آباو اجداد سے سرمشق لیتا تھا لیکن جب وہ درخت ہی نہ رہتا تو نہ اجداد اس کی دستگیری کرتے اور نہ عزیز و اقارب ہی میں سے کوئی اس کا ہاتھ تھامتا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ اگرچہ سب سے بڑی قربانی دے رہے تھے لیکن اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے باوجود وہ اس سلسلے میں افسردہ یا غمگین نہیں تھے تاہم اس لمحہ ان کی سوچوں کا محور ترک تعلقات ہی تھا۔

بہرکیف' جب سورج ڈوب گیا اور رات کی تاریکی پھیل گئی تو بھی حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سفر جاری رکھا لیکن چونکہ سنگلاخ علاقہ ختم ہو چکا تھا لہٰذا وہ قدرے آسانی سے قدم اٹھا سکتے تھے۔

رات بھر کا سفر کرنے کے بعد جب صبح کی روشنی پھیلی تو وہ لوگ اس غار کے نزدیک پہنچے جسے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت محمد ﷺ کے عارضی قیام کے لئے منتخب کیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ عمر کے لحاظ سے حضرت محمد ﷺ سے تین سال بڑے تھے اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ان کا شمار مکہ کے متمول افراد میں ہوتا تھا لیکن انہوں نے اپنی تمام دولت اور جائیداد اسلام کی راہ میں قربان کر دی اور فی الوقت بے بضاعت ہو چکے تھے۔ اگرچہ حضرت ابوبکرؓ عمر میں بڑے تھے اور طبقہ اشراف سے تعلق رکھتے تھے لیکن غار میں پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس جگہ کو صاف کیا اور اپنی قبا پھاڑ کر اس کے ٹکڑوں سے غار میں موجود مختلف سوراخوں کو مسدود کر دیا تاکہ کوئی موذی جانور سانپ یا بچھو وغیرہ ان سوراخوں سے نکل کر حضرت محمد ﷺ کو ایذا نہ پہنچا سکے اور جب انہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ غار میں اب کوئی خطرہ نہیں تو انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کو غار میں داخل ہونے کی دعوت دی۔

اسی غار میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت محمد ﷺ کے پیروں کے زخموں کو باندھا اور چونکہ ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس پر سر رکھ کر پیغمبرؐ استراحت کر سکتے لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے حضرت محمد ﷺ سے کہا۔ وہ اپنا سر ان کی گود میں رکھ کر آرام سے لیٹ جائیں لیکن پیغمبرؐ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ حضرت ابوبکرؓ بھی تھکے ہوئے ہیں اور انہیں بھی آرام کی ضرورت ہے ان کی تجویز نہ مانی اور خود پتھریلی زمین پر سر رکھ کر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سونے سے پہلے یہ دیکھا کہ اس غار میں ایک سوراخ باقی رہ گیا ہے جسے وہ کپڑا کم ہونے کی وجہ سے نہیں بھر سکے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے پاؤں کی ایڑی اس سوراخ پر رکھ دی اور سونے کی غرض سے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سانپ جو اس سوراخ میں بیٹھا تھا جب باہر نکلنے لگا تو حضرت ابوبکرؓ کی ایڑی سے ٹکرا گیا اور جھنجھلا کر انہیں ڈس لیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ درد کی شدت سے بلبلا اٹھے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پسینے کے قطرے ان کے چہرے سے ڈھلک کر حضرت محمد ﷺ کی پیشانی پر ٹپکنے لگے اور یوں ان کی بھی آنکھ کھل گئی۔ حضرت محمد ﷺ نے جب یہ دیکھا

کہ حضرت ابوبکرؓ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ چکا ہے تو فوراً سمجھ گئے کہ وہ ضرور کسی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ وجہ پوچھنے پر جب انہیں یہ علم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ کو سانپ نے ڈس لیا ہے تو فوراً کاٹے کی جگہ کو باندھ کر اس کا زہر نکال دیا اور اپنا لعاب مبارک اس جگہ پر لگایا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ آرام کرنے کے قابل ہو گئے۔

جس رات حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ مذکورہ غار (یعنی سانپوں والی غار) کی طرف رہ نوردی کر رہے تھے تو اسی رات مکہ میں قریش کے منتخبہ افراد اپنے قبائلی منصوبے کے تحت حضرت محمد ﷺ کے گھر میں داخل ہو گئے تاکہ آپؐ کا (نعوذ باللہ) کام تمام کر دیں۔ لیکن وہاں انہیں آپؐ کی بجائے حضرت علیؓ کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے متعجب ہو کر حضرت علیؓ سے پوچھا۔ آیا محمد (ﷺ) مکہ سے باہر نکل گئے ہیں۔

حضرت علیؓ جو راست گو تھے اور جھوٹ نہیں بولتے تھے' بولے کہ ہاں آپؐ مکہ سے باہر چلے گئے ہیں۔

یہ جانتے ہی قریش کے کارندے اسی رات مکہ کے آس پاس پھیل گئے اور گرد و نواح کے بیابانوں میں حضرت محمد ﷺ کی تلاش شروع کر دی۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کروا دیا کہ جو شخص آپؐ کو ڈھونڈ نکالے گا یا ان کی خفیہ گاہ کا پتہ چلائے گا تو اسے انعام کے طور پر ایک سو اونٹ پیش کئے جائیں گے۔ اگلے دن قریش کے کارندے تیز رفتار اونٹوں کے ذریعے اس علاقے تک پہنچ گئے جہاں سانپوں والی غار تھی اور جہاں حضرت محمد ﷺ' حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ پناہ لئے بیٹھے تھے۔ اگرچہ قریش کے افراد غار کے سامنے سے گزرے اور دیکھا بھی لیکن اس میں داخل نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مکڑی نے غار کے منہ پر جالا بن دیا تھا لہٰذا جب تعاقب کرنے والوں نے یہ دیکھا کہ غار کے مدخل پر مکڑی کے تاروں کا پردہ پڑا ہوا ہے تو انہیں یقین ہو گیا کہ محمد ﷺ کم سے کم اس غار میں داخل نہیں ہوئے کیونکہ اگر وہ غار میں داخل ہوتے تو مکڑی کا جالا ٹوٹ جاتا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا تعاقب کرنے والوں کے پہلے دستے کے بعد دوسرا گروہ بھی اسی غار کے پاس پہنچا اور انہوں نے مشاہدہ کیا کہ غار کے دہانے پر ایک پرندے کا گھونسلہ بنا ہوا ہے اور اس کے انڈے بھی وہاں موجود ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ محمد (ﷺ) بلاشبہ اس غار میں داخل نہیں ہوئے کیونکہ اگر وہ اس غار میں داخل ہوتے تو مکڑی کا جالا اور پرندے کا آشیانہ یہاں نہ ہوتے۔

دوسری طرف غار کے اندر کی صورت حال یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ جو تھکن سے چور تھے اور سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا تھے' قریش کی رفت و آمد دیکھ کر مزید ہراس میں مبتلا ہو گئے لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے اللہ کی مدد کا یقین دلایا۔ قرآن کی نویں سورۃ "توبہ" کی چالیسویں آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

"یعنی اگر تم نے (اے کفار) ان کی مدد نہ کی لیکن اللہ نے' جبکہ کفار نے انہیں مکہ سے نکال دیا تھا' مدد کی اور وہ ان دو افراد میں سے ایک تھے جو غار میں ٹھہرے ہوئے تھے اور پیغمبر (ﷺ) نے اپنے دوست سے کہا کہ غم زدہ نہ ہو کیونکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (اور ایسا ہی ہوا) اللہ نے اس پر جو بہت ڈرا ہوا تھا تسکین نازل کی" یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو طمانیت قلب حاصل ہوئی۔

حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ تین شب و روز تک اسی غار میں ٹھہرے رہے اور جب وہاں سے نکلے تو ان کی نظر مکڑی کے جالے اور پرندے کے گھونسلے پر پڑی اور انہیں یقین ہو گیا کہ اللہ کی رحمت اور مدد ان کے شامل حال ہے۔

تین دن کی جستجو کے بعد قریش بھی تھک گئے اور ہار مان کر مکہ واپس چلے آئے۔

اسی اثناء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا غلام عامر بن فہیرہ طے شدہ منصوبے کے مطابق دو سفید اونٹنیاں لے کر مذکورہ غار تک پہنچ گیا اور حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ ان پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے تاہم انہوں نے احتیاطی طور پر سمندر کے کنارے کا

راستہ اختیار کیا تاکہ تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں سے بچے رہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے بدن پر قبا نہیں تھی اور حضرت محمد ﷺ بھی چونکہ بڑی عجلت میں گھر سے روانہ ہوئے تھے اس لئے وہ بھی مناسب لباس اپنے ہمراہ نہ لا سکے تھے۔ ان دونوں کا لباس پھٹے ہوئے کپڑوں پر مشتمل تھا اور اگر اس لمحہ کوئی انہیں دیکھتا تو حیرت میں ڈوب جاتا کہ یہ پھٹے پرانے کپڑوں والے کیونکر سفید اونٹنی پر جو صحرائے عرب کی بہترین اور گراں بہا ترین سواری ہے، بیٹھے ہوئے ہیں۔

دوسری طرف قریش کے ڈھنڈورچی سب جگہ یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ جو کوئی بھی محمد (ﷺ) کو گرفتار کرے یا انہیں پکڑنے میں مدد دے تو انعام کے طور پر ایک سو اونٹ کا حقدار قرار پائے گا۔



ہجرت

ایک دن قبیلہ بنو مدلج کا سربراہ اپنے خیمے میں بیٹھا کچھ لوگوں کے ساتھ مصروف گفتگو تھا کہ ایک شخص خیمے میں داخل ہوا اور بولا: اے سراقہ! میں نے آج دو اونٹ سواروں کو دیکھا ہے جو جماز (اونٹنی) پر سوار تھے اور سمندر کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے ایک یقیناً محمد (ﷺ) تھا۔

سراقہ بن مالک نے جیسے ہی یہ بات سنی تو اس شخص کی بتائی ہوئی نشانیوں سے فوراً یہ سمجھ گیا کہ بلاشبہ ان دو مسافروں میں سے ایک محمد (ﷺ) ہے جس کے سر کی قیمت ایک سو اونٹ مقرر کی گئی ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ خبر لانے والا شخص اس کے انعام میں شریک نہ ہو جائے تو اسے بہکانے کی خاطر بولا: "ارے تجھے غلط فہمی ہوئی ہے وہ دونوں اونٹ سوار تو گزشتہ رات میرے مہمان تھے اور آج صبح ہی یہاں سے روانہ ہوئے ہیں!"

جب وہ شخص مایوس ہو کر چلا گیا تو سراقہ بن مالک اپنے قبیلے کے چند افراد کے ساتھ

تیز رفتار گھوڑوں پر سوار حضرت محمد ﷺ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا (واضح رہے کہ سراقہ بن مالک کا قبیلہ قریش کے اتحادیوں میں شمار ہوتا تھا) اور چونکہ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے لہٰذا بہت جلد حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ تک پہنچ گئے اور ان کے قریب پہنچتے ہی جب سراقہ نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی تو وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔

سراقہ نے مسلسل تین مرتبہ حضرت محمد ﷺ تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کے گھوڑے کی ٹانگیں خم ہو گئیں اور وہ زمین بوس ہو گیا۔

دور جاہلیت کے اعراب فال نکالنے پر یقین رکھتے تھے لہٰذا جب سراقہ کا گھوڑا تین مرتبہ لڑکھڑا کر گرا تو اس نے فال نکالنے کا فیصلہ کیا کہ آیا محمد ﷺ کو پکڑ کر قریش کے حوالے کر دے یا نہیں لیکن اس کی فال بھی منفی نکلی لیکن اس کے باوجود اس نے چوتھی بار گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس مرتبہ بھی وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا اور وہ شخص پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ تک پہنچنے میں ناکام رہا۔

جب سراقہ نے یہ دیکھا کہ اس کا گھوڑا متواتر چار بار زمین بوس ہو چکا ہے اور اس کی فال بھی اچھی نہیں نکلی تو وہ فریاد کناں چلایا: یا محمد (ﷺ) ٹھہرو میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

سراقہ نے اپنا گھوڑا اپنے ہمراہیوں کے حوالے کیا اور پیدل ہی حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف روانہ ہو گیا اور ان کے سامنے پہنچنے کے بعد بولا: "یا محمد (ﷺ) میں قریش کا اتحادی ہوں اور چاہتا تھا کہ آپ کو گرفتار کر کے قریش کے حوالے کر دوں اور اس کے بدلے میں ایک سو اونٹ دریافت کروں لیکن اب مجھے احساس ہوا ہے کہ آپؐ برحق ہیں کیونکہ میرا گھوڑا چار بار زمین پر گر گیا اور آپ تک نہ پہنچ سکا لہٰذا میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ آپ ایک دن قریش پر غلبہ پالیں گے اور میں اس دن کے لئے آپ سے امان مانگتا ہوں۔" پیغمبر اسلامؐ نے پوچھا: "تمہارا مطلب کیا ہے؟"

سراقہ بن مالک نے جواب دیا: "میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ قریش پر غلبہ کریں

تو مجھے ان کا ساتھ دینے کے جرم میں سزا نہ دیں اور نہ ہی میرے قبیلے کو انتقام کا نشانہ بنائیں"۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا کہ اس دن تم امان میں ہو گے اور کوئی تمہیں، یا تمہارے قبیلے کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

بعد میں سراقہ بن مالک مسلمان ہو گئے اور ان کا شمار اسلام کے نامور سرداروں میں ہونے لگا۔ اور اس دن کے بعد انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی جستجو میں آنے والے قریش کے افراد کو اپنے قبیلے کی حدود میں آنے سے منع کر دیا اور جب بھی کوئی وہاں آتا تو وہ اسے گمراہ کر دیتے اور کہتے کہ محمد (ﷺ) یہاں سے نہیں گزرے شاید کسی اور راستے سے گئے ہوں گے۔

کچھ اسلامی کتابوں میں یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ ہجرت کے سفر میں حضرت ابوبکرؓ کے خادم عامر بن فہیرہ اور ایک دوسرے غلام جو دونوں آزاد ہو چکے تھے' حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔ ان کتابوں کے مؤلفین نے لکھا ہے کہ عامر بن فہیرہ چونکہ مختلف راستوں کو بخوبی پہچانتا تھا اور رہنما (یعنی گائیڈ) کے طور پر بھی کام کرتا تھا اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے اسے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

دو دن کے بعد حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کا سامنا ایک قافلے سے ہوا اور پتہ چلا کہ آپؐ کا ایک چچا زاد بھائی "زبیر بن العوام" اس قافلے میں سفر کر رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے زبیر سے کچھ کپڑے اور اشیائے خورد و نوش حاصل کیں اور اپنا سفر جاری رکھا۔
مزید دو دن کی رہ نوردی کے بعد وہ لوگ "اسلم" نامی قبیلے میں پہنچے اور اس قبیلے کے سربراہ "اوس بن ہاجر" نے تجویز پیش کی کہ وہ لوگ اس قبیلے کے ایک فرد کو جو درحقیقت راہنما (گائیڈ) بھی تھا' اپنے ہمراہ لے جائیں تاکہ وہ ان لوگوں کو بخیر و عافیت مدینہ کی حدود تک پہنچا دے۔ اس طرح مسعود نامی ایک سفری راہنما پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ہو لیا۔

جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں ایک سفری راہنما یعنی گائیڈ صرف راستہ بتانے والا شخص ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت ایک پاسپورٹ کی سی بھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان

خشک اور بے آب و گیاہ صحراؤں میں ایک گائیڈ کا وجود سفر کرنے والوں کے لئے فی الحقیقت زندگی کے بیمے جیسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحرا میں سبھی ایک راہنما کو پہچانتے ہیں اور راہنما بھی سب سے واقفیت رکھتا ہے لہٰذا اتنا ہی کافی ہے کہ جب وہ دور سے آواز لگائے اور اپنا تعارف کروائے تو راستہ روکنے والے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور مسافروں کو جانے دیتے ہیں۔ جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں جو مسافر کسی راہنما کے ساتھ سفر کرتا ہے تو وہ کسی مشکل سے دوچار نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی اس کی جان و مال پر بری نظر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت محمد ﷺ نے اوس بن ہاجر کی تجویز مان لی اور مسعود کو سفری راہنما کے طور پر اپنے ساتھ لے لیا۔

مسعود نے پیغمبر اسلامؐ کو بتایا کہ وہ اپنے قبیلے کی حدود تک ہی ان کا ساتھ دے سکتا ہے اور اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پیغمبر اسلامؐ نے یہ بات بھی مان لی اور یوں وہ دونوں حضرات مسعود کی راہنمائی میں دوبارہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ مسعود نے اپنے قبیلے کی آخری حدود تک ان کا ساتھ دیا اور وہاں پہنچنے کے بعد بولا کہ میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا کیونکہ اپنے قبیلے کی حدود سے نکل جاؤں گا۔ حضرت محمد (ﷺ) نے شکریئے کے ساتھ مسعود کو اذن رخصت دیا اور وہ اپنے قبیلے کی طرف واپس لوٹ گیا۔ قبیلہ اسلم کی حدود سے خارج ہونے کے بعد حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جس کے دوسرے سرے پر "قبا" نامی سرزمین واقع تھی۔

قبا کے نزدیک پہنچتے ہی پیغمبر اسلام ﷺ یک لخت ٹھہر گئے اور حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے: "یا ابوبکر! اس اونٹنی کو جس پر میں بیٹھا ہوا ہوں میرے ہاتھوں فروخت کر دو۔" حضرت ابوبکرؓ تعجب آمیز لہجے میں بولے: "یا رسول اللہ ﷺ! اس اونٹنی کو خریدنے کی کیا ضرورت ہے میں اس قصوئ کو یونہی آپ کی نذر کرتا ہوں۔"

"قصوئ" جزیرۃ العرب کی اصیل اونٹنی کو کہتے تھے۔ ایسی اونٹنی باربرداری کے لئے استعمال نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف سواری یا اونٹوں کی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے پرورش

پاتی تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا "یا ابوبکر! میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنی ساری دولت اللہ کی راہ میں اور اس کے دین کے فروغ کے لئے پانی کی طرح بہادی ہے لیکن میں اس اونٹنی کو اپنے ذاتی استعمال کے لئے چاہتا ہوں لہٰذا تمہیں اس کی بخشش نہیں کرنی چاہیے۔ تم اس قصویٰ کی قیمت بتادو میں ادا کردوں گا۔"

جزیرۃ العرب میں کچھ اصیل اونٹنیوں (یعنی قصویٰ) کے کان کاٹ دیئے جاتے تھے اور ایسا کرنے سے ان کا یہ خیال تھا کہ اگر اونٹنی کے کان تھوڑے سے کاٹ دیئے جائیں تو وہ زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ لگا سکتی ہے۔ اس قسم کی گوش بریدہ یعنی کان کٹی اونٹنی کو عربی زبان میں "قصویٰ" کہتے ہیں اور چونکہ جس اونٹنی پر پیغمبر اسلامؐ سفر کر رہے تھے اس کا کان بھی کٹا ہوا تھا لہٰذا وہ بھی ایک "قصویٰ" تھی۔ تاہم بعد میں یہ نام اسلامی تاریخ میں "اسم خاص" کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ دیکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قصویٰ کو بطور نذرانہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو انہوں نے چار سو درہم کے عوض وہ اونٹنی پیغمبر اسلامؐ کے ہاتھوں فروخت کردی اور یہ وہی اونٹنی ہے جس کا نام اسلامی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکا ہے اور وہ مسلمان جو پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت کی تاریخ سے واقف ہیں یہ ضرور جانتے ہیں کہ جس اونٹنی پر بیٹھ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اس کا نام "قصویٰ" تھا۔



ہجرت کی اہمیت اسلام میں اور جہان میں

حضرت محمد ﷺ کی ہجرت تاریخ اسلام کا انتہائی اہم واقعہ ہے کیونکہ اس ہجرت کے بعد اسلامی معاشرہ صحیح معنوں میں ایک "امت" میں بدل گیا۔ رنگ و نسل، اعلیٰ و ادنیٰ اور امیر و غریب کے طبقاتی فاصلے مٹ گئے۔ خاص طور پر اشرافیہ طبقے کی فوقیت اور قبائلی بالادستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ سارے مسلمان ساجی طور پر ایک دوسرے کے برابر قرار دے دیئے گئے۔

ہجرت، پرانی دنیا اور نئے ماحول کے درمیان حد فاصل بن گئی جس نے دورہ جاہلیت کو عہد اسلام سے جدا کر دیا اور کچھ اس طرح خاندانی برتری کا پانسہ الٹ دیا کہ جیسا کہ ہم بعد ازاں بتائیں گے کہ جب حضرت محمد ﷺ قبا میں داخل ہوئے تو حضرت عمرؓ بن خطاب جیسا شخص جو مکہ کے سرداروں میں اول مقام رکھتا تھا اور جس کی قامت دو میٹر کے برابر تھی اور جس کی آواز آسمانی بجلی کی کڑک کی طرح فضا میں گونجتی تھی اور لوگ کہتے

تھے کہ ابلیس بھی ان سے ڈرتا ہے تو ایسا شخص اپنے کندھوں پر پتھر اٹھا رہا تھا اور مٹی ڈھو رہا تھا تاکہ مسجد کی تعمیر میں حصہ لے سکے اور خود سرکار دو عالمؐ اور حضرت ابوبکرؓ اس مٹی سے جسے حضرت عمرؓ بن خطاب لاتے تھے مسجد کی تعمیر کے لئے گارا بنا رہے تھے۔ حالانکہ اسلام لانے سے پہلے اگر حضرت عمرؓ بن خطاب کو جزیرۃ العرب کی ساری دولت پیش کی جاتی تو وہ ایک پتھر تو کیا مٹھی بھر مٹی بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے پر راضی نہ ہوتے کیونکہ مکہ میں ہر قسم کا کام نوکروں اور غلاموں کی ذمہ داری ہوتا تھا اور اشرافیہ طبقہ اپنے آپ کو ایک برتر مخلوق تصور کرتا تھا۔

قبا کی وادی مدینہ کے جنوب میں واقع تھی اور وہ علاقہ مدینہ کے حدود میں شمار ہوتا تھا۔ مغربی مؤرخین کہتے ہیں کہ سن ۶۲۲ء میں ستمبر کے مہینے کی دوسری تاریخ کو قبا میں داخل ہوئے لیکن اسلامی مؤرخین کا کہنا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مورخہ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء کو قبا میں قدم رکھا اور چونکہ وہ دن محرم کے مہینے کا ایک دن تھا لہٰذا مسلمانوں نے محرم کی پہلی تاریخ کو اسلامی سال کا مبداء قرار دیا اور آج بھی دنیا کی ساری مسلمان قومیں اسی تاریخ کو جو تاریخ ہجری کے نام سے موسوم ہے اپنے معمولات زندگی میں استعمال کرتی ہیں۔

اگر پیغمبر اسلام ﷺ جولائی کی ۱۶ تاریخ کو قبا میں داخل ہوئے ہوں تو جیسا کہ اسلامی مؤرخین نے بھی لکھا ہے کہ موسم گرما کے باعث ان دنوں شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ قبا کے شہریوں نے سن رکھا تھا کہ حضرت محمد ﷺ آج وہاں پہنچنے والے ہیں لہٰذا وہ پو پھٹتے ہی اپنے گھروں سے نکل کر پیغمبر اسلام ﷺ کے انتظار میں کھڑے ہو گئے تھے لیکن جب سورج سر پر آگیا اور گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تو لوگ سورج کی تیز شعاعوں کو برداشت نہ کر سکے اور اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ قبا میں داخل ہوئے تو سورج آسمان کے وسط میں تھا اور اس کی شعاعوں کی حدت سے زمین کچھ اس طرح دہک رہی تھی کہ اگر کوئی برہنہ پا قدم اٹھاتا تو

فوراً اس کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے۔
کوئی بھی گلی کوچوں میں نہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی آمد کا نظارہ دیکھ سکے اور صرف ایک یہودی، کہ تاریخ نے جس کا نام ثبت نہیں کیا اس لمحہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس یہودی کو قبا کے دوسرے شہریوں کی طرح یہ علم تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ آج قبا میں داخل ہونے والے ہیں لہٰذا اس نے جیسے ہی دو سفید اونٹنیوں کو دیکھا اور ان پر سوار دو افراد پر نظر دوڑائی تو فوراً سمجھ گیا کہ آپؐ قبا میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی وہ قبا کے گلی کوچوں میں دوڑنے لگا اور زور زور سے چلانے لگا کہ "اے یہودیو! آگاہ رہو تمہارا نجات دہندہ آ گیا ہے"۔ مدینہ کے یہودی بھی جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مسلمانوں کی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی آمد کے منتظر تھے تاکہ وہ ان کے باہمی اختلافات کا خاتمہ کر دیں جن کی وجہ سے ان کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔
قبا کے لوگوں نے جب اس شخص کی چیخ و پکار سنی تو اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ نہ صرف مرد اور عورتیں بلکہ کمسن بچے بھی دوپہر کی شدید گرمی کے باوجود گھروں سے نکل آئے تاکہ آپؐ کو ایک نظر دیکھ سکیں اور یہ دیکھ سکیں کہ وہ پیغمبر جو اللہ کی طرف سے مبعوث ہوا ہے کیسا ہے!
حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے کھجور کے دو درختوں کے سامنے اپنی اونٹنیوں کو بٹھایا اور نیچے اتر کر نخل کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ قبا کے رہنے والے جن میں مسلمان اور یہودی دونوں شامل تھے آپ کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دو میں سے کون پیغمبر اسلام ﷺ ہیں۔
حضرت ابوبکرؓ چونکہ حضرت محمد ﷺ سے تین سال بڑے تھے لہٰذا وہ اس بنا پر کہ لوگ غلطی نہ کریں اور انہیں پیغمبر نہ سمجھ بیٹھیں ایک دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور اپنا لبادہ اتار کر ایک سائبان کی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کے سر پر تھام لیا تاکہ وہ سورج کی تمازت سے محفوظ رہیں۔ دراصل ان درختوں کا سایہ اتنا نہیں تھا کہ انہیں سورج کی گرمی

سے محفوظ رکھ سکے اور حضرت ابوبکرؓ کا بنایا ہوا سائبان آپ کو بہتر طور پر سورج کی شعاعوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔

اس لمحہ لوگوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کو بخوبی پہچان لیا اور عربوں کی رسم کے مطابق انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے "ہلہلہ" مچانا شروع کر دیا۔ (ہلہلہ یعنی "Applause Cry Of Exculation" دراصل عرب باشندوں کا مخصوص انداز ہے اور یہ خاص طرز کی اس آواز کا نام ہے جسے عرب باشندے خوشی کے مواقع پر یا کسی کے استقبال کرنے کی خاطر اپنے منہ سے نکالتے ہیں جو لوگ عرب ممالک میں رہے ہوں وہ "ہلہلے" کا انداز اور اس کا مفہوم بخوبی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ رسم آج بھی برقرار ہے تاہم ہلہلے کی ایک قسم اظہار اعتراض کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ خلیل)

جس جگہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اپنے اونٹوں سے اترے تھے اس کا نام محلہ بنی عمرو بن عوف تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے پوچھا "یہ جگہ کس کی ملکیت ہے؟" جواب میں ایک نوجوان آگے بڑھا اور بولا "یہ زمین میری ہے اور کھجور کے ان درختوں کو میں نے بویا ہے"۔

آپ ﷺ نے کہا "میرا مطلب یہ تھا کہ اس زمین کا مالک' کہ اب مجھے پتہ چل گیا ہے تم ہو' کیا اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم کچھ دیر کے لئے ان درختوں کے سائے تلے ٹھہر جائیں؟"

اس نوجوان نے بصد اشتیاق جواب دیا "کیوں نہیں آپ جب تک چاہیں یہاں ٹھہر سکتے ہیں یا قیام کر سکتے ہیں"۔ لیکن اسی لمحہ قبا کے مسلمانوں میں سے ایک خاتون جن کا نام کلثوم تھا آگے بڑھیں اور انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ اور ابوبکرؓ سے درخواست کی کہ وہ ان کے گھر چلیں اور وہاں قیام کریں۔ آپ نے ان کی دعوت قبول کرنے سے اجتناب کیا اور بولے کہ ہم لوگ تمہارے لئے زحمت کا باعث بنیں گے لیکن ام کلثومؓ نے مصر ہوتے ہوئے جواب دیا کہ یا رسول اللہ میرے گھر میں ایک حجرہ خالی ہے جو میرے استعمال میں

نہیں لہٰذا آپ اور آپ کا ساتھی بلا تکلف اس حجرے میں ٹھہر سکتے ہیں۔ میں خود آپ کے اونٹوں کی دیکھ بھال کروں گی اور ان کے دانہ پانی کا خیال رکھوں گی۔ لہٰذا ام کلثوم کے اصرار پر پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کی دعوت قبول کرلی اور ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر مذکورہ حجرے میں سکونت اختیار کرلی۔

دوسری طرف اہل مدینہ بھی اسی دن آپؐ کی آمد سے باخبر ہو گئے اور پہلا شخص جو پیغمبر اسلام ﷺ کے شوق دیدار میں مدینہ سے قبا پہنچا وہ عمرؓ بن خطاب تھے۔ بعد ازاں دوسرے مسلمان بھی قبا پہنچنا شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ آپؐ اپنے مختصر سے حجرے میں ان سب کو خوش آمدید نہیں کہہ سکتے تھے لہٰذا سعد بن خیثمن نامی شخص نے جس کا شمار بھی مسلمانوں میں ہوتا تھا اپنے گھر کو جو خاصا بڑا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے اختیار میں دے دیا تاکہ اس وسیع گھر میں پیغمبر اسلام ﷺ کو دیگر مسلمانوں سے ملاقات کرنے میں سہولت رہے۔ تاہم آرام کرنے کی غرض سے آپ ام کلثوم کے چھوٹے گھر میں واپس آجاتے اور رات بھی وہیں بسر کرتے تھے۔

قبا پہنچنے کے تیسرے دن حضرت محمد ﷺ نے ایک مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے مسجد کی زمین بطور ہدیہ پیش کرنا چاہی لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا کہ میں اس زمین کو خریدنا زیادہ پسند کروں گا۔ لہٰذا انہوں نے وہ زمین خرید لی۔ اسلامی تاریخ میں زمین کی قیمت درج نہیں لیکن سبھی مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ مسجد قبا کی زمین کو پیغمبر اسلام ﷺ نے خریدا تھا۔

مسجد قبا وہ پہلی مسجد ہے جو مسلمانوں نے تعمیر کی اور سارے مسلمان خواہ وہ جو حضرت عمرؓ کی طرح مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے اور مہاجرین کہلاتے تھے اور وہ جو مدینہ کے مسلمان باشندے تھے اور انصار کے نام سے مشہور تھے مذکورہ مسجد کی تعمیر میں شریک ہوئے۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ بھی حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مل کر گارا بناتے اور اینٹیں ڈھالتے تھے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب بھی اپنے کندھوں پر بھاری بھرکم پتھر اٹھاتے اور

بہت دور سے مٹی کی بوریاں ڈھو کر لاتے تھے تاکہ اس سے گارا بنا کر اینٹیں ڈھالی جا سکیں۔

مسجد قبا حقیقی معنوں میں مسلمانوں کی پہلی جامع مسجد ہے کیونکہ سارے مسلمانوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اور حضرت عمرؓ بن خطاب' حضرت ابوبکرؓ اور صہیبؓ رومی جیسے نامی گرامی اور اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ دوسرے غریب اور مفلس مسلمانوں کے شانہ بشانہ پتھر ڈھوتے رہے اور عام مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ بھی صبح سے شام تک عام لوگوں کی طرح کام کرتے رہتے تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے قبا میں بیس روز قیام کیا اور جب مسجد مکمل ہو گئی تو انہوں نے مدینہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا جسے اس زمانے میں "یثرب" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

عربی زبان میں یثرب کے معنی ہیں ایسا مقام جو انسان کو تکلیف پہنچائے یا ایسی جگہ جہاں انسان بیمار پڑ جائے۔ یہ نام دراصل بدوی باشندوں نے اس شہر کے لئے منتخب کیا تھا کیونکہ ایک بدوی عرب جو صحرا میں پہلی بار بارش کا رنگ دیکھتا تھا (اور وہ بھی صرف موسم بہار میں) جب مدینہ میں قدم رکھتا تو وہاں کی بارشوں کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ اسی بنا پر صحرانشین باشندے مدینہ کو ایک خراب آب و ہوا والا شہر سمجھتے تھے اور اسے یثرت کے نام سے پکارتے تھے۔ جبکہ شہر کے اصلی باشندوں نے اسے "طیبہ" کا نام دے رکھا تھا یعنی پاکیزہ اور دل پسند شہر۔ لہٰذا مدینے کا پہلا نام طیبہ تھا اور اس کی وجہ تسمیہ غالباً" یہ تھی کہ جب کوئی انسان جزیرۃ العرب کے سلگتے ہوئے صحراؤں سے نکل کر طیبہ میں قدم رکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے بہشت میں داخل ہو گیا ہو۔ لیکن بدوی باشندے جو صحرا کی خشک آب و ہوا میں پرورش پاتے تھے جب طیبہ میں داخل ہوتے تو وہاں کی آب و ہوا کو جس میں قدرے نمی بھی ہوتی تھی برداشت نہ کر پاتے اور جلد ہی بیمار پڑ جاتے تھے۔ تاہم کچھ عرصہ بعد وہ بھی اس شہر کے عادی ہو جاتے اور وہاں کی مرطوب ہوا انہیں پریشان نہیں کرتی تھی۔

وہ لوگ جو مکہ سے ہجرت کر کے یثرب پہنچے تو شروع میں ان لوگوں کی اکثریت بیمار پڑ گئی' حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ' حضرت ابو بکرؓ اور ان کا آزاد شدہ غلام عامر بن فہیرہ بھی مدینہ پہنچنے کے بعد بیمار ہو گئے تھے۔

لہٰذا دو مختلف طرز تفکر رکھنے والوں نے اس شہر کے لئے دو مختلف نام تجویز کر رکھے تھے جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بالکل متضاد تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے اس شہر میں داخل ہونے کے بعد ایک تو اس لئے کہ دو متضاد ناموں کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے اس بنا پر بھی کہ یہ نام وہاں کے مقامی مسلمانوں یعنی انصار اور مکہ سے آنے والے مسلمانوں یعنی مہاجرین کے درمیان اختلاف نظر کا سبب نہ بنے' دونوں ناموں کو منسوخ کر دیا اور اس شہر کو مدینہ کہہ کر پکارا یعنی "شہر"۔ مدینہ کے لفظ سے نہ تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شہر اچھا ہے اور نہ ہی یہ پتہ چلتا تھا کہ برا ہے۔

مدینے کا رقبہ' جب آپ ﷺ وہاں داخل ہوئے تو تیس کلو میٹر کے برابر تھا۔ اس شہر میں عام گھروں کے علاوہ بہتر قلعے بھی موجود تھے جن میں سے ۵۹ قلعے یہودیوں کے اور باقی تیرہ قلعے مدینہ کے اعراب کے تھے۔

شہر مدینہ بلندی پر واقع ہے اور دو پہاڑ اس کے شمال اور جنوب میں سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ مدینہ کے تین طرف یعنی مشرق' مغرب اور جنوب میں منجمد شدہ آتش فشاں لاوا پھیلا ہوا ہے۔

اس زمانہ میں مدینہ کی آب و ہوا (آج کی طرح) معتدل تھی اور وہاں جزیرۃ العرب کے دوسرے علاقوں کی نسبت بارشیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس شہر کے کنارے پانی کا بڑا تالاب بھی تھا جو بارش کے پانی سے بھرا رہتا تھا اور کبھی خشک نہیں ہوتا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی طفولیت کے زمانے میں' جیسا کہ آپ اس کتاب کے آغاز میں پڑھ چکے ہیں' اسی تالاب میں تیرنا سیکھا تھا اور وہ طفل جو مکہ میں پانی سے نہیں کھیل سکتا تھا اسی تالاب میں تیرنے اور پانی سے کھیلنے سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔

مدینہ کے رہنے والے بھی اہل مکہ کی طرح مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر شخص کسی نہ کسی قبیلے سے وابستہ تھا۔

وہاں بھی مکہ کی طرح پولیس تھی نہ جیل اور نہ ہی کوئی عدالت لہٰذا جو بھی حق تلفی کا نشانہ بنتا تو اپنے قبیلے سے امداد طلب کرتا تاکہ اس کا قبیلہ اس کا حق واپس دلوا سکے۔

مدینہ میں بھی مکہ کی طرح انسانی جان کا قتل گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک نقصان تصور ہوتا تھا اور قاتل مقتول کے قبیلے کو خون بہا ادا کر کے حساب برابر کر دیتا تھا۔ خون بہا کی کم سے کم حد ایک سو اونٹ تھی لیکن بڑے لوگوں کے خون کی قیمت اس سے زیادہ دریافت کی جاتی تھی۔

مدینہ کے رہنے والے آدھے باشندے عرب تھے اور آدھے یہودی۔

مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے تھے اور اعراب بھی تین قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مدینہ کے اعراب کا ذریعہ معاش زراعت اور مویشیوں کی پرورش تھا اور ان میں سے کچھ تجارت کا پیشہ بھی اختیار کئے ہوئے تھے۔ یہودیوں کے تینوں قبیلوں کا مشغلہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک قبیلہ کھیتی باڑی کرتا تھا اور دوسرا زرگری اور گوہر فروشی اور تیسرا قبیلہ باغبانی کے ذریعے اپنی روٹی کماتا تھا۔

مدینہ کے اعراب میں گاہے اوقات جنگ بھی چھڑ جاتی تھی اور ان میں سے ایک لڑائی اسلام سے پہلے مدینہ کے دو عرب قبیلوں کے درمیان چھڑی تھی جس کی وجہ زمین کا تنازعہ تھا۔

مذکورہ دو قبیلوں کو اس معرکہ آرائی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا لیکن ایک شخص جس کا نام عبداللہ بن ابی تھا' اس نزاع سے فائدہ اٹھا گیا اور اس نے اپنی قدر و منزلت میں اتنا اضافہ کر لیا کہ مدینہ کے کچھ لوگ اسے اپنا بادشاہ بنانے کی سوچنے لگے حتیٰ کہ مدینہ کے سناروں نے اس کے سر کا ناپ بھی لے لیا تاکہ اس کے لئے تاج بنا سکیں۔ لیکن جب انہوں نے یہ سنا کہ پیغمبر اسلام ﷺ مدینہ آ رہے ہیں اور وہ سب لوگوں کے درمیان

انصاف برقرار کردیں گے اور باہمی رنجشوں کا خاتمہ کردیں گے تو انہوں نے عبداللہ بن ابی کو بادشاہ بنانے کا خیال ترک کردیا۔

اس سے پہلے کہ حضرت محمد ﷺ مدینہ میں داخل ہوں تو وہاں "اشنق" نامی ایک شخص ایسا تھا جو انسانی قتل کے سلسلے میں خون بہا کا تعین کرتا یا کسی جرم کے بارے میں سزا سناتا تھا۔

ہجرت سے پہلے حضرت ابوبکرؓ بھی مکہ میں ایسے ہی مقام پر فائز تھے اور جب بھی کوئی قتل واقع ہوتا یا آنکھ پھوڑ دی جاتی یا کسی کا دانت توڑ دیا جاتا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس شکایت لے کر آتا تاکہ وہ خون بہا یا دیت کی شرح معلوم کریں۔

مدینہ میں خون بہا کی شرح یا دوسرے جرائم کی سزا مکہ سے مختلف نہ تھی اور وہاں بھی ایک آدمی کے خون کی قیمت ایک سو اونٹ اور آنکھ پھوڑنے کا جرمانہ پچاس اونٹ کی صورت میں طلب کیا جاتا تھا تاہم دانت توڑنے کی سزا دانت کا توڑنا ہی ہوتا تھا یعنی جس کسی کا دانت ٹوٹتا تو وہ اپنے مدمقابل کا دانت توڑنے کا حق رکھتا تھا۔

مدینہ کے یہودی جو پیغمبر اسلام ﷺ کی آمد پر خوش تھے تو وہ اس خوشی کے علاوہ اپنے دلوں میں یہ آس بھی لگائے بیٹھے تھے کہ آپ ان کے دین کو قبول کرلیں گے۔

حضرت محمد ﷺ نے بھی مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ کے احکام کے مطابق کچھ اس طرح کا مصالحت آمیز لائحہ عمل اختیار کیا کہ جس سے یہودیوں کی امیدواری مزید بڑھ گئی۔ ان میں سے ایک مسجد قبا کی تعمیر تھی جس کا قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا۔

یہودیوں نے جب یہ دیکھا کہ مسجد قبا کی محراب بیت المقدس کی طرف ہے تو انہیں یقین ہو گیا کہ آپ عنقریب موسیٰ کا دین قبول کرلیں گے کیونکہ قرآن میں گزشتہ پیامبروں کا نام جن میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی شامل ہیں بڑے احترام سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بھی سمائی ہوئی تھی کہ اگر کوئی قوم اس قابل ہے کہ جس میں پیغمبر اٹھایا جائے تو وہ صرف قوم یہود ہی ہو سکتی ہے۔

جب آپؐ مسجد قبا کی تعمیر میں مصروف تھے تو یہودیوں کے کچھ مذہبی راہنماؤں نے ان سے ملاقات کی اور یہ جاننا چاہا کہ وہ کب موسیٰ کا دین قبول کر رہے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے علمائے یہود کو جو جواب دیئے ان سے واضح ہوتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ لہٰذا یہودیوں نے کہا: یا محمد (ﷺ) اگر تم پیغمبر بننا چاہتے ہو تو پہلے یہودی بنو کیونکہ آج تک جو پیغمبر بھی آیا ہے اس کا تعلق قوم یہود سے تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں صرف قوم یہود ہی اس قابل ہے کہ اس کے برگزیدہ افراد اللہ سے ہمکلام ہو سکیں۔ ہو سکتا ہے اللہ دوسری اقوام سے رابطہ برقرار کرے لیکن یہاں بھی جو قوم واسطے کا کردار ادا کرے گی وہ قوم یہود ہی ہو گی کیونکہ دنیا کی ساری قوموں میں یہودیوں کا مقام اول ہے اور بقیہ قومیں دوسرے' تیسرے یا چوتھے نمبر پر آتی ہیں۔

آپؐ نے یہودیوں کے مذہبی راہنماؤں کو جواب دیا کہ میں بذات خود پیغمبر نہیں بنا بلکہ اللہ نے مجھے پیامبری کے لئے مبعوث کیا ہے۔ اللہ کی نظر میں کوئی قوم دوسری قوم پر برتری نہیں رکھتی اور ساری قومیں اور سارے انسان اللہ کی نظر میں ایک ہیں اور اللہ جب بھی چاہے اور جس کے ساتھ بھی چاہے رابطہ برقرار کر سکتا ہے اور یہ امتیاز صرف قوم یہود کو حاصل نہیں۔

پہلی مرتبہ جب مسلمانوں نے مسجد قبا میں نماز ادا کی تو وہ جمعہ کا دن تھا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے روز جمعہ کو مسلمانوں کی اجتماعی عبادت کا دن قرار دیا۔ یہ بات بھی یہودیوں پر گراں گزری کیونکہ انہیں توقع تھی کہ آپ ہفتے (سنیچر) کے دن کو مسلمانوں کی عبادت کے لئے متعین کریں گے۔

قبا میں کسی بھی یہودی نے اسلام قبول نہیں کیا مگر ایک شخص نے جو وہی یہودی تھا جس نے آپؐ کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ تاریخ نے مذکورہ شخص کا نام ثبت نہیں کیا لیکن کچھ اسلامی مصنفین نے لکھا ہے کہ اس شخص کا نام "شلوم" تھا۔

اسی جمعہ کے دن جب مسلمان فریضہ نماز ادا کرنے کی خاطر مسجد قبا میں جمع ہوئے تو

کچھ یہودی بھی وہاں پہنچ گئے۔ آپؐ نے اپنے خطبے میں یہودیوں کو مخاطب قرار دیتے ہوئے انہیں یہ سمجھانا چاہا کہ وہ لوگ دوسری قوموں سے برتر نہیں۔ اللہ نے کسی قوم کو دوسری قوم پر فوقیت دے کر پیدا نہیں کیا بلکہ اس کی نظر میں سب برابر ہیں البتہ اللہ کا قرب وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو متقی اور پرہیز گار ہوں۔

جب یہودی مسجد قبا سے باہر نکلے تو وہ جان چکے تھے کہ آپؐ یہودیوں کا دین تسلیم کرنے والے نہیں۔ لہٰذا اس دن کے بعد انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ اور عام مسلمانوں کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور اپنی دشمنی کا اظہار افواہوں سے شروع کیا۔ انہوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ اللہ کی طرف سے پیغام آیا ہے کہ ساری مسلمان عورتیں بانجھ ہو جائیں گی اور جو عورت بھی اسلام لائے گی تو وہ ہمیشہ کے لئے بے اولاد ہو جائے گی۔

یہ افواہ ایسے موقع پر پھیلائی گئی کہ جب مکہ سے مہاجرت کرنے والے مسلمان مدینہ کے موسمی اثرات کی وجہ سے بیمار پڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کی عورتیں بھی مردوں کی طرح بیمار تھیں اور جب انہوں نے یہ سنا کہ بے اولاد ہو جائیں گی تو ان پر مزید نفسیاتی دباؤ پڑا اور وہ پہلے سے زیادہ پریشان رہنے لگیں۔

آپؐ نے مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ان سے کہا کہ مسلمان عورتوں کے بارے میں کچھ افواہیں پھیلی ہوئی ہیں جو ہرگز اللہ کا پیغام نہیں لہٰذا تم مردوں کا فرض ہے کہ انہیں حوصلہ و دلداری دو اور یاد رکھو کہ جو انسان بھی اپنے آرام بخش کلام سے کسی کے دل کو تسکین پہنچائے گا تو اس کا اجر اللہ کے پاس محفوظ رہے گا۔

بعد میں اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ مسلمانوں کا قبلہ (جو بیت المقدس کی طرف تھا) بدل دیا جائے اور خانہ کعبہ کو مسلمانوں کا نیا قبلہ قرار دیا جائے۔ لہٰذا مسجد قبا کا قبلہ بھی تبدیل ہو گیا اور چونکہ شروع میں مذکورہ مسجد کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا لہٰذا کچھ اسلامی مؤرخین نے مسجد قبا کو "دو قبلوں والی مسجد" کا نام دیا ہے۔



قبا سے روانگی، مدینہ میں آمد

جب مسجد قبا مکمل ہو گئی تو حضرت محمد ﷺ نے عزم مدینہ کیا اور اپنی اونٹنی پر جس کا نام قصوئی تھا سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب محمد ﷺ مدینہ پہنچے تو سارے مسلمان اس شہر کی گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں جمع ہو چکے تھے اور ان میں سے کچھ لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کی اونٹنی کی طرف جاتے اور اس کی عنان تھام کر یہ درخواست کرتے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے گھر میں قیام کریں یا ان کے محلے کی طرف چلیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جب لوگوں کا اصرار و اشتیاق دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ اگر وہ مسلمانوں میں سے کسی ایک کے گھر میں ٹھہریں یا کسی خاص محلے میں اتریں تو ہو سکتا ہے یہ بات دوسروں کی رنجش یا دل شکنی کا باعث بنے اور وہ یہ تصور کرنے لگیں کہ پیغمبر خدا ان میں سے کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں اور اسے خاص نوازش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کہا میرے اونٹ کی لگام چھوڑ دو اور اسے جہاں بھی چاہے جانے دو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری اونٹنی وہیں بیٹھے گی جہاں اللہ کی مرضی ہو گی اور میں بھی وہیں قیام کروں گا جہاں اللہ چاہے گا۔

پیغمبر کی اونٹنی قصویٰ مدینہ کے کئی محلوں سے گزری اور محلہ "النجار" میں داخل ہو گئی۔ دور سے ایک سفید عمارت نمایاں ہوئی جسے محمد ﷺ نے پہچان لیا اور جان گئے کہ یہ حضرت عبدالمطلب کی والدہ کا گھر تھا جو ہاشم کی زوجہ تھیں۔ مدینہ کے مسلمان بھی اس بات سے باخبر تھے لہٰذا وہ سمجھے کہ قصویٰ اس گھر کے سامنے ٹھہر جائے گی لیکن اس نے وہاں توقف نہیں کیا اور اپنی راہ چلتی رہی۔ مدینہ کے سارے مسلمان پیغمبر ﷺ کی اونٹنی کے پیچھے چل رہے تھے اور یہ جاننے کے مشتاق تھے کہ یہ اونٹنی آخر کار کہاں ٹھہرے گی۔

کچھ مسافت کے بعد وہ لوگ ایسی جگہ پہنچے جہاں حضرت محمد ﷺ کے والد حضرت عبداللہؓ کی قبر تھی تاہم سبھی لوگ جانتے تھے کہ ان کی والدہ آمنہؓ کی قبر وہاں نہیں ہے۔ کچھ مسلمانوں کا خیال گزرا کہ شاید اونٹنی وہاں ٹھہرے لیکن قصویٰ وہاں بھی نہیں رکی اور اپنی راہ چلتی رہی۔ کچھ لمحوں بعد ایسی جگہ پہنچی جہاں "انیسہ" نامی خاتون کا گھر تھا۔ اس زمانے میں جبکہ حضرت محمد ﷺ کی والدہ بقید حیات تھیں اور آپؐ بھی مدینہ میں رہتے تھے تو اس وقت انیسہ ایک کمسن بچی تھی جو آپؐ کے ساتھ کھیلا کرتی تھی لیکن اب وہ ادھیڑ عمر کی عورت سمجھی جاتی تھی۔ پیغمبر ﷺ کی اونٹنی نے وہاں بھی توقف نہیں کیا لیکن وہ اس علاقے سے جو قبیلہ النجار کا مسکن تھا دور بھی نہیں ہوئی تھی۔

آپؐ نے جب یہ دیکھا کہ ان کی اونٹنی اس محلے سے دور نہیں ہو رہی تو انہیں اپنی والدہ اور ان کے خاندان کی یاد آ گئی کیونکہ ان کا شجرہ مادری قبیلے النجار سے پیوستہ تھا اور اگرچہ انہوں نے مکہ میں اپنے جد و اسلاف سے ناطہ توڑ لیا تھا تاہم ان کا رابطہ شجرہ مادری سے اب بھی برقرار تھا۔

قصویٰ کچھ دیر تک النجار نامی محلے میں چکر لگاتی رہی پھر ایسے قطعہ زمین میں داخل ہو گئی جو بالکل خالی تھا۔ اونٹنی وہاں پہنچ کر چند قدم اور آگے بڑھی پھر ٹھہر گئی اور زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے۔ حضرت محمد ﷺ نے یہ اطمینان حاصل کرنے کی خاطر کہ آیا اس کا توقف عارضی ہے یا مستقل قصویٰ کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل کی نہیں دی۔

اس جگہ پر جہاں اونٹنی نے گھٹنے ٹیکے تھے کوئی گھر موجود نہیں تھا اور اس قطعہ زمین کو کھجوریں خشک کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ البتہ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گھر تھا اور مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کو بتایا کہ یہ گھر ابو ایوبؓ نامی شخص کی ملکیت ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ پیغمبرؐ کی اونٹنی زمین کے اس ٹکڑے میں بیٹھ گئی ہے تو انہوں نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر اسلام ﷺ مسلمانوں کی عبادت کے لئے وہاں مسجد بنائیں گے اور وہیں پر اپنے گھر کی تعمیر بھی کریں گے اور زمین کا وہ ٹکڑا، ہماری آج کی اصطلاح میں، اسلام کا ہیڈ کوارٹر بنے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے پوچھا: یہ زمین کس کی ہے؟

مسلمانوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور بولا: یا محمد (ﷺ) یہ زمین دو کمسن یتیم بچوں کی ملکیت ہے اور میں اسد بن زرارہ ان بچوں کا سرپرست ہوں۔ لیکن میں اس زمین کو آپ کی نذر کرتا ہوں تاکہ آپ یہاں مسجد بنا سکیں اور گھر کی تعمیر کر سکیں۔

آپؐ نے جواب دیا: اگر یہ زمین ان دو یتیم بچوں کی نہ ہوتی اور تمہاری ملکیت ہوتی تو بھی میں اسے بلا قیمت حاصل کرنے پر راضی نہ ہوتا خاصا یہ کہ دو یتیم بچے اس زمین کے مالک ہیں۔

یا اسد! میرا بچپن یتیمی میں گزرا ہے اور میں بھی ماں باپ کی نعمت سے محروم رہا ہوں لہٰذا میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ ایک یتیم پر کیا گزرتی ہے اور اسے کتنے غم اٹھانے پڑتے ہیں۔ البتہ میں ایک شرط پر یہ زمین لینے پر آمادہ ہوں اور وہ یہ کہ تم اس زمین کی

قیمت دوسری عام زمینوں سے زیادہ لگا کر مجھ سے دریافت کرو۔

اسدؓ بن زرارہ نے کہا کہ اس زمین کی قیمت سات دینار ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے زمین کی قیمت کے بارے میں دوسرے مسلمانوں سے مشورہ کیا اور انہوں نے اسدؓ بن زرارہ کی لگائی ہوئی قیمت کی توثیق کر دی۔ پھر آپؐ نے اعلان کیا کہ میں اس زمین کو دس دینار کے عوض خرید رہا ہوں تاکہ اسدؓ بن زرارہ ان یتیم بھائیوں کے لئے یہاں سے بہتر زمین خرید سکے۔

اسلام کے خزانچی حضرت ابوبکرؓ نے، جو آپؐ کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے بلادریغ پیسوں کی تھیلی کھولی اور سونے کے دس سکے زمین کے مالک کو ادا کر دیئے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس زمانے میں دس دینار یعنی سونے کے دس سکے ایک بہت بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت نہ تو مکہ کا اپنا کوئی سکہ رائج تھا اور نہ ہی مدینہ کا۔ اور ان دونوں شہروں میں جو سکے جاری تھے وہ رومی تھے یا ایرانی۔ دینار سونے کا بنا ہوا سکہ تھا اور ایرانی دینار کو "خسروی" یا "دینار خسروان" کے نام سے پہچانتے تھے۔ رومی سکے کا نام "ہرقلی" تھا جو وہاں کے بادشاہ ہرقل کے نام پر رکھا گیا تھا۔ واضح رہے کہ روم سے مراد "رومتہ الصغریٰ" (آج کا ترکی) ہے جس کا پایہ تخت بزنطین تھا جو آج "استنبول" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

مدینہ پہنچنے کے دوسرے ہی دن پیغمبر اسلام ﷺ نے تمام مسلمانوں کی مدد سے اسی جگہ پر جہاں ان کی اونٹنی بیٹھی تھی، مسجد کی تعمیر شروع کر دی اور بلا امتیاز سارے مرد جن میں خود پیغمبر ﷺ بھی شامل تھے اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈھوتے، پتھر لاتے، گارا بناتے اور مسجد کی تعمیر میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔

مذکورہ مسجد کا انداز تعمیر ایسا نمونہ بن گیا کہ جس کو سامنے رکھ کر صدر اسلام میں دوسری مساجد کی بنیاد رکھی گئی۔ مسجد کی تعمیر کا طریقہ کار یہ تھا کہ مسجد کی بنیادوں کے لئے تین ذراع کی گہرائی میں پتھر رکھے جاتے اور خام اینٹوں سے دیواروں کی چنائی کی جاتی تھی۔

مسجد کی چھت کو درخت خرما کے تنوں سے مکمل کیا جاتا اور اسے کھجور کے پتوں سے جنہیں "جرید" کہتے ہیں ڈھانپ دیا جاتا تھا۔

مذکورہ مسجد کی تعمیر میں سات ماہ کا عرصہ لگا اور مسلمانوں نے اس مسجد کو خاصا مضبوط اور پائیدار بنایا کیونکہ مدینہ ایسا شہر تھا جہاں بارشیں زیادہ ہوتی تھیں اور اگر مسجد کو مضبوط نہ بنایا جاتا تو وہاں کی شدید بارشیں اسے نقصان پہنچا سکتی تھیں۔

مسجد مدینہ کا قبلہ بھی مسجد قبا کی سمت جیسا تھا کیونکہ ابھی یہ احکام نہیں آئے تھے کہ قبلے کا رخ کعبہ کی طرف موڑ دیا جائے۔

مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والے کچھ مسلمان ایسے تھے جن کے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ کی مسجد میں ہی ان لوگوں کے لئے اینٹوں اور گارے کی مدد سے ایک بہت بڑا تھڑا (صفہ) تعمیر کروایا جہاں وہ لوگ رات کے وقت آرام کر سکتے تھے اور دن کے وقت سورج کی تمازت سے محفوظ رہنے کے لئے اس جگہ پر ایک سائبان بھی تعمیر کروایا جسے کھجور کے درختوں کی شاخوں اور پتوں سے ڈھانپا گیا تھا۔

چونکہ اس جگہ کو "صفہ" کہتے تھے اسی لئے وہاں قیام کرنے والوں کو "اہل الصفہ" کے نام سے پکارا گیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو شروع میں بہت غریب اور مفلوک الحال تھے لیکن بعد میں یہی لوگ مشاہیر اسلام کے زمرے میں آئے اور جو شخص بھی اہل صفہ سے تعلق رکھتا تھا وہ آج اسلام کی بزرگ شخصیت سمجھا جاتا ہے..... اور صفہ نامی یہی جگہ جو ایک دن غریبوں اور مسکینوں کی پناہ گاہ تھی علم و دانش کا مرکز بن گئی اور صفہ میں ہی اسلام کے پہلے دانش کدہ نے درس و تدریس کا کام شروع کیا۔

حضرت محمد ﷺ جب مدینہ میں اپنی اونٹنی سے نیچے اترے اور زمین پر قدم رکھا تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سامان اتارا اور چاروں طرف نظر دوڑائی تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ ٹھہرنے کے لئے کون سی جگہ مناسب ہو گی۔ اسی لمحہ ایوبؓ جن کا پورا نام "ابوایوب

خالد بن زید" تھا اور جن کا گھر دوسرے گھروں کے مقابلے میں زیادہ قریب تھا' آگے بڑھے اور پیغمبر ﷺ کے ہاتھوں سے سامان لیتے ہوئے بولے: یا رسول اللہ! آپ میرے ہاں قیام فرمائیں۔

آپؐ نے پوچھا: "آیا تمہارے گھر میں اتنی جگہ ہے کہ مجھے ٹھہرا سکو؟"

ابوایوبؓ نے جواب دیا: "بالکل ہے یا رسول اللہ"۔

آپؐ نے فرمایا: "میں ایک شرط پر تمہارے ہاں ٹھہرنے کو تیار ہوں کہ کھانے پینے کے سلسلے میں تم پر بوجھ نہ بنوں"۔

ابوایوبؓ نے حیران ہو کر پوچھا: "مگر آپ کتنا کھاتے ہیں یا رسول اللہ! جو مجھ پر بوجھ بنیں گے"۔

پیغمبرؐ نے جواب دیا: "میرا کھانا جتنا بھی کم ہو پھر بھی تمہارے لئے زحمت کا باعث بنوں گا"۔

جب ابوایوبؓ کو یہ احساس ہوا کہ آپؐ اس بات پر مصر ہیں کہ وہ ان کے گھر کھانا وغیرہ نہیں کھائیں گے تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور پیغمبر اسلام ﷺ صرف رات کو سونے کی غرض سے ان کے گھر جاتے اور سارا دن دوسرے مسلمانوں کے دوش بدوش مسجد کی تعمیر میں مصروف رہتے تھے۔ آپؐ کا نصب العین یہ تھا کہ جتنا جلدی ہو سکے "امت" یعنی اسلامی معاشرے کی تشکیل اور تربیت کا کام شروع کر دیں۔

مکہ سے مدینہ آنے والے اکثر مسلمان انتہائی مفلس اور تہی دست تھے اور چونکہ وہ لوگ حال ہی میں اپنے وطن اور خاندان سے دور ہوئے تھے لہٰذا ان پر غم و اندوہ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس کے علاوہ یہودیوں کی افواہیں بھی جن میں مسلمان عورتوں کے بانجھ ہو جانے کا ذکر تھا انہیں مزید پریشان کیا کرتی تھیں۔ لیکن اسی دوران ایک مسلم عبداللہؓ بن زبیر کی زوجہ نے ایک خوبصورت اور تندرست بچے کو جنم دیا اور اس واقعہ نے مسلمانوں کے خدشات دور کر دیئے اور وہ جان گئے کہ مسلمانوں کی عورتیں بے اولاد نہیں رہیں گی۔

چونکہ مکہ سے آنے والے مسلمان تہی دست تھے اور ان کے پاس رہنے کے لئے جگہ بھی نہیں تھی، اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے انصار کو ہدایات دیں کہ وہ لوگ مکہ کے مسلمانوں میں کسی ایک کے ساتھ "عہد اخوت" باندھ لیں اور انہیں اپنے گھروں میں جگہ دیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تحصیل معاش کریں تاکہ مکہ کے مسلمانوں کی زندگی سدھر جائے اور جیسے ہی وہ لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوں اور اپنی روزی خود کمانے لگیں تو مدینہ کے مسلمانوں یعنی انصار سے علیحدہ ہو کر اپنے لئے مستقل زندگی اختیار کرلیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے کلام میں اتنا اثر تھا کہ مدینہ کے سارے مسلمانوں نے ان کی تجویز کو دل و جان سے قبول کرلیا اور یوں مکہ سے آنے والے ایک سو چھیاسی مسلمانوں نے مدینہ کے مسلمانوں یعنی انصار کے ساتھ عہد اخوت باندھا اور ان لوگوں کے گھروں میں پناہ گزین ہو گئے۔

قرآن کی آٹھویں سورہ "سورۃ انفال" کی ۷۴ ویں آیت میں مدینہ کے مسلمانوں کی قدر دانی ہوئی ہے جنہوں نے مکہ کے مہاجرین کو پناہ دی تھی۔ مذکورہ سورۃ میں آیا ہے۔

"والذین امنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اووا ونصروا اولٰئک ھم المومنون حقا لھم مغفرۃ ورزق کریم"۔

یعنی "وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی (یعنی مکہ کے مہاجرین کو اپنے گھروں میں جگہ دی) اور مدد کی (یعنی مہاجرین کی مدد کی) وہ سچے مومن ہیں اور اللہ ان کی مغفرت کرتا ہے اور ان پر رزق کے دروازے کھولتا ہے"۔

چونکہ مسلمانوں کو مسجد کی تعمیر میں بھی حصہ لینا تھا للذا عہد اخوت باندھنے کے بعد انہوں نے آپس میں یہ سمجھوتہ کیا کہ جو مہاجر کسی انصار کے گھر میں مقیم ہے تو وہ ایک دن اللہ کی راہ میں مسجد کی تعمیر میں بلا مزدوری کام کرے اور دوسرے دن کہیں اور محنت

مزدوری کرکے اپنے اور اپنے میزبان کے لئے ذریعہ معاش فراہم کرے۔

مدینہ کے مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا اور ہر مدنی مسلمان جس نے مکی مسلمان کو پناہ دے رکھی تھی ایک دن اپنے اور اپنے مہمان کا پیٹ بھرنے کا لئے محنت مزدوری کرتا اور ایک دن اللہ کی راہ میں رضاکارانہ طور پر کام کرتا تھا۔

خود حضرت محمد ﷺ تحصیل معاش کی خاطر اہل مدینہ کے کسی فرد کے ساتھ عہد اخوت باندھنے پر رضامند نہ ہوئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے دل کو ٹھیس پہنچے جن کے ساتھ انہوں نے عہد اخوت نہیں باندھا اور شاید وہ لوگ یہ سوچیں کہ پیغمبر ﷺ نے انہیں عہد اخوت کے قابل نہیں سمجھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے چچا کے بیٹے علیؓ بن ابی طالب کے ساتھ عہد اخوت باندھ لیا اور ان سے کہا: "یا علی ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنے ذریعہ معاش کے لئے ایک دن تم کام پر جاؤ اور دوسرے دن میں محنت مزدوری کروں گا"۔

حضرت علیؓ نے جواب میں کہا: "یا رسول اللہؐ! مسجد کی تعمیر اور اس کے کام کی پیشرفت کے لئے آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دن ایسا نہیں کہ مسلمانوں کو آپ سے کوئی نہ کوئی کام نہ ہو اور وہ اپنے مسائل آپ کے حضور پیش نہ کریں۔ لہٰذا آپ روزانہ مسجد جائیں اور اس کام کی نگرانی کریں اور مسلمانوں کے سوالات کا جواب دیں میں اکیلا ہی اپنے اور آپ کے وسیلہ معاش کے لئے کام کرنے پر تیار ہوں"۔

حضرت محمد ﷺ نے علیؓ کی تجویز مان لی اور پیغمبرؐ کے چچا زاد بھائی روزانہ کام کی تلاش میں باہر نکل جاتے تھے۔

شاید آپ یہ تصور کریں کہ وہ کام جو حضرت علیؓ مدینہ میں انجام دیتے تھے ان کے خاندانی وقار اور اعلیٰ طبقے کی حیثیت کے مطابق ہوتا تھا' جی نہیں۔ اگرچہ حضرت علیؓ بھی آپؐ کی طرح خاندان بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا شمار بھی مکہ کے بزرگوں میں

ہوتا تھا لیکن وہ تحصیل معاش کی خاطر پانی ڈھونے کا کام انجام دیتے تھے تاکہ مدینے کا ایک مالدار شخص اپنے گھر کی تعمیر کے لئے گارا بنا سکے اور اینٹیں ڈھال سکے۔

پانی کے ذخیرے اور مکان بنانے کی جگہ کے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ تھا کہ حضرت علیؓ صبح سے شام تک سولہ ڈول سے زیادہ پانی نہیں لا سکتے تھے اور ایک ڈول کے عوض انہیں ایک کھجور سے زیادہ مزدوری نہیں ملتی تھی۔ لہٰذا حضرت علیؓ کی ایک دن کی مزدوری کھجور کے صرف سولہ دانے ہوتے جن میں سے آٹھ دانے وہ آپؐ کو دے دیتے تھے اور یوں وہ دونوں ایک عرصہ تک روزانہ آٹھ کھجوروں پر ہی گزارا کرتے رہے...... اور یہی تھے وہ عظیم لوگ جنہوں نے اسلام کی بنیاد رکھی اور اسے پروان چڑھایا۔ تاہم جیسا کہ ہم کتاب کے آغاز میں بتا چکے ہیں کہ وہ لوگ بچپن سے ہی بھوک اور پیاس کو برداشت کرنا سیکھ جاتے تھے اور بھوک اور پیاس کا خوف ان کے عزم و ارادہ کو متزلزل نہیں کرتا تھا۔

مدینہ کی آدھی آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی اور آپؐ نے اس شہر میں مستقر ہونے کے بعد بھرپور کوشش کی کہ وہ لوگ بھی اسلام کو مساعدت کی نگاہ سے دیکھیں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

علمائے اسلام نے لکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جب اسلام آیا تو سارے اسلامی احکام یکبارگی نازل نہیں ہوئے بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج تیئس سال کی مدت میں نازل ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ جہاں بھی ضرورت محسوس ہوتی اور اللہ کی طرف سے فی الوقت نئے احکام نازل نہ ہوئے ہوتے تو آپؐ تورات کے قوانین کو مدنظر رکھ کر کوئی فیصلہ کر لیتے تھے۔

اسلامی احکام کے بتدریج نازل ہونے کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر گزشتہ قوانین یک لخت منسوخ کر دیئے جاتے اور ان کی جگہ نئے احکام نازل ہو جاتے تو عین ممکن تھا کہ لوگ الجھن کا شکار ہو جاتے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں اور یوں نئے قوانین پر بروقت اور صحیح طور پر عمل درآمد بھی نہ ہو سکتا۔ لہٰذا نئے قوانین کے نافذ ہونے

کا عقلی اور منطقی طریقہ یہی تھا کہ وہ بتدریج نازل ہوں اور عام لوگ بھی ان سے آہستہ آہستہ مانوس ہو جائیں۔

آج اگرچہ مغربی ممالک میں علم و ٹیکنالوجی دورہ جاہلیت کے جزیرۃ العرب کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کر چکی ہے اور ہرچند کہ باہمی روابط اور تبادل افکار کے ذرائع جیسے اخبارات' جرائد' کتابیں' ریڈیو' ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون وغیرہ سب جگہ پھیلے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کوئی حکومت خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو صرف ایک یا دو دن میں بیسیوں قوانین لاگو نہیں کر سکتی اور نہ ہی ان پر عملدرآمد کروا سکتی ہے اور اگر ایسا کرے بھی تو عوام کا دماغ اور ان کے اعصاب مختل ہو جائیں گے' زندگی کی ڈور ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گی' معاشرے میں افراتفری پھیل جائے گی اور نت نئی مشکلات جنم لینا شروع کر دیں گی۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت اور بعثت کے بعد پرانے احکام جب تک منسوخ نہ ہو جاتے تو ان پر عملدرآمد باقی رہتا اور ان میں سے ایک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کے احکام تھے جو ابھی تک اپنی جگہ برقرار تھے کیونکہ اللہ نے انہیں کالعدم قرار نہیں دیا تھا۔ لہٰذا اسی بنا پر اور آپؐ کی طرف سے گزشتہ قوانین کی رعایت کرنے کے سبب بھی یہودیوں کے دلوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ شاید آپؐ ان کے دین میں داخل ہو جائیں گے۔ وہ لوگ کہتے تھے "یا محمد (ﷺ) تم پیغمبر نہیں کیونکہ ہم میں سے نہیں ہو۔ سارے انبیاء ہماری قوم سے اٹھے تھے اور ہو سکتا ہے تم بھی ایک دن پیغمبر بن جاؤ لیکن ہماری قوم میں شامل ہوئے بغیر ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہاری قسمت میں نبی بننا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ موسیٰؑ کے دین کو قبول کر لو! (وضاحت : حضرت محمد ﷺ نے یہودیوں کو جو جواب دیئے تھے ان کا ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ خلیل)

اس سے پہلے کہ مسلمانوں کا قبلہ تبدیل ہو قرآن کی دوسری سورۃ کی یہ آیت نازل

ہوئی جس کا مفہوم درج ذیل ہے۔
"مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں اور تم جس طرف بھی نظر دوڑاؤ تو اللہ کے مظاہر دیکھ سکتے ہو"۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قوم یہود مسلمانوں کے ساتھ مصالحت آمیز رویہ اپنانے پر آمادہ نہیں تو اللہ نے قرآن کی دوسری سورہ "بقرہ" کی آیات نمبر ۱۴۲' ۱۴۴' ۱۴۸' ۱۴۹ اور ۱۵۰ میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ نماز پڑھتے وقت اپنا رخ کعبہ کی طرف موڑ لیں اور آج کے بعد اپنا قبلہ سمجھیں۔ سورہ بقرہ کی ۱۴۲ ویں آیت میں آیا ہے:

یعنی بیوقوف (نادان یہودی) کہتے ہیں کیا ہوا کہ جس قبلے کی طرف تم نماز پڑھتے تھے اسے بدل دیا۔ (اے پیغمبر) ان سے کہو کہ مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں اور اللہ جس کو بھی چاہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے (یعنی جو راستہ اللہ دکھائے اس کے بندوں کو اسی راستے پر چلنا چاہئے)۔

کچھ اسلامی عرفاء نے انہی آیات کے پیش نظر کہ جن میں منزلت کے لحاظ سے مشرق اور مغرب میں کوئی فرق نہیں سمجھا گیا یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سب جگہ اللہ کی نظر میں ایک ہی ہے۔ لہٰذا اسلامی عرفا و صوفیا نے اپنے کلام میں انہی آیات سے الہام لیا ہے اور ان کے نزدیک دیر و حرم' کعبہ و بت خانہ اور صومعہ و میخانہ ایسے مقام ہیں جہاں اللہ کی تلاش کی جاتی ہے۔ا۔

لیکن اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ ہر چند اللہ کی نظر میں مشرق و مغرب ایک ہی ہیں لیکن جب اللہ اپنے بندوں کو حکم دے اور ان سے کہے کہ سوئے کعبہ نماز ادا کریں تو کوئی یہ بہانہ بنا کر اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا کہ مشرق و مغرب اللہ کی نظر میں ایک ہی ہیں۔

اسلامی تاریخ میں قبلے کا رخ بدلنے کا حکم انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس طرح امت مسلمان یہودی اور عیسائی اقوام سے جدا ہو کر اپنا علیحدہ تشخص پانے میں

کامیاب ہو گئی اور دین اسلام مذکورہ دونوں ادیان خاص طور پر یہود سے مکمل طور پر جدا ہو گیا۔

اسلام وہ دین تھا جو ایسے پیغمبر پر نازل ہوا جن کا سلسلہ نسب ابراہیم علیہ السلام سے جا ملتا ہے اور کعبہ بھی وہی مکان ہے جس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی تھی لہٰذا جب اللہ نے یہ امر کیا کہ مسلمان اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف پھیر کر نماز ادا کریں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد اسلام یہودیوں یا مسیحیوں کے دین سے وابستہ نہیں اور خود ایک مکمل اور مستقل دین کی حیثیت رکھتا ہے۔

وضاحت ا۔ : اسلامی عرفاء اور صوفیاء کا ذکر چلا ہے تو اہل ادب کی دلچسپی کے لئے اور اس لئے بھی کہ کونسٹن ویرژیل کی بات کا مفہوم واضح ہو جائے تو ایران کے مشہور شاعر و عارف حافظ شیرازی (جو خواجہ شیرازی کے نام سے بھی مشہور ہیں) کا یہ شعر درج کروں تو شاید مناسب ہو۔

همه کس طالب یار رندچه هشیارچه مست
همه جا خانه عشق است چه مسجد چه کنشت

یعنی سبھی یار کے طالب ہیں کیا ہشیار کیا مست۔ سب جگہ خانہ عشق ہے کیا مسجد کیا کنشت۔ کنشت یعنی کلیسا۔ صومعہ اسی طرح شاعر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

عشق در صحبت میخانہ بگفتار آید
زانکہ در دیر و حرم محرم اسرارش نیست

یعنی عشق کا ذکر چلے اب صحبت میخانہ میں۔ کیونکہ اب دیر و حرم محرم اسرار نہیں۔ اور جدید دور میں ایران کے سیاسی اور مذہبی پیشوا آیت اللہ خمینی مرحوم کہتے ہیں۔

درمیخانہ کشائید بہ رویم شب و روز
کہ من از مسجد و از مدرسہ بیزار شدم



اسلام کا پہلا بنیادی آئین

اللہ نے قرآن میں کئی بار ملت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی تھی لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین جو درحقیقت اسلام کی بنیاد بنا اصولی طور پر موسوی اور عیسوی ہر دو ادیان کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا تھا اور چونکہ دین اسلام کی اساس دین ابراہیمؑ پر رکھی گئی تھی لہٰذا اسلام کو ہمہ گیر مقبولیت اور بین الاقوامی مقام حاصل ہو گیا۔

نصرانی مذہب چونکہ نسل پرستی کی طرف مائل ہو چکا تھا اور یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ اسرائیلی قوم دنیا کی آقا ہے اور صرف وہی اللہ سے رابطہ قائم کرنے کا حق رکھتی ہے لہٰذا دین یہود ایک عالمگیر دین نہیں بن سکتا تھا۔

دین مسیحیت بھی چونکہ دین یہود کی تکمیل کے لئے نازل ہوا لہٰذا وہ بھی بین الاقوامی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا تھا لیکن اسلام جو مکمل طور پر کلیسی اور نصرانی ادیان سے جدا

ہو چکا تھا اور اس کا اپنا علیحدہ اور مستقل قبلہ بھی متعین ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس میں ہمہ گیر مقبولیت حاصل کرنے اور سارے جہان میں پھیل جانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی کیونکہ اس جہان کا ہر انسان خواہ کہیں کا رہنے والا ہو اور کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو بڑی آسانی سے اسلام قبول کر سکتا ہے (قارئین محترم توجہ فرمائیں کہ ان حقائق کو بیان کرنے والا شخص یعنی کونسٹن ویرژیل گیورگیو ایک یورپی مؤرخ ہے لہٰذا اس کی حقیقت پسندی اور حقیقت گوئی کی تعریف نہ کرنا بے لطفی ہے۔ خلیل)

سارے مسلمان اور خاص طور پر وہ لوگ جو مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے اس بات پر بہت خوش تھے کہ ان کا قبلہ تبدیل ہو چکا ہے اور اب وہ کعبہ کی جانب رخ پھیر کر نماز پڑھ سکیں گے۔

اس بات سے قطع نظر کہ کعبہ اس زمانے میں بھی تمام اعراب کی نگاہوں میں مقدس مقام رکھتا تھا لیکن وہ لوگ جو مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اپنے وطن کو بھلا نہیں سکتے تھے لہٰذا جب قبلے کی تبدیلی کا حکم آیا اور مسلمان سوئے کعبہ نماز ادا کرنے لگے تو ان لوگوں کے دلوں کو بہت تسکین حاصل ہوئی۔

پیغمبر اسلام ﷺ مسجد مدینہ کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اسی مسجد کے آس پاس متعدد رہائشی مکانات بنوانے میں بھی مصروف تھے تاکہ بے گھر لوگوں کو سرپناہ میسر آ جائے۔

کچھ مسلمان جن میں خود پیغمبر اسلام ﷺ بھی شامل تھے مکہ سے ہجرت کرتے وقت اپنے اہل خاندان کو وہیں چھوڑ آئے تھے لیکن انہیں مدینہ آنا تھا اور اپنے خاندانی سربراہ سے ملحق ہونا تھا کیونکہ کسی کنبے کے افراد ایک درخت کی شاخوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں درخت کے تنے سے پیوستہ رہنا ہوتا ہے اگر کوئی شاخ اپنے تنے سے جدا ہو جائے تو ایسا ہے جیسے کوئی ہاتھ بدن سے جدا ہو گیا ہو۔

پیغمبر اسلام ﷺ جو اپنے اہل خاندان کو مکہ سے مدینہ لانے کی سوچ رہے تھے تو مذکورہ گھروں کی تکمیل [illegible] عرصہ پہلے مدینہ کے بازار میں گئے اور تین اونٹنیاں خریدیں

جن کی قیمت حضرت ابوبکرؓ نے ادا کی۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مدینہ آمد کے موقع پر حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس دو اونٹنیاں تھیں اور مزید تین اونٹ خریدنے کے بعد ان کی تعداد پانچ ہو گئی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کو بلوایا اور ان سے کہا: "یا علیؓ تم جانتے ہی ہو کہ میری بیٹیاں اور اسی طرح میری زوجات حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ مکہ میں ہیں۔ لہٰذا تم ان اونٹوں کو اپنے ہمراہ لے جاؤ اور ان لوگوں کو مکہ سے مدینہ لے آؤ۔ اس کے علاوہ زید کو بھی اپنے ہمراہ لیتے جاؤ اور اس کی بیویؓ ام ایمن کو بھی اپنے ساتھ لیتے آنا"۔ واضح رہے کہ زیدؓ وہی آزاد شدہ ملازم تھے جنہیں پیغمبر ﷺ نے اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی چار صاحبزادیاں تھیں جن کا نام فاطمہؓ، ام کلثومؓ، زینبؓ اور رقیہؓ تھا۔

رقیہؓ اپنے خاوند حضرت عثمانؓ کے ہمراہ مدینہ پہنچ چکی تھیں جبکہ باقی تین صاحبزادیاں مکہ ہی میں قیام پذیر تھیں۔

حضرت علیؓ، زیدؓ کے ہمراہ سوئے مکہ روانہ ہو گئے اور واپسی پر پیغمبرؐ کی زوجات اور دو صاحبزادیوں فاطمہؓ اور ام کلثومؓ کو زیدؓ کی زوجہ ام ایمنؓ کے ہمراہ مدینہ لے آئے لیکن حضرت زینبؓ پیغمبر اسلام ﷺ کی چوتھی صاحبزادی، ان لوگوں کے ساتھ نہ آ سکیں۔ یوں حضرت محمد ﷺ کے خاندان میں صرف زینبؓ اپنے خاندانی سربراہ سے ملحق نہ ہو سکیں جبکہ باقی لوگ ان سے آ ملے۔

مسلمانوں کے بعض دوسرے خاندانوں میں بھی مشابہہ صورت حال دیکھنے کو ملتی تھی اور جو میاں بیوی ہم دین نہیں تھے وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہ سکے۔ یعنی جو عورت مسلمان نہیں تھی وہ مکہ میں رہ گئی اور اس کا شوہر جو مسلمان ہو چکا تھا مدینہ کی

طرف ہجرت کر گیا۔ تاہم جن لوگوں کی عورتیں مسلمان تھیں وہ انہیں لے کر مدینہ چلے آئے اور یوں مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے اور حضرت ابوبکرؓ کے پانچ اونٹوں کو مسلمانوں کے اہل خاندان کی مکہ سے مدینہ منتقلی کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اونٹ جب بھی مدینہ آتے تو مسلمان انہیں احترام و اکرام سے نوازتے یعنی کوئی شخص پیغمبر اسلام ﷺ کے اونٹوں کا راستہ نہیں روکتا تھا اور وہ جہاں بھی چاہتے "تعلیف" کرتے یعنی چرتے ور جس جگہ بھی چاہتے پانی پی سکتے تھے۔

جب مدینہ کی مسجد مکمل ہو گئی اور مکی مسلمان اپنے خاندانوں کو مکہ سے مدینہ لے آئے تو حضرت محمد ﷺ نے مدینہ کے شہر کے لئے جو مستقل شہر تھا ایک آئین لکھوایا (اسلامی تاریخ میں یہ آئین "میثاق مدینہ" کے نام سے مشہور ہے۔ خلیل) یہ بنیادی آئین جو ۵۲ شقوں پر مشتمل ہے خود پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے تدوین ہوا تھا یعنی قرآنی آیات کی طرح وحی نہیں تھا۔ مذکورہ آئین کے ۵۲ بنیادی اصولوں میں سے ۲۵ اصول مسلمانوں کے لئے اور بقیہ ۲۷ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لئے تھے جن میں یہودی، مسیحی اور صائبین بھی شامل تھے۔

مدینے کا بنیادی آئین کچھ اس طرح تدوین کیا گیا تھا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے برابری کے اصولوں پر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ زندگی بسر کریں اور ہر شہری آزادانہ طور پر اپنے دینی فرائض انجام دے اور کسی کو بھی دوسروں کے لئے مزاحمت ایجاد کرنے کی اجازت نہ ہو۔

یہ آئین ہجرت کے پہلے سال یعنی ۶۲۳ء میں جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ کو مکہ سے مدینہ آئے ایک سال گزر چکا تھا، لکھوایا گیا۔ اس آئین یا منشور کے مطابق مدینہ کے شہری خواہ کسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں اس بات کے مجاز تھے کہ اپنے دین پر کاربند رہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرے لیکن مختلف ادیان

کے ماننے والوں کا یہ فرض ضرور بنتا تھا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہو تو وہ اپنی قوتوں کو یکجا کر کے متجاوز کے مقابلے پر نکل آئیں۔

ہم اس آئین یا منشور کے کچھ حصے جنہیں حضرت محمد ﷺ نے مدینہ میں وضع کیا پڑھنے والوں کی نظر سے گزارتے ہیں۔ البتہ ہم یہ بھی کہیں گے کہ حضرت محمد ﷺ اس قانون میں دوسرے مذاہب کو جو آزادی دی تھی تو اس سلسلے میں انہوں نے قرآنی آیات سے الہام لیا تھا کیونکہ اللہ نے قرآن کی دوسری سورۃ "بقرہ" کی ۶۲ ویں آیت میں یوں کہا ہے:

"ان الذین امنو و الذین ھادو والنصری و الصائبین من امن باللہ و الیوم الاخر و عمل صالحا فلھم اجر ھم عند ربھم و لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"۔

یعنی وہ جو ایمان لائے (یعنی دین اسلام میں داخل ہوئے) اور وہ جو یہودی، مسیحی اور صابی ہوئے اگر حقیقت میں اللہ پر ایمان لائیں اور روز جزا پر یقین رکھیں اور نیک عمل انجام دیں تو اللہ انہیں اجر دے گا اور ان پر خوف یا غم طاری نہیں ہونا چاہئے۔

"صائبین" کہ جن کا تذکرہ اس آیت میں ہوا ہے ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ستاروں اور فرشتگان کی پوجا کرتے لیکن اللہ پر بھی یقین رکھتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے یہودیوں، عیسائیوں اور حتیٰ کہ صائبین کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں کیا تاہم شرط یہ ہے کہ وہ لوگ نیک کام انجام دیں، ان کا ایمان سچا ہو اور اس میں ریا اور کھوٹ شامل نہ ہو۔

قرآن کی پانچویں سورۃ "المائدہ" کی ۶۶ ویں آیت میں اللہ نے یہودیوں اور مسیحیوں کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار نظر کیا ہے۔

"ولو انھم اقامو التورتہ والانجیل و ما انزل الیھم من ربھم لاکلو من فوقھم و من تحت ارجلھم منھم امتہ مقتصدۃ و کثیر منھم ساء

مایعلمون"۔
اگر وہ (یعنی یہودی اور مسیحی) تورات اور انجیل پر عمل کریں جو ان کے اللہ نے ان پر نازل کیا ہے اس پر کاربند رہیں (مسلمان کہتے ہیں کہ یہاں اللہ کی مطلب وہی قرآن ہے) تو وہ اوپر اور نیچے (یعنی زمین اور آسمان) سے اللہ کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے اور ان (یعنی یہودیوں اور مسیحیوں) میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اہل عدل و انصاف ہیں (یعنی تورات اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں) لیکن ان میں سے اکثر برے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

بالائے ذکر آیات کا حوالہ دینے سے یہ بتانا مقصود تھا کہ وہ قانون یا آئین جسے حضرت محمد ﷺ نے مدینہ میں تدوین کیا اور جو ہجرت کے پہلے سال نافذ ہوا وہ دراصل قرآنی احکام کے عین مطابق تھا البتہ اس کے الفاظ اور جملات قرآنی آیات کا حصہ نہیں تھے۔

دنیا کے کسی بھی بانی دین نے پیغمبر اسلام ﷺ کی طرح دوسرے ادیان کے ساتھ مدارا نہیں کیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے بہت کوشش کی کہ مدینہ میں دوسرے ادیان کے ماننے والے اسلام کے سائے تلے آزادانہ زندگی بسر کریں اور انہیں اطمینان دلایا کہ کوئی بھی ان کے لئے مزاحمت ایجاد نہیں کرے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ ان کے دین کو، جو آزادی اور مساوات کی بنیادوں پر استوار ہے دوسرے مذاہب سے خطرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو عین ممکن ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کو اپنے تحت اثر لے لے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو گا کہ دوسرے مذاہب اسلام پر اثر انداز ہو سکیں۔

میثاق مدینہ کی ۲۵ شقیں، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مسلمانوں سے متعلق تھیں اور ۲۷ کا تعلق دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے تھا۔ اس آئین کی پہلی اور دوسری شق میں مدینہ کے مختلف قبائل کا نام لیتے ہوئے پیغمبر اسلامؐ کہتے ہیں: "مومنین یہ برداشت نہ کریں کہ ان کے دینی بھائیوں کی کمر زندگی کے بوجھ تلے خم ہو جائے اور وہ تماشائی بنے

دیکھتے رہیں۔ مومنوں کا فرض ہے کہ زندگی کے مسائل میں اپنے دینی بھائیوں کی مدد کریں اور اگر کوئی مومن اپنی آزادی کے لئے فدیہ ادا کرنا چاہے یا خون بہا دینا چاہے تو دوسرے مسلمانوں کو مل کر اس کی مدد کرنی چاہئے تاکہ وہ اپنا قرض ادا کر سکے"۔

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اسلام سے پہلے جزیرۃ العرب میں ہر شخص کسی نہ کسی قبیلے کا رکن ہوتا تھا اور اگر وہ کسی کے قتل کا مرتکب ہو جاتا تو مرنے والے کا خون بہا اس کا قبیلہ ادا کرتا تھا۔ اگر وہ بذات خود قابل نہ ہوتا لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ نے اسلام کی منادی شروع کی تو انہوں نے قبائلی اور خاندانی امتیاز کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ البتہ مدینہ کے آئین میں ایک نئے امتیاز نے اس کی جگہ لے لی اور وہ مومن ہونے اور امت اسلام کا رکن ہونے کا امتیاز تھا۔

اگر امت کا کوئی فرد یعنی مسلمان کسی بنا پر گرفتار ہو جاتا اور اس کی آزادی کے لئے فدیہ طلب کیا جاتا تو مسلمانوں کا فرض بنتا تھا کہ مطلوبہ فدیہ ادا کر کے اسے رہا کروائیں اور اگر وہ کسی کے قتل کا مرتکب ہو جاتا (بشرطیکہ وہ قتل جرم و خباثت نہ ہو جیسا کہ تیرہویں شق سے ظاہر ہے) تو دیگر مسلمان باہمی طور پر خون بہا ادا کر کے اس کی نجات کا وسیلہ فراہم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ مدینہ کے آئین کی تیرہویں شق کہتی ہے:

"اگر کوئی مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہو یا کسی پر ظلم کرے یا کسی کی حق تلفی کرے یا مومنین میں نفاق ڈالنے کی کوشش کرے تو وہ بالائے ذکر مراعات سے محروم ہو جائے گا۔ ایسے موقع پر تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ مل کر اس کے خلاف آواز اٹھائیں اور بوقت ضرورت سزا بھی دیں چاہے وہ ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہو"۔

سولہویں اصل شق میں کہا گیا ہے کہ قاتل کو سزا ہونی چاہئے اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام ﷺ کا حکم ہے: "جو انسان جان بوجھ کر کسی کو قتل کرے تو اس کی سزا موت ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایک قاتل کی حمایت کرے"۔

آئین کا ۲۶ اصول تھا: "جو اختلاف بھی ہو اسے برطرف کرنے کے لئے اللہ سے

رجوع کرو اور اللہ کے نمائندے یعنی پیغمبرؐ کے ذریعے اپنے اختلافات کا حل تلاش کرو"۔

چھتیسویں شق میں لکھا گیا تھا "یہودیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دین پر کاربند رہیں اور مسلمان بھی اپنے دین پر قائم رہیں اور جو لوگ "مولا" ہیں یا "پناہ گزین" ہیں تو ان کے بارے میں بھی یہی حکم لاگو ہے"۔

چونکہ مولا اور پناہ گزینوں کے بارے میں گزشتہ ابواب میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے لہٰذا اس کی تکرار غیر ضروری ہو گی۔

ایک اور شق میں آیا ہے "یہودی اپنے اخراجات زندگی خود برداشت کریں گے اور مسلمان بھی اپنی زندگی کا بوجھ خود اٹھائیں لیکن یہودی اور مسلمان دونوں مل کر ایسے شخص کے خلاف محاذ آرائی کریں گے جو آئین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا"۔

"یہودی اور مسلمان آپس میں حسن سلوک کا مظاہرہ کریں اور ایک دوسرے کا حق پائمال نہ کریں"۔

"مدینہ کے شہری قبیلہ قریش یا ان کے حامیوں اور اتحادیوں کی حمایت نہیں کریں گے"۔

اس عبارت میں قبیلہ قریش سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکہ میں مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے تھے اور اسلام کی سخت مخالفت کرتے تھے۔ لہٰذا انہیں اس قبیلے کے ان افراد سے جدا تصور کرنا چاہئے جو قبول اسلام کر چکے تھے اور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے۔

مدینہ کے آئین میں اس بات کا بھی ذکر تھا کہ مدینے کا شہر "حرم" ہے یعنی ایسی سر زمین جو مقدس ہے لہٰذا یہاں جنگ و جدال نہیں ہونا چاہئے۔

نئے آئین کے نفاذ سے مدینہ کے باشندوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کیونکہ اس قانون کی رو سے وہ تمام لوگ جو مدینہ کے باسی تھے یکساں حقوق سے بہرہ مند ہو گئے۔

مدینہ میں زندگی بسر کرنے والے عرب باشندے سب کے سب مسلمان تھے سوائے ان لوگوں کے جنہیں قرآن نے "منافقین" کے نام سے یاد کیا ہے۔

"منافقین" یا "منافقوں" کا مطلب اسلام کے مخالف کا نہیں جیسا کہ عام تصور ہے کیونکہ منافقین، اسلام کی مخالفت نہیں کرتے تھے تاہم واضح طور پر اس کی طرفداری بھی نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ ان دو حالتوں کے درمیان میں رہتے تھے۔

منافق یعنی وہ جو نفاق ایجاد کرے یعنی جدائی ڈالے لیکن عربی زبان میں منافق کے تحت اللفظی معنی "رینگنے والے" کے ہیں یا ایسا جانور جو لومڑی کی طرح بل کی تلاش میں ہو تاکہ اس میں چھپ جائے اور خطرے سے محفوظ رہے۔

قرآن کی چوتھی سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۳۷ میں اللہ نے منافقین کے بارے میں یوں اظہار نظر کیا ہے:

"وہ (منافق) جو ایمان لائے پھر کافر ہوئے۔ پھر ایمان لائے اور پھر کافر ہوئے اور پھر اپنے کفر پر باقی رہے تو اللہ ایسے لوگوں کی مغفرت نہیں کرتا اور انہیں ہدایت کی راہ نہیں دکھاتا"۔

سورہ النساء کی ۱۴۵ ویں آیت میں منافقین کے بارے میں یوں آیا ہے:

"منافقوں کا گڑھ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں (جہاں عذاب کی شدت دوسرے طبقات سے زیادہ ہے) ہو گا اور آپ (اے رسولؐ) ان کی نجات کا وسیلہ نہ ڈھونڈ پائیں گے تاکہ انہیں رہائی دلا سکیں"۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اللہ نے اتنا سخت عذاب حتیٰ کہ کافروں کے لئے بھی منظور نہیں کیا بلکہ اللہ کی نظر میں ایک منافق کا عذاب یعنی ایسے شخص کی سزا جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام کا خیر خواہ ہے نہ بدخواہ ایک کافر سے بھی زیادہ ہے۔

قدیم اٹلی کا مشہور شاعر ڈینٹے (Alighieri Dante) جس کے بارے میں ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اس نے اپنی مشہور کتاب "La Divind Commedia" میں قرآن سے اقتباس کئے ہیں اور معراج کے واقعات کی تقلید کرتے ہوئے، برزخ، جنت اور جہنم کا نقشہ پیش کیا ہے تو اس نے بھی دو چہرے والوں کو یعنی ایسے لوگوں کو جو کھل کر

موافقت کرتے ہیں نہ مخالفت' دوزخ کے سب سے نچلے درجے کا مستحق قرار دیا ہے۔

بہرطور ان آیات سے جو آپؐ پر نازل ہوئیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے بارے میں بے طرف رہنا اللہ کے نزدیک ناقابل بخشش جرم ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ قریش نے پیغمبر اسلام ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور پیغمبر اسلام ﷺ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے سبب ان کی دسترس سے دور ہو گئے۔

قبیلہ قریش نے جب یہ دیکھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ ان کی گرفت سے نکل گئے ہیں تو ان کی نسبت ان لوگوں کے کینے اور عداوت میں مزید اضافہ ہو گیا اور ان کے دو سرداروں نے جن میں ابوسفیان اور ابی بن خلف شامل تھے' اہل مدینہ کے لئے انتباہ کی شکل میں ایک پیغام بھجوایا جس کا مضمون کچھ یوں تھا:

"ہمارا اور تمہارا رابطہ ٹوٹ جانا ہمارے لئے دیگر عرب قبائل سے ترک تعلقات کر لینے سے زیادہ افسوسناک ہے۔ لیکن جو قدم تم لوگوں نے اٹھایا ہے اس کی وجہ سے ہمارے اور تمہارے تعلقات کشیدہ ہو چکے ہیں۔ تم نے ایسے شخص کو پناہ دی ہے جس کا شمار مکہ کے بزرگوں میں ہوتا ہے اور اسے پناہ دے کر تم لوگوں نے ہمیں اپنے معاملات میں مداخلت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم تمہیں (یعنی انصار کو) نصیحت کرتے ہیں کہ تم لوگ اپنے آپ کو اس کے اور ہمارے درمیان قرار نہ دو۔ وہ یا تو کوئی نیک انسان ہے تو ایسی صورت میں ہم اسے تم لوگوں سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں اور اس کے وجود سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اگر وہ کوئی "خطاکار" ہے تو بھی ہمارا حق بنتا ہے کہ اسے تم لوگوں سے طلب کریں اور "ضروری کارروائی" انجام دیں"۔

انصار نے جب یہ مراسلہ دریافت کیا تو ایک مسلمان شاعر کعبؓ بن مالک سے کہا کہ وہ قریش کے پیغام کا جواب ہجو آمیز اشعار میں دیں۔ ہم اس بات کا بھی ذکر کر چکے ہیں کہ کوئی بھی کلام خواہ نثر ہو یا نظم صحرائے عرب میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ یہاں

تک کہ بعض مسلمانوں کے بقول ہجو آمیز اشعار زہریلے تیروں سے زیادہ اثر رکھتے تھے۔

کعبؓ بن مالک نے بھی ایک ہجو آمیز قصیدہ لکھ کر قریش کے نام ارسال کر دیا لیکن اس قصیدے کو دریافت کرنے کے باوجود قریش اپنی دست درازیوں سے باز نہیں آئے اور انہوں نے ایک بار پھر اہل مدینہ کے لئے مراسلہ روانہ کر دیا البتہ اس مرتبہ ان کا مخاطب منافقوں کا سربراہ عبداللہ بن ابی تھا۔

اس مراسلے میں قریش نے عبداللہ بن ابی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تم نے ہمارے ایک رشتہ دار کو جو مکہ سے بھاگ نکلا ہے' مدینہ میں پناہ دے رکھی ہے لہٰذا اگر تم اسے ہمارے حوالے نہیں کرو گے تو ہم مدینہ پر حملہ کر دیں گے' تم لوگوں کا قتل عام کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنا کر لے جائیں گے۔

لیکن عبداللہ بن ابی اور اس کے ہمنواؤں نے اس پیغام کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا اور اگر وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تو ان پر منافقین کا اطلاق نہ ہوتا۔

عرب باشندے کہتے ہیں کہ منافق وہ لوگ تھے جو اپنی زندگی میں شروع سے آخر تک مثبت یا منفی کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ یہی بحث کرتے رہتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے کس کا ساتھ دینا چاہئے اور کس کا ساتھ نہیں دینا چاہئے اور جب بھی رائے شماری ہوتی تو موافق یا مخالف رائے دینے سے گریز کرتے تھے۔

قریش مکہ نے جب یہ دیکھا کہ ان کے دو مراسلوں سے جو انہوں نے انصار اور منافقین کو ارسال کئے ہیں' خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو اس بار انہوں نے مدینہ کے یہودیوں کو مخاطب قرار دیتے ہوئے یہ پیغام بھجوایا کہ وہ لوگ کسی طور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے حوالے کر دیں۔ لیکن یہودیوں نے بھی واضح جواب نہیں دیا کہ آیا وہ ایسا کریں گے یا نہیں۔ البتہ انہوں نے پس پردہ یہ وعدہ ضرور کر لیا کہ وہ لوگ بوقت ضرورت قریش کا ساتھ دیں گے۔

جب انصار' منافقین اور یہودیوں کے نام ارسال کردہ مراسلات سے مطلوبہ نتائج

حاصل نہیں ہوئے تو قبیلہ قریش نے پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف معاشی حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

قبیلہ قریش کے سبھی ارکان سوداگر تھے اور اقتصادی محاذ آرائی کے لئے سوداگروں کا موثر ہتھیار اقتصادی بائیکاٹ یا معاشی ناکہ بندی ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا قبیلہ قریش نے جزیرۃ العرب کے شمال میں واقع تجارتی راستوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور مدینہ کو کچھ اس طرح اقتصادی محاصرے میں جکڑ دیا کہ ہر قسم کی اشیائے ضرورت مدینہ پہنچنا بند ہو گئیں۔

اگر یہ واقعہ مکہ کے بارے میں رونما ہوتا تو وہاں کے سارے باشندے بھوک کی شدت سے ہلاک ہو جاتے کیونکہ مکہ میں نہ تو زراعت ہوتی تھی اور نہ ہی باغات پائے جاتے تھے لیکن مدینہ کے مضافات میں کھیت اور باغات موجود تھے جہاں سے اشیائے اکل مدینہ پہنچتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود مدینہ کے شہری اشیائے خورد و نوش کی قلت کا شکار ہو گئے اور مدینہ میں اشیائے ضرورت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔

حضرت محمد ﷺ مسجد مدینہ کے قریب اپنے گھر میں جو درحقیقت مختصر سی کوٹھڑی تھی، رہائش پذیر تھے اور انہیں مدینہ کی معاشی ناکہ بندی پر بہت افسوس تھا۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ قریش نے صرف ان کی دشمنی میں ایک شہر کے سارے باشندوں کو بھوکا رہنے کی سزا دے رکھی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ مدینہ میں انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا گھر کھجور کے درخت کی لکڑی اور اس کے پتوں سے بنا ہوا تھا اور اس لئے کہ کوئی رہ گزر گھر کے اندر نہ جھانکے اور اہل خانہ کی بے پردگی نہ ہو تو کھجوروں کے تنوں پر کھال چڑھا دی گئی تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ اپنے سادہ سے گھر میں بھیڑ کی کھال بچھا کر زمین پر سوتے تھے اور ان کی خوراک کبھی خرما اور کبھی گندم کی روٹی پر مشتمل ہوتی تھی لیکن انہوں نے کبھی بھی خرما اور نان یکجا تناول نہیں کئے۔

پیغمبر ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب مدینہ اقتصادی ناکہ بندی سے

دو چار تھا اور کھانے پینے کی چیزیں بھاری قیمت پر فروخت ہو رہی تھیں تو ان دنوں ہمارے گھر میں کھانا پکانے کی غرض سے آگ نہیں جلتی تھی اور وہ ایسا زمانہ تھا کہ ہم نے کبھی بھی آگے پیچھے (متواتر) دو دن روٹی نہیں کھائی۔

پیغمبر اسلام ﷺ اگرچہ شادی شدہ تھے لیکن گھریلو کام انجام دینے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتے اور جس دن ان کے ہاں کھانا پکایا جاتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے آگ بھی جلاتے تھے۔ آپؐ کے گھر میں پکنے والی غذا ایک قسم کی حلیم ہوتی تھی اور چونکہ پیغمبر ﷺ کی زوجات گوشت کھانے کی شوقین تھیں تو کبھی کبھار ان کے ہاں گوشت بھی پکا لیا جاتا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ اپنے کپڑے خود سیتے، اپنے نعلین کی مرمت بھی خود ہی کرتے تھے۔ چونکہ وہ بہت صفائی پسند تھے لہٰذا اپنے کپڑے خود دھوتے اور دن میں کئی مرتبہ مسواک کے ذریعے دانتوں کی صفائی بھی کرتے تھے۔ انہی کا یہ قول ہے "صفائی اور پاکیزگی آدھا ایمان ہے"۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں تحمل کی یگانہ علامت، کہ جس کا ذکر سارے مؤرخین نے کیا ہے، یہ تھی کہ ان کے پاس ایک رومال تھا جس سے وہ کھجوریں وغیرہ تناول کرنے کے بعد ہاتھ پونچھتے تھے۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے دکھاوا یا تحمل کہا جا سکے۔

جب مدینہ کی معاشی ناکہ بندی نے شدت اختیار کر لی اور عام لوگ اشیائے ضرورت کی قلت کے باعث پریشان رہنے لگے تو پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ مذہبی رہنما کے علاوہ ایک سیاسی پیشوا کے فرائض بھی سنبھال لیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس دن سے حکومت یا انتظامیہ وجود میں آئی تھی تو ایک حکمران کے پاس اپنے عدو کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف دو ہی راستے موجود ہوتے ہیں۔ ایک سیاست اور دوسرا جنگ! بالکل ایسے ہی جیسے انسانی تمدن کی ابتداء سے آج تک جو بھی

انسان کپڑے سینا چاہے تو اسے سوئی دھاگے اور قینچی کا سہارا لینا پڑتا ہے اور کپڑے کی سلائی کے لئے اس کے سوا دوسرا طریقہ کار موجود نہیں اسی طرح کسی سربراہ مملکت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے بالائے ذکر دو حربوں یعنی سیاست یا جنگ میں کسی ایک کا انتخاب کرے۔

پیغمبر اسلام ﷺ جان چکے تھے کہ وہ قریش کے ساتھ سیاسی مداوا نہیں کر سکتے لہٰذا انہوں نے دوسرے طریقے یعنی جنگ کو ترجیح دی اور تلوار نیام سے نکال لینے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک عرب شاعر تلوار کے وصف میں کہتا ہے اے تلوار! لوہار نے تجھے پر طائر کی طرح سبک، شاخ درخت کی طرح نرم و خمیدہ اور سنگ خارا کی طرح سخت اور مضبوط بنایا پھر تجھ میں ایک دلیر جنگجو کی روح پھونک دی!"

ایک دوسرا شاعر تلوار کی تعریف میں کہتا ہے: "اے شمشیر من! تیری دھار اتنی نرم و لطیف ہے کہ جب اسے لمس کرتا ہوں تو میرے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔ تیرا قبضہ مجھے اپنی انگلیوں تلے کسی پختہ پھل سے بھی زیادہ نرم محسوس ہوتا ہے"..... اور اس دن کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے فیصلہ کر لیا کہ دین اللہ کی حفاظت و کامیابی کے لئے تلوار کا سہارا لینا پڑ گیا تو دریغ نہیں کریں گے۔



مدینہ سے گزرنے والے مکی کاروانوں پر پابندی

پیغمبر اسلام ﷺ نے قبیلہ قریش کو خبردار کیا کہ چونکہ اس قبیلے نے مدینے کو معاشی محاصرے میں لے رکھا ہے لہٰذا آج کے بعد مکہ کے تجارتی قافلوں کو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ مسلمانوں کی قلمرو سے عبور کریں اور اگر انہوں نے مدینہ کی حدود سے گزرنے کی کوشش کی تو ان کا راستہ روک دیا جائے گا۔

اس انتباہ کے بعد حضرت محمد ﷺ نے چالیس رضاکار مسلمانوں کو منتخب کیا اور ان کی قیادت اسلام کے نامور سردار حضرت حمزہؓ کے سپرد کردی۔ حضرت محمد ﷺ نے ان چالیس افراد کو بیس اونٹ بھی فراہم کئے اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ حضرت حمزہؓ کی زیر قیادت مدینہ اور بحیرہ احمر کے درمیان واقع اس گزرگاہ کی نگرانی کریں جو درحقیقت مکہ کے تجارتی قافلوں کی رفت و آمد کا اصلی راستہ ہے۔

وہ چالیس رضاکار جن کا شمار مہاجرین میں ہوتا تھا اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے

تنخواہ یا مزدوری نہیں چاہتے تھے اور ان کے پاس گھوڑے بھی نہیں تھے جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ ایسے کاموں کے لئے گھوڑے اونٹوں سے زیادہ بہتر اور مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن فی زمانہ مسلمان اتنے مالدار نہیں تھے جو گھوڑے خرید کر اپنے سپاہیوں کو فراہم کر سکیں۔

جزیرۃ العرب میں ایک قطعہ زمین ایسا ہے جسے "حجاز" کہتے ہیں اور حجاز اس علاقے کا نام ہے جو بحیرہ احمر کے کنارے ایک طویل پٹی کی شکل میں شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے اور جس کی لمبائی ایک ہزار کلومیٹر کے برابر ہے۔ اس علاقے میں پہاڑ اور ٹیلے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

حجاز میں دنیا کے بہترین گھوڑوں کی پرورش ہوتی ہے اور وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے جو عربی گھوڑوں کے نام سے مشہور ہیں اور تیز رفتاری میں جن کا کوئی ثانی نہیں حجاز ہی میں پرورش پاتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خود حجاز میں عربی گھوڑا ایک گرانقدر جانور سمجھا جاتا ہے اور ہر کوئی اسے پالنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ دوسرے یہ کہ عربی گھوڑا جزیرۃ العرب کے صحراؤں میں رہنے کے قابل نہیں چونکہ اس سے بھوک اور پیاس برداشت نہیں ہوتی۔

عربی باشندے جب یہ چاہتے کہ صحرا میں کسی جنگی مشن کے لئے گھوڑوں کا استعمال کریں تو وہ ان کے لئے پانی اور چارہ مہیا کرنے کی غرض سے کئی فالتو اونٹ اپنے ہمراہ لے جانے پر مجبور ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صحرا میں پانی کا مسئلہ نہ صرف اس جانور کے لئے اہمیت رکھتا تھا بلکہ اضافی اونٹوں کی مدد سے پانی اور چارہ ڈھونا بھی مشکلات میں اضافے کا سبب بنتا تھا۔

اونٹ ایک ریگستانی جانور ہے وہ صحرائی جھاڑیوں سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے اور پانی پیئے بغیر کئی دن تک گزارا کر سکتا ہے۔ اگر ایسی جگہ دستیاب ہو جائے جہاں ہرا بھرا چارہ موجود ہو تو اسے پانی کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

جس قافلے میں گھوڑے ہوتے تو اس قافلے کے مسافر پانی کی کمی کی صورت میں اپنے حصے کا پانی گھوڑوں کو دے دیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گھوڑا انسان کی طرح پیاس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ لیکن جب وہ لوگ میدان کارزار میں اترتے اور لڑائی شروع ہوتی تو گھوڑا ایک بے مثال مرکب کی حیثیت سے نمودار ہوتا اور کوئی دوسرا جانور جو سواری کے لئے استعمال ہوتا تھا پھرتی' چالاکی' تیز رفتاری اور فرمانبرداری میں گھوڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

عربی روایات میں ذکر ہوا ہے کہ جب اللہ نے آدمؑ کی تخلیق کی تو انہیں سارے جانوروں سے روشناس کرایا تاکہ وہ ان میں سے جسے چاہے منتخب کرلیں۔ آدم علیہ السلام نے تمام جانوروں میں سے گھوڑے کو پسند کیا اور اللہ نے بھی انسان کی پسند کو سراہا کیونکہ خود اللہ بھی گھوڑے کو دوسرے جانوروں پر ترجیح دیتا تھا۔

بہرکیف حضرت حمزہؓ اور ان کے چالیس ساتھی جنہیں کفار کے قافلوں کا راستہ روکنا تھا اس بات پر ملول تھے کہ ان کے پاس گھوڑے نہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے پاس گھوڑے ہوتے تو وہ اپنے فرائض منصبی بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے۔

حضرت حمزہؓ اور ان کے چالیس ساتھیوں کی گشت کا علاقہ بحیرہ احمر اور مدینے کا درمیانی علاقہ تھا جس کی وسعت ایک سو تیس کلومیٹر کے برابر تھی اور مکہ کے قافلے بہر صورت اس علاقے سے گزرنے پر مجبور تھے۔

کچھ دنوں بعد ایک قافلے کا گرد و غبار نمایاں ہوا اور جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ اس قافلے کا سالار وہ شخص ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ہے یعنی ابوجہل۔

ابوجہل وہی تھا جو پیغمبر اسلام ﷺ کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا اور اس نے ان کے سر کی بولی لگا رکھی تھی' یہ وہی شخص تھا جس نے خانہ کعبہ میں حضرت محمد ﷺ کے سر اور چہرے کو اونٹ کی اوجڑی میں جکڑ کر ان کا دم گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔

مسلمانوں کو جب یہ پتہ چلا کہ اس قافلے کا سربراہ ابوجہل ہے تو انہوں نے اس پر حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

لیکن اسی لمحہ محمد بن عمرو نامی شخص نمودار ہوا جو دراصل اس قبیلے کا سربراہ تھا جس کے علاقے سے مکہ کا کاروان گزر رہا تھا۔ اس شخص نے حضرت حمزہؓ کا راستہ روکتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اس کاروان پر حملہ کرنے سے باز رہیں۔ عمرو نے بتایا کہ ہمارے قبیلے نے قریش کے ساتھ یہ معاہدہ کر رکھا ہے کہ مکہ کے کاروان ہر قسم کی دست درازی سے محفوظ رہتے ہوئے ہمارے علاقے سے گزریں۔ لہٰذا ہم نہ تو خود ان پر دست درازی کرتے ہیں اور نہ کسی کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے علاقے میں مکہ کے کاروانوں کا راستہ روکے۔

عمرو نے بتایا کہ اس پیمان کے بموجب جو ہم نے قریش کے ساتھ باندھا ہے ہم مکی کاروانوں کی حمایت کے عوض سال میں دو مرتبہ ''خوہ'' دریافت کرتے ہیں۔

''خوہ'' (ذمہ کے وزن پر پڑھئے) درحقیقت اخوت کا متبادل کلمہ ہے لیکن اس کا اصلی مفہوم وہی ''باج'' ہے جو تجارتی قافلوں کی طرف سے مقامی قبائل کو پیش کیا جاتا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ تجارتی قافلے کسی لوٹ مار کے بغیر ان کے علاقے سے بحفاظت گزر جائیں۔

عمرو نے مزید بتایا کہ ہم نے ایسا ہی ایک معاہدہ مدینہ کے تاجروں کے ساتھ بھی منعقد کیا ہوا ہے اور مدینہ کے قافلے بھی بے خوف و خطر ہماری سرزمین سے عبور کرتے ہیں اور ہم ان پر بھی کسی کو حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ ہم اہل مدینہ سے بھی ''خوہ'' دریافت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ ہم ہر صورت میں اپنے ہم عہد تجارتی قافلوں کی حمایت و حفاظت کریں گے۔ اس کے علاوہ ہر عہد و پیمان مقدس و محترم ہوتا ہے اور ہمیں اس کا پاس رکھنا چاہئے۔

حضرت حمزہؓ جو خود ایک عرب تھے بخوبی سمجھتے تھے کہ کسی عہد و پیمان کو ٹھکرایا نہیں

جا سکتا۔ مزید برآں انہیں یہ بھی احساس ہو چلا تھا کہ اگر وہ کاروان مکہ پر حملہ کریں تو نہ صرف یہ کہ انہیں مقامی قبیلے سے نبرد آزما ہونا پڑے گا بلکہ مستقبل میں مدینہ کے قافلے بھی اس علاقے سے گزرتے ہوئے غیر محفوظ اور مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔

اگرچہ ابوجہل نے مکہ پہنچ کر قریش کے سرداروں کو اپنے ساتھ پیش آنے والی صورت حال سے آگاہ کر دیا مگر انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور یہ فیصلہ کر لیا کہ مکہ کے قافلے حسب سابق اسی علاقے سے گزرتے رہیں۔ اگر اہل مکہ کے پاس کوئی چارہ ہوتا تو وہ اپنے کاروانوں کو راستے سے نہ گزارتے لیکن وہ سمندر اور مدینہ کے درمیان نسبتاً باریک راستے سے گزرنے پر مجبور تھے۔

دوسری بار کفار مکہ کے مقابلے پر جانے والی مسلمانوں کی جماعت میں ساٹھ رضاکار شامل تھے اور یہ لوگ بھی پہلے گروہ کی طرح اونٹوں پر سوار تھے۔ اس مرتبہ حضرت عبیدؓ بن حارث بن عبدالمطلب جو رشتے میں پیغمبر اسلامؐ کے چچا بھی تھے اس مختصر سی سپاہ کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ ساٹھ افراد بھی حضرت حمزہؓ کی زیر قیادت جانے والے چالیس رضاکاروں کی طرح مہاجرین میں شمار ہوتے تھے اور رضائے الٰہی کی خاطر اس مہم میں شریک ہوئے تھے۔

ان لوگوں نے مدینہ اور سمندر کے درمیانی علاقے کی نگرانی کرتے ہوئے دو ہفتوں کے بعد مکہ کے ایک کاروان کو ڈھونڈ نکالا اور یہ پتہ چلا لیا کہ اس قافلے کا سربراہ ایسا شخص ہے جس کا نام عکرمہ ہے اور عکرمہ ابوجہل کا بیٹا تھا۔

مذکورہ قافلے میں شامل مردوں کی تعداد ایک سو چالیس تھی یعنی حضرت عبیداللہؓ کی سپاہ سے دگنی۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے مسلمانوں کو دیکھا تو دم دبا کر بھاگ نکلے لیکن ان میں سے دو افراد ایسے تھے جنہوں نے فرار کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ مسلمانوں سے آ ملے کیونکہ وہ خود مسلمان تھے۔

ان دو افراد میں سے ایک کا نام مقدادؓ بن عمرو اور دوسرا عتبہؓ بن غزوان کے نام سے

پہچانا جاتا تھا۔ یہ دونوں حضرات اس زمانے میں جبکہ مسلمان مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو وہ بھی ان کے ہمراہ حبشہ کی طرف نکل گئے اور کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد واپس مکہ چلے آئے لیکن جب یہ لوگ مکہ پہنچے تو ہجرت کا آغاز ہو چکا تھا اور پیغمبر اسلام ﷺ مکہ سے کوچ کرکے مدینہ پہنچ چکے تھے۔

ان دونوں حضرات نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ مدینہ پہنچ کر اپنے دینی بھائیوں سے جا ملیں لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم جب انہیں یہ علم ہوا کہ عکرمہ کی زیر قیادت ایک کاروان روانہ ہونے والا ہے جو مدینہ کے پاس سے گزرے گا تو وہ اس کاروان کے ساتھ ہو لئے تاکہ شاید اسی بہانے مدینہ پہنچ سکیں لہٰذا جب اہل قافلہ نے فرار کی راہ اختیار کی تو انہیں مسلمانوں سے ملحق ہونے کا موقع مل گیا۔

ان دو افراد کے مدینہ پہنچنے پر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کی آمد کے کچھ عرصہ بعد رضاکار مسلمانوں کا تیسرا دستہ جو بیس اونٹ سواروں پر مشتمل تھا حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی سربراہی میں روانہ ہوگیا تاکہ کفار مکہ کو مدینہ کی معاشی ناکہ بندی کرنے کی سزا دے سکے۔

اس کی وجہ کہ باری باری رضاکار تبدیل ہو رہے تھے یہ تھی کہ ہر مسلمان چاہتا تھا کہ وہ اسلام کی راہ میں کوئی خدمت انجام دے لہٰذا اسی بنا پر کہ دوسرے مسلمان خدمت گزاری سے محروم نہ رہیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ اصول اپنایا کہ رضاکار دستے باری باری تبدیل ہوتے رہیں۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، پیغمبر ﷺ کی والدہ حضرت آمنہؓ کے بھانجے تھے اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں حضرت سعدؓ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کی راہ میں اولین بار کسی کافر کا خون بہایا تھا یعنی اسے زخمی کیا تھا۔

حضرت سعدؓ ''خرار'' نامی علاقے میں ایک مکی کاروان کے مقابل نکل آئے اور چاہا کہ اس پر حملہ کریں لیکن ایک بار پھر مقامی قبیلے کا سربراہ مسلمانوں کی راہ میں حائل ہو گیا

اور بولا کہ میرے قبیلے کا علاقہ "دارالامان" ہے۔ یہاں ہم نہ تو خود کسی قافلے پر حملہ کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کو حملے کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ ہمیں دونوں طرف سے "خوہ" حاصل ہوتا ہے (خوہ کے بارے میں گزشتہ سطور میں وضاحت ہو چکی ہے کہ درحقیقت یہ ایک قسم کا "ٹیکس" تھا جو کسی قافلے کی طرف سے اس قبیلے کے سربراہ کو ادا کیا جاتا تھا جس کے علاقے سے کارواں گزر رہا ہو اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں سے گزرنے والے قافلے امان میں رہیں)۔

مقامی قبیلہ نہ صرف یہ کہ اہل قافلہ سے خوہ دریافت کرتا تھا بلکہ مویشیوں کی خوراک اور اشیائے ضرورت کی فروخت سے بھی منافع کماتا تھا۔ لہٰذا ان کے علاقے میں اگر کسی کاروان پر حملہ ہوتا تو وہ "باج" کے حصول سے محروم ہو جاتے اور اشیائے خورد و نوش کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے بھی۔

یہی وجہ تھی کہ رضاکار مسلمان ایک بار پھر کسی کارروائی کے بغیر مدینہ لوٹ آئے اور حضرت سعدؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ اس سلسلے میں کسی اور طریقہ کار پر غور کرنا چاہئے۔

حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کو بتایا کہ صحرانشین عرب چونکہ اہل مکہ سے استفادہ کرتے ہیں لہٰذا وہ کفار کے کاروانوں کا راستہ روکنے کے سلسلے میں ہمارے اقدامات سے اتفاق نہیں کریں گے۔ وہ لوگ کفار مکہ سے جو کچھ دریافت کرتے ہیں وہ دراصل خوہ اور اشیائے ضرورت کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی ہے لیکن میں اس کے بدلے میں انہیں ایسی چیز دوں گا کہ جس کے سامنے مذکورہ دونوں آمدنیاں بے وقعت ہو کر رہ جائیں گی۔

مسلمانوں نے پوچھا "یا رسول اللہ! آپ انہیں کیا دیں گے؟"

جواب ملا "اس ناچیز منافع کے عوض جو بادیہ عرب اہل مکہ سے دریافت کرتے ہیں میں انہیں اسلام کی دعوت اور جنت کی بشارت دوں گا"۔

حضرت محمد ﷺ نے جیسے ہی یہ سوچا تو اسے عملی جامہ پہنانے کی غرض سے

مذاکرات شروع کر دیئے اور ان سے کہا کہ وہ لوگ اس معمولی منافع سے چشم پوشی کر لیں جسے وہ اہل مکہ سے حاصل کرتے ہیں۔ میں اس کے بدلے تم لوگوں کو بہشت پانے کی خوشخبری دیتا ہوں۔

ہم جو یورپی باشندے ہیں اور اپنی منطق اور سوچ کے مطابق ہر بات کا موازنہ کرتے ہیں یہی کہیں گے کہ بدوی اعراب نے یقیناً پیغمبر اسلام ﷺ کی تجویز کو نہیں مانا ہو گا کیونکہ ہم جو اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے ہیں آج کے نقد کو کل کے ادھار کی امید پر ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ صحرائی باشندوں نے حضرت محمد ﷺ کی پیشکش قبول کر لی اور اہل مکہ سے حاصل ہونے والی آمدنی سے دستبردار ہو گئے تاکہ اللہ کی رضا حاصل کر سکیں اور جنت کے حقدار قرار پائیں۔

دو چیزیں اس بات کا سبب بنیں کہ اعراب حضرت محمد ﷺ کی تجویز کو دل و جان سے قبول کر لیں اور ان میں سے ایک وہ قرآنی آیات تھیں جو سوچوں میں انقلاب اور دلوں میں دگرگونی کا سبب بنتی تھیں۔ خاص طور پر وہ آیات جن میں بہشت اور اس کی خصوصیات کا ذکر ہوا تھا۔ قرآن کی ۷۶ ویں سورۃ ''الانسان'' کی بارہویں آیت میں اللہ نے فرمایا ہے۔

''وجذٰئھم بما صبروا جنتہ و حریرا''۔

''چونکہ صبر انہوں نے بھوک اور پیاس پر (یہاں بھوک اور پیاس سے مراد روزہ ہے) تو اللہ اس کے بدلے میں انہیں جنت میں داخل کرے گا اور انہیں ریشمی لباس پہننا نصیب ہو گا''۔

(قارئین کرام ہو سکتا ہے آپ قرآن کی ۷۶ ویں سورۃ کو اپنے قرآن مجید میں ''الدہر'' کے نام سے پائیں۔ تاہم اس سورۃ کے لئے الانسان کا عنوان بھی استعمال ہوا ہے اور میں نے خود ایک قرآن میں جو غالباً'' کسی عربی ملک میں شائع ہوا تھا الانسان ہی پڑھا ہے

اور اس کے انگریزی ترجمے کو "Time Or Man" کے نام سے مشاہدہ کیا ہے۔ خلیل)
اسی سورۃ کی تیرہویں آیت میں آیا ہے متکئین فیھما علی الارائک لایرون فیھا شمسا" ولا زمھریرا"۔
یعنی وہ لوگ جو جنت میں داخل ہوں گے وہ وہاں (تکیوں سے) ٹیک لگائیں گے اور انہیں گرمی کا احساس ہو گا نہ سردی کا۔
سورۃ الانسان کی چودہویں آیت میں کہا گیا ہے "ودانیتہ علیھم ظلالھا وذللت قطوفھا تذلیلا" یعنی جنت میں درختوں کا سایہ ان سے نزدیک ہو گا (یعنی درختوں کا سایہ ان پر چھا جائے گا) اور جنت میں رہنے والوں کے لئے میوہ چننا بہت آسان ہو گا۔
اس آیت کی فصاحت کو جو سورۃ الانسان کی چودہویں آیت ہے ہم یورپی لوگ نہیں سمجھ سکتے اور صرف ایک عربی زبان جاننے والا ہی سمجھ سکتا ہے کہ ان مختصر کلمات میں کتنی فصاحت و بلاغت موجود ہے۔ جب ایسی آیات کو دلنشیں پیرائے میں بدوی اعراب کے سامنے پڑھا جاتا جو فطرتا" سخن آشنا اور فصاحت شناس بھی تھے تو وہ اتنے متاثر ہوتے کہ یہ کلام ان کی روح میں نفوذ کر جاتا اور وہ اس کو کسی طور بھی بھلا نہیں سکتے تھے۔
لہٰذا اگر جنت اور اس کی لذات کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ذکر ہو اور جنت میں حاصل ہونے والی خوشیوں کی تفصیل بیان کی جائے تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ اللہ نے سارے مسلمانوں منجملہ ان بادیہ اعراب کو جنہیں پیغمبر اسلام ﷺ اپنے ساتھ متحد کرنا چاہتے تھے یہ بشارت دی کہ قبول اسلام کی صورت میں اور اس پر عمل کرنے کے صلے میں وہ بہشت کے حقدار قرار پائیں گے جہاں وہ ریشمی لباس زیب تن کریں گے اور انہیں ایسی شراب نصیب ہو گی جس کی طبع کافور کی طرح سرد اور جس کی خوشبو زنجیل (سونٹھ) کی مانند فرحت بخش ہو گی اور خوبصورت عورتیں جو ہمیشہ جوان اور دوشیزہ رہیں گی (یعنی حوریں) مدام ان کے ساتھ بسر کریں گی۔

بہرحال قرآنی آیات کا اعجاز ایک بار پھر آشکار ہوا اور صحرانشین اعراب نے رضائے الٰہی اور حصول جنت کی خاطر اہل مکہ سے حاصل ہونے والی آمدنی سے چشم پوشی کرلی اور اس کی بجائے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ تعاون کرنے پر رضامند ہو گئے۔ یہ موضوع چونکہ قرآنی آیات کے اثرات اور خود پیغمبر اسلام ﷺ کے ذاتی کمالات کے پیش نظر بڑی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ہم اس بارے میں آئندہ صفحات میں بھی گفتگو کریں گے۔

بہرحال حضرت محمد ﷺ بدوی قبائل کو مسلمانوں کے ساتھ متحد کرنے کی غرض سے ساٹھ رضاکاروں پر مشتمل جماعت کے ساتھ مذکورہ قبائل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس بار رضاکار دستے کی قیادت بذات خود پیغمبر اسلام ﷺ کے ہاتھ میں تھی اور اس مرتبہ بھی مسلمانوں کے پاس سواری کے لئے گھوڑے نہیں تھے اور وہ اونٹوں پر سفر کر رہے تھے۔

حضرت محمد ﷺ مدینہ سے نکلنے کے بعد اپنی سپاہ کے ہمراہ قبیلہ غفار کے محل سکونت کی طرف روانہ ہو گئے۔

قبیلہ غفار وہ پہلا قبیلہ ہے جس نے اسلام قبول کیا۔ اس تاریخ سے دس سال پہلے حضرت ابوذرؓ جو راہزن تھے اپنے کئے پر سخت نادم ہوئے اور اسلام لانے کے بعد راہزنی سے توبہ کرلی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں قبیلے میں واپس بھیج دیا تاکہ وہ اہل قبیلہ کو قبول اسلام کی دعوت دیں۔ دس سال کی مدت میں قبیلہ غفار کے تمام ارکان مسلمان ہو گئے اور انہوں نے ڈکیتی اور لوٹ مار سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرلی۔

قبیلہ غفار کی رہائش کا علاقہ مدینہ اور ینبع نامی خطہ زمین کے درمیان واقع تھا اور پیغمبر اسلام ﷺ اس سے پہلے کہ قبیلہ غفار کی حدود میں داخل ہوں تو "ابواء" نامی علاقے میں ٹھہر گئے۔ کیونکہ ان کی والدہ حضرت آمنہؓ اسی مقام پر دفن تھیں۔

جب حضرت محمد ﷺ اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کے پاس پہنچے تو اونٹ سے اتر آئے اور پیادہ ہی قبر کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوسرے مسلمان بھی جنہیں یہ علم ہو چکا تھا کہ

یہاں والدہ پیغمبر ﷺ کی قبر ہے' اپنی جگہ ٹھہر گئے اور ان میں سے حضرت عمرؓ جو رضاکارانہ طور پر سفر میں شریک ہوئے تھے پیغمبر ﷺ کے ہمراہ قبر تک پہنچے۔

حضرت محمد ﷺ نے لحد مادر کے سامنے پہنچ کر زانو ٹیکے' پیشانی قبر پر رکھی اور بے اختیار ہو کر رو دیئے۔

گو کہ حضرت آمنہؓ کو فوت ہوئے پچاس سال گزر چکے تھے لیکن حضرت محمد ﷺ اس طفل کی مانند جس نے حال ہی میں اپنی ماں کو کھویا ہو' زار زار رو رہے تھے۔ انہیں اپنی ماں کی زحمتوں اور مشقتوں کا احساس ہو رہا تھا جو انہوں نے ان کی پرورش کے دوران جھیلی تھیں۔ جب حضرت محمد ﷺ پیدا ہوئے تو ان کے والد حضرت عبداللہ زندگی کو وداع کہہ چکے تھے اور ان کی والدہ نے بیوہ ہوتے ہوئے کسی آسرے کے بغیر اپنے اکلوتے فرزند کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ خود اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

حضرت محمد ﷺ لحد مادر پر اپنی طفولیت کے مشکل دنوں کی یادوں میں ڈوب گئے اور انہیں احساس ہوا کہ جب تک ان کی ماں زندہ تھیں تو ہر دشواری کا سامنا کرنا ان کے لئے کتنا آسان ہوتا تھا۔ جب بھی وہ اپنی کمسنی کے زمانے میں گھر لوٹتے تو ان کی والدہ انہیں نوازش کرتیں' ان کا منہ ہاتھ دھلاتیں اور اپنے ہاتھوں سے پکایا ہوا کھانا ان کے سامنے رکھ کر بڑے پیار و محبت سے انہیں کھانا کھلاتی تھیں۔

لیکن جب حضرت آمنہؓ کی آنکھیں بند ہو گئیں تو حضرت محمد ﷺ بالکل تنہا رہ گئے۔ جب وہ صحرا سے برہنہ پا واپس آتے تو کوئی نہ تھا جو ان کا منہ ہاتھ دھلائے اور ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرے حتیٰ کہ ان کی راہ دیکھنے والا اور ان کی واپسی کا انتظار کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا تھا۔

کوئی ہے جو کسی یتیم بچے کی راہ میں آنکھیں بچھائے اور اس کی آمد سے پہلے اس کے لئے کھانا اور پانی تیار رکھے تاکہ جب وہ تھکا ہارا واپس آئے تو پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے

اور جی بھر کر پیاس بجھا سکے۔

بہرحال حضرت محمد ﷺ اپنی والدہ کی قبر پر اتنا روئے کہ حضرت عمرؓ جن کی ہیبت کے بارے میں مشہور تھا کہ ابلیس بھی ان سے خوفزدہ رہتا ہے اور جن کی آواز میں برق آسمانی کی سی گرج ہوتی تھی، گلوگیر ہو کر کہنے لگے "یا رسول اللہ! اتنا مت رویئے کہ میں بھی روتے روتے بے قابو ہو جاؤں"۔

بعض مؤرخین جن میں ابن سعد، بخاری اور ابن ہشام شامل ہیں لکھتے ہیں کہ جب حضرت محمد ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر سے سر اٹھایا تو حضرت عمرؓ بولے "یا رسول اللہ! آپ اتنا کیوں رو رہے ہیں۔ دیکھئے میری آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں"۔

بہرحال حضرت محمد ﷺ اپنی والدہ کی قبر پر اتنا روئے کہ حضرت عمرؓ جیسا مضبوط دل انسان بھی ضبط نہ کر سکا اور رونے لگا یہ ممکن تھا کہ رونے لگے۔

جب حضرت محمد ﷺ نے لحد مادر کو وداع کہا تو آپ سرزمین غفار میں داخل ہونے سے پہلے "ودان" نامی خطہ زمین میں پہنچے جو قبیلہ بنو ضمرہ کی رہائش کا علاقہ تھا اور اس وقت تک مذکورہ قبیلے کا ایک بھی فرد مسلمان نہیں ہوا تھا۔

قبیلہ "بنو ضمرہ" قبیلہ غفار کا ایک ذیلی شعبہ سمجھا جاتا تھا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اس قبیلے کے سرکردہ افراد سے گفت و شنید کی خاطر ایک ہفتے تک ودان میں قیام کیا۔

ایک ہفتے کے بعد، ان مذاکرات کے نتیجے میں جو حضرت محمد ﷺ اور سرداران قبیلہ کے درمیان انجام پذیر ہوئے اور جن میں حضرت محمد ﷺ نے ان لوگوں کے لئے قرآنی آیات کو دہرایا تو مسلمانوں اور بنو ضمرہ کے درمیان ایک فوجی معاہدہ منعقد ہو گیا۔ یہ اسلامی تاریخ کا پہلا فوجی معاہدہ ہے جو مسلمانوں اور کسی دوسرے فریق کے مابین لکھا گیا اور طرفین نے اپنی مہریں لگا کر اس کی توثیق بھی کی۔

اس معاہدے میں حضرت محمد ﷺ نے اللہ کے رسول ﷺ اور مسلمانوں

کے پیشوا کی حیثیت سے یہ عہد کیا کہ اگر بنو ضمرہ پر حملہ ہوا تو وہ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے اسی طرح بنو ضمرہ کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ جب بھی مسلمانوں کو امداد کی ضرورت محسوس ہوئی تو بنو ضمرہ ان کی حمایت میں شمشیربدست حاضر ہو جائیں گے۔ علاوہ ازیں بالائے ذکر معاہدہ کی رو سے بنو ضمرہ کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ مکہ کے قافلوں کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دیں۔

سرزمین "ودان" یعنی بنو ضمرہ کا رہائشی علاقہ مدینہ سے تین روز کی مسافت اور مکہ سے نو دن کی مسافت پر واقع تھا۔

ہو سکتا ہے یہ تصور کیا جائے کہ بنو ضمرہ نے اس بنا پر حضرت محمد ﷺ سے اتحاد کر لیا ہو گا کہ انہوں نے دیکھا مکہ دور ہے اور مدینہ نزدیک لہٰذا مسلمانوں سے بنا کر رکھنے ہی میں مصلحت ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اگرچہ مکہ دور تھا پھر بھی قریش کی ہیبت اور طاقت اتنی زیادہ تھی کہ بنو ضمرہ انہیں نظرانداز نہیں کر سکتے تھے اور باطناً" ان سے خوفزدہ رہتے تھے۔ دراصل جو چیز اس بات کا سبب بنی کہ قبیلہ بنو ضمرہ قریش کا ساتھ چھوڑ دے اور مسلمانوں کی طرف جھک جائے تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی اس دعوت کا اثر تھا جس میں انہوں نے مذکورہ قبیلے کو بشارت دی تھی کہ اگر وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں تو انہیں اللہ کی رضا حاصل ہو گی اور جس کے نتیجے میں وہ بہشت کے حقدار قرار پائیں گے۔

بہشت ایسی جگہ ہے جہاں انسان ایک بار قدم رکھ دے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاودانی خوشیوں سے ہمکنار ہو جائے گا۔ لہٰذا ہر طرح کی دینوی فداکاری حصول بہشت کے لئے بالکل جائز ہے۔

اس دنیا میں انسان کی عمر کوتاہ ہے اور یہ مختصر سی زندگی بھی اکثر اوقات رنج و مشقت میں گزر جاتی ہے۔ لیکن جنت میں انسان کو لافانی زندگی اور کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ لہٰذا جنت کے حصول کی خاطر اس دنیا کو عقبٰی کے ہاتھوں بیچ دینا ایسا معاملہ ہے جس میں انسان کا خسارہ نہیں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ بنو ضمرہ کے ساتھ جنگی سمجھوتہ کرنے کے بعد قبیلہ غفار کی جانب روانہ ہو گئے۔ قبیلہ غفار آج بھی جزیرۃ العرب میں موجود ہے۔ کرنل لارنس جو میرے خیال میں کسی تعارف کا محتاج نہیں اور سبھی اسے پہچانتے ہیں اور جس نے پہلی عالمگیر جنگ میں کوشش کی تھی کہ تمام عرب اقوام کو متحد کرکے ایک عظیم عربی مملکت کی داغ بیل ڈالے تو اس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران کچھ عرصہ قبیلہ غفار کے ساتھ بسر کیا تھا۔

کرنل لارنس اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ قبیلہ غفار کے ارکان اخلاقی اور نفسیاتی خصوصیات کے اعتبار سے آج بھی ویسے ہی ہیں جیسا کہ چودہ سو برس پہلے اسلام کے ابتدائی دور میں تھے۔ ان کی نظر میں ہر چیز روشن ہے یا تاریک' سیاہ ہے یا سفید' اچھی ہے یا بری' سچی یا جھوٹی اور ان کی ظاہری یا باطنی سوچوں میں درمیانی درجے کی کوئی چیز موجود نہیں یعنی وہ کبھی بھی اچھے یا برے کا درمیانی راستہ اختیار نہیں کرتے۔

کرنل لارنس قبیلہ غفار کو عرب قبائل کا پاک ترین علاقہ سمجھتا ہے اور چونکہ اس قبیلے کے افراد کی زندگی میں حد وسط موجود نہیں لہٰذا اسلام سے پہلے وہ راہزنی کیا کرتے تھے لیکن جب اسلام لے آئے تو قبیلے کے تمام مرد و زن مکمل طور پر متقی و پرہیز گار بن گئے اور انہوں نے حتیٰ کہ ایک بار بھی راہزنی کا سوچا تک نہیں۔

قبیلہ غفار کے ارکان احکام دین کی بجا آوری میں اتنے ژرف نگر اور سخت گیر بن گئے کہ اگر ان میں سے کوئی کسی گناہ کا مرتکب ہو جاتا تو بذات خود پیغمبر اسلام ﷺ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا تھا چاہے کسی نے اسے گناہ کرتے دیکھا تک نہ ہو۔

ایک مرتبہ قبیلہ غفار کا ایک فرد مسلمان ہونے کے بعد "زنائے محصنہ" کا مرتکب ہو گیا یعنی ایسی عورت کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات برقرار ہو گئے جو پہلے ہی شادی شدہ تھی۔

کسی نے بھی اس شخص کو مذکورہ فعل انجام دیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کہ اسے "زنائے محصنہ" کی سزا کا مستحق قرار دیا جاسکے۔ کجاکہ چار گواہ پیش کئے جاتے جو یہ شہادت دیتے کہ انہوں نے مذکورہ مرد اور عورت کو گناہ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

لیکن جس شخص سے یہ عمل سرزد ہوا وہ اگرچہ جانتا تھا کہ سنگسار کردیا جائے گا لیکن اس کے باوجود وہ خود ہی پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچا اور اپنے فعل کا اعتراف کرتے ہوئے بولا کہ فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہوں لہٰذا مجھے سزا دی جائے۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ اس کی عقل میں خلل واقع نہیں ہوا اور وہ جنون کی حالت میں اپنے آپ پر تہمت نہیں لگا رہا تو اسے شرع اسلام کے مطابق سزا دے دی گئی۔

ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی جنگ میں چونکہ اونٹوں کی تعداد کم تھی اور سارے سپاہی اونٹوں پر سوار نہیں ہوسکتے تھے لہٰذا حضرت محمد ﷺ نے قبیلہ غفار کے سپاہیوں کو رخصت دے دی اور ان سے کہا کہ تم لوگ اپنے قبیلے میں لوٹ جاؤ کیونکہ ہم فی الحال تم لوگوں کو اپنے ہمراہ نہیں لے جاسکتے۔ قبیلہ غفار کے ارکان کو جب یہ علم ہوا کہ وہ لوگ میدان کارزار میں جانے سے محروم ہوگئے ہیں تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور انہوں نے اس انداز میں رونا شروع کردیا گویا کچھ مائیں اپنے بچوں کی موت پر شیون زاری کر رہی ہوں۔ اس دن کے بعد مسلمانوں نے مزاح کے طور پر قبیلہ غفار کا نام "بنوا لبکاء" رکھ دیا یعنی رونے والا قبیلہ!

بہرکیف حضرت محمد ﷺ نے قبیلہ غفار کے ساتھ ایک جنگی سمجھوتہ کیا جس کی رو سے اگر مذکورہ قبیلہ کسی کے حملے کا نشانہ بنا تو مسلمان اس کی حمایت میں نکل آئیں گے اور اسی طرح قبیلہ غفار بھی مسلمانوں کی مدد کرنے اور ان کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت حاضر و آمادہ رہے گا۔

بعد میں قبیلہ غفار کو پیغمبر اسلام ﷺ کا اتنا اعتماد حاصل ہوا کہ ایک مرتبہ جب حضرت محمد ﷺ کسی سفر پر روانہ ہونے والے تھے تو انہوں نے اپنی جگہ ابوذر غفاریؓ

کو مدینے کا نظم و نسق سنبھالنے کی ذمہ داری سونپ دی۔

قبیلہ غفار کے ساتھ فوجی معاہدہ منعقد ہو جانے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے مذکورہ قبیلے کی سرزمین کو خیرباد کہا اور قبیلہ جہینیہ کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لیا۔

قبیلہ جہینیہ ینبع کے پہاڑی علاقے میں واقع رودہ نامی مقام پر رہائش پذیر تھا۔ وہ قبیلہ بھی مسلمانوں کا اتحادی بن گیا اور اس قبیلے کے افراد اتنے سچے اور پکے مسلمان بن گئے کہ انہوں نے اپنے خرچ اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے مدینہ میں ایک مسجد تعمیر کی جسے مسجد قبا کے بعد مسلمانوں کی دوسری مسجد کا رتبہ حاصل ہوا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا سفر جاری رکھا اور بنو مدلیج کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔

یہ وہی قبیلہ تھا کہ جب حضرت محمد ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو اس قبیلے کے سربراہ نے آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ قریش کا مقرر کردہ انعام حاصل کر سکے لیکن جب بھی وہ آپ کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتا تو اس کا گھوڑا ٹھہر جاتا یا زمین پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔ قبیلے کے سربراہ سراقہ نے تین بار اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن تینوں مرتبہ اس کا گھوڑا زمین بوس ہو گیا۔

اگرچہ قبیلہ بنو مدلیج کے افراد بت پرست تھے پھر بھی انہوں نے بڑی عزت و اکرام سے حضرت محمد ﷺ کی پذیرائی کی اور ان کے ساتھ جنگی معاہدہ کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ بعد میں سراقہ بن مالک جو مسلمان ہو چکے تھے اسلام کے نامور سرداروں میں شمار ہوئے۔

بالائے ذکر چار قبیلوں کے ساتھ جنگی معاہدے کرنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ مطمئن ہو گئے کیونکہ وہ چاروں قبیلے ایسے مقامات پر واقع تھے کہ جہاں سے کفار کے قافلے بہرصورت عبور کرنے پر مجبور تھے اور چونکہ وہ قبیلے اسلام کے اتحادی بن چکے تھے لہٰذا مکہ کے قافلوں کی روک تھام میں موثر طور پر مسلمانوں کی مدد کر سکتے تھے۔

بدوی قبائل کے ساتھ مذاکرات و معاہدات انجام دینے کے بعد جب حضرت محمد ﷺ مدینہ پہنچے تو انہیں ایک ناگوار خبر سننے کو ملی اور وہ یہ تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں کچھ اونٹ سوار جو تیز رفتار اونٹوں پر سوار تھے ابن جبیر نامی شخص کی قیادت میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے اور متعدد گھروں میں آگ لگانے کے علاوہ مسلمانوں کا مال بھی لوٹ کر لے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان لٹیروں کو بنو قریش نے بھیجا تھا۔

اس حملے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کو اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان عنقریب لڑائی چھڑنے والی ہے۔



"ماہ حرام اور عبداللہؓ بن جحش کا حملہ"

مدینہ کی حدود سے گزرنے والے مکہ کے قافلے اب اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کے اتحادی قبائل ان کا راستہ روکنے میں موثر کردار ادا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہر قافلہ متوسط طور پر ڈھائی ہزار محافظ سپاہی اپنے ساتھ لے کر چلتا تھا۔

دوسری جانب پیغمبر اسلام ﷺ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ قریش مکہ کی اشتعال انگیزیوں اور ریشہ دوانیوں کے پیش نظر ان کی نقل و حرکت' ارادوں اور منصوبوں سے باخبر رہیں تاکہ مدینہ کے مسلمان قریش کی موذیانہ چالوں سے غافل گیر نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ نومبر کے مہینے سن ۶۲۳ء میں یعنی ہجرت کے دوسرے سال پیغمبر اسلام ﷺ نے آٹھ مسلمانوں کو منتخب کیا اور ان میں سے ایک یعنی عبداللہؓ بن جحش کو بقیہ افراد کی سربراہی سونپ دی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک مکتوب بھی لکھوایا اور اسے سربمہر کرنے کے بعد/

عبداللہؓ بن حجش کو دیتے ہوئے یہ ہدایات دیں کہ وہ سرزمین نجد کی طرف روانہ ہو جائیں اور جب وہاں پانی کے کنوئیں کے پاس پہنچیں اور اپنے اونٹوں کو سیراب کرا چکیں تو پھر اس خط کو کھولیں اور اس میں جو کچھ درج ہے اس پر عمل کریں۔

عبداللہؓ بن حجش جو دوسرے تمام مسلمانوں کی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کے دستورات پر مو بہ مو اور بے چون و چرا عمل کرتے تھے دو دن تک مغرب کی جانب چلتے رہے۔ یہاں تک کہ پانی کنوئیں پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اونٹوں کو پانی پلایا پھر پیغمبر اسلام ﷺ کا نامہ کھول کر پڑھنے لگے۔

عبداللہؓ بن حجش نے دیکھا کہ اس نامے میں انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ مکہ اور طائف کے درمیانی راستے میں "نخلہ" کے مقام پر قریش کے حالات کا پتہ چلائیں اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں اور اپنے کام کی گزارش آپؐ کو پیش کریں۔

عبداللہؓ بن حجش جیسے ہی خط کے مضمون سے آگاہ ہوئے تو بلا تامل اپنے دوسرے سات ساتھیوں کے ہمراہ دو ہفتے کا سفر کرنے کے بعد ماہ رجب کی آخری تاریخ کو نخلہ کے مقام پر پہنچ گئے۔

میرے خیال میں یہ مقام ان لوگوں کے لئے ناآشنا نہیں جو شروع سے اس کتاب کا مطالعہ کرتے آئے ہیں۔ گزشتہ ابواب میں ہم بتا چکے ہیں کہ نخلہ وہی مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان کی طرف پتھر پھینکے تھے تاکہ اسے وہاں سے دور کر سکیں۔ پیغمبر ﷺ کے زمانے میں جزیرۃ العرب کے معروف بتوں میں سے ایک یعنی منات کا مجسمہ اسی جگہ پر نصب تھا۔ نخلہ وہی جگہ ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ طائف چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو رات کے پچھلے پہر وہاں پہنچے اور سوزناک آواز میں قرآنی آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ پیغمبر اسلام ﷺ جو آیات پڑھ رہے تھے وہ اتنی متاثر کن تھیں کہ وہاں پر موجود جنوں کی جماعت ان پر ایمان لے آئی۔ اس رات جب حضرت محمد ﷺ نخلہ پہنچے تو ایسے انسان کی حیثیت میں تھے جسے عرب باشندے اپنی زبان میں

""دخل" یعنی قبیلے سے رانذہ ہوا کہتے تھے۔

عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ساتھی جب نخلہ پہنچے تو ان کی تعداد چھ رہ گئی کیونکہ ان کے دو ساتھی راستہ بھٹکنے کی وجہ سے صحرا میں گم ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک سعدؓ بن وقاص اور دوسرے عتبہؓ بن غزوان تھے۔

لہٰذا بقیہ چھ افراد کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ طائف سے مکہ جانے والے کاروانوں کی نگرانی کریں اور ان کے حالات کا پتہ لگائیں لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو رجب کا مہینہ تھا یعنی حرمت والے مہینوں میں سے ایک مہینہ!

یہ جاننا ضروری ہے کہ سارے جزیرۃ العرب میں ماہ حرام ایک جیسے نہیں تھے بلکہ ہر علاقے کی ضروریات کے پیش نظر اس کے ماہ حرام بھی مخصوص ہوتے تھے تاہم مکہ میں سال کے گیارہویں اور بارہویں مہینے یعنی "ذیقعدہ" اور "ذی الحجہ" اور پہلے مہینے یعنی محرم اور ساتویں مہینے یعنی رجب المرجب کو حرمت والے مہینے سمجھا جاتا تھا۔

رجب کا مہینہ ماہ حرام ہونے کے علاوہ چھوٹے حج یعنی حج عمرہ کا مہینہ بھی تھا اور کعبہ کی زیارت کرنے والے بے خوف و خطر مکہ آتے اور اطمینان سے خانہ کعبہ کی زیارت کرتے تھے۔

جب عبداللہؓ بن جحش اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نخلہ پہنچے تو رجب کا مہینہ ختم ہونے میں ابھی ایک دن باقی تھا۔

اسی دن ایک کاروان جو طائف سے مکہ جا رہا تھا اور جس کا سامان کشمش اور کھالوں پر مشتمل تھا نخلہ میں داخل ہوا۔ اہل کاروان نے نخلہ کے مقام پر مختصر پڑاؤ ڈالنے کے بعد سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ رجب کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے مکہ کی حدود میں داخل ہو جائیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رجب کا مہینہ ختم ہونے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ اگر وہ لوگ یہ دن ختم ہونے سے پہلے مکہ نہ پہنچ سکے تو ہو سکتا ہے راستے میں حملے کا نشانہ بن جائیں۔

دوسری جانب عبداللہؓ بن جحش کی نظر مذکورہ کارواں پر پڑی تو ان کا خون کھول اٹھا۔ انہیں قریش کے مظالم یاد آئے اور جور و ستم کے وہ مناظر ان کی آنکھوں میں گھوم گئے جن کی کہانی ہر سننے والے کے رونگٹے کھڑے کر دیتی تھی۔

لیکن عبداللہؓ بن جحش حیران تھے کہ کیا کریں؟

اگر وہ نخلہ کے مقام پر کاروان مکہ کو انتقام کا نشانہ بناتے تو چونکہ "ماہ حرام" کے ختم ہونے میں پورا ایک دن باقی تھا لہٰذا ان کا یہ عمل اس اصول کی خلاف ورزی ہوتا جسے سبھی تسلیم کرتے تھے کیونکہ رجب کے مہینے میں اور اسی طرح دوسرے مہینوں یعنی ذیقعد، ذی الحجہ اور محرم میں نہ تو کسی کو معرکہ آرائی کی اجازت تھی اور نہ ہی اس بات کا حق پہنچتا تھا کہ کسی قافلے کو حملے کا نشانہ بنائے۔

البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ عبداللہؓ بن جحش کاروان مکہ کا تعاقب کریں اور رجب کا مہینہ ختم ہونے کے بعد اس پر حملہ آور ہو جائیں لیکن چونکہ نخلہ اور مکہ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا لہٰذا عبداللہؓ جحش جانتے تھے کہ ایک دن کے بعد وہ قافلہ مکہ کی حدود میں داخل ہو جائے گا اور اس طرح وہ مذکورہ کاروان پر حملہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ حرم میں لڑائی کی ممانعت تھی اور یہ فعل انتہائی قابل مذمت سمجھا جاتا تھا۔

لیکن اس لمحہ عبداللہؓ بن جحش اس احساس میں مبتلا تھے کہ کاروان کا راستہ روکنا درحقیقت اللہ کی راہ میں اسلام کی خدمت کرنا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مکہ کے اعیان و اشراف نے (کہ یہ کاروان بھی انہی کا تھا) مدینہ کو اقتصادی محاصرے میں لے رکھا ہے اور وہ لوگ مسلمانوں کو بھوک کی شدت سے خوفزدہ اور مرعوب کرنا چاہتے ہیں جبکہ مسلمان فی زمانہ اس قابل نہیں تھے کہ قریش کے ساتھ مقابلہ بمشکل کر سکیں۔ آخر کار عبداللہؓ بن جحش نے ماہ رجب کی حرمت اور اللہ کی راہ میں مبارزت کرنے کی ضرورت میں سے دوسری راہ کو اپنانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھیوں سمیت کاروان مکہ پر ہلہ بول دیا۔ اس قافلے میں قریش کے چار افراد شامل تھے۔ ان افراد میں سے ایک مارا گیا، دو اسیر ہو گئے اور

چوتھا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور مسلمانوں نے قافلے کا سارا مال اور مویشی اپنے قبضے میں لے لئے۔ جس مسلمان نے قریش کے مذکورہ فرد کو ہلاک کیا تھا ان کا نام وقیدؓ یا واقد بن عبداللہ تھا۔ وقیدؓ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں پہلی بار کسی کافر کو موت کے گھاٹ اتارا۔ (وضاحت: اسلامی تواریخ میں کسی مسلمان کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے سب سے پہلے بت پرست کا نام عمرو بن حضرمی درج ہوا ہے۔ یہ شخص مذکورہ قافلے میں شامل تھا۔ خلیل)

بہرحال جو شخص بھاگ نکلا وہ مکہ پہنچا اور سرداران قریش کے سامنے قافلہ تاراج ہونے کی تفصیل بیان کی۔ اہل مکہ نے مسلمانوں کا تعاقب کرنے کی کوشش کی لیکن ان تک نہ پہنچ سکے اور مسلمان مال غنیمت کے ساتھ بحفاظت مدینہ پہنچ گئے۔

لیکن نہ صرف مکہ میں صدائے اعتراض بلند ہوئی بلکہ مدینہ کے بت پرست اور یہودی بھی احتجاج کرنے میں پیش پیش رہنے لگے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف الزام تراشی کی مہم شروع کر دی اور جا بجا یہ چرچا کرنے لگے کہ مسلمان اللہ کے معین کردہ مہینوں کی حرمت کا پاس نہیں رکھتے اور انہوں نے رجب کے مہینے میں جو متارکہ جنگ کا مہینہ ہے کاروان مکہ پر حملہ کر کے دیرینہ قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔

جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں منجملہ مکہ اور مدینہ میں حرمت والے مہینوں کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ ان مہینوں میں حتیٰ کہ پیشہ ور لٹیرے بھی کسی قافلے یا اس کے مسافروں پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ دراصل جزیرۃ العرب میں قوانین کی (خواہ جیسے بھی ہوں) بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور ان پر بلا استثناء عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر بدوی اعراب ان قوانین پر عمل نہ کرتے تو صحرائے عرب میں ان کا جینا دوبھر ہو جاتا۔

صحرائے عرب کے کچھ حصوں میں مٹی کا ایک پیالہ بھی بڑی دولت سمجھا جاتا تھا۔ اگر وہ چوری ہو جاتا تو اس کا نقصان پورا کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سارق کے لئے

جو سزا رکھی وہ ہاتھ کا کاٹنا تھا اور چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی کا بھی مال چوروں اور لٹیروں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہتا۔

ماہ حرام کے قانون کا منشاء بھی جزیرۃ العرب کے باشندوں کی خصوصیات زندگی سے مطابقت رکھتا تھا۔ جزیرۃ العرب کا بڑا حصہ (جس میں مکہ بھی شامل ہے) بنجر اور غیر قابل کاشت تھا۔ وہاں کے مکین مجبور تھے کہ زراعت ہونے والے علاقوں سے اشیائے خوراک در آمد کریں اور اس کے عوض اپنی مصنوعات ان علاقوں تک پہنچائیں۔ لہٰذا اس کام کے لئے انہیں تجارت کرنے کی اشد ضرورت تھی اور یہ تجارت صرف ایسی صورت میں امکان پذیر ہو سکتی تھی کہ قافلوں کی رفت و آمد پر امن ماحول میں بلا مانع جاری رہے۔

لیکن دوسری جانب صحرائی قبیلے بھی بھوک کا شکار تھے اور یہ قافلے ان کے لئے لقمہ چرب کی حیثیت رکھتے تھے اور چونکہ انہیں موت کا بھی خوف نہیں تھا لہٰذا بڑی بیدردی سے سوداگروں کا مال لوٹ کر لے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اعراب نے ایسا قانون وضع کیا کہ جس کے مطابق سال کے چند مہینوں میں کشت و خون اور راہزنی پر پابندی لگا دی گئی اور سارے بادیہ نشینوں نے اس قانون کو تسلیم کر لیا۔

جزیرۃ العرب میں حرمت والے مہینوں کی رعایت کرنا اتنا ضروری سمجھا جاتا تھا کہ دو خون کے پیاسے بھی اپنی تلوار پھینک کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ خانہ کعبہ میں حاضر ہوتے اور بتوں کی پرستش کرنے لگتے تھے۔ البتہ جب ماہ حرام کی مہلت ختم ہو جاتی تو وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی کارروائیاں از سر نو شروع کر دیتے تھے۔

مکہ میں یہ معمول تھا کہ کچھ معزز اور عمر رسیدہ افراد حرمت والے مہینوں کا حساب رکھتے تھے اور جیسے ہی ذیقعد کا مہینہ شروع ہوتا تو ان کا سربراہ خانہ کعبہ میں داخل ہو کر اونچی آواز میں یہ اعلان کرتا تھا:

"اے لوگو آگاہ رہو ماہ حرام شروع ہو چکا ہے اور متارکہ جنگ کا زمانہ آ پہنچا ہے۔ آج کے بعد کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہیں ہونا چاہئے اور ساری دشمنیاں اور اختلافات فی الحال

بھلا دیئے جائیں"۔

پھر ماہ حرام کے اختتام پر یہی شخص خانہ کعبہ میں آکر لوگوں کو باخبر کرتا کہ حرمت کے ایام ختم ہو چکے ہیں اور لوگ اپنے اپنے اختلافات اور تنازعات از سرنو شروع کر سکتے ہیں۔

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہمارے تصور کے برخلاف قدیم اعراب صرف قمری تاریخوں ہی سے استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ کچھ عرصہ تک شمسی تقویم کی بھی پیروی کرتے رہے ہیں۔ اسی بنا پر وہ لوگ ہر تین سال میں ایک بار اپنے سال کو تیرہ مہینوں میں تقسیم کرتے تھے۔ یعنی ان کے دو سال متواتر بارہ مہینوں اور تیسرا سال تیرہ مہینوں پر مشتمل ہوتا تھا اور تیرہویں مہینے کو "خالی مہینہ" یا ماہ صفر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

"خالی مہینہ" یا ماہ صفر شروع میں سال کے بارہ مہینوں میں شامل نہیں تھا کہ اس کے نام سے واضح ہے یہ مہینہ ایک فالتو مہینہ تصور ہوتا تھا۔ اس زمانے میں محرم کے دو مہینے ہوتے تھے۔ ایک کو "محرم الحرام" اور دوسرے کو "محرم الحلال" کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ صفر کے مہینے نے دوسرے محرم یعنی "محرم الحلال" کی جگہ لے لی۔

بہرحال جب کاروان مکہ سے حاصل شدہ مال غنیمت لے کر عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ساتھی مدینہ میں داخل ہوئے تو عام مسلمان بھی شبہ میں مبتلا ہو گئے حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی یہ جانتے ہوئے کہ رجب کے مہینے میں کاروان مکہ پر حملہ ہوا ہے غمگین اور ملول ہو گئے اور انہوں نے حکم دیا کہ قافلے کا سارا سامان ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور کوئی اسے ہاتھ نہ لگائے تاکہ بعد میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے کہا کہ متارکہ جنگ کے قانون کی پابندی نہ کرنا ایک افسوسناک واقعہ ہے لیکن اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتانے کے لئے کہ وہ اس واقعہ سے متاسف نہ ہوں درج ذیل آیت نازل کی جو آج قرآن کی دوسری سورۃ البقرہ کی ۲۱۷ویں آیت ہے:

"یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ قل قتال فیہ کبیر و صد

عن سبیل اللہ و کفر بہ والمسجد الحرام و اخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ اکبر من القتل ط..... الی اخر

یعنی ''آپ سے (اے محمد ﷺ) حرمت والے مہینوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اس ماہ میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے مگر اللہ کی راہ روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد الحرام میں داخلے پر پابندی لگانا اور ان لوگوں کو جو اس کے اہل ہیں (یعنی مسلمانوں کو) وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے بھی بڑا جرم ہے''۔

سورۃ بقرہ کی بالائے ذکر آیت خاصی مفصل ہے اور اللہ نے اس آیت میں ماہ حرام کے بارے میں گزشتہ قانون کی توثیق کرتے ہوئے یہ تاکید کی کہ ماہ حرام میں کشت و خون سے بھی بڑا جرم یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے ماننے والوں کو مکہ سے نکال دیا جائے اور فتنہ انگیزی کی بنیاد رکھی جائے۔ لفظ فتنہ کے معنی متعدد ہیں لیکن یہاں اس سے اللہ کی مراد وہی زبردستی کی جلا وطنی ہے۔

مندرجہ بالا آیت نے حضرت محمد ﷺ کی تشویش و اضطراب کو یکسر ختم کر دیا اور وہ جان گئے کہ ماہ رجب میں متارکہ جنگ کی خلاف ورزی اللہ کے نزدیک قابل مذمت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی علم ہو گیا کہ اللہ کے احکام کو جاری کرنے اور دین اسلام کی ترویج کی خاطر سال کے کسی بھی حصے میں ضروری اقدام کیا جا سکتا ہے۔

کچھ دنوں بعد اہل مکہ کا ایک وفد مدینہ آیا تاکہ قافلے کے سامان' اس کے اونٹوں اور قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں پیغمبر اسلام ﷺ سے گفت و شنید کرے۔

آپ ﷺ نے قافلے کا مال و اسباب اور اس کے اونٹ واپس نہیں دیئے البتہ دونوں قیدیوں کو ایک ہزار چھ سو درہم فدیہ کے عوض آزاد کر دیا اور اس رقم کو مسلمانوں میں بانٹ دیا۔ ان دو اسیروں میں ایک مسلمان ہو گیا اور اس نے مکہ جانے سے انکار کر دیا۔ یہ بات دوسرے مسلمانوں کے لئے انتہائی مسرت کا باعث بنی۔

(وضاحت: اسلامی تاریخ میں مسلمان ہونے والے قیدی کا نام حکمؓ بن کیسان ذکر ہوا ہے اور دوسرا قیدی جو آزاد ہو کر مکہ چلا گیا اس کا نام عثمان بن عبداللہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں افراد مسلمانوں کے سب سے پہلے اسیر تھے۔ علاوہ ازیں قافلے کے مال و اسباب کے سلسلے میں اسلامی تذکرہ نویسوں میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے قافلے کا مال غنیمت قبول کرنے سے انکار کیا حتیٰ کہ قریش کو خون بہا بھی ادا کیا جبکہ کچھ مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے وہ مال غنیمت جو روک رکھا تھا تقسیم کر دیا اور خود بھی خمس قبول فرمالیا۔ کونسٹن ویر ژیل نے غالباً" دوسرے گروہ کے نظریئے کو معتبر سمجھتے ہوئے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ حوالے کے لئے مطالعہ فرمایئے سیارہ ڈائجسٹ کا جہاد نمبر صفحہ نمبر ۲۹ اور رسول نمبر جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۸۰ تا ۱۸۲۔ خلیل)



"جنگ بدر میں حضرت محمدؐ کی جنگی حکمت عملی سننے کے قابل ہے"

جب مسلمانوں کی طرف سے "بطن نخلہ" میں کاروان مکہ پر حملہ کئے جانے کا مسئلہ حل ہو گیا تو اس کے چھ ہفتے بعد "عیون" یعنی آنکھوں یا ہماری آج کی اصطلاح میں سراغ رسانوں نے یہ اطلاع دی کہ ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ جو دو ہزار اونٹوں پر مشتمل ہے اور جس کے سامان کی مالیت پچاس ہزار دینار کے لگ بھگ ہے مدینہ کی جانب بڑھ رہا ہے تاکہ وہاں سے گزر کر مکہ کی راہ اختیار کرے اور اس عظیم کارواں کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھ میں ہے۔

مکہ کے سارے گھرانے یا یوں کہئے قریش کے سبھی خاندان اس کارواں میں ذی نفع تھے اور اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ مذکورہ کارواں مدینہ کی حدود میں پہنچے تو عبدالمطلب کی ایک بیٹی نے جو غیب گوئی بھی کرتی تھی، مکہ کے بازاروں میں ندا لگائی اور لوگوں کو باخبر کیا کہ عنقریب ایک بہت بڑی مصیبت اہل مکہ پر

نازل ہونے والی ہے اور وہ مصیبت اگلے چند دنوں میں حتیٰ کہ تین دن کے اندر واقع ہو سکتی ہے۔

اہل مکہ کے لئے جو سبھی سوداگر تھے سب سے بڑی مصیبت یہی تھی کہ وہ اپنے پیسوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں یا مالی منافع سے محروم ہو جائیں۔ اور چونکہ وہ جانتے تھے کہ دختر عبدالمطلب کی پیش گوئیاں اکثر اوقات درست ثابت ہوتی ہیں لہٰذا ان کا ماتھا ٹھنکا اور انہیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کاروان مکہ کے لئے کوئی خطرہ یا حادثہ پیش آگیا ہو۔

مکہ میں یہ معمول تھا کہ جب کوئی تجارتی کارواں دور دراز کے سفر سے لوٹتا اور مکہ کے قریب پہنچنے لگتا تو ایک ہرکارہ تیز رفتار اونٹنی پر سوار مذکورہ کارواں کی آمد سے تین چار دن پہلے ہی مکہ پہنچ جاتا اور وہاں کے باشندوں کو کارواں کے آنے کی خوشخبری سناتا تھا۔ مکہ میں اس ہرکارے کو "بالنفا ہرکارہ" کہتے تھے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ جب ہرکارہ آتا اور کارواں کی آمد کا اعلان کرتا تو مکہ کی عورتیں جو اپنے شوہروں کی آمد کا انتظار کر رہی ہوتی تھیں اپنے چہرے کو زائد بالوں سے مصفیٰ کرتیں (یعنی بناؤ سنگھار کرتیں) گھر بار سنوارتیں اور اپنے شوہروں کے انتظار میں بیٹھ جاتی تھیں۔

لیکن اس مرتبہ جب مذکورہ ہرکارے کے آنے میں تاخیر ہو گئی تو اہل مکہ چہ میگوئیاں کرنے لگے اور اپنے آپ سے کہنے لگے کہ اگر وہ کارواں معمول کے مطابق مکہ کی سمت بڑھ رہا ہوتا تو خبر دینے والے کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ یقیناً کوئی ناگوار واقعہ پیش آگیا ہے جو ہرکارہ اب تک یہاں تک نہیں پہنچ سکا۔

مکہ میں ایک تنظیم ایسی تھی جس کا کام لوگوں کو اہم خبروں سے آگاہ کرنا تھا اور اس کام کے لئے اس کے پاس کچھ ڈھنڈورچی بھی ہوتے تھے جنہیں مؤذن کہا جاتا تھا۔ یہ ڈھنڈورچی مکہ کے گلی کوچوں میں چل نکلتے یا چوراہوں پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں لوگوں کو تازہ خبروں یا اہم واقعات سے مطلع کرتے تھے لیکن جب اس دن ڈھنڈورچی نے لوگوں

کو باخبر کرنے کے لئے مکہ کے بازار میں آواز لگائی تو اہل مکہ نے دیکھا کہ وہ ایسے اونٹ پر بیٹھا ہے جس کا کجاوہ اس کی پشت کی بجائے پیٹ کے نیچے بندھا ہے یعنی وہ اونٹ کی برہنہ پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے۔ ہرکارے نے الٹے کپڑے پہن رکھے ہیں، اس کے بال پریشان ہیں اور اونٹ کے دونوں کانوں سے خون بہہ رہا ہے کیونکہ اونٹ کے کان کاٹ دیئے گئے ہیں۔ ہرکارے کا چہرہ بھی کیچڑ آلود ہے اور وہ ہراس انگیز آواز میں چلا رہا ہے۔ "اے قبیلہ قریش کے لوگو! باخبر رہو کہ مکہ کا کارواں خطرے میں ہے۔ مسلمانوں نے تمہارے کارواں کو تاراج کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ لہٰذا تم میں جو بھی غیرت مند ہے تلوار اٹھائے اور مقابلے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اے مکہ کے دلیرو! تم لوگ مسلمانوں کا راستہ روک لو ورنہ پورے کا پورا قافلہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

مکہ میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی ہرکارہ لوگوں کو بری خبر سنانا چاہتا تو اپنی حالت یوں بنا لیتا کہ اس کے ظاہری حلیے سے ہی کسی ناگوار خبر کی نشاندہی ہو جاتی تھی۔

جب مذکورہ ڈھنڈورچی مکہ کے بازار میں داخل ہو گیا تو اس کے پیچھے چند دوسرے افراد کہ وہ بھی دراصل ہرکارے تھے کیچڑ آلود چہرے اور برہنہ بدن کے ساتھ مکہ کے گلی کوچوں میں چلنے لگے اور وحشت آور انداز میں پہلے ہرکارے کا ساتھ دینے لگے۔ انہیں عریاں ہرکارے کہا جاتا تھا۔

ہرکاروں کا برہنہ ہونا اس بات کی علامت تھی کہ عنقریب ایک بہت بڑی آفت آنے والی ہے اور وہ ہرکارے بھی کچھ اس انداز میں چیخ و پکار کر رہے تھے کہ گویا مسلمان ابھی اور اسی وقت کاروان مکہ کو تاراج کرنے میں مصروف ہیں۔ البتہ ان حرکات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اہل مکہ کو اکسائیں تاکہ وہ اپنے کارواں کی نجات کے لئے بلاتاخیر اٹھ کھڑے ہوں۔

صرف چند ہی گھنٹوں میں نو سو پچاس جنگجو مرد، سات سو اونٹوں اور ایک سو گھوڑوں کی مدد سے مسلمانوں کے مقابلے پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مکہ کے مردوں کے علاوہ

شہر کی عورتیں بھی جو "نتاف" یعنی خوشخبری دینے والے قاصد کے نہ آنے پر مضطرب اور پریشان تھیں جنگی ٹولے کے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہو گئیں۔

عربی زبان میں "نتاف" کا مطلب ہے "بالوں کو زائل کرنے والا" اور جیسا کہ ہم گزشتہ سطور میں بتا چکے ہیں کہ یہ نام درحقیقت اس قاصد کو دیا گیا تھا جو کسی کارواں کے پہنچنے سے پہلے ہی مکہ پہنچ جاتا اور قافلے کے آنے کی خوشخبری سناتا تھا۔

مکہ کی ان عورتوں نے جو جنگی ٹولے کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گئیں یہ فیصلہ کیا کہ وہ مدینہ تک جائیں گی اور میدان کارزار میں حاضر ہو کر مکہ کے جنگجوؤں کو مسلمانوں کے قتل عام پر اکسائیں گی۔

مسلح مردوں، بے شمار اونٹوں اور تیز رفتار گھوڑوں پر مشتمل طاقتور فوج کے آمادہ ہونے کے علاوہ جنگی اخراجات پورے کرنے کے لئے مکہ کے شہر میں چند گھنٹوں کے اندر اندر دو لاکھ پچاس ہزار درہم کا چندہ بھی جمع ہو گیا۔

اس سے پہلے یہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا کہ مکہ کے تاجروں کی طرف سے اتنی مختصر مدت میں اتنی خطیر رقم ادا ہوئی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبل ازیں مکہ کے سوداگروں کو اپنا منافع اتنا خطرے میں نظر نہیں آیا تھا لیکن اس لمحہ انہیں احساس ہوا کہ مسلمانوں کی جوابی کارروائیاں ان کے لئے مہلک صورت حال اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ لہٰذا اگر ان سے نمٹنے کے لئے فوری چارہ جوئی نہ کی گئی تو مکہ کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت معطل ہو جائے گی اور اس طرح وہ لوگ بھی اپنی ہستی و نیستی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

دوسری طرف حضرت محمد ﷺ بھی مدینہ میں ایک گروہ کو آمادہ کر رہے تھے جس کا کام یہ تھا کہ مدینہ کے پاس سے گزرنے والے کاروان مکہ کا راستہ روک دے۔ حضرت محمد ﷺ کی سپاہ تین سو تیرہ افراد پر مشتمل تھی جو سبھی رضاکارانہ طور پر شریک ہوئے تھے۔

واضح رہے کہ یہ کارروائی مشرکین مکہ کے اس اقدام کے جواب میں کی جا رہی تھی

جس میں انہوں نے مسلمانان مدینہ کی ناکہ بندی کر کے انہیں اشیائے خوردونوش کی رسد سے محروم کر رکھا تھا اور قریش مکہ مسلمانوں کو مرعوب کرنے اور انہیں دین اسلام سے دستبردار ہونے پر مجبور کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے۔

"انصار" یعنی مدینہ کے مسلمان باشندوں کے دو قبیلے تھے جن کا نام "اوس" اور "خزرج" تھا۔ ہر قبیلے سے ستر افراد حضرت محمد ﷺ کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ لہٰذا پیغمبر اسلام ﷺ کی تین سو تیرہ سپاہیوں پر مشتمل فوج کے ایک سو چالیس سپاہی انصار میں سے تھے اور بقیہ مہاجر تھے یعنی وہ مسلمان جو مکہ سے کوچ کر کے مدینہ چلے آئے تھے۔

تین سو تیرہ افراد پر مشتمل مسلمانوں کی سپاہ کے پاس سواری کے لئے صرف ستر اونٹ اور دو گھوڑے موجود تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ ہر اونٹ پر دو مجاہد بیٹھ جائیں اور باقی لوگ پیدل چلیں اور کچھ دیر چلنے کے بعد وہ لوگ جو اونٹوں پر سوار ہیں نیچے اتر آئیں اور ان کی جگہ پیدل چلنے والے جو تھک چکے ہوں گے اونٹوں پر بیٹھ جائیں اور یوں یہ سفر جاری رہے۔

جب حضرت محمد ﷺ تین سو تیرہ سپاہیوں اور ستر اونٹوں پر مشتمل اپنی سپاہ کے ہمراہ روانہ ہوئے تو یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان کسی جنگی مشن میں گھوڑے استعمال کر رہے تھے (صرف دو گھوڑے!)

ہجرت کا دوسرا سال تھا اور ماہ رمضان کی سترہ (۱۷) تاریخ جب حضرت محمد ﷺ اپنی سپاہ کے ہمراہ مدینہ کے جنوب مغربی حصے میں بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع وادی بدر میں کاروان مکہ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے لیکن وہ کارواں نہ اس دن آیا نہ اور کسی دن۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ میں نہ صرف یہودی زندگی بسر کرتے تھے بلکہ منافقین کا ٹولہ بھی رہتا تھا جو مسلمانوں کی طرفداری کرتے تھے نہ بظاہر مخالفت۔ ان دو ٹولوں نے اپنے جاسوسوں کی مدد سے کاروان مکہ کے سربراہ ابوسفیان کو یہ خبر پہنچا دی کہ مسلمان

مذکورہ کارواں کو روکنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا ابوسفیان نے اپنا راستہ بدل دیا اور ایک دوسرے راستے سے جو طویل ضرور تھا لیکن بے خطر بھی تھا' مکہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔

کاروان مکہ وادی بدر سے نہ گزرا لیکن اس کی جگہ نو سو پچاس جنگجو افراد پر مشتمل مکہ کی فوج تیزی سے مدینہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تاہم مسلمانوں کے سراغ رسانوں نے ان کے ہراول دستے کے دو سپاہیوں کو پکڑ لیا اور حضرت محمد ﷺ کے پاس لے آئے۔ حضرت محمد ﷺ نے ان دو افراد سے تفتیش کی اور معلوم ہوا کہ نو سو پچاس سپاہی جنگی ساز و سامان کے ساتھ تیزی سے مدینہ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ ان دونوں کو اسارت میں رکھا جائے اور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "میرے خیال میں جس طرح مکہ کے کارواں کو یہ خبر پہنچا دی گئی ہے کہ وہ مدینہ کے پاس سے نہ گزرے تو اسی طرح مکہ میں بھی قبیلہ قریش کو ہمارے خلاف لڑنے پر اکسایا گیا ہے لہٰذا کفار مکہ کی ایک فوج جو نو سو پچاس سپاہیوں پر مشتمل ہے' ابوجہل کی قیادت میں ہماری جانب بڑھ رہی ہے۔ ہم یہاں سے مدینہ لوٹ سکتے ہیں لیکن مدینہ واپس جانا ہمارے فائدہ میں نہیں ہو گا کیونکہ لشکر کفار مدینہ پر حملہ آور ہو جائے گا اور نہتے مسلمانوں کا قتل عام کر ڈالے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم اسی جگہ پر قریش مکہ کا انتظار کریں کیونکہ نبرد آزمائی کے لئے یہ جگہ شہر سے بہتر ہے اور یہاں کامیابی کا امکان بھی زیادہ ہے۔"

وادی بدر ایسا خطہ زمین ہے جس کا کچھ حصہ خاکی' کچھ سنگلاخ اور بقیہ ریتلے علاقے پر مشتمل ہے۔ یہ وادی دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مشرق میں واقع پہاڑ کا نام "العدوۃ القصویٰ" اور مغرب میں واقع پہاڑ کو "العدوۃ الدنیا" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وادی بدر کے جنوب میں اسفل نامی پہاڑی سلسلہ بھی ہے جہاں صدر اسلام میں پانی کے متعدد چشمے موجود تھے۔ مکہ کے کارواں وہاں پڑاؤ ڈالتے اور چشموں کے پانی سے استفادہ کرتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جب نبرد آزمائی کا ارادہ کیا تو اپنی سپاہ کی جگہ

تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس لمحہ تک مسلمانوں کا دستہ وادی بدر کے شمالی دہانے پر کاروان مکہ کی آمد کا انتظار کررہا تھا لیکن جب یہ ثابت ہوگیا کہ کاروان مکہ نہیں آئے گا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ ہمیں اپنی جگہ تبدیل کرکے کوہ اسفل کے دامن میں مورچہ بندی کر لینی چاہئے تاکہ پانی کے ذخیرے ہمارے اختیار میں رہیں اور دشمن ان پر قبضہ نہ کرسکے۔

حضرت محمد ﷺ کے احکام کی فوری طور پر تعمیل ہوئی اور سارے مسلمان وادی بدر کے شمال سے اس کے جنوبی حصے میں منتقل ہو گئے اور کوہ اسفل کے دامن میں واقع پانی کے سارے منابع اپنی گرفت میں لے لئے۔ اسی مقام پر پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ: اب تک عرب باشندے مختلف جگہوں میں انفرادی طور پر لڑتے رہے ہیں یعنی تن بہ تن لڑائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہر کسی کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اکیلے ہی شجاعت کا مظاہرہ کرے تاکہ لوگوں کی نظروں میں آئے اور لوگ اسے "برز" (یعنی بہادر اور دلیر) کے نام سے پکاریں۔ لیکن ہم اس لڑائی میں اللہ کے لئے پیکار کررہے ہیں اپنے لئے نہیں اور یہ اللہ ہے جو فرد فرد کی دلیری اور جانفشانی کو دیکھ رہا ہے۔ اگر ہم نے اس کی راہ میں جان بھی دے دی تو اس کا اجر بھی وہی دے گا اور ہمیں جنت میں لے جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ہماری سپاہ کفار کے مقابلے میں صرف ایک تہائی افراد پر مشتمل ہے۔ اگر ہم انفرادی طور پر لڑیں گے تو نقصان اٹھائیں گے اگر مل کر پیکار کریں تو فتح ہماری ہو سکتی ہے۔

پھر حضرت محمد ﷺ نے مسلمانوں کو ایسی جنگی صف آرائی سے روشناس کرایا جو اس دن سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے اسکندر مقدونی کے زمانے میں متداول تھی اور جسے یونانی زبان میں "فالاثر" کہتے تھے۔

(وضاحت: فالاثر "FAL-ALGKS" ایک یونانی کلمہ ہے جو خاص طرز کے فوجی دستوں کا نام تھا جس کی تفصیل آپ آئندہ سطور میں پڑھیں گے۔ تاہم انگریزی زبان میں

(اس کا متبادل کلمہ "PHALANX" ہے جو دراصل یونانی زبان سے انگریزی زبان میں داخل ہوا اور لفظ "FLANK" بھی غالباً اسی سے مشتق ہے جس کا مطلب پہلو بہ پہلو کھڑے ہونا یا چکر کاٹ کر دشمن پر حملہ کرنے کے ہیں۔ فرانسیسی زبان میں ایسے فوجی دستوں کو "PHALANGES" کہا جاتا ہے۔ خلیل) فالاثر دراصل ایسی جنگی آرائش کا نام تھا جس میں سارے سپاہی پیٹھ سے پیٹھ ملا کر صف باندھ لیتے اور یہ صف بوقت ضرورت خم ہو کر ایک مثلث، مربع یا دائرے کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

اس مثلث، مربع یا دائرے میں سارے سپاہیوں کا چہرہ دشمن کی طرف ہوتا اور ان کی پیٹھ مذکورہ مثلث، مربع یا دائرے کے اندر ہوتی تھی لہٰذا دشمن کسی طور بھی عقب سے حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ جس طرف بھی جاتا اپنے مخالف سپاہیوں کو روبرو پاتا تھا۔ اس قسم کی جنگی آرائش کو یونانی زبان میں کہتے تھے اور اسی بنا پر قدیم یونانی فوجی دستوں کو فالاثر کے (ن۔ ژ۔ ساکن) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جزیرۃ العرب کی تاریخ میں پہلی بار مذکورہ جنگی حکمت عملی کو روشناس کروایا اور جنگ بدر میں عملی طور پر اسے اپنایا بھی۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی شجاعت اور دلیری کے علاوہ جو چیز ان کی فتح اور کامیابی کا سبب بنی وہ یہی طریقہ کار تھا جو حضرت محمد ﷺ نے انہیں سکھایا تھا۔

اس دن حضرت محمد ﷺ نے سپاہ اسلام کی جو فالاثر (لیکن یہ کلمہ عربی زبان میں داخل نہیں ہوا) تشکیل دی وہ تکون کی شکل میں تھی اور اس کے تینوں کونوں پر تین پرچم دکھائی دیتے تھے۔

جنگ بدر میں پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے جنگی جوہر نمایاں کیے اور مثلث کی شکل میں تین فوجی دستے تشکیل دیئے جو ایک دوسرے کو مکمل کرنے کے علاوہ ایک دوسرے کی پشت پناہی بھی کرتے تھے۔ دشمن جس سمت سے بھی حملہ کرنا چاہتا تو کسی نہ کسی دستے کو اپنے روبرو پاتا اور دوسرا دستہ پہلے کی حمایت کرتا نظر آتا تھا۔

ہر فالاٹر یعنی مثلث نما دستے میں ایک پرچم دار بھی دکھائی دیتا تھا۔ پہلے دستے کے پرچم دار حضرت علیؓ تھے۔ انہوں نے سفید رنگ کا جھنڈا تھاما ہوا تھا جس پر ایک عقاب کی تصویر دکھائی دیتی تھی۔

دوسرے دستے کے پرچم دار مصعبؓ بن عمیر تھے جن کا شمار مہاجرین میں ہوتا تھا اور تیسرے دستے کا جھنڈا ایک انصاری سپاہی کے ہاتھ میں تھا (وضاحت: اسلامی تاریخ میں انصاری سالار کا نام حضرت سعدؓ بن معاذ ذکر ہوا ہے۔ خلیل)

جب پیغمبر اسلام ﷺ اپنی سپاہ کی تقسیم بندی سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے ایک بار پھر مسلمانوں کو مخاطب کیا اور فرمایا:

''اے مسلمانو! اگر تم فتح حاصل کرو تو جنت میں جاؤ گے اور اگر اس راہ میں اپنی جان دے دو تو چونکہ اللہ کی راہ میں شہادت پاؤ گے تو پھر بھی تمہارا مقام بہشت میں ہو گا۔ بہشت میں رہنے والوں میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس دنیا میں لوٹ آئے مگر وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہوں۔ صرف انہی لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس دنیا میں واپس آجائیں تاکہ ایک بار پھر اللہ کی راہ میں شہید ہوں کیونکہ فقط وہی جانتے ہیں کہ اللہ شہداء کو بہشت میں کن عظیم نعمتوں سے نوازتا ہے۔''

جب سورج مغرب میں ڈوبنے لگا تو مکہ کی فوج نمایاں ہو گئی لیکن چونکہ تاریکی پھیل رہی تھی لہٰذا نہ تو مسلمانوں نے لڑنا پسند کیا اور نہ ہی قریش مکہ نے کہ جس کی قیادت ابوجہل کر رہا تھا۔

رات کے وقت پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کے خیموں کی جگہ بدل دی تاکہ اگلی صبح جب وہ لوگ دشمن کے سامنے ظاہر ہوں تو سورج ان کی آنکھوں میں نہ پڑے اور لڑائی کرتے وقت ان کی آنکھیں نہ چندھیا جائیں۔

یہ حکمت عملی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ حربی فنون سے بخوبی آگاہ تھے لیکن ہم نہیں جانتے کہ اس عظیم انسان نے جنگی تربیت کہاں حاصل کی۔

اس رات پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ پہرے داروں کے علاوہ جو باری باری تبدیل ہوتے رہیں گے' باقی سب لوگ آرام سے سو جائیں تاکہ اگلے دن تازہ دم ہو کر لڑائی کے لئے آمادہ ہو سکیں اور میں بارگاہ الٰہی میں تمہارے دلوں کی تسکین کے لئے دعا کروں گا۔ لہٰذا اسی مناسبت سے قرآن کی آٹھویں سورۃ کی گیارہویں آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ:

"یاد کرو اس وقت کو جب دشمن کے خوف سے سو نہیں سکتے تھے لیکن اللہ کی مدد نے تمہیں آسودہ خاطر کر دیا اور تم سو گئے اور اللہ نے آسمان سے پانی برسایا تاکہ تمہاری تطہیر ہو اور وہ بارش تمہارے لئے ایک فائدہ اور بھی لائی کہ ریت سے بھری زمین تمہارے لئے یوں بن گئی کہ لڑائی کے دن تمہارے پاؤں (ریت میں) نہ دھنسیں۔"

اس رات مسلمان سپاہی اگرچہ دشمن کے بہت قریب تھے لیکن اتنے بے فکر ہو کر سوئے کہ بارش آنے پر بھی سوتے رہے۔ اللہ نے' جیسا کہ قرآن میں آیا ہے اس رات مسلمانوں پر پانی برسایا تاکہ ان کی تطہیر کرے اور اگلے دن اسلامی سپاہیوں کے پاؤں ریتلی زمین میں نہ دھنسیں۔

بعض اسلامی مورخین لکھتے ہیں کہ جنگ بدر کا آغاز ہجرت کے دوسرے سال ماہ رمضان کی سترہ تاریخ کو بروز جمعہ ہوا تھا۔ اگر جنگ بدر مورخہ سترہ رمضان بروز جمعہ صبح کے وقت شروع ہوئی ہو تو یہ ضروری تھا کہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے سپاہی جمعے سے پہلے یعنی جمعرات کے دن میدان جنگ میں پہنچ چکے ہوں کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سپاہ اسلام نے ایک رات میدان جنگ میں گزاری تھی۔ لیکن اگر وہ لوگ بروز جمعہ رمضان کی سترہ تاریخ کو میدان کارزار میں پہنچے ہوں تو ناگزیر طور پر جنگ کا آغاز مورخہ اٹھارہ رمضان ۲ھ کو ہوا ہو گا۔ انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کیونکر ایک ایسی سپاہ کے بل بوتے پر جو دشمن کے مقابلے میں صرف ایک تہائی افراد پر مشتمل تھی وادی بدر میں قریش کی طاقتور اور مسلح فوج کے سامنے آ کھڑے ہوئے!

مکہ کے سپاہی بزدل نہیں تھے جو ہم یہ تصور کریں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے سوچا ہو گا کہ جیسے ہی مسلمان حملہ کریں گے تو وہ لوگ دم دبا کر بھاگ نکلیں گے۔ وہ لوگ یعنی قریش مکہ عرب ہونے کے ناطے فطری طور پر شجاع و دلیر تھے۔ وہ بھی تلوار چلانا جانتے تھے اور عرصہ کارزار میں مرنے یا مار ڈالنے سے انہیں بھی کوئی باک نہیں تھا۔ وہ زمانہ آج کا زمانہ نہیں تھا کہ ایک مختصر سی سپاہ جدید اور پیش رفتہ اسلحے کے زور پر کسی طاقتور فوج کا مقابلہ کر سکے یا اس کی پیش قدمی روک سکے۔ اس زمانے میں دونوں فریقوں کے اسلحے ایک جیسے ہوتے تھے اور صرف سپاہیوں کی جسمانی طاقت ہی دوسروں پر برتری کی علامت تصور ہوتی تھی۔ لہٰذا میدان جنگ میں سپاہیوں کی تعداد خاص اہمیت رکھتی تھی اور ہر فوج کا سربراہ یہ جاننے کی کوشش کرتا تھا کہ دشمن کے پاس کتنے سپاہی موجود ہیں۔

علاوہ ازیں اگر جنگ بدر میں حضرت محمد ﷺ کے پاس جنگی ساز و سامان لشکر قریش سے زیادہ ہوتا تو شاید یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ وہ جنگی ساز و سامان کے بل بوتے پر قریش سے نبرد آزما ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس لڑائی میں مکہ کی فوج سات سو اونٹوں اور ایک سو گھوڑوں کی مدد سے میدان کارزار میں اتری تھی۔ جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس صرف ستر اونٹ اور دو گھوڑے موجود تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت محمد ﷺ کو اپنے اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ تھا اور انہیں یقین تھا کہ اللہ ان کی مدد کرے گا اور وہ یہ پسند نہیں کرے گا کہ بت پرست مسلمانوں پر غالب آ جائیں۔

اس کے علاوہ ہر وہ مسلمان جو جنگ بدر میں شریک تھا اپنے پیغمبرؐ کی طرح اس بات پر ایمان رکھتا تھا کہ اللہ مسلمانوں کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر جان سے جائیں تو بھی سیدھے بہشت میں جائیں گے۔

مضبوط ارادے اور ایمان راسخ کے علاوہ جس چیز نے مسلمانوں کو جنگ بدر میں فتح سے ہمکنار کیا وہ حضرت محمد ﷺ کی ذاتی صلاحیت اور حربی مہارت تھی جس کی جزیرۃ العرب میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ماہ رمضان کی سترہ تاریخ بروز جمعہ یا اٹھارہ تاریخ بروز ہفتہ

کی صبح کو پیغمبر اسلام ﷺ یہ جان چکے تھے کہ اگر انہیں شکست ہو گئی تو نہ صرف مسلمان صفحہ روزگار سے محو ہو جائیں گے بلکہ اسلام کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا کیونکہ ابھی اسلام اتنا تنومند نہیں ہوا تھا کہ ایک بڑی شکست کا متحمل ہو سکے اور اگر اس دن مسلمانوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تو پھر اسلام کا نام لیوا بھی کوئی نہ رہتا (نعوذ باللہ)

جزیرۃ العرب میں یہ رواج تھا کہ بوقت پیکار فوجوں کے سربراہ کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر جنگ کی نگرانی کرتے اور ضروری ہدایات جاری کرتے تھے۔ عام طور پر یہ جگہ میدان جنگ کے عقبی حصے میں منتخب کی جاتی تھی۔

حضرت محمد ﷺ بھی جو اپنی فوج کے سپہ سالار تھے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو گئے اور وہاں سے جنگ کی صورت حال کے مطابق ہدایات جاری کرنے لگے۔ اس جگہ کو جہاں سے جنگی فرمان جاری ہوتے ہیں عربی زبان میں "عریش" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

سورج نکلتے ہی جنگ کا آغاز ہو گیا اور دیرینہ رسم کے مطابق ابتداء میں ایسے اشعار پڑھے گئے جن کا مقصد دشمن کی تحقیر کرنا اور اپنی تعریف و توصیف بیان کرنا تھا۔

اشعار پڑھنے کے بعد قریش کی فوج سے تین لڑاکے باہر نکلے اور دونوں فوجوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ ان تین افراد میں سے ایک ابوسفیان کا سسر عتبہ تھا۔

دوسرا شخص شعبہ کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ یہ زوجہ ابوسفیان کا چچا تھا۔

تیسرا جنگجو "الولید" ابوسفیان کا سالا تھا۔

یہ تینوں افراد جب دونوں فوجوں کے درمیان پہنچے تو اپنی تلواریں لہراتے ہوئے للکارے "ہل من مبارز" یعنی "ہے کوئی ہمارا مقابلہ کرنے والا۔"

لشکر اسلام سے تین سپاہی جو تینوں انصار میں سے تھے آگے بڑھے اور جواب دیا "ہم تمہارا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔"

قریش کے جنگجوؤں نے پوچھا "تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا "ہم مدینہ کے رہنے والے ہیں۔"

قریش کے تینوں لڑاکے یک زبان ہو کر پکارے "ہم تم لوگوں کو نہیں پہچانتے لہٰذا تمہارے ساتھ نہیں لڑیں گے۔ ہمارا تعلق مکہ کے اشراف سے ہے۔ ہمارا مقابلہ وہی کرے جو ہمارے برابر کا ہو۔"

اس پر حضرت عمرؓ گرجدار آواز میں چلائے "سب مسلمان آپس میں برابر ہیں اور ان میں کوئی کسی سے برتر نہیں۔" قریش کے سرداروں نے جواب دیا "ہم صرف ان لوگوں سے مقابلہ کریں گے جو مکہ کے رہنے والے ہوں اور ہم انہیں پہچانتے بھی ہوں۔"

لہٰذا حضرت محمد ﷺ نے پہلے دستے کے پرچم دار حضرت علیؓ کو آواز دے کر بلایا اور ان سے کہا یا علی تم الولید کے مقابلے میں جاؤ۔ پھر اپنے چچا حضرت حمزہؓ اور عبیدؓ بن حارث کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ قریش کے بقیہ دو افراد کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

مسلمانوں کے تین مجاہد جب قریش کے تین جنگجوؤں کے مقابل پہنچے تو پیکار کرنے سے پہلے انہوں نے رجز خوانی شروع کر دی۔

"رجز" دراصل کسی شخص کا اپنی ہی جانب سے تعارف کرانے کو کہتے تھے جس کے بعد جنگ و جدال کے بارے میں مختلف اشعار پڑھے جاتے تھے۔ لہٰذا میدان کارزار میں اترنے کے بعد حضرت علیؓ نے آواز لگائی کہ میں علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب ہوں۔ پھر انہوں نے معروف شاعر "امری القیس بن حجر الکندی" کے مشہور قصیدے کے آخری اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔

"امری القیس" کا شمار "ارباب معلقات سبعہ" میں ہوتا تھا اور تمام عرب دانشور اسے جزیرۃ العرب کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔

"ارباب معلقات سبعہ" فی الواقع ان سات شاعروں کو کہا جاتا ہے جن کا کلام جزیرۃ العرب کے بہترین اشعار کی حیثیت سے ڈیڑھ سو سال تک خانہ کعبہ کی دیوار سے معلق رہا تھا۔ اسی لئے ان شاعروں کو "ارباب معلقات" کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔

ابوسفیان کے سالے ''الولید'' نے جب اپنا تعارف کرایا تو اس نے بھی ''الحرث بن خلزہ لیشکری'' نامی شاعر کے چند اشعار دہرائے۔ مذکورہ شاعر بھی ارباب علقات سبعہ میں شامل تھا۔

رجز خوانی کے بعد فریقین ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے۔

عربوں کے ہاں تلوار سے لڑنا یورپی باشندوں کی لڑائی سے مختلف ہوتا تھا۔

جب کوئی یورپی جنگجو تلوار ہاتھ میں تھامتا تو اس کے اگلے حصے یعنی تلوار کی نوک کا استعمال کرتا تھا۔ لہٰذا یورپی لڑاکوں کی شمشیرزنی کا فن زیادہ تر تلوار کی نوک کے استعمال میں تھا۔ لیکن عرب باشندے تلوار کا نچلا حصہ استعمال کرتے تھے اور لڑائی کے دوران تلوار کی نوک زیادہ اہم کردار ادا نہیں کرتی تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عربوں کے ہاں شمشیرزنی کے خاص قواعد موجود نہ تھے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ گرچہ عرب باشندے تلوار کا نچلا حصہ استعمال کرتے تھے لیکن وہ بھی یونانیوں، رومیوں اور یورپ کی دوسری قوموں کی طرح جنگی تربیت حاصل کرتے اور باقاعدہ طور پر تلوار چلانے کا فن بھی سیکھتے تھے۔ ایسی جنگوں میں ڈھال کا صحیح استعمال بہت اہمیت رکھتا تھا کیونکہ تلوار کے وار سے بچنے کے لئے ڈھال ہی بہترین وسیلہ سمجھی جاتی تھی۔

بہرکیف۔ حضرت علیؓ اپنے طاقتور حریف ''الولید'' کے مقابلے میں بڑی چابک دستی سے تلوار چلا رہے تھے تاہم ان دونوں کی لڑائی زیادہ دیر تک جاری نہ رہی کیونکہ حضرت علیؓ کے ایک مہلک وار نے الولید کی رگ حیات اور حلقوم کو کاٹ ڈالا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور چند لمحوں بعد اس کی بے جان لاش زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

حضرت حمزہؓ نے بھی اپنے مدمقابل کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن مسلمانوں کے تیسرے مجاہد حضرت عبیدہؓ بن حارث جو ابوسفیان کے سسر سے نبرد آزما تھے، شدید زخمی ہو گئے لیکن آخر کار انہوں نے بھی اپنے دشمن کا کام تمام کر دیا۔

اس طرح تینوں مسلمان مجاہد فتح یاب ہو گئے۔ مسلمانوں نے اس واقعہ کو فال نیک

سمجھا اور ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ جب مشرکین مکہ نے یہ دیکھا کہ ان کے تین نامور سردار خاک و خون میں مل چکے ہیں تو انہوں نے ہلہلہ کناں اپنے نیزوں کو ہوا میں اچھالا جو اس بات کی علامت تھی کہ ہمہ گیر اور تن بہ تن لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ پھر وہ شدید حملے کی غرض سے مسلمانوں کی طرف بڑھنے لگے۔

وہ لوگ جو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے تیزی سے بڑھ رہے تھے بخوبی جانتے تھے کہ ان کے مدمقابل کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی اولاد ہیں' ان کے بھائی ہیں' چچا ہیں یا کوئی اور رشتہ دار۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان کا خون بہانے کے لئے بلا جھجک آگے بڑھ رہے تھے۔

اس دن تک جزیرۃ العرب کی تاریخ میں یہ دیکھنے کو نہیں ملا تھا کہ کوئی باپ اپنے بیٹے' کوئی بھائی اپنے بھائی اور کوئی چچا اپنے بھتیجے کے مقابل صف آرا ہوا ہو کیونکہ وہ لوگ جو ایک دوسرے کے ناطے دار تھے ناگزیر ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور صحرائے عرب میں کسی قبیلے کے ارکان ہرگز آپس میں نبرد آزما نہیں ہوتے تھے۔

حضرت محمد ﷺ نے جیسے ہی یہ دیکھا کہ عام لڑائی شروع ہو چکی ہے تو وہ عریش سے نیچے اتر آئے اور اپنے آپ کو سپاہ اسلام کے درمیان میں پہنچاتے ہوئے دلنشیں آواز میں قرآنی آیات کی تلاوت کرنے لگے۔ جن آیات کی تلاوت پیغمبر اسلام ﷺ کر رہے تھے ان کا تعلق اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے جزائے خیر کے سلسلے میں تھا اور اللہ نے ان آیات میں مسلمانوں کو بشارت دی تھی کہ جو مسلمان بھی فی سبیل اللہ جہاد کرے گا تو چاہے کسی کو مارے یا خود مر جائے' دونوں صورتوں میں اس کی جگہ بہشت میں ہو گی۔

حضرت محمد ﷺ کی زبانی قرآنی آیات سن کر مسلمانوں کا جوش۔ جذبہ اتنا بڑھ گیا کہ ان میں سے عمیرؓ نامی سپاہی نے پکارتے ہوئے کہا: "اب میرے اور جنت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا" اور یہ کہتے ہی وہ اپنی صف سے باہر نکلے اور مشرکوں پر ٹوٹ پڑنے

لیکن اگلے ہی لمحے دشمن کے نرغے میں آنے کے باعث شہید کر دیئے گئے۔

حضرت محمد ﷺ نے بانگ لگائی اور خبردار کیا کہ میری ہدایات کو فراموش نہ کرو اور حصول جنت کے شوق میں اپنی صفیں مت چھوڑو۔ اگر تم اپنی صفوف توڑو گے تو بت پرست تم پر غالب آجائیں گے۔

دوسری طرف قبیلہ قریش کے سپاہی اپنی خاص روش کے مطابق لڑائی میں مصروف تھے۔ ہر کوئی یہ سوچ رہا تھا کہ تن تنہا شجاعت کا مظاہرہ کرے۔ اسے اپنے دیگر ساتھیوں کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے لڑائی سے ایک دن پہلے مسلمانوں کے گوش گزار کر دیا تھا کہ تم لوگ اپنی ذات کے لئے تلوار نہیں چلا رہے جو کسی اعزاز و انعام کی توقع رکھو بلکہ اللہ کی راہ میں تلوار چلا رہے ہو جس کے لئے کسی خود نمائی کی ضرورت نہیں۔ جب تم لوگ اپنا فرض پورا کر چکو گے تو یقین رکھو کہ اللہ بھی اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور تمہیں جنت میں اعلیٰ درجات عطا کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی ہدایات پر سختی سے عمل کیا اور دوران جنگ میں افراتفری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

یہ تو ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے تین فوجی دستے تھے جو مثلث کی شکل میں صف آرائی کیے ہوئے تھے۔ یہ تینوں دستے ایک دوسرے کی آڑ تھے اور ہر دستہ کچھ اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ مکہ کے سپاہی کسی بھی طرف سے ان کی پشت پر حملہ آور نہیں ہو سکتے تھے۔

مسلمانوں کے تینوں دستوں کے پاس ایک خاص علامت موجود تھی تاکہ مسلمان سپاہی میدان کارزار میں اپنے ساتھیوں کو پہچان سکیں اور انہیں غلطی سے دشمن کا آدمی نہ سمجھ بیٹھیں۔

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک دستہ زرد رنگ کا سرپوش پہنے ہوئے تھا اور دوسرا سبز رنگ کا اور تیسرے دستے کے افراد اپنے سروں پر پرندوں کے پر باندھے ہوئے تھے منجملہ

حضرت حمزہؓ نے شتر مرغ کے کئی پر اپنے سر پر باندھ رکھے تھے جو ہوا کے چلنے سے لہرا رہے تھے۔

روایت ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ نے دیکھا کہ قریش کی فوج بہت دباؤ ڈال رہی ہے تو انہوں نے پہلے دستے کے پرچم دار حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ زمین سے کچھ مٹی اٹھا کر انہیں دیں۔ حضرت علیؓ زمین پر جھکے اور مٹھی بھر مٹی اٹھا کر حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں میں دے دی۔ آپ نے وہ مٹی بت پرستوں کی طرف پھینکتے ہوئے اونچی آواز میں کہا: "دور ہو جاؤ یہاں سے اے بے دین لوگو۔" پھر مسلمانوں نے من حیث المجموع حملہ کر دیا اور تینوں دستے یوں آگے بڑھنے لگے کہ ان کی صفوں میں ذرا بھی رخنہ نہیں پڑا۔ تینوں دستے کچھ اس انداز میں پیش قدمی کر رہے تھے جیسے تین قلعے حرکت میں آ گئے ہوں۔ آخر کار قریش کے سپاہی مسلمانوں کے برق آسا حملے کے دباؤ میں آکر عقب نشینی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

حضرت محمد ﷺ کو یہ اطلاع حاصل ہو چکی تھی کہ ان کے ساہوکار چچا عباس (حضرت عباسؓ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) بھی سپاہ قریش میں شامل ہیں لہٰذا آپؐ نے تاکید کی کہ انہیں زندہ گرفتار کیا جائے۔

جناب عباسؓ اگرچہ کفار کی فوج میں شامل ہو کر وادی بدر تک پہنچے تھے لیکن تین وجوہات کی بنا پر انہوں نے جنگ میں شرکت نہیں کی بلکہ فوج کے پیچھے ہی کھڑے رہے۔

پہلی وجہ یہ کہ وہ ایک تاجر تھے اور انہیں کشتم کشت سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔

دوسرے یہ کہ وہ اپنے بھتیجے سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔

تیسری وجہ یہ کہ ان کی بیوی مسلمان تھیں اور انہوں نے اپنے خاوند کو تاکید کی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں شرکت نہ کریں۔

اسلامی سپاہ کے ایک رکن نے جو اپنے گروہ کے ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا پیغمبر ﷺ کے چچا کو دیکھا اور پہچان لیا۔ وہ سپاہی گرچہ لاغر اندام اور ضعیف الجثہ تھا اور اس

کے مقابلے میں حضرت عباسؓ بھاری بھرکم اور فربہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ انہیں گود میں اٹھا کر پیغمبر ﷺ کے پاس لے آیا اور خود تیزی سے واپس چلا گیا تاکہ میدان جنگ میں اپنی جگہ سنبھال سکے۔

فوج کفار کا سپہ سالار ابوجہل گرچہ اپنے محافظوں کے حلقے میں تھا لیکن مسلمانوں نے وہ حلقہ توڑ دیا اور ابوجہل تک رسائی حاصل کرلی۔ سپاہ اسلام کے ایک مجاہد معاذؓ بن عمرو نے ابوجہل کے پیر پر ایسا وار کیا کہ وہ شدید زخمی ہو گیا اور کراہتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے اپنے باپ کے دفاع میں حضرت معاذؓ پر حملہ کر دیا اور اپنی تلوار سے ایسا وار کیا کہ ان کا سیدھا ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹ کر کھال سے لٹک گیا۔

حضرت معاذؓ کے چہرے پر تکلیف کا ذرا بھی احساس نمایاں نہ ہوا اور انہوں نے اپنے الٹے ہاتھ سے سیدھا ہاتھ اکھاڑ کر دور پھینک دیا اور بولے: "یہ بھی اللہ کی راہ میں۔" پھر وہ جھکے، زمین پر پڑی ہوئی تلوار اٹھائی اور لڑائی میں مصروف ہو گئے۔ چند ہی لمحوں بعد اسلام کے ایک مجاہد نے لشکر مکہ کے سپہ سالار ابوجہل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وضاحت: اسلامی تواریخ کے مطالعے کے مطابق پہلے حضرت معاذؓ بن عمرو نے ابوجہل پر وار کیا لیکن وہ خود زخمی ہو جانے اور عکرمہ کے حملے کا نشانہ بن جانے کے باعث اپنے کام کو انجام تک نہ پہنچا سکے۔ پھر ایک اور مجاہد حضرت معاویذؓ بن افرعہ نے اپنا نیزہ ابوجہل کے سینے میں اتارا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ابوجہل کا کام تمام ہو چکا ہے وہ دوسری طرف متوجہ ہو گئے جبکہ ابوجہل خاتمہ جنگ تک زخمی حالت میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ رسول گرامی ﷺ کے حکم پر حضرت عبداللہؓ بن مسعود ابوجہل کی تلاش میں نکلے اور اسے زخمی حالت میں زمین پر پڑا ہوا پایا۔ یہاں حضرت عبداللہؓ اور ابوجہل کے مابین کچھ گفتگو ہوئی جس کے بعد حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے ابوجہل کا سر کاٹا اور لاکر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا۔

یہاں یہ بتانا بھی خالی از لطف نہ ہو گا کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود وہی ہیں جو اسلام کے ابتدائی دور میں "کاتبان وحی" کے زمرے میں آتے تھے اور ان معدودے چند افراد میں شمار ہوتے تھے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی قرآنی آیات کو ثبت و ضبط کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتے تھے..... اور ابو جہل کا اصلی نام "عمرو بن ہشام بن مغیرہ مخزومی" اور اس کی کنیت "ابوالحکم" تھی لیکن اپنی ہٹ دھرمی، اسلام دشمنی اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شدید عداوت کے باعث وہ "ابو جہل" کے نام سے مشہور ہوا۔ خلیل)

ابو جہل کی موت کے بعد لشکر کفار کے حوصلے پست ہو گئے اور ان میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ گرچہ ان کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان کی پیش روی نہیں روک سکتے لہٰذا ان کے قدم اکھڑ گئے اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور چونکہ ان کی عقب نشینی تجدید جنگ کی خاطر نہیں تھی لہٰذا یہ کہنا چاہئے کہ انہوں نے پسپائی اختیار کی اور اپنے بت پرست ساتھیوں کی لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ابو جہل کے علاوہ قریش کے دوسرے نامور سردار جن میں ابو سفیان کا سسر اور سالا بھی شامل ہیں، جنگ بدر میں اپنے انجام کو پہنچے۔ اس جنگ میں اگرچہ مسلمان تعداد کے لحاظ سے سپاہ قریش کے مقابلے میں صرف ایک تہائی کے برابر تھے لیکن اس کے باوجود انہیں صرف چودہ سپاہیوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔

جنگ بدر، جو پیروان اسلام کی مکمل فتح پر ختم ہوئی۔ مسلمانوں کے حوصلے بڑھانے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی۔ اس جنگ میں ایک مختصر سی سپاہ نے اپنے ایمان کی طاقت، حضرت محمد ﷺ کی بے مثال قیادت اور ان کی نوظہور حکمت عملی کی بدولت ایک ایسی فوج کو شکست دی اور اسے مکمل طور پر تار و مار کر دیا جو ان سے تین گنا بڑی تھی۔

جنگ کے خاتمے پر اور قریش کے سپاہیوں کے بھاگ نکلنے کے بعد ایک مسلمان

سپاہی میدان جنگ میں چل نکلا تاکہ مرنے والوں کا مشاہدہ کر سکے۔

یہ مسلمان سپاہی ابو حذیفہؓ بن عتبہ تھے اور یہ جانتے ہوئے مرنے والوں کو نظر سے گزار رہے تھے کہ سبھی کا تعلق مکہ سے تھا اور چونکہ وہ خود مکہ کے رہنے والے تھے لہٰذا یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آیا وہ مرنے والوں میں سے کسی کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔

اچانک ان کی نظر ایک جنازے پر پڑی۔ وہ جھکے اور کچھ دیر تک مقتول کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر جب اٹھے تو ان کے چہرے پر غم و اندوہ کے آثار نمایاں تھے۔ اسی اثناء میں حضرت محمد ﷺ بھی وہاں سے گزرے۔ آپؐ نے دیکھا کہ ابو حذیفہؓ بہت غمگین ہیں لہٰذا انہیں مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا: ''یا ابو حذیفہؓ اتنے افسردہ و ملول کیوں ہو' آج تو اللہ نے ہمیں فتح و نصرت سے نوازا ہے؟''

حضرت ابو حذیفہؓ نے اپنے سامنے پڑے ہوئے جنازے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور بولے: ''میں اس شخص کے لئے افسردہ ہوں یا رسول اللہ' کیونکہ یہ میرا باپ ہے''۔

حضرت محمد ﷺ کو جب یہ علم ہوا کہ ابو حذیفہؓ اپنے باپ کے جنازے کے سامنے کھڑے ہیں تو آپؐ نے انہیں تسلی دی تاہم ابو حذیفہؓ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ مجھے توقع تھی وہ دن ضرور آئے گا جب میرا باپ شرک سے توبہ کرے گا اور بت پرستی سے دستبردار ہو جائے گا لیکن آج جبکہ اس کا جنازہ میری آنکھوں کے سامنے پڑا ہے تو مجھے دکھ ہو رہا ہے کہ وہ قبول اسلام کئے بغیر کیوں دنیا سے رخصت ہو گیا''۔

جنگ بدر کی شرح جو ''ایام العرب'' نامی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے آج بھی گزشتہ کی طرح اسلامی تاریخ کے اہم ترین اور ممتاز ترین واقعہ کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔

بدر کے مقام پر مسلمان پہلی بار کسی رسمی لڑائی میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور فتح

و نصرت کا مزہ چکھا۔ اس کے علاوہ انہیں یہ سبق بھی حاصل ہوا کہ مضبوط ایمان اور حربی فنون کے صحیح استعمال سے ایک کمزور اور ناچیز سپاہ اپنے سے کئی گنا طاقتور اور بڑی فوج پر غلبہ حاصل کر سکتی ہے۔

اس دن یعنی جنگ بدر کے خاتمے پر مسلمانوں نے بقیہ وقت اپنی اموات کو دفن کرنے میں گزارا اور مشرکین کے جنازوں کو بدر کے کنوئیں میں پھینک دیا۔

جنگ شروع ہونے سے قبل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ جنازوں کو مسلا نہ کریں اور ان کے ہاتھ، پیر یا جسم کے دوسرے حصے کاٹ کر یادگار کے طور پر اپنے پاس نہ رکھیں (جیسا کہ دور جاہلیت میں رواج تھا) کیونکہ جس طرح زندگی میں زندہ رہنے والوں پر احسان کرنا چاہئے اسی طرح مرنے کے بعد مرنے والوں پر بھی احسان کرنا ضروری ہے۔

جب مسلمانوں کی میتیں قبروں میں اتاری جارہی تھیں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ قبروں کو ایک صف میں قرار دیں اور کوشش کریں کہ قبروں کی ظاہری حالت اچھی اور خوبصورت ہو۔

مسلمانوں میں سے کسی نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! اگر قبریں ظاہری طور پر اچھی اور خوبصورت نہ ہوں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے مرنے والوں کو دکھ پہنچے گا؟“

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: ”مرنے والوں کو دکھ نہیں پہنچے گا بلکہ زندہ رہنے والوں کا دل دکھے گا کیونکہ ایک کھنڈر اور ویران قبر کا نظارہ انسان کے لئے غم انگیز منظروں میں سے ایک ہے۔“



جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک

جب مسلمانوں کی میتیں سپردخاک کر دی گئیں تو پیغمبر اسلام ﷺ نے جنگی قیدیوں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

جنگ بدر میں لشکر کفار کے ستر افراد مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے تھے۔

جزیرۃ العرب میں یہ دستور تھا کہ کوئی قیدی اسی سپاہی کی ملکیت بن جاتا تھا جس نے اسے میدان جنگ سے گرفتار کیا ہو۔

جو سپاہی دشمن کے کسی فرد کو گرفتار کرتا تو اسے یہ حق حاصل تھا کہ اگر چاہے تو اپنے قیدی کو جان سے مار ڈالے یا بردہ فروشی کے بازار میں لے جاکر فروخت کردے یا پھر خود اپنا غلام بنالے۔

جب کسی قیدی کو موت کے گھاٹ اتارنا مقصود ہوتا تو اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ کر اسے زمین پر بٹھا دیتے اور اس کے ہاتھوں پر بندھی رسی کا دوسرا سرا کسی

درخت سے باندھ دیتے تاکہ اسیر بھاگنے کی کوشش نہ کرے اور پھر تلوار کو ہاتھ میں تھام کر گردن کے پیچھے سے اتنا شدید وار کرتے کہ محکوم کا سر ہوا میں اڑ جاتا اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑتا تھا۔

اس دن بھی جب اموات مسلمین دفن ہو گئیں تو پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے صلاح مشورہ کیا کہ جنگی قیدیوں کا کیا کیا جائے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے "سب کی گردنیں اڑا دی جائیں"۔

حضرت ابوعبیدہؓ بولے "میرے خیال میں سارے اسیروں کو زندہ جلا دینا چاہئے"۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ نے تجویز پیش کی کہ جنگی قیدیوں کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ مکہ میں اپنے اہل خاندان سے رابطہ قائم کریں اور ان سے کہیں کہ وہ لوگ ان کی آزادی کے لئے فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لے جائیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس کی منظوری دے دی۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے جنگی قیدیوں کے بارے میں ایسا آئین مرتب کیا گیا جو میرے (کونسٹن ویرژیل کے) خیال میں دنیا کا سب سے پہلا آئین ہے جو جنگی قیدیوں کے بارے میں وضع ہوا اور جس میں جنگی قیدیوں سے نیک سلوک کرنے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس سے قبل کہ حضرت محمد ﷺ جنگی قیدیوں کے بارے میں مذکورہ دستور نافذ کریں تو یہ رسم تھی کہ جو شخص دشمن کے کسی سپاہی کو میدان جنگ میں گرفتار کرتا تو اس کے ساتھ من مانا سلوک کرتا حتیٰ کہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا خواہ گردن اڑا کر یا زندہ جلا کر۔

صحرائے عرب میں کوئی قیدی در حقیقت اس شخص کی بلاشرکت غیرے ملکیت ہوتا تھا جس نے اسے پکڑا ہو اور اگر قیدی کے اہل خاندان اس کی رہائی کے لئے مناسب رقم ادا کر دیتے تو وہ چھوٹ جاتا ورنہ پکڑنے والے کی طرف سے یا تو بیچ دیا جاتا یا پھر تہہ تیغ کر دیا

جاتا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے آئین میں یہ بھی ذکر کیا کہ جنگی قیدیوں کی آزادی کے لئے جو فدیہ مقرر ہو گا وہ ان کے اہل خاندان کی حیثیت کے پیش نظر تعین کیا جائے گا اور چونکہ لشکر قریش کے زیادہ تر قیدی دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ہر جنگی قیدی کی آزادی کا فدیہ چار ہزار درہم ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مقررہ رقم ادا نہیں کر سکتا تو وہ اس کے عوض مناسب تعداد میں تلواریں اور نیزے دے کر اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جو قیدی پڑھنا لکھنا جانتے ہیں تو وہ نقد یا اسلحے کی شکل میں فدیہ ادا کرنے سے معاف ہیں۔ ایسے لوگوں کا فدیہ یہ ہے کہ دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں جس کے بعد وہ آزاد کر دیئے جائیں گے۔

حضرت محمد ﷺ کے دستور میں یہ تاکید بھی ہوئی تھی کہ جنگی قیدی جب تک مسلمانوں کی قید میں ہیں تو انہیں مفت خوراک اور لباس فراہم کیا جائے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے کیونکہ اللہ جنگی قیدیوں کو ایذا پہنچانا پسند نہیں کرتا۔

مذکورہ آئین میں جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنے کی اتنی تاکید کی گئی تھی کہ مسلمان اپنا کھانا اور کپڑے تک انہیں دے دیتے اور خود بھوکا رہنا گوارا کر لیتے کہ مبادہ ان کا قیدی بھوکا' پیاسا یا برہنہ رہ جائے۔

بہرطور جنگ بدر میں مسلمانوں کے غلبہ پا لینے کی خبر جیسے ہی مکہ پہنچی تو اہل مکہ نے ایک اور جنگ کے ذریعے مسلمانوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔

اہل مکہ میں سے ایک جس نے حضرت محمد ﷺ اور دیگر مسلمانوں سے بدلہ لینے کی ٹھانی وہ ابوسفیان تھا۔ جنگ بدر میں اس کا ایک بیٹا' سسر اور داماد مارے گئے تھے بلکہ دوسرا بیٹا مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو چکا تھا۔ لہٰذا ابوسفیان بھی مجبور تھا کہ اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے چار ہزار درہم کا فدیہ ادا کرے۔

ابوسفیان نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ جب تک مسلمانوں سے انتقام نہ لے لے تو اس

وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا اور نہ ہی اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کرے گا۔ ابوسفیان کی بیوی نے بھی جم غفیر کے سامنے قسم کھائی کہ اگر اس کے بیٹے' باپ اور بھائی کا قاتل اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالے گی۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر اس کے بیٹے' باپ اور بھائی کے قاتل کئی لوگ ہوئے تو وہ ان سب کے کان' ناک اور زبان کاٹ کر ان سے ہار بنائے گی اور جس دن اسلام کو شکست ہو گی تو وہ یہ ہار گلے میں ڈال کر میدان جنگ میں ناچے گی۔

ایک طرف جبکہ مکہ میں مسلمانوں کے خلاف غضب و انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے تو دوسری طرف مدینہ سے یہ خبر موصول ہوئی کہ اہل مکہ قیدیوں کو آزاد کروا سکتے ہیں اور ہر قیدی کی آزادی کا فدیہ چار ہزار درہم ہے لہٰذا ستر (۷۰) اسیروں کی رہائی کے لئے دو لاکھ اسی ہزار درہم ادا کرنے ہوں گے۔

مکہ کے بزرگوں نے کہا کہ ہمیں قیدیوں کا فدیہ ادا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ مسلمان مالی طور پر بہت کم حیثیت ہیں۔ اگر انہیں فدیہ کے طور پر اتنی بھاری رقم وصول ہو گئی تو ان کی حالت سدھر جائے گی لہٰذا ہمیں اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمن کو مالی طور پر مستحکم نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن جنگی قیدیوں کے اہل خاندان بمعہ ابوسفیان بزرگان قریش کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو فدیہ ادا کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ اپنے عزیز و اقارب کو مسلمانوں کی قید سے رہائی دلا سکیں۔ لہٰذا قریش کے سرداروں نے بادل نخواستہ اسرائے جنگ کی آزادی کے لئے فدیہ ادا کرنے کی منظوری دے دی۔

جنگی قیدیوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کا نام تھا "ابوالعاص"۔ یہ شخص حضرت محمد ﷺ کی مرحومہ زوجہ حضرت خدیجہؓ کا بھانجا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کا شریک حیات بھی۔

دختر پیامبرؐ نے اپنے خاوند کی رہائی کے لئے تین ہزار درہم فراہم کر لئے لیکن وہ بقیہ ایک ہزار درہم مہیا نہ کر سکیں لہٰذا اس کے بدلے میں انہوں نے زیور کے دو ٹکڑے جن

کی مالیت ایک ہزار درہم تھی' نقد کے ہمراہ مدینہ روانہ کر دیئے اور پیغام بھجوایا کہ ان کے عوض میرے شوہر کو آزاد کر دیا جائے۔

جب وہ نقد رقم اور زیور حضرت محمد ﷺ کے پاس لائے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان دو زیوروں میں سے ایک ہار وہ ہے وہ ان کی پہلی زوجہ حضرت خدیجہؓ کا تھا۔

جب خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو حضرت محمد ﷺ نے ان کا ہار اپنی بیٹی زینبؓ کو دے دیا اور اس دن جب ان کی نظر حضرت خدیجہؓ کے ہار پر پڑی جسے ان کی بیٹی نے اپنے شوہر کی آزادی کے لئے بھیجا تھا تو ان کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں اور آپؐ بے اختیار ہو کر رونے لگے۔ مسلمانوں نے جب اپنے پیغمبر کو روتے دیکھا تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان میں سے کچھ تو جانے بغیر ہی کہ پیغمبر ﷺ کس لئے رو رہے ہیں خود بھی رونے لگے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب جو بلند قامت' کشادہ سینے' گرجدار آواز اور مضبوط ارادے کی بنا پر سب میں ممتاز اور نمایاں تھے آگے بڑھے اور گویا ہوئے: "یا رسول اللہؐ! آپ کیوں رو رہے ہیں۔ ہم آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہیں تو ہمارا دل بھی غم سے پھٹنے لگتا ہے"۔

پیامبر خدا نے گلوگیر آواز میں جواب دیا "یا عمر یہ ہار جو تم دیکھ رہے ہو' یہ دراصل میری زوجہ خدیجہؓ کا تھا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے اسے اپنی بیٹی زینب کو دے دیا تھا اور آج زینب نے یہ ہار اور ایک دوسرا زیور بمعہ تین ہزار درہم نقد کے ہمارے لئے بھیجا ہے تاکہ ہم ان چیزوں کے عوض اس کے خاوند کو آزاد کر دیں۔ جب میری نظر اس ہار پر پڑی تو مجھے خدیجہؓ اور زینب کی یاد آ گئی اور میں بے اختیار ہو کر رونے لگا"۔

حضرت عمرؓ نے دوسرے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ "ابو العاص" شوہر بنت رسول کو فدیہ وصول کئے بغیر آزاد کر دیا جائے اور یہ تین ہزار درہم اور دونوں زیور بھی واپس کر دیئے جائیں۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے منع فرمایا اور

بولے: "یا عمر! میرے اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں جو میری بیٹی کا خاوند فدیہ ادا کئے بغیر رہا ہو جائے، مگر ایک شرط پر کہ وہ اپنی آزادی کے بدلے میں یہ وعدہ کرے کہ میری بیٹی کو طلاق دے کر ہماری پاس بھیج دے تاکہ وہ مسلمانوں میں زندگی بسر کرے"۔

سارے مسلمانوں نے اس نظریئے کو پسند کیا اور کہنے لگے کہ دختر پیامبرؐ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایک مشرک کی زوجیت میں رہے۔

ایسا ہی ہوا اور ابوالعاص نے رہا ہونے اور مکہ پہنچنے کے بعد حضرت زینبؓ کو مدینہ روانہ کر دیا لیکن راستے میں حضرت زینبؓ کو ایک ناگوار حادثے کا سامنا کرنا پڑا جس کا ذکر ہم اگلے صفحات میں کریں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے ایک اور نزدیکی رشتہ دار جو مسلمانوں کے اسیر بنے ان کے چچا حضرت عباسؓ تھے اور جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر ہوا ہے کہ ایک کمزور سا کوتاہ قد مسلمان سپاہی انہیں اٹھا کر پیغمبر ﷺ کے پاس لے آیا تھا جبکہ عباسؓ اس کے مقابلے میں خاصے فربہ اور بلند قامت تھے۔

حضرت محمد ﷺ انتہائی محبت کرنے والے رحم دل انسان تھے۔ آپؐ اپنے رشتہ داروں کو بہت چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے چچا قید میں ہیں لیکن وہ ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی اصولوں کی پابندی انہیں حضرت عباسؓ کی مدد کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

جنگ بدر کے خاتمے پر جب قیدیوں کے معاملات نمٹائے جا رہے تھے تو حضرت عباسؓ کی بھی باری آئی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ہی بولے "بھتیجے! میں تو ایک چھپا ہوا مسلمان تھا تم لوگوں نے خواہ مخواہ مجھے پکڑ لیا ہے"۔

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: "اسلام کوئی خفیہ دین نہیں جو مسلمان چوری چھپے اس کی پیروی کریں۔ دوسرے یہ کہ آپ کو میدان جنگ میں اسلحہ تھامے دیکھا گیا اور مشرکوں کی صف میں، اگرچہ سب سے پیچھے، آپ کا موجود ہونا اس بات کی علامت ہے کہ

آپ مسلمانوں اور ان کے اللہ سے نبرد آزما ہونے آئے تھے لہٰذا اب جبکہ اسیر ہو چکے ہیں تو آپ کو بھی اپنی رہائی کے لئے فدیہ ادا کرنا ہو گا"۔

حضرت عباس (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) چونکہ ایک آزمودہ کار ساہوکار تھے لہٰذا یہاں بھی انہوں نے اپنا پیشہ فراموش نہیں کیا اور فدیہ کی شرح میں کمی کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت محمد ﷺ کسی طور بھی فدیہ میں چھوٹ دینے پر آمادہ نہیں تو کہنے لگے "بھئی میں تو ایک مفلس انسان ہوں اور فدیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ ماضی میں میری حالت بہت اچھی تھی لیکن مختلف کاروباری معاملات میں نقصان اٹھانے کے باعث اب بالکل تہی دست ہو چکا ہوں اور چونکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کم حیثیت لوگ تلواروں اور نیزوں کی صورت میں فدیہ ادا کر سکتے ہیں تو میں بھی اپنی رہائی کے لئے ایسا ہی فدیہ ادا کرنے کو تیار ہوں"۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا کہ ہم اس بارے میں تحقیق کریں گے اور اگر یہ ثابت ہو گیا کہ آپ کی بساط میں کچھ نہیں تو اجناس کی صورت میں فدیہ وصول کر کے آپ کو آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت عباسؓ کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ ان کی دولت اور جائیداد کے بارے میں تحقیق کی جائے گی تو فوراً چار ہزار درہم دینے پر آمادہ ہو گئے اور اس طرح فدیہ کی وصولی کے بعد انہیں آزاد کر دیا گیا۔

اس سے پہلے کہ حضرت عباسؓ فدیہ ادا کر کے آزاد ہوں، تو چونکہ ان کے پاس پہننے کے کپڑے نہیں رہے تھے لہٰذا وہ برہنہ تن رہ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر ابن ابی نامی ایک مسلمان نوجوان کو ان پر ترس آ گیا اور اس نے اپنی قمیض اتار کر انہیں پیش کر دی۔ رسول اکرم ﷺ اس نوجوان کی سخاوت اور رحمدلی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کے حق میں دعا فرمائی۔

اس واقعہ کے دس سال بعد اسی نوجوان کا باپ جو مکہ کا رہنے والا تھا جب فوت ہوا تو

اس کے پاس کفن تک نہیں تھا جس میں لپیٹ کر اسے دفنایا جا سکے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس نیکی کے بدلے جو اس شخص کے بیٹے نے جنگ بدر میں عم رسولؐ کے ساتھ کی تھی اپنا پیرہن اتار کر "ابی" پر ڈال دیا اور یوں اسے دفن کر دیا گیا۔

بہرطور کہنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ اگرچہ اجرائے احکام میں سختی سے کام لیتے تھے۔ لیکن صلہ رحمی کو بھی فراموش نہ کرتے اور اپنے خویش و اقارب سے انتہائی پسندیدہ اور نیک برتاؤ کرتے تھے۔

جنگ بدر نے اسلام کے لئے کامیابی کا دروازہ کھول دیا اور ایک وقت ایسا آیا جب مسلمان اتنے طاقتور اور غنی ہو گئے کہ دس ہزار گھوڑے لے کر میدان کارزار میں اترتے تھے جبکہ جنگ بدر میں ان کے پاس صرف دو گھوڑے موجود تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے ہاں جتنی شہرت جنگ بدر کی ہے اتنی کسی اور جنگ کی نہیں۔

ہم نے گزشتہ ابواب میں ذکر کیا تھا کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ نے رسالت کا آغاز کیا تو ابی لہب نے اپنے بیٹے پر دباؤ ڈالا کہ وہ آپ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دے۔

حضرت رقیہؓ کو اپنے والد سے بہت محبت تھی اور یہ وہی رقیہؓ ہیں جنہوں نے اپنے والد کی جان اس وقت بچائی تھی کہ جب خانہ کعبہ میں ان کا دم گھونٹنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

جب ابی لہب کے لڑکے نے انہیں طلاق دے دی تو وہ کچھ عرصہ کے بعد حضرت عثمانؓ کی زوجیت میں آ گئیں۔ حضرت عثمانؓ ایک مالدار نوجوان تھے اور حضرت رقیہؓ سے عقد نکاح کے بعد وہ بھی دوسرے مسلمانوں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہو گئے۔ جب حضرت رقیہؓ اور ان کے خاوند حضرت عثمانؓ نے حبشہ سے مراجعت کی تو دوسرے مسلمانوں کی طرح انہوں نے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی یہاں تک کہ جنگ بدر کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اسی اثناء میں حضرت رقیہؓ سخت بیمار ہو گئیں اور چونکہ حضرت محمد ﷺ دیگر مسلمانوں

کے ہمراہ لڑائی کے لئے باہر جا رہے تھے لہٰذا پیامبر اسلام ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو مدینے کا نظم و نسق سنبھالنے اور اپنی زوجہ کی تیمارداری کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔

جنگ بدر کے خاتمے پر جب مسلمان مدینہ واپس پہنچے تو حضرت رقیہؓ کی حالت مزید بگڑ گئی۔ وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں اور جلد ہی موت کی آغوش میں چلی گئیں۔

حضرت محمد ﷺ کو اپنی بیٹی کی وفات پر بے انتہا دکھ پہنچا اپنے اہل خاندان سے غایت درجے کی محبت تھی اور وہ انہیں بچھڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ابھی حضرت رقیہؓ کو فوت ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک اور صدمہ برداشت کرنا پڑا اور ان کا نواسہ یعنی پہلا نواسہ اور ان کی دوسری بیٹی حضرت زینبؓ بھی داغ مفارقت دے گئیں اور اس واقعہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر ہوا ہے کہ پیغمبر ﷺ کے داماد یعنی ان کی صاحبزادی کے خاوند اس شرط پر رہا کر دیئے گئے کہ مکہ جائیں اور اپنی بیوی کو طلاق دے کر مدینہ روانہ کر دیں تاکہ وہ مسلمانوں میں زندگی بسر کریں۔

جب پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی تو ان کی تمام بیٹیاں مہاجرت کر کے مدینہ آ گئی تھیں سوائے ان کی دوسری صاحبزادی زینبؓ کے جنہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ مکہ میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ان کے شوہر ابو العاص نے جنگ بدر میں شرکت کی، اسیر ہوئے اور پھر آزاد ہونے کے بعد جب مکہ پہنچے تو انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا اور زینبؓ کو مدینہ روانہ کر دیا۔ تاہم اس مقصد کے پیش نظر کہ زینبؓ بحفاظت منزل تک پہنچ جائیں تو انہوں نے اپنے بھائی "کنہ" کو ان کے ہمراہ سفر پر روانہ کر دیا (لفظ کنہ کو "ذمہ" کے وزن پر پڑھئے۔ مترجم)

لیکن قریش کسی طور یہ جان گئے کہ حضرت محمد ﷺ کی بیٹی مکہ سے مدینہ جا رہی ہے تاکہ اپنے والد کے ساتھ زندگی بسر کرے لہٰذا جیسے ہی وہ کاروان جس میں حضرت زینبؓ سفر کر رہی تھیں مکہ کی حدود سے نکلا تو قریش کے ایک ٹولے نے "ہبر" نامی شخص

کی قیادت میں اس کارواں پر حملہ کر دیا تاکہ حضرت زینبؓ کو مدینہ جانے سے روک سکیں۔

ابوالعاص کے بھائی کنہ اور قافلے کے دوسرے مردوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا اور یوں قریش کے کارندے حضرت زینبؓ کو مکہ لوٹانے میں ناکام ہو گئے۔

لیکن حضرت زینبؓ جو مکہ سے روانگی کے وقت حاملہ تھیں اس زود خورد میں اونٹ سے نیچے گر گئیں اور ان کا اسقاط حمل ہو گیا اور چونکہ ان کا بچہ وقت سے پہلے متولد ہوا لہٰذا پیدا ہوتے ہی جاں بحق ہو گیا۔

وہ بچہ حضرت محمد ﷺ کا پہلا نواسہ تھا اور جب آپ کو یہ علم ہوا کہ "ہبر" نامی شخص نے حضرت زینبؓ کے کارواں پر حملہ کیا ہے اور ان کے اسقاط حمل کا سبب بنا ہے تو حکم دیا کہ اسے گرفتار کر کے لایا جائے اور جب "ہبر" کو مدینہ لایا گیا تو حضرت زینبؓ جو بیماری کی حالت میں مدینہ پہنچی تھیں اسی بیماری کے باعث زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکیں اور دار فانی کو وداع کہہ گئیں۔ اس طرح پیامبر اسلام ﷺ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور اپنے چاہنے والے باپ کو داغ مفارقت دے گئیں۔

جب "ہبر" کو مدینہ لایا گیا تو ایک مسلمان نے غضبناک ہو کر کہا۔ اس جانی کو زندہ جلا دینا چاہیے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا: "ہرگز نہیں' یہ صرف اللہ ہے جو آگ اور انسانی جان کا مالک ہے اور صرف وہی کسی کو آگ میں جلا سکتا ہے' میں کسی کو آگ میں جھونکنے کا حکم جاری نہیں کر سکتا"۔

بعض مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی کہ "ہبر" کو سزائے موت دی جائے لیکن رسول خدا ﷺ اتنے مہربان اور رؤف تھے کہ انہوں نے اس شخص کو سزائے موت

دینے سے چشم پوشی کرلی۔ اس سے پہلے کہ حضرت زینبؓ یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی دوسری صاحبزادی بیماری کے باعث مدینہ میں انتقال کر جائیں تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر کرنا اس لحاظ سے ضروری ہے کہ یہ بتایا جاسکے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں عورتوں کے کیا حقوق ہوتے تھے۔

ا العاص کو اپنی زوجہ سے والہانہ محبت تھی اور حضرت زینبؓ بھی انہیں بہت چاہتی تھیں۔ ابو العاص چوری چھپے مکہ سے نکلے اور مدینہ پہنچ گئے اور جیسے وہ مدینہ میں داخل ہوئے تو حضرت زینبؓ نے مسجد میں جاکر اپنے والد اور دیگر مسلمانوں کو بتایا کہ انہوں نے ابو العاص کو "حق جوار" دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ہم نے گزشتہ ابواب میں ذکر کیا تھا کہ بادیہ نشین عربوں کے سماجی حقوق و مراعات میں سے ایک مراعت یہ تھی کہ وہ جسے چاہتے حق جوار (یعنی پناہ) دے سکتے تھے۔ حق جوار عام طور پر اجنبیوں کو دیا جاتا تھا اور اگر کوئی اجنبی اس حق کے نتیجے میں پناہ حاصل کر لیتا تو اس کی جان کو امان مل جاتی تھی۔

عرب خواتین کا حق جوار مردوں سے زیادہ ہوتا تھا یعنی صحرائے عرب میں عورت کا احترام اتنا زیادہ تھا کہ اگر کوئی مصیبت زدہ یا ستایا ہوا شخص اپنے آپ کو کسی عورت کے خیمے تک پہنچا سکتا اور اس کے ہاتھ خیمے کی رسیوں کو چھو لیتے اور وہ پناہ کی درخواست کرتا تو اسے حق جوار حاصل ہو جاتا تھا۔

ایک اجنبی، چاہے وہ فراری مجرم ہی کیوں نہ ہو اگر کسی عرب خاتون سے پناہ کی درخواست کرتا اور وہ خاتون اپنے سر کی چادر اس پر ڈال دیتی تو اس کی جان بچ جاتی اور ایذا رسانی سے محفوظ ہو جاتا تھا۔

مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ بنت رسول، ابو العاص کو حق جوار دینا چاہتی ہیں تو ان کی نگاہیں پیغمبر اسلام ﷺ پر جم گئیں اور وہ یہ سننے کا انتظار کرنے لگے کہ آپؐ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا کہ حضرت زینبؓ اس شخص کا جو اس

کا سابقہ شوہر بھی ہے حق جوار دے سکتی ہے۔ میری بیٹی اس کی معاشی مدد بھی کر سکتی ہے لیکن اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ ایک مسلمان عورت کسی مشرک کے ساتھ ایک جگہ نہیں رہ سکتی۔

ابوالعاصؓ بعد ازاں مسلمان ہو گئے اور انہوں نے حضرت زینبؓ سے دوبارہ نکاح کر لیا لیکن تجدید نکاح کے بعد حضرت زینبؓ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکیں اور دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یوں پیغمبر اسلام ﷺ کو ایک بار پھر صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔



مکہ میں جنگ بدر کی صدائے بازگشت

گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اہل مدینہ کے لئے ایک بنیادی آئین مرتب کیا تھا جس کی ایک شق یہ تھی کہ مدینہ کے یہودی مسلمانوں کے خلاف اہل مکہ سے گٹھ جوڑ نہیں کریں گے۔

لیکن مدینہ کے یہودیوں نے اس آئین کی خلاف ورزی کی اور ان کے کچھ شاعر مدینہ سے نکل کر مکہ پہنچ گئے تاکہ اہل مکہ کو حضرت محمد ﷺ کے خلاف بھڑکائیں اور انہیں ایک بار پھر مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے پر اکسائیں۔ یہودیوں کے شاعروں میں سے ایک شاعر جو کہ مکہ پہنچا وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مشہور تھا اور اسے کعب بن اشرف کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

مدینہ کے یہودی شاعر ایسے وقت پر مکہ پہنچے کہ وہاں مسلمانوں کے خلاف غضب و انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ قریش کے سرداروں نے مکہ میں یہ نعرہ رائج کر رکھا تھا۔

"مرنے والوں کو روؤ نہیں ان کا انتقام لو"۔

مرنے والوں سے ان کی مراد جنگ بدر کے مقتولین تھے اور انہوں نے یہ اعلان کروا دیا تھا کہ اگر مکہ کا کوئی شہری جنگ بدر کے مرنے والوں پر آنسو بہائے گا تو وہ خواہ مرد ہو یا عورت اسے شہر اور قبیلے سے نکال دیا جائے گا۔ جزیرۃ العرب میں قبیلے کی طرف سے جلا وطن کیا جانا گویا سزائے موت پانے کے مترادف تھا اور شاید سزائے موت سے بھی بدتر کہ جس کی تفصیل گزشتہ ابواب میں بیان ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مائیں جن کے بچے جنگ بدر میں مارے گئے تھے وہ ان کی موت پر آنسو بہانے کی ہمت نہیں کرتی تھیں۔

ایک رات ایسی ہی ایک ماں نے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ وہ آواز کسی عورت کی تھی جو شیون زاری میں مصروف تھی۔ رونے کی آواز سن کر اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مرنے والوں پر رونے کی پابندی ہے۔

وہ عورت اپنے گھر سے نکلی اور آواز کے تعاقب میں اس گھر تک پہنچ گئی جہاں سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے گھر میں قدم رکھا اور دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔

اس عورت نے پوچھا "اماں! کیا رونے پر سے پابندی ہٹا دی گئی ہے جو تم رو رہی ہو؟"

بوڑھی عورت خوفزدہ ہو کر بولی "تم کس لئے پوچھ رہی ہو؟"

گھر میں داخل ہونے والی عورت نے جواب دیا "میرا بھی دل غم سے پھٹا جا رہا ہے اور میں اپنے بیٹے کی موت پر جو جنگ میں مارا گیا رونا چاہتی ہوں لیکن آنسو بہاتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ اگر ایسا کروں تو قبیلے والے مجھے جلا وطن کر دیں گے لیکن تیرے رونے کی آواز سن کر یہاں چلی آئی کہ تجھ سے پوچھوں آیا رونے پر سے پابندی ہٹ گئی ہے جو تو رو رہی ہے اور اگر ایسا ہے تو آؤ ہم دونوں مل کر اپنے بچوں کی یاد میں آنسو بہائیں!"

بوڑھی عورت کو یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے بیٹے کی موت پر رو رہی ہے

بلکہ اس نے کہا کہ میں اپنے بچے کے لئے نہیں رو رہی کیونکہ اس کی موت میرے لئے بے اہمیت ہے بلکہ میرا ایک اونٹ تھا جو گم ہو گیا ہے۔ مجھے اس اونٹ سے از حد محبت تھی اور میں اس کے گم ہونے پر بہت افسردہ ہوں اور یہ آنسو جو تم دیکھ رہی ہو اسی کی یاد میں بہا رہی ہوں اولاد کے لئے نہیں!

یہ واقعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مکہ کے عام شہریوں کے دلوں میں بزرگان قریش کا اتنا خوف اور دبدبہ بیٹھا ہوا تھا کہ داغدیدہ مائیں اونٹ کے گم ہونے کا بہانہ کرکے اپنے بچوں کی موت پر آنسو بہایا کرتی تھیں۔

ابو جہل کی موت کے بعد جو جنگ بدر میں مارا گیا مکہ میں تین افراد پر مشتمل ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا جس میں قریش کی برجستہ شخصیتیں شامل تھیں۔ ان میں سے ایک ابی لہب' دوسرا ابو سفیان اور تیسرا صفوان بن امیہ تھا۔ ان تینوں نے یہ عہد کیا کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے کہ جب تک پیامبر اسلام ﷺ کو راستے سے نہ ہٹا دیں اور اسلام کا قلع قمع نہ کر دیں۔

ابی لہب نے جنگ بدر میں شرکت نہیں کی حالانکہ عربوں کے قبائلی دستور کے مطابق اس کا جنگ میں شریک ہونا از حد ضروری تھا لیکن جب بدر کی لڑائی شروع ہوئی تو یہ شخص بستر بیماری پر پڑا ہوا تھا لہٰذا اس نے "عاص بن ہاشم" نامی شخص کو اپنی جگہ میدان جنگ میں روانہ کر دیا اور اسے مزدوری کے طور پر چار ہزار درہم بھی ادا کئے تاکہ وہ میدان جنگ میں ابی لہب کی کمی پوری کر سکے۔

جب مشرکین مکہ کو جنگ بدر میں شکست کی ہزیمت اٹھانا پڑی اور انہیں قیدیوں کی رہائی کے لئے فدیہ بھی ادا کرنا پڑ گیا تو ابی لہب نے اس خفت و خواری کا بدلہ لینے کے لئے ایک بار پھر پیغمبر اسلام ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس منصوبے کی تکمیل کے لئے خفیہ طور پر ایک شخص کی خدمات حاصل کیں اور ضروری ہدایات دینے کے بعد اسے مدینہ کی طرف روانہ کر دیا۔

مدینہ میں حضرت محمد ﷺ پر قاتلانہ حملہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس محافظوں کا ٹولہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے گھر کا دروازہ ہر کسی کے لئے کھلا رکھتے تھے۔ جو بھی چاہتا ان کے گھر میں داخل ہو سکتا تھا اور جب بھی کوئی ان کے گھر میں قدم رکھتا تو دیکھتا کہ آپؐ یا تو اپنے پاپوش کی مرمت میں مصروف ہیں یا اپنے کپڑے مرتب کر رہے ہیں یا پھر گھر کے کاموں میں اہل خانہ کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہیں۔

حضرت محمد ﷺ کے پاس ایک خادم ضرور تھا لیکن وہ ان کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ اس کے ذمے دو کام تھے' ایک یہ کہ جب باہر کے لوگ آپؐ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ آتے تو وہ ان کی آؤ بھگت کرتا اور رسول اللہ ﷺ سے ان کی ملاقات کا بندوبست کرتا تھا کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ مدینہ کے گرد و نواح سے مختلف وفود اپنی عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے مدینہ آتے اور مختلف معاملات پر پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ گفت و شنید کیا کرتے تھے۔

مذکورہ خادم کا دوسرا کام یہ تھا کہ جب حضرت محمد ﷺ مسجد جاتے تو وہ ان کے نعلین کی حفاظت کرتا تھا لیکن اس خوف سے نہیں کہ پیغمبر کے نعلین چوری ہو جائیں گے کیونکہ مسلمانوں میں چور کا نام و نشان تک نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب نماز ختم ہوتی اور مسلمان مسجد سے نکل کر اپنے جوتے پہننے لگتے تو ان میں سے بعض لوگ بدحواسی میں جوتوں کو خلط ملط کر دیتے تھے اور اس طرح آپؐ کو اپنے نعلین تلاش کرنے میں دقت پیش آتی اور آپ کا وقت بھی ضائع ہوتا لیکن جب آپؐ کا خادم جوتوں کی نگرانی کرتا تو یہ مشکل پیش نہ آتی اور رسول اکرم ﷺ بہ سہولت اپنے نعلین پہن کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔

مدینہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی بہت سادہ تھی۔ ان کا انداز زندگی عام مسلمانوں کے طرز زندگی سے مختلف نہیں تھا۔ لہٰذا جو بھی ان پر قاتلانہ حملہ کرنا چاہتا تو دن

یا رات کے کسی بھی حصے میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔

ابی لہب نے پیغمبر اسلام ﷺ پر قاتلانہ حملہ کرنے کے لئے ایک شخص کو منتخب کیا جس کا بیٹا جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو چکا تھا۔ اس شخص کا نام عمیر بن وہب تھا۔

عمیر بن وہب نے یہ مشہور کر دیا کہ میں اس لئے مدینہ جا رہا ہوں تاکہ فدیہ ادا کر کے اپنے لڑکے کو چھڑا لاؤں۔ جبکہ ابی لہب' ابوسفیان اور صفوان بن امیہ جانتے تھے کہ وہ اس لئے مدینہ جا رہا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو راستے سے ہٹا سکے۔

اس کے علاوہ ابی لہب نے بذات خود اس شخص کے سفری اخراجات ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کی اور اس کی واپسی تک اس کے گھر کا خرچہ دینے کا بھی وعدہ کر لیا۔

عمیر نے مدینہ پہنچنے کے بعد حضرت محمد ﷺ کے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ اسے بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت اپنے گھر میں موجود ہیں۔ عمیر' حضرت محمد ﷺ کے گھر میں داخل ہو گیا اور اس نے دیکھا کہ رسول گرامی اپنی ردا (چادر) دھونے میں مصروف ہیں۔ عمیر کو داخل ہوتا دیکھ کر رسول اللہؐ نے سر اٹھایا اور دریافت کیا۔ "آیا مجھ سے کوئی کام؟" عمیر بولا "یا محمد (ﷺ) دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی ردا دھونے میں مصروف ہو اور یہ کام' ایسے شخص کو دیکھتے ہوئے جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہو' بڑا تعجب آور ہے!"

رسول اللہ ﷺ نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

عمیر نے کہا "جو شخص اپنے آپ کو پیغمبر کہتا ہو اسے اپنے کپڑے خود نہیں دھونے چاہئیں بلکہ یہ کام تو اس کے غلاموں اور کنیزوں کے کرنے کا ہے"۔

حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا "میرے پاس غلاموں اور کنیزوں کی فوج نہیں۔ میں اپنے کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتا ہوں اور تجھے بھی یقین دلاتا ہوں کہ اگر کوئی پیغمبر اپنے کپڑے خود دھوئے تو اس کی پیغمبری میں کمی واقع نہیں ہوتی"۔

پھر آپؐ نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے عمیر کو مخاطب کیا اور بولے "گویا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے"۔

عمیر بولا "ہاں! دراصل یہ پوچھنے آیا تھا کہ مجھے اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے کتنا فدیہ ادا کرنا ہوگا؟"

روایت میں ہے کہ جب حضرت محمد ﷺ نے یہ بات سنی تو بولے "اے مرد تو جھوٹ بولتا ہے۔ تو اس لئے نہیں آیا کہ فدیہ ادا کرکے اپنے قیدی کو چھڑا لے جائے بلکہ تو مجھے قتل کرنے آیا ہے"۔

عمیر نے یہ بات سنی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا خنجر زمین پر پھینک دیا اور بولا "قسم رب کی! میرے اور ان تین آدمیوں کے سوا جنہوں نے آپؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا کوئی اور انسان اس سازش سے باخبر نہیں تھا کہ میں آپ کو قتل کرنے آیا ہوں۔ مجھے یقین کہ ان تینوں نے بھی راز فاش نہیں کیا ہوگا لہٰذا آپ جو اس موضوع سے باخبر ہو چکے ہیں تو یقیناً آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور میں اسی وقت آپ پر ایمان لاتا ہوں اور دین اسلام کو قبول کرتے ہوئے ہمیشہ کے لئے کفر و شرک سے توبہ کرتا ہوں"۔

روایت ہے کہ حضرت عمیرؓ نے قبول اسلام کے بعد اعلان کیا کہ میں اب تک اسلام کو مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن آج کے بعد میری تمام تر سعی یہی ہوگی کہ اسلام کی ترقی میں پیش پیش رہوں۔

اس واقعہ کے بعد عمیرؓ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے سنا کہ ابی لہب کا انتقال ہو چکا ہے۔ ابی لہب کی موت کیسے واقع ہوئی اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مکہ میں ایک گول میدان تھا جس کا نام تھا "مربد"۔ باہر سے آنے والے قافلے اس میدان میں پڑاؤ ڈالتے اور قافلے کے مسافر اپنے جاننے والوں سے اسی میدان میں ملاقات

کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے مسافر بھی اسی میدان میں اپنے سفر کے مشاہدات دوسروں تک پہنچاتے تھے۔

ایک دن جب ابی لہب اس میدان سے گزر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک بدوی عرب کوئی بات کہہ رہا ہے اور لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے بڑی دلچسپی اور انہماک سے اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ ابی لہب بھی اس شخص کی باتیں سننے کے لئے آگے بڑھا اور جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ شخص جنگ بدر کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے اور مسلمانوں کے بقول کہہ رہا ہے کہ جنگ بدر میں پانچ ہزار فرشتے مسلمانوں کی مدد کو آسمان سے اترے تھے اور قریش مکہ کی شکست کا سبب بنے تھے۔ پھر اس شخص نے شاید اس لئے کہ سننے والوں کو مزید متاثر کر سکے اضافہ کیا کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان فرشتوں میں سے کچھ کو دیکھا ہے جو آسمان سے اتر رہے تھے۔ ان سب نے ایک ہی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور ان کے خودوں پر رنگا رنگ ہیرق لہرا رہے تھے۔

حاضرین بڑی حیرت اور تعجب کے عالم میں مقرر کی باتیں سن رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے مجمع پر اس شخص کی باتوں کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔

ابی لہب نے جب لوگوں کا انہماک دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ حاضرین اس شخص کی باتوں کا گہرا اثر لے رہے ہیں تو وہ غصے سے بپھر گیا اور اس شخص کو ڈانٹتے ہوئے بولا ''تو جھوٹ کہتا ہے بدر کی لڑائی میں فرشتے آسمان سے نہیں اترے تھے جو مسلمانوں کی مدد کریں''۔

فرشتوں کا تذکرہ کرنے والے شخص نے بڑی سرد مزاجی سے ابی لہب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''لوگو! جیسا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس شخص کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہا ہوں تو اسی طرح میں نے ان فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے آسمان سے اترتے دیکھا تھا جنھوں نے ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ان کے خودوں پر رنگا رنگ.....''

لیکن ابی لہب نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی اور غضبناک ہو کر بولا "تو جھوٹ بکتا ہے اور لوگوں کو من گھڑت کہانیاں سنا کر ان کے دلوں میں مسلمانوں کا خوف ڈالنا چاہتا ہے"۔

حاضرین میں سے کچھ نے مذکورہ راوی کی حمایت کی اور کہنے لگے کہ یہ شخص سچ کہتا ہے کیونکہ جنگ بدر میں اگر فرشتے مسلمانوں کی مدد کو نہ اترتے تو قریش کی طاقتور فوج صرف تین سو تیرہ نہتے افراد کے ہاتھوں ہزیمت کیوں اٹھاتی؟ دوسرا فریق ابی لہب کی حمایت کرنے لگا اور یوں دونوں فریقوں میں نوک جھونک شروع ہو گئی جو بڑھتے بڑھتے تنازعہ کی شکل اختیار کر گئی اور بات رفتہ رفتہ ہاتھاپائی تک پہنچ گئی اور اسی ہاتھ پائی میں ابی لہب شدید زخمی ہو گیا۔

لوگ اسے اٹھا کر اس کے گھر لے آئے اور بستر پر ڈال دیا لیکن وہ پھر اپنے بستر سے نہ اٹھ سکا اور سات دن کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ ایک عرب مؤرخ "عیسیٰ" لکھتا ہے کہ جب ابی لہب زخمی حالت میں بستر بیماری سے لگا تو اس کے بعد طاعون میں مبتلا ہو گیا اور اسی بیماری میں اس کی جان جاتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اقرباء نے طاعون کی سرایت کے خوف سے اس کا جنازہ شہر سے دور لے جا کر دفن کر دیا..... لیکن وہ دن اور آج کا دن جو مسلمان بھی ابی لہب کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے تو اس کی طرف پتھر ضرور پھینکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ابی لہب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

ابی لہب کے بعد ابوسفیان نے مخالفین اسلام کی قیادت سنبھال لی اور اس کی بیوی جس کا نام "ہند" تھا اپنے شوہر سے بھی زیادہ اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتی تھی (وضاحت: اکثر مؤرخین نے ابوسفیان کی زوجہ کا نام "ہندہ" تحریر کیا ہے جو درحقیقت کلمہ "ہن" سے ماخوذ ہے۔ خلیل)

کلمہ ہند دراصل "ہن" کا لفظ ثانیت ہے اور ہن کا مطلب ایک بے اہمیت اور بے

وقعت چیز اور چونکہ دورہ جاہلیت کے عرب باشندے لڑکی ذات کے لئے کسی اہمیت کے قائل نہیں تھے لہٰذا کچھ لوگ اپنی لڑکیوں کا نام "ہند" رکھ دیتے تھے، یعنی ایک بے قدر و قیمت وجود!

جنگ بدر کے دس ہفتے بعد مکہ کے سرداروں نے مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے ایک فوج مدینہ کی جانب روانہ کی جس کی قیادت ابوسفیان کر رہا تھا۔ ابوسفیان پیامبر خدا کا برادر رضاعی بھی سمجھا جاتا تھا کیونکہ دونوں نے ایک ہی دایہ کی چھاتی سے دودھ پیا تھا۔ گوکہ ابوسفیان کا اصلی پیشہ تجارت تھا لیکن وہ شعر بھی کہتا تھا۔ قبول اسلام سے قبل کہے گئے اس کے ہجو آمیز اشعار خاصی شہرت رکھتے تھے۔

ابوسفیان چار سو سپاہیوں کے ہمراہ ماہ حرام میں یعنی جس مہینے میں جنگ نہیں کرنی چاہئے، مکہ سے نکلا اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابوسفیان نے مدینہ کے نزدیک "کوہ نیب" کے علاقے میں اپنے افراد کو ٹھہرنے کا حکم دیا اور خود گنتی کے چند سپاہیوں کے ہمراہ مدینہ میں داخل ہوگیا۔

مکہ کے قبیلہ قریش اور مدینہ کے یہودیوں نے خفیہ طور پر یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ مشرکین مکہ جب بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہیں تو مدینہ کے یہودی ان کی مدد کریں گے۔ ابوسفیان کو یہ اطمینان حاصل تھا کہ یہودی اس کے ساتھ ہیں لہٰذا مدینہ میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھا یہودیوں کے ایک سرکردہ شخص "سلام بن میشام" کے گھر پہنچ گیا۔

سلام بن میشام نے ابوسفیان کے اعزاز میں شاہانہ ضیافت کا اہتمام کیا اور اعلیٰ غذاؤں اور بہترین مشروبات سے اس کی خاطر تواضع کی۔ جب ضیافت ختم ہوگئی تو ابوسفیان نے اپنے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا اور بولا "ہم تمہارے بھروسے پر مدینہ آئے ہیں تاکہ تم لوگوں کی مدد سے آج ہی رات مسلمانوں کا قصہ تمام کرڈالیں"۔

سلام بن میشام نے جواب میں کہا "ہمیں اپنے وعدے کا پاس ہے اور اسی وعدے

کے مطابق ہم مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں ضرور تمہارا ساتھ دیں گے لیکن ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم اتنی جلد بازی سے کام لو گے اور اچانک مدینہ چلے آؤ گے۔ ہم لوگوں نے فی الحال لڑائی کی تیاری نہیں کی لہٰذا نہ تو آج تمہارے ساتھ جنگ میں شریک ہو سکتے ہیں نہ اگلی رات اور نہ ہی آئندہ راتوں میں مگر یہ کہ کچھ عرصہ گزر جائے اور ہم لوگ اپنے آپ کو لڑائی کے لئے آمادہ کرلیں!"

ابوسفیان نے، جو اس نیت سے آیا تھا کہ اسی رات مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائے جب اپنا منصوبہ نقش بر آب ہوتے دیکھا تو وہ جھنجلا اٹھا اور اس نے مدینہ سے نکلتے وقت یہودی نشین محلے میں واقع مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگادی، دو مسلمانوں کو جاں بحق کر دیا اور مسلمانوں کا سامان لوٹ کر بھاگ نکلا جس میں "جو" کی بوریاں بھی شامل تھیں۔ مذکورہ محلہ مدینہ کے شمال میں واقع تھا اور محلہ عریق (یا عریض) کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

مسلمانوں کو جیسے ہی یہ علم ہوا کہ ابوسفیان مدینہ میں داخل ہو چکا ہے اور اس نے محلہ عریق میں مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگادی، دو افراد کو قتل کر دیا اور کچھ کا سامان بھی لے بھاگا ہے تو وہ بھی ابوسفیان کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

ابوسفیان اور اس کے سپاہیوں نے اس غرض سے کہ وہ تیز تر بھاگ سکیں اور مسلمانوں کی دسترس سے دور ہو جائیں تو جو سے بھری ہوئی بوریاں اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کی پیٹھ سے زمین پر پھینکنا شروع کر دیں جو بعد میں مسلمانوں کے قبضے میں آگئیں۔ اسی بنا پر اس واقعہ کو "جو کی چوری" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ (وضاحت: اسلامی تاریخ میں یہ واقعہ "غزوہ سویق" کے نام سے مشہور ہے۔ عربی زبان میں سویق جو کو کہتے ہیں۔ خلیل)

پیغمبر اسلام ﷺ نے کفار کو متنبہ کرنے کی غرض سے یہ حکم جاری کیا کہ مکہ کا جو بھی کارواں مدینہ کی حدود سے عبور کرے تو اس کا راستہ روک دیا جائے۔

ایک دن مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ مکہ کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان اور صفوان بن

امیہ کی سرپرستی میں خیبر سے مکہ کی طرف جا رہا ہے اور اس کارواں کا ساز و سامان چاندی کے برتن اور زیور پر مشتمل ہے۔

خیبر مدینہ کے شمال میں واقع ایسا شہر تھا جہاں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ اس شہر میں رہنے والے اکثر یہودی باشندوں کا پیشہ زرگری تھا۔ وہ لوگ چاندی کے برتن، سونے کے زیور اور دوسری قیمتی اشیاء بنانے کے ماہر تھے۔ خیبر کے یہودی نہ صرف یہ کہ چاندی کے برتن اور زینت کا سامان فروخت کرتے بلکہ انہیں کرائے پر بھی دیتے تھے۔ مکہ کے مالدار لوگ جب شادی بیاہ کرتے یا پر تکلف ضیافتیں دیتے تو خیبر کے یہودیوں سے قیمتی برتن اور دوسرا سامان کرائے پر لیتے تھے۔

پیامبر اسلام ﷺ کی ہجرت سے کئی سال پہلے کی بات ہے کہ مکہ کے ایک ممتاز شخص نے ایک بڑا جشن منانے کی غرض سے خیبر کے یہودیوں سے کچھ گراں بہا برتن اور دوسری ذی قیمت سامان کرائے پر لیا۔ اتفاق سے مذکورہ سامان کا کچھ حصہ گم ہو گیا اور گمان یہ ہے کہ چوری ہو گیا۔ خیبر کے یہودیوں نے اپنے مال کا مطالبہ کیا اور دس ہزار سونے کے سکے تاوان کے طور پر وصول کر لئے۔

خیبر کے یہودی کے برتن اور سونے کے زیورات دوسرے شہروں کے باشندوں کو دینے سے پہلے یہ ضرور اطمینان کر لیتے تھے کہ اگر ان کا مال ضائع ہو گیا تو وہ اس کی قیمت وصول کر سکتے ہیں یا نہیں اور جب تک انہیں یہ اطمینان حاصل نہ ہو جاتا تو وہ چاندی اور سونے کے برتن یا دوسرا قیمتی سامان ہرگز کرائے پر نہیں دیتے تھے۔

بہرکیف مسلمانوں نے سرزمین نجد کے کنارے واقع "القرادہ" نامی چشمے کے پاس کاروان مکہ کو دیکھا اور بلا تامل اس پر حملہ کر دیا۔ ابو سفیان اور صفوان بن امیہ بھاگ نکلے اور مذکورہ کارواں کا سارا سامان مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

مسلمانوں کو اس حملے سے "قریباً" ایک لاکھ درہم کا مال غنیمت حاصل ہوا اور یہ مکہ کی پہلا کارواں تھا جو صحیح معنوں میں مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور انہوں نے مذکورہ کارواں کا

سارا مال ضبط کر کے فی الواقع مدینہ پر ابوسفیان کے حملے کی تلافی کر دی۔

جب یہ خبر مکہ پہنچی کہ خیبر سے مکہ آنے والا کارواں مسلمانوں کی انتقامی کارروائی کا نشانہ بن گیا ہے تو مکہ کے بت پرستوں کے تن من میں آگ لگ گئی اور انہوں نے تیزی سے ایک اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔



مدینہ سے یہودیوں کا اخراج

ایک طرف جبکہ مکہ کے رہنے والے اپنے آپ کو مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی جنگ کے لئے آمادہ کر رہے تھے تو دوسری طرف مدینہ میں وہ لوگ جو اسلام کے دشمن تھے ہجو آمیز اشعار کی آڑ میں مسلمانوں کے مقابلے پر نکل آئے۔

ہم نے اس تاریخی بحث میں بتایا تھا کہ جزیرۃ العرب میں سخن و کلام کی بہت اہمیت تھی۔ خاص طور پر کلام منظوم کا اثر بہت گہرا ہوتا تھا اور سیاسی نوک جھونک میں ہجو گوئی جو شعر کی ایک صنف ہے اتنی مؤثر سمجھی جاتی تھی کہ عرب باشندے یہ کہتے تھے کہ ہجو کا زخم تلوار یا نیزے کے زخم سے زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔

مدینہ کے شاعروں میں سے ایک جو پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر مسلمانوں کے بارے میں ہجو کہتا تھا کعب بن الاشرف نامی شاعر تھا جس کا نام گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہ شخص مکہ گیا، کئی مہینے وہاں ٹھہرا اور اہل مکہ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف

بھڑکانے کے بعد مدینہ واپس چلا آیا۔

کعب بن الاشرف نے مدینہ پہنچنے کے بعد رسول اکرم ﷺ اور دین اسلام کی مخالفت میں کہے گئے اشعار کو مدینہ کے عام میدانوں اور ہر اس جگہ پر جہاں لوگ اجتماع کرتے تھے ایک خاص انداز میں پڑھنا شروع کر دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ سننے والوں کو بھی اپنے اشعار دہرانے پر اکسایا کرتا تھا۔

مدینہ کے دوسرے شاعروں میں جو رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہجو گوئی کرتے تھے ایک عورت بھی شامل تھی جس کا نام اسماء بنت مروان تھا۔ یہ عورت پیغمبر اسلام ﷺ اور عام مسلمانوں کے علاوہ قرآن مجید' جبرائیل اور اللہ کے بارے میں بھی ہجو آمیز اشعار کہتی تھی جن سے مسلمانوں کو بہت دکھ پہنچتا تھا۔ حتیٰ کہ پیغمبر اسلام ﷺ بھی اس عورت کے کہے ہوئے اشعار کی وجہ سے رنجیدہ خاطر ہو جاتے تھے لیکن چونکہ آپ انتہائی سلیم المزاج اور حلیم طبع انسان تھے لہٰذا ہرگز بردباری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ان کے اللہ نے قرآن کی ایک سورۃ میں یوں کہا ہے:

"والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنو و عملوالصالحات و تواصو بالحق و تواصو بالصبر"۔

سورۃ والعصر کی پہلی آیت میں اللہ نے زمانے کی قسم کھائی ہے (یعنی اس زمانے کی قسم جس میں محمد (ﷺ) پیغمبری کے لئے مبعوث ہوئے) کہ یہ زمانہ معرفت اور حقیقت کا زمانہ ہے اور انسان (اپنی نادانی اور ضد کے باعث) اپنے لئے خسارہ بٹور رہا ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے (اللہ اور اس کے رسول پر) اور نیک کام کئے اور حق کی راہ میں پائیداری کی اور صبر و بردباری کے ساتھ استقامت کرتے رہے۔

قرآن میں متعدد بار صبر و بردباری کا ذکر ہوا ہے اور اللہ نے ہر بار انسانوں کو یہی تاکید کی ہے کہ تحمل مزاج رہیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں اور پیغمبر اسلام ﷺ تو ویسے بھی بردباری میں اپنی مثال آپ تھے۔ البتہ عام مسلمان اپنے پیغمبر

ﷺ کی طرح ضبط و تحمل سے کام نہیں لے سکتے تھے اور شاعروں کی ہجو گوئی انہیں سخت تکلیف پہنچاتی تھی کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ مذکورہ شاعر برملائے عام ان کے رسول اور اللہ کے بارے میں ہرزہ سرائی کر رہے ہیں۔ مسلمان اپنے بارے میں تو بدگوئی برداشت کر سکتے تھے لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کی شان میں گستاخی ان کی قوت برداشت سے باہر تھی۔ ایک دن ایک مسلمان مرد جو اندھا بھی تھا اسماء بنت مروان کے گھر میں داخل ہوا اور اپنا خنجر قبضے تک اس کے سینے میں اتار دیا۔ یوں اسماء بنت مروان اپنے انجام کو پہنچی۔

دوسرے دن جب لوگوں کو یہ علم ہوا کہ ہجو گو شاعرہ اسماء ایک نابینا شخص کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے تو انہیں بہت حیرت ہوئی کیونکہ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اندھا شخص کیونکر اسماء کے گھر میں داخل ہو گیا' کیسے اسے ڈھونڈ نکالا اور کس طرح اسے موت کے گھاٹ اتار گیا۔

آخر کار معلوم ہوا کہ وہ شخص اسماء کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہے اور سالہا سال اس کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ وہ گھر کے گوشہ گوشہ سے آشنا تھا اور اسماء کی عادات و اطوار سے بھی واقفیت رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ عورت کہاں سوتی ہے۔

ایک نابینا شخص کے ہاتھوں اسماء کے قتل کی خبر تیزی سے مدینہ میں پھیل گئی اور حضرت محمد ﷺ کو بھی مسجد میں یہ خبر سننے کو ملی۔ جب وہ نابینا شخص مسجد میں آیا تو رسول اکرم ﷺ نے دریافت کیا "آیا اسماء کو تم نے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟"

نابینا شخص نے جواب دیا "جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ میں نے گزشتہ رات اسے ٹھکانے لگا دیا ہے اور مجھے اس سلسلے میں ذرا بھی احساس ندامت نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں یہ بات اتنی بے اہمیت ہے کہ دو بکریاں بھی اس مسئلے پر سینگ نہیں لڑاتیں"۔

لیکن رسول خدا ﷺ اس واقعہ سے متاسف ہوئے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ انہیں ہر قسم کے کشت و خون سے نفرت تھی۔ آپ کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ اسلام دشمن

عناصر مسلمانوں کی تحمل مزاجی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں ایسا اقدام کرنے پر اکسا رہے ہیں جس میں ان کی اپنی مرضی شامل نہیں۔ تاہم آپ اسماء کے قتل کے سلسلے میں مداخلت کرنے سے بھی معذور تھے کیونکہ میثاق مدینہ کے مطابق ہر قبیلہ اپنے داخلی معاملات میں خود مختار تھا اور جب قاتل و مقتول ایک ہی قبیلے سے ہوں تو دوسرا سزا دینے کے لئے مداخلت نہیں کر سکتا تھا بلکہ مذکورہ شخص کی سزا اس کے اپنے قبیلے کے فیصلے پر منحصر ہوتی تھی۔

اسماء کے بعد کعب بن اشرف نامی شاعر بھی ایک مسلمان کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا اور اس بار بھی مرنے والا اور مارنے والا دونوں ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مدینہ میں ایک اور شاعر بھی تھا جس کا نام ابو عفک تھا۔ یہ شخص بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے بارے میں توہین آمیز اشعار سراہتا تھا۔ وہ بھی ایک مسلمان کے ہاتھوں جو قبیلہ ابو عفک سے تعلق رکھتا تھا مارا گیا اور یوں تینوں ہجو گو شاعر یکے بعد دیگرے انجام کو پہنچے۔

(وضاحت: اس کتاب کے مصنف کونسٹن ویرژیل نے ہجو گو شعرا کو کیفر کردار تک پہنچانے والے غیرت مند مسلمانوں کا نام ذکر نہیں کیا جبکہ بعض اسلامی تواریخ میں مذکورہ تین افراد کا نام بشرح ذیل ذکر ہوا ہے۔

۱۔ حضرت عمیرؓ بن عوف جنہوں نے اسماء یا عصماء بنت مروان کو ٹھکانے لگایا۔

۲۔ حضرت ابو نائلہ جنہوں نے کعب بن اشرف کو انجام تک پہنچایا۔

۳۔ حضرت سالمؓ بن عمیر جنہوں نے ابو عفک کا قصہ تمام کیا۔ خلیل)

لیکن تینوں شاعروں کی عبرتناک موت کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہجو گوئی جاری رہی تاہم اس مرتبہ مدینہ کے یہودی شرانگیز اشعار کے ذریعے مسلمانوں کا دل دکھانے لگے۔

حضرت محمد ﷺ نے یہودیوں کو نصیحت کی کہ وہ مسلمانوں کی ایذا رسانی سے باز آجائیں اور انہیں یاد دلایا کہ تم لوگوں نے میثاق مدینہ کے مطابق یہ عہد کیا ہے کہ

مسلمانوں کے ساتھ مصالحت آمیز رویہ اپنائے رکھو گے اور جو لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں ان سے اتحاد نہیں کرو گے۔ حتیٰ کہ آپؐ نے یہودیوں اور مسلمانوں کے تعلقات بہتر بنانے کی غرض قبیلہ زرگر کے سربراہ سے ملاقات بھی کی۔

گزشتہ ابواب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ مدینہ کے یہودی تین بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر قبیلے کا پیشہ دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک قبیلہ زراعت کا کام کرتا تھا' دوسرا زرگری اور تیسرا دباغت (Tanning) کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھا۔

(وضاحت: اس کتاب کے مصنف نے تینوں یہودی قبائل کی شناخت ان کے مشغلوں سے کی ہے۔ جبکہ اسلامی تاریخ کے مطابق ان قبائل کے نام بالترتیب یہ تھے۔ بنو قریظہ' بنو نظیر اور بنو قینقاع۔ ان قبیلوں میں بنو قینقاع سب سے زیادہ طاقتور اور مالدار تھا اور اس کے اکثر ارکان کا پیشہ زرگری تھا۔ خلیل)

قبیلہ زرگر کا سربراہ چونکہ یہ جانتا تھا کہ ہزاروں سپاہیوں پر مشتمل ایک طاقتور فوج مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے عنقریب مکہ سے مدینہ آ رہی ہے لہٰذا اس نے بڑی بے اعتنائی کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کی۔

در حقیقت یہ شخص بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے خفیہ طور پر مشرکین مکہ سے یہ سمجھوتہ کر رکھا تھا کہ جب مکہ کی فوج مدینہ پر حملہ آور ہو گی تو وہ اس کی مدد کریں گے۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس شخص نے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کی تھی۔

بہرطور پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودیوں کے سربراہ سے میثاق مدینہ کے بارے میں گفتگو کی اور اسے یاد دلایا کہ قانون کا احترام سب پر واجب ہے چاہے یہودی ہوں یا مسلمان اور ان میں سے کسی کو ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جو مدینہ کے قانون کے منافی ہو۔ پھر آپ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے باہمی تعلقات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اظہار کیا کہ اگرچہ مسلمانوں نے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی نہیں کی اور انہوں نے یہودیوں کو

کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچائی لیکن اس کے باوجود یہودی لوگ جگہ جگہ ہجو و ہزل سے بھرپور اشعار پڑھ کر مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے ہیں اور چونکہ مسلمان صبر و تحمل سے کام لے رہے ہیں لہٰذا یہودیوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے اور وہ یہ تصور کرنے لگے ہیں کہ شاید مسلمان ان سے خائف ہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ مسلمانوں نے جنگ بدر میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہیں کسی سے باک نہیں۔ تاہم وہ نہیں چاہتے کہ انتقامی کارروائی کے نتیجے میں یہودیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ یہودی بھی مسلمانوں کو پریشان کرنے سے باز آجائیں اور میثاق مدینہ کا احترام کریں۔

قبیلہ زرگر کے یہودی سربراہ نے گستاخانہ انداز میں جواب دیا۔ یا ابوالقاسم جنگ بدر نے آپ اور آپ کے پیروکاروں کو مغرور بنا دیا ہے اور آپ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ چونکہ جنگ بدر میں اہل مکہ پر غالب آچکے ہیں تو سب جگہ فتح آپ ہی کی ہو گی۔ لیکن آپ اس بات سے غافل ہیں کہ جنگ بدر میں آپ نے جن لوگوں سے مقابلہ کیا تھا وہ آپ کی اپنی قوم سے تھے اور آپ نے ابھی یہودیوں سے نبرد آزمائی نہیں کی جو یہ جان سکیں کہ جنگجو لوگ کیسے ہوتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے انتہائی تحمل مزاجی اور بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ہم تم لوگوں سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ اچھے تعلقات رکھیں۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ چونکہ مکہ سے ایک بڑی فوج آنے کی خبر گرم ہے لہٰذا تم نہیں چاہتے کہ ہمارا ساتھ دو لیکن اتنا ضرور کر سکتے ہو کہ فوج آنے پر بے طرف رہو۔

یہودیوں کو کفار مکہ سے اتنی امیدیں وابستہ تھیں کہ قبیلہ زرگر کے سربراہ نے حتیٰ کہ بے طرف رہنے کا بھی واضح طور پر وعدہ نہیں کیا اور کہنے لگا کہ بات مسلمانوں کے "برتاؤ" پر منحصر ہے۔ اگر مسلمانوں کا رویہ تسلی بخش رہا تو ہم لشکر مکہ کے آنے پر بے طرف رہیں گے لیکن ایسی صورت میں جبکہ مسلمان یہودیوں کے ساتھ نرم اور مصالحت

آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے تھے تو ایک دن جب ایک نوجوان مسلمان لڑکی سناروں کے بازار سے گزر رہی تھی تو کچھ یہودی لڑکوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال کر اسے ستانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی بے حرمتی کرنے کی بھی کوشش کی۔ اسی اثناء میں ایک اور یہودی قریب کی دکان سے باہر نکلا اور اس لڑکی کا دامن کھونٹے سے باندھ دیا۔ جب لڑکی نے بھاگنا چاہا تو چونکہ اس کا دامن کھونٹے سے بندھا ہوا تھا لہٰذا پھٹ گیا اور اس کے بدن کا کچھ حصہ نمایاں ہو گیا۔

اتفاق سے ایک مسلمان وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے جب یہ منظر دیکھا تو اس کی غیرت جوش میں آ گئی وہ آگے بڑھا اور اپنا مکا پوری قوت سے یہودی زرگر کے سر پر دے مارا۔ دوسرے آوارہ لڑکے یہودی زرگر کی حمایت میں نکل آئے اور مسلمان شخص پر حملہ آور ہو گئے اور اسے جان سے مار دیا۔

مسلمانوں نے قبیلہ زرگر (یعنی قبیلہ تیقاع) سے خون بہا کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے خون بہا دینے سے انکار کر دیا۔ جب کوئی قبیلہ کسی کے قتل کا مرتکب ہو اور اس کا دیہ بھی ادا نہ کرے تو اس زمانے کے دستور کے مطابق اسے لڑائی کے لئے آمادہ ہو جانا چاہئے۔ مسلمانوں نے یہودیوں کے قبیلہ زرگر کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن مذکورہ قبیلے کے سارے افراد جن میں سات سو جنگجو مرد بھی شامل تھے اپنے قلعہ نما گھروں میں مورچہ بندی کر کے بیٹھ گئے۔ انہیں فی الوقت مسلمانوں سے لڑائی کا خوف نہیں تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مکہ کی فوج ابوسفیان کی قیادت میں عنقریب مدینہ پہنچنے والی ہے لیکن انہیں اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ لڑائی وقت سے پہلے شروع ہو گئی ہے۔

مسلمانوں نے زرگروں کے محلے کو محاصرے میں لے لیا اور دو ہفتے تک زرگر یہودی مسلمانوں کے شدید محاصرے میں گھرے رہے۔ ان دو ہفتوں میں نہ تو مسلمانوں میں سے کوئی زخمی ہوا اور نہ ہی یہودیوں میں سے۔ دو ہفتے بعد یہودیوں کو یہ خبر ملی کہ مکہ کی فوج ابھی اس شہر سے باہر ہی نہیں نکلی مدینہ پہنچنا تو دور کی بات ہے۔ لہٰذا جب یہودی

مشکل میں پڑ گئے تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور تسلیم ہو گئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ مغلوبین کے ساتھ ہمیشہ مہربانی سے پیش آئے تھے لہٰذا آپ نے یہودیوں کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کوئی چیز ضبط نہیں کی اور ان سے کہا کہ تم لوگ مختار ہو چاہو تو مسلمان ہو جاؤ یا پھر ہمیشہ کے لئے مدینہ سے نکل جاؤ۔

رسول اللہ ﷺ نے انہیں یہ بھی اجازت دے دی کہ مدینہ سے نکلتے وقت تم لوگ جو کچھ چاہو اپنے ہمراہ لے جا سکتے ہو۔ لہٰذا زرگر یہودی اپنا سارا مال حتیٰ کہ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں تک اکھاڑ کر لے گئے اور جب مدینہ سے باہر نکلے تو دو دستوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک دستے نے جنوب یعنی مکہ کا راستہ اختیار کیا تاکہ لشکر کفار میں شامل ہو کر مسلمانوں کو نابود کرنے کی سازشوں میں ان کا ساتھ دیں۔ دوسرا دستہ جزیرۃ العرب کے یہودی نشین شہروں میں سے ایک کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگرچہ یہودی زرگروں کے اخراج سے مدینہ میں اسلام دشمن عناصر میں کمی واقع ہو گئی لیکن پھر بھی باقی ماندہ یہودیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ مکہ کے قبیلہ قریش کو بھی یہودیوں کی جلاوطنی سے نقصان پہنچا کیونکہ وہ سات سو جنگجو مرد جو مدینہ پر حملے کے موقع پر ان کی مدد کر سکتے تھے ان کے ہاتھ سے جاتے رہے۔



جنگ احد اور مسلمانوں کی شجاعت

ہم نے بتایا تھا کہ ابوسفیان چار سو سپاہیوں کے ہمراہ رات کی تاریکی میں مدینہ پہنچا تاکہ یہودیوں کی مدد سے پیروان اسلام کا قلع قمع کر دے لیکن مدینہ کے یہودی قریش کی حمایت میں حضرت محمد ﷺ کے خلاف مقابلہ آرائی کی ہمت نہ کر سکے اور یوں ابوسفیان جب بددل ہو کر مدینہ سے لوٹنے لگا تو اس نے مسلمانوں کے گھروں کو غارت گری کا نشانہ بنایا اور دو مسلمانوں کو بھی جاں بحق کر دیا۔ جب مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا تو ابوسفیان کے سپاہیوں نے "جو" کی بوریاں زمین پر پھینکنا شروع کر دیں جو بعد میں مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ لہٰذا اسی بنا پر اس گریز و تعاقب کو "غزوہ سویق" کا نام دیا گیا کیونکہ عربی زبان میں جو کو سویق کہتے ہیں۔

ابوسفیان نے مکہ پہنچ کر ایک عظیم فوج کی تنظیم نو کی اور ۶۲۵ء مارچ کے مہینے یعنی ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ تین

ہزار جنگجو سپاہی ابوسفیان کی زیر کمان لشکر قریش میں شامل تھے جن میں سے سات سو سپاہی مکمل طور پر سلح پوش تھے اور صفوان بن امیہ اس فوج کا نائب سپہ سالار مقرر ہوا تھا۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قریش کے سات سو سپاہی "سلح پوش" تھے تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ لوگ سرد علاقوں کے جنگجوؤں کی طرح آہنی لباس پہنے ہوئے تھے' کیونکہ صحرائے عرب میں آہنی لباس نہیں چل سکتا اور اگر کوئی سپاہی ایسے حفاظتی لباس کا استعمال کرے تو میدان کارزار میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سورج کی حرارت اسے بھون کر رکھ دے گی۔

دراصل وہ سات سو سپاہی زرہ پہنے ہوئے تھے جو تیر و تبر اور شمشیر کی ضربات سے ان کی حفاظت کر سکتی تھی اسی لئے وہ لوگ دوسروں کے مقابلے میں "سلح پوش" سمجھے جاتے تھے۔ لشکر قریش میں دو سو سپاہیوں کے پاس گھوڑے بھی تھے اور اس سوار فوج کی کمان ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جسے جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ دنیا کے نامور جنگجو افراد کی صف میں شمار کیا جاتا ہے یعنی "خالد بن ولید!"

خالد بن ولید کی دلیری' ہوشیاری اور میدان جنگ میں اپنے مدمقابل کی کمزوریوں کو بھانپ لینے اور ان سے بروقت فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کو تمام اسلامی مؤرخین نے تسلیم کیا ہے۔ میدان جنگ میں اگر اس بہادر شخص پر تیروں اور برچھیوں کی بارش ہو رہی ہوتی تو بھی وہ اتنا بے پروا اور مطمئن نظر آتا تھا کہ گویا اپنے گھر میں دسترخوان کے کنارے بیٹھا طعام تناول کر رہا ہو لیکن جب حملہ کرنا چاہتا تو اتنا پھرتیلا اور چالاک ثابت ہوتا کہ پلک جھپکتے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتا تھا۔

خالد بن ولیدؓ بعد میں مسلمان ہو گئے اور مختلف جنگوں میں شجاعت اور دلیری کے ایسے جوہر دکھائے کہ انہیں "سیف اللہ" یعنی اللہ کی تلوار کے لقب سے نوازا گیا لیکن ہجرت کے تیسرے سال شوال کے مہینے میں یہی بہادر شخص آیا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف پیکار کرے اور انہیں صفحہ ہستی سے مٹا ڈالے۔

ابوسفیان کے ہمراہ مدینہ آنے والے دوسرے سرداروں میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی شامل تھا جس کے سینے میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور کینے کی آگ سلگ رہی تھی۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی اپنے شوہر کے ہمراہ مدینہ چلی آئی تاکہ اپنی مانگی ہوئی نذر پوری کر سکے اور میدان جنگ میں ہلاک ہونے والے مسلمانوں کے کان اور ناک اپنے ہاتھ سے کاٹے اور ان کا ہار بنا کر گلے میں ڈال لے۔

لشکر مکہ میں ایک عورت ایسی بھی تھی کہ اگر جس کا نام ذکر نہ ہو تو تاریخی نقطہ نظر سے ناقابل بخشش تصور ہو گا۔ (وضاحت: یہ الفاظ کونسٹن ویرژیل ایک یورپی مؤرخ کے ہیں) اس عورت کا نام "عمرہ علقمہ" تھا اور اس وقت اس کی عمر پینتیس' چالیس سال کے درمیان تھی یہ عورت بلند قامت' قوی جثہ اور خوبرو دکھائی دیتی تھی۔ اس نے جنگ احد میں جو بہادری دکھائی وہ سننے کے قابل ہے۔

بہرحال مورخہ ۲۰ مارچ ۶۲۵ء بروز بدھ یعنی ۱۲ شوال ۳ ہجری کو قریش کی فوج جو تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی مدینہ کے نزدیک پہنچی اور پھر شمال کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ مکہ' مدینہ کے جنوب میں واقع ہے۔ اسی بنا پر مسلمان شمال کی طرف یعنی شام کو جانے والے مکی کاروانوں کا راستہ روک سکتے تھے۔ لہٰذا جو فوج مکہ سے مدینہ آئے اسے "قاعدتاً" جنوب کی طرف سے مدینہ میں داخل ہونا چاہئے یا پھر شہر کے جنوب میں مورچہ بندی کرنی چاہیے نہ کہ شمال کی طرف روانہ ہو جائے۔

لیکن مکہ کی فوج مدینہ کے پاس پہنچ کر اس لئے شمال کی جانب نکل گئی (یعنی اس نے شہر کا چکر کاٹا) کہ جنوب کی طرف سے مدینے پر حملہ کرنا بہت دشوار تھا اور اس دشواری کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ کے جنوبی حصے میں اونٹوں کی نقل و حرکت باآسانی ممکن نہیں تھی۔ مدینے کا جنوبی حصہ آتش فشاں لاوے سے پیدا ہونے والے تیز دھار پتھروں سے اٹا پڑا تھا لہٰذا اونٹوں اور حتیٰ کہ گھوڑوں کے لئے بھی وہاں قدم اٹھانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ ابوسفیان کی فوج اس علاقے میں پیکار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ جنگ کا لازمہ یہ ہے کہ ایک فوج متحرک ہو' آزادانہ طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکے اور باآسانی جنگی حرکات انجام دے سکے۔ جبکہ اس علاقے میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوسفیان نے مدینہ کو حلقہ وار عبور کرنے کا فیصلہ کیا اور کوہ احد کے دامن میں لڑائی کرنے کو ترجیح دی کیونکہ وہاں کی زمین ریتلی تھی اور اونٹوں کی نقل و حرکت آسانی سے انجام پذیر ہو سکتی تھی یعنی آج کے عسکری محاورے کے مطابق وہاں پر (Manoeuvre) (یعنی عسکری حرکت) انجام دینے میں بہت آسانی تھی۔

لشکر قریش جب مدینہ کے پاس پہنچا تو اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ مسجد قبا میں تھے اور ہم بتا چکے ہیں کہ یہ مسجد جو مدینہ کے نزدیک قبا کے مقام پر بنائی گئی تھی مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ ہفتے میں ایک بار مسجد میں جاتے اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کے بعد مسلمانوں سے گفتگو کیا کرتے تھے۔

وہ بدھ (یا ایک دوسری روایت کے مطابق جمعرات) کا دن تھا اور جب پیغمبر ﷺ نے یہ سنا کہ مکہ کی فوج مدینہ کی حدود میں داخل ہو چکی ہے تو انہیں چنداں حیرت نہ ہوئی کیونکہ آپ عرصہ سے یہ پیش بینی کر رہے تھے کہ کفار مکہ عنقریب مدینہ پر حملہ آور ہونے والے ہیں تاکہ مسلمانوں سے جنگ بدر کا انتقام لے سکیں اور انہیں صفحہ روزگار سے محو کر سکیں۔

لشکر مکہ نے احد کے دامن میں اترنے کے بعد اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو مدینہ کے شمال میں واقع کھیتوں میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور انہوں نے بھی فصلوں کو شدید نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ ان کا یہ عمل مسلمانوں کو بھڑکانے اور لڑائی پر اکسانے کے مترادف تھا اور اہل مدینہ بھی بخوبی سمجھتے تھے کہ ان کا مقصد کیا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس دن اور اس رات مدینہ کے مختلف قبائل کے سربراہوں سے مشورہ کیا کہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔

دراصل پیغمبر اسلام ﷺ یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے کہ جنگ شروع ہونے کے بعد مدینہ میں امن و امان برقرار رہے گا یا نہیں کیونکہ آپ کو اندیشہ تھا کہ جب لڑائی شروع ہو تو کہیں منافقین اور مدینہ کے دوسرے غیر مسلم قبیلے عقب سے مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں لہٰذا آپ یہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں مکمل اطمینان حاصل کر لیں۔

منافقوں کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپ کو ہماری وفاداری پر اطمینان رکھنا چاہئے اور یہودیوں نے بھی وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی پشت پر حملہ نہیں کریں گے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کی بات مان لی اور پھر جنگی حکمت عملی کے بارے میں قبائلی سرداروں اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ باہمی مشورہ شروع کر دیا۔

عبداللہ بن ابی نے کہا کہ میرے خیال میں مسلمانوں کو شہر میں رہتے ہوئے مورچہ بندی کر لینی چاہئے کیونکہ مدینہ میں ایسی عمارتیں موجود ہیں جو کسی مضبوط قلعے سے کم نہیں اور اگر مسلمان ان عمارتوں میں پناہ لے لیں تو مکہ کی فوج ان پر غلبہ نہیں پا سکے گی۔

پیغمبر اسلام ﷺ اس موضوع سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ مدینہ کی عمارتیں قلعوں کی طرح مستحکم و محفوظ ہیں اور اگر مسلمان ان میں پناہ لے لیں تو مکہ کی طاقتور فوج ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی بشرطیکہ ان کے پاس وافر مقدار میں اشیائے خورد و نوش موجود ہوں جو محاصرے کے دنوں میں کام آ سکیں لیکن چونکہ یہ تجویز عبداللہ بن ابی کی جانب سے پیش کی گئی تھی لہٰذا پیغمبر ﷺ کو شک گزرا کیونکہ آپؐ کو عبداللہ بن ابی کی نیت و اخلاص پر قطعاً بھروسہ نہیں تھا۔

آپؐ نے سوچا کہ عمارتوں میں پناہ لینے کی تجویز کے پس پردہ شاید کوئی خفیہ سازش کارفرما ہے اور مشورہ دینے والا یہ چاہتا ہے کہ کسی طور مسلمانوں کی طاقت محبوس اور جنگی حرکت موقوف ہو جائے اور وہ مناسب موقع ملنے پر عمارتوں کے دروازے کھول دے اور

مسلمانوں کو قریش کے حوالے کر دے۔

عبداللہ بن ابی کی بات سننے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے جوانوں سے مشورہ طلب کیا اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہؐ ہماری نظر میں بہتر یہی ہے کہ مدینہ سے باہر نکل کر قریش کا مقابلہ کیا جائے کیونکہ ہم شہر میں رہ کر لڑائی کا اہتمام کریں گے تو ہماری نقل و حرکت محدود ہو جائے گی اور ہم بالکل بندھ کر رہ جائیں گے لیکن شہر سے نکل کر ہمیں ہر طرف جانے کی آزادی ہو گی اور ہم لڑائی کے تقاضوں کے مطابق مناسب حکمت عملی اختیار کر سکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے جوانوں کا نقطہ نظر سنا تو ان کی تجویز کو پسند کیا اور شہر سے نکل کر قریش کا مقابلہ کرنے کی منظوری دے دی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی یہ عادت تھی کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے اور جو نظریہ بھی مفید ہوتا اسے منظور کر لیتے۔ لیکن ایک بار فیصلہ کر لینے کے بعد اس میں کسی قسم کی تبدیلی گوارہ نہیں کرتے تھے۔

جب حضرت محمد ﷺ نے مدینہ سے نکل کر لشکر مکہ سے مقابلہ آرائی کا قطعی فیصلہ کر لیا تو عبداللہ بن ابی نے پھر اصرار کیا کہ آپ اپنا فیصلہ بدل دیں اور مدینہ میں ہی ٹھہرے رہیں یعنی شہر کے اندر رہ کر قریش کی فوج کا سامنا کریں اور مدینہ کی مضبوط عمارتوں میں پناہ لے لیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ اے عبداللہ بن ابی! ایک پیغمبر جو اللہ کی طرف سے اپنی رسالت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ذمہ دار ہو تو وہ شہر میں پناہ نہیں لیتا اور اپنے آپ کو عمارتوں میں محبوس نہیں کرتا بلکہ جو انسان اللہ کا رسول ہو تو جب وہ اپنی تلوار میان سے نکال لے تو اسے آگے ہی بڑھنا چاہیے اور اس کے لئے اللہ کی پناہ کافی ہے۔ کفار مکہ کی فوج تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی اور لشکر اسلام میں صرف ایک ہزار سپاہی شامل تھے اور ان ایک ہزار میں سے بھی، جیسا کہ ہم بعد ازاں بتائیں گے تین سو

افراد واپس چلے گئے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس صرف سات سو سپاہی باقی رہ گئے۔

اس بار بھی اسلامی لشکر میں دو گھوڑے شامل تھے اور مسلمانوں کے پاس زرہ اور خود کے علاوہ دوسرے جنگی سامان کی بھی قلت تھی۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ مدینہ سے نکل کر لشکر مکہ کا مقابلہ کرنے کا حتمی فیصلہ کر چکے تو آپ نے اپنی فوج کا معائنہ کیا۔ جنگی سامان کے لحاظ سے سپاہ اسلام کی صورت حال تسلی بخش نہیں تھی کیونکہ مسلمان فی زمانہ اتنے مالدار نہیں ہوئے تھے کہ اپنے لئے مناسب مقدار میں جنگی ساز و سامان فراہم کر سکیں۔

جس وقت رسول اکرم ﷺ اپنی فوج کا معائنہ کر رہے تھے تو انہیں یہ اطلاع دی گئی کہ ہو سکتا ہے وہ یہودی جو ان کے سپاہ میں شامل ہیں جنگ شروع ہونے کے بعد لشکر مکہ سے جا ملیں۔ یہودیوں نے مدینہ کے بنیادی آئین (یعنی میثاق مدینہ) کے مطابق ہتھیار اٹھائے اور سپاہ محمد ﷺ میں شامل ہو گئے تھے۔ مدینے کا بنیادی آئین یہ کہتا تھا کہ اگر مدینہ بیرونی حملے کا نشانہ بنے تو شہر کے سارے باشندے بلا امتیاز اس کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور ہتھیار تھام لیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ اگرچہ یہ جانتے تھے اور آپ کو اندازہ تھا کہ یہودی باشندے جنگ شروع ہونے کے بعد ابوسفیان کے ساتھ ملحق ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں تاہم آپ ﷺ نے اس موضوع کا اظہار نہ ہونے دیا اور اگلے دن مسلمانوں کی فوج مدینہ سے نکل کر کوہ احد کے مشرقی دامن میں پہنچ گئی اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا جبکہ مکہ کی فوج اسی پہاڑ کے مغربی حصے میں ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی۔

ہفتے کا دن تھا اور شوال ۳ھ کی ۱۵ تاریخ۔ منافقوں کا سربراہ عبداللہ بن ابی اپنے ٹولے کے ہمراہ کوہ احد کے مشرقی دامن سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا اور مسلمانوں کو اکیلا چھوڑ گیا۔ منافقوں کے اس عمل نے ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ کا سوئے ظن بے بنیاد نہیں تھا اور یہاں جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ منافق یعنی وہ لوگ جو بظاہر مسلمان تھے پیغمبر اسلام ﷺ کا ساتھ چھوڑ گئے

جبکہ یہودی جن کے بارے میں افواہ گرم تھی کہ وہ لشکر مکہ سے جا ملیں گے اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔

"اگر تم دشمن پر بڑھ چڑھ کر حملہ کرو اور اس کا شیرازہ بکھیر دو تو ہم مخملی قالینوں پر تمہیں گلے سے لگائیں گے اور شراب کی لذت سے تمہیں مدہوش کر دیں گے۔"

"لیکن اگر تم نے دشمن کو پیٹھ دکھائی تو پھر کبھی بھی ہماری محبت سے لطف اندوز نہیں ہو سکو گے۔"

اس سے پہلے کہ لڑائی شروع ہو تو ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے اپنے غلاموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم میں سے جو بھی مسلمانوں کے سرکردہ افراد میں سے کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکے تو بلا دریغ آزاد کر دیا جائے گا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس دو سے زیادہ گھوڑے نہیں تھے اور اس دن جو ۱۵ شوال ۳ھ ہفتے کا دن تھا تو ان دو گھوڑوں میں سے ایک پر حضرت انسؓ نامی سپاہی سوار تھے۔ جب مسلمانوں کی فوج نے لشکر مکہ کی جانب پیش قدمی شروع کی تو جس گھوڑے پر حضرت انسؓ بیٹھے ہوئے تھے وہ کچھ اس انداز میں چلا کہ اس کا بدن حضرت انسؓ کی تلوار سے ٹکرایا اور تلوار کا کچھ حصہ نیام سے باہر نکل آیا..... میدان جنگ میں تلوار کا خود بخود نیام سے باہر نکل آنا نیک فال سمجھا جاتا تھا اور یہ واقعہ اس بات کی علامت تھی کہ مسلمان اس جنگ میں ضرور فتحیاب ہوں گے۔ حضرت انسؓ اس واقع سے اتنا خوش ہوئے کہ انہوں نے یہ مسرت آور خبر سب تک پہنچا دی۔

بعد ازاں مسلمان ایک منظم فوج کی شکل میں لشکر مکہ کی طرف بڑھنے لگے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے آخری بار اپنی یہ نصیحت دہرائی کہ اگر مسلمان اپنی صفوں میں' جو ایک متحرک قلعے کی حیثیت رکھتی ہیں' اتحاد برقرار رکھیں اور نظم و ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور انفرادی طور پر داد شجاعت دینے سے گریز کریں تو یقیناً فتح سے ہمکنار ہوں گے۔

اگرچہ بت پرستوں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں چار گنا سے بھی زیادہ تھی

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو ابتدائی لمحات ہی میں مسلمانوں کی برتری نمایاں ہو گئی اور صاف ظاہر ہونے لگا کہ اس بار بھی کامیابی مسلمانوں کے قدم چومے گی۔

بت پرستوں کی فوج جس طرف سے بھی حملہ آور ہوتی تو اسے مسلمانوں کی تیز دھار تلواروں اور نوکیلے نیزوں کا سامنا کرنا پڑتا اور انہیں کوئی شگاف ایسا نہ مل سکا کہ جس سے گزر کر وہ مسلمانوں کی پشت پر پہنچ سکیں یا ان کی صفوں میں رخنہ ڈال سکیں۔

دوسری طرف مسلمان سپاہی پورے اتحاد و اعتماد کے ساتھ آہستہ آہستہ پیش قدمی کر رہے تھے اور آخرکار ان کی دلیری، پائیداری اور جانبازی نے قریش کے دلوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی، ان کی ہمت جواب دے گئی اور انہوں نے میدان جنگ سے پسپا ہونا شروع کر دیا۔

بت پرستوں کا فرار کسی دکھاوے یا مسلمانوں کو ورغلانے یا فریب دینے کے لئے نہیں تھا بلکہ وہ لوگ سچ مچ خوفزدہ ہو چکے تھے لہٰذا انہیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ جان بچا کر بھاگ نکلیں۔ وہ جان چکے تھے کہ اگر مزید رکے تو پھر زندہ نہیں بچ سکیں گے۔

لشکر قریش کے خیمے وہیں نزدیک تھے اور جب مسلمانوں نے دیکھا کہ مکہ کی فوج پسپائی اختیار کر رہی ہے تو وہ سمجھے کہ اب مال غنیمت حاصل کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ لشکر مکہ کی خیمہ گاہ میں بہت زیادہ مقدار میں مال و اسباب کے علاوہ بڑی تعداد میں گھوڑے اور اونٹ بھی موجود تھے لہٰذا مسلمانوں نے انہیں حاصل کرنے کی دوڑ میں اپنی صفوں کو توڑ دیا اور مال غنیمت کے حصول میں سرگرم عمل ہو گئے۔

جب پہلی صف کے علمبردار حضرت علیؓ نے یہ صورتحال دیکھی تو بانگ لگائی۔

''مسلمانو! کہاں جاتے ہو..... ہو سکتا ہے دشمن ہمیں داؤ دینا چاہتا ہو۔ کیا رسول اللہ (ﷺ) نے یہ تاکید نہیں کی تھی کہ صورتحال کیسی بھی ہو تم لوگ نظم و ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دینا!''

مال غنیمت کی طرف لپکنے والے سپاہیوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ

حکم تھا کہ جب تک جنگ جاری ہے تو اپنی صفوں کو مت توڑنا اور اب جبکہ لڑائی ختم ہو چکی ہے اور ہم فتح یاب ہو چکے ہیں تو صفوں میں کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ کہہ کر وہ لوگ بڑی شتابی سے قریش کے خیموں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

دوسری طرف عینین نامی ٹیلے پر عبداللہؓ بن جبیر کی قیادت میں پہرہ دینے والے مسلمانوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ بت پرستوں کی فوج پسپا ہو رہی ہے اور مسلمان سپاہی بھی اپنی صفیں چھوڑ کر مال غنیمت کی طرف جھپٹ رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہمیں بھی چلنا چاہئے اور مال غنیمت کے حصول میں حصہ لینا چاہئے۔

ان کے سپہ سالار عبداللہؓ بن جبیر نے انہیں منع کیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یاد دلاتے ہوئے کہا کہ میدان جنگ میں جیسی بھی صورتحال ہو ہمیں یہاں سے نہیں ہلنا چاہئے۔ لیکن تیر اندازوں نے مصر ہو کر کہا کہ جب قریش کی فوج شکست کھا چکی ہے اور لڑائی بھی ختم ہو چکی ہے تو پھر ہم بھی دوسروں کی طرح مال غنیمت کے حصہ دار کیوں نہ بنیں۔ یہ کہنے کے بعد وہ لوگ بھی ٹیلے سے نیچے اتر آئے اور خیمہ گام قریش کی طرف بے تحاشہ دوڑنے لگے اور اس طرح عبداللہؓ بن جبیر سمیت صرف بارہ سپاہی مذکورہ ٹیلے پر باقی رہ گئے۔

اسی اثنا میں جب مکہ کے سپاہی مسلمانوں کے ہاتھوں پسپائی اختیار کرتے ہوئے اپنے خیموں کے پاس پہنچے تو انہیں ان عورتوں کا سامنا کرنا پڑ گیا جو ان کے ہمراہ میدان جنگ تک آئی ہوئی تھیں۔

جزیرۃ العرب میں قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ میدان جنگ میں حاضر ہوتی تھیں تاکہ ان کا حوصلہ بڑھائیں اور ان کی غیرت کو بھڑکا کر انہیں پائیداری کے ساتھ مقابلہ کرنے پر اکساتی رہیں۔ اس سلسلے میں ایک عرب شاعر کہتا ہے۔ "جب ہم پیکار کرتے ہیں تو ہماری عورتیں میدان جنگ میں نظارہ گر ہوتی ہیں اور ان کی آنکھیں کسی الاؤ کی طرح ہمارے خون کو جوش دلاتی رہتی ہیں۔"

ایسی جنگوں میں جہاں مردوں کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ پسپائی کرنے لگتے تو عرب عورتیں جو فوج کے ہمراہ میدان جنگ تک آتی تھیں' اپنے بال بکھیر لیتیں' گریبان چاک کر لیتیں اور تقریباً" نیم عریاں حالت میں اپنے دشمن کی طرف دوڑنا شروع کر دیتیں تھیں تاکہ اپنے مردوں کو غیرت دلائیں اور انہیں ڈٹ کر مقابلہ کرنے پر اکسائیں۔

اس دن احد کے میدان میں بھی ایسا ہی ہوا۔ قریش کی عورتوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے مرد مسلمانوں کے سامنے ہزیمت اٹھا رہے ہیں تو انہوں نے "عمرہ علقمہ" نامی بلند قامت عورت کی سرکردگی میں اپنے گیسو پریشان کر لئے اور اپنے کپڑے کچھ اس طرح پھاڑ لئے کہ انہیں تقریباً" عریاں کہا جا سکتا تھا۔

"عمرہ علقمہ" نے قریش کے مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے بانگ لگائی کہ "کیا ہوئی تمہاری غیرت؟ کہاں گئی تمہاری حمیت؟ اگر تم گنتی کے چند مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بھاگنے سے بہتر یہی ہے کہ مزاحمت کرو اور میدان جنگ میں عزت سے مر جاؤ کیونکہ جو شخص میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا جائے تو اس پر انگلی نہیں اٹھتی کیونکہ وہ اپنا فرض پورا کر چکا ہوتا ہے اور کوئی اسے سرزنش نہیں کرتا کہ تو نے فتح کیوں حاصل نہیں کی لیکن جو مرد اپنی جان کے خوف سے اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے سے بھاگ نکلے تو اسے چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جانا چاہئے اور عورتوں کی طرح بچے سنبھالنے اور کھانا پکانے کی مشق کرنی چاہئے۔ اے بزدلو! تم جاؤ گھروں میں بیٹھو اور گھر بار سنبھالو' ہم تمہاری جگہ میدان جنگ میں جا کر لڑتی ہیں۔"

اسلامی تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس دن مسلمانوں نے قریش کے نو علمبرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو سب کے سب قبیلہء عبدالدار سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کفار کا آخری علمبردار زمین پر گرا تو عمرہ علقمہ نے جھک کر اس کا پرچم اٹھایا اور اس کی تلوار تھام کر مسلمانوں پر جھپٹ پڑی۔ قریش کے مردوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کی غیرت جوش میں آ گئی اور وہ بھی پلٹ کر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے لگے۔

لشکر مکہ کا حملہ مسلمانوں کے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ بت پرستوں کو شکست فاش ہو چکی ہے اور وہ خود فتح سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ لہٰذا جب مسلمانوں پر حملہ ہوا تو وہ منظم صفوں میں نہیں تھے بلکہ جنگی غنائم حاصل کرنے کی دوڑ میں اپنی صفیں توڑ چکے تھے۔ تاہم انہوں نے قریش کو حملہ کرتے دیکھا تو چاہا کہ صفوں کی تشکیل نو کریں۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور جلد ہی بے ترتیبی و افراتفری کا شکار ہو گئے۔

دوسری طرف خالد بن ولید نے' جو اپنے دو سو گھڑ سواروں کی معیت میں دور کھڑا میدان جنگ کا نظارہ کر رہا تھا اور اس وقت تک میدان کارزار میں داخل نہیں ہوا تھا جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی صفیں تتر بتر ہو چکی ہیں اور قریش کے سپاہی بھی عورتوں کے غیرت دلانے پر بھاگنے کی بجائے مزاحمت کرنے لگے ہیں اور مسلمان سپاہی بھی ایک منظم و متحد فوج کی بجائے انفرادی طور پر لڑ رہے ہیں تو اس نے موقع غنیمت جانا اور گھاٹی سے گزر کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت عبداللہؓ بن جبیر اور ان کے گیارہ ساتھیوں نے خالد بن ولید کا راستہ روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور وہ بارہ کے بارہ افراد خالد بن ولید کے سپاہیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

خالد بن ولید اپنے گھڑ سواروں کے ہمراہ مسلمانوں کی پشت پر پہنچ گیا اور چونکہ سامنے سے قریش کے سپاہی بھی مزاحمت کر رہے تھے لہٰذا مسلمان دونوں طرف سے گھیرے میں آ گئے اور انہیں شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

دوسری طرف عمرہ علقمہ بھی پرچم اٹھائے قریش کے مردوں کو بڑھ چڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے اکسا رہی تھی اور دوسری خواتین بھی اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ قریش کے غلاموں میں ایک سیاہ فام غلام بھی تھا جس کا نام تھا "وحشی"۔ یہ شخص ابوسفیان کی بیوی ہندہ کے وعدے کے مطابق آزاد ہونے کے لالچ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں تھا تاکہ ان پر وار کر کے اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کر سکے۔ لیکن اس کا ہاتھ

پیغمبر اسلام ﷺ تک نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی وہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ یا حضرت علیؓ جیسے سرکردہ افراد پر وار کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ تاہم اس کے عوض اس نے پیغمبر ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کو ڈھونڈ نکالا اور اپنی مالکن کی ہدایت کے مطابق ان کی تاک میں بیٹھ گیا۔ حضرت حمزہؓ بڑی دلیری اور یکسوئی سے تلوار چلا رہے تھے۔ وحشی کو ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہو سکی یہاں تک کہ خالد بن ولید کی فوج عینین نامی ٹیلے سے گزر کر مسلمانوں کے عقب میں پہنچی اور ان پر حملہ آور ہو گئی۔ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ جو قریش کے سپاہیوں کا قلع قمع کرنے میں مصروف تھے واپس پلٹے تاکہ قریش کی پیش قدمی روک سکیں اور اسی اثنا میں وحشی نے جب یہ دیکھا کہ حضرت حمزہؓ کی پیٹھ اس کی طرف ہے تو اس نے موقع غنیمت جانا اور دبے قدموں سے حضرت حمزہؓ کے عقب میں پہنچ کر اپنا نیزہ اتنی قوت سے ان کی طرف پھینکا کہ نیزے کی نوک سینے کے پار ہو گئی۔ عم رسول ﷺ لڑکھڑا کر گرے اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ان کی روح پرواز کر گئی۔

جب ہندہ نے یہ سنا کہ حضرت حمزہؓ وحشی کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں تو اس نے اسی لحہ نہ صرف یہ کہ وحشی کو آزاد کر دیا بلکہ میدان جنگ میں کھڑے کھڑے اپنے کنگن اور ہار اتار کر اسے بخش دیئے اور بولی کہ میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تو حمزہ کو موت کے گھاٹ اتارے گا تو میں تیرے گلے سے طوق غلامی اتار دوں گی لیکن اب آزادی کے علاوہ یہ چیزیں بھی بطور انعام تجھے بخش رہی ہوں۔

خالد بن ولید کے ناگہاں حملے نے اسلامی لشکر میں شدید اضطراب پیدا کر دیا اور عام سپاہی سراسیمہ ہو کر متفرق ہونا شروع ہو گئے۔ البتہ کچھ لوگ جن میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ شامل تھے، حضرت محمد ﷺ کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور ایک محافظ سپاہ کے طور پر خالد بن ولید کے سپاہیوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ جگہ جہاں ہم کھڑے ہیں خالد بن ولید کے سواروں کی تیر رس میں ہے اور وہ لوگ بڑی آسانی سے ہمیں گھیرے میں لے

سکتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے آپ کو احد کے بالائی حصے تک پہنچا سکیں تو مشرکوں کے گھوڑے پہاڑ پر نہیں چڑھ سکیں گے اور ہم ان کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی بدنظمی پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے صفوں کو نہ توڑنے کی تاکید کی تھی اور خاص طور پر گھاٹی کی نگرانی کرنے والوں سے کہا تھا کہ صورتحال جیسی بھی ہو وہ اپنی جگہ پر قائم رہیں لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے آج میری باتوں پر عمل نہیں کیا لہٰذا میں نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ آج بھی جنگ بدر کی طرح ہمیں کامیابی سے نوازے۔ ماسوائے ان لوگوں کے جو رسول اللہ ﷺ کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھے بقیہ مسلمان عقب سے خالد بن ولید کے اچانک حملے اور سامنے سے قریش کے سپاہیوں کی شدید مزاحمت کے باعث جم کر نہ لڑ سکے اور بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے گنتی کے چند ساتھی خالد بن ولید کے سواروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ایسی جگہ پہنچ گئے جو گھڑ سواروں کی دسترس سے دور تھی کیونکہ گھوڑے پہاڑ پر چڑھنے سے قاصر تھے۔

قریش کے دو سپاہی ایک بڑے پتھر کے پیچھے کمین لگائے بیٹھے تھے اور منجنیق کے ذریعے مسلمانوں پر پتھر برسا رہے تھے۔ ان دو میں سے عبداللہ بن قمہ نامی شخص کا پھینکا ہوا پتھر رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر پڑا اور ان کا دندان مبارک شہید ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے پیغمبر اسلام ﷺ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے پیر پھسلنے کے باعث ایک گڑھے میں گر گئے اور شدید زخمی ہو گئے۔ اسی اثناء میں خالد بن ولید اور اس کے کچھ ساتھی گھوڑوں سے اتر کر پہاڑ پر چڑھنے لگے تاکہ پیغمبر ﷺ سمیت اسلام کے بچے کھچے سپاہیوں کا کام تمام کر ڈالیں۔ دوسری طرف پہاڑ کے نیچے سے خالد بن ولید کے بقیہ سپاہیوں نے مسلمانوں کو اپنے تیروں کی آماجگاہ بنانا شروع کر دیا..... اور یہ وہی لمحہ تھا کہ جب عبداللہ بن قمہ نے یہ دیکھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ پتھر سے زخمی ہونے کے بعد گڑھے میں گر گئے ہیں تو وہ تیزی سے پہاڑ سے نیچے اترا اور میدان جنگ میں پہنچ کر چیخ و پکار کرنے لگا: ”الا

ان محمداً قد قتل۔" اس ناگوار خبر نے ان اکا دکا مسلمانوں کے حوصلے بھی پست کر دیئے جو ابھی تک قریش کے سامنے مزاحمت کر رہے تھے۔ وہ لوگ اتنے مایوس ہوئے کہ ہتھیار پھینک کر واپس لوٹنے لگے۔

لیکن دوسری طرف صورتحال یہ تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ گڑھے میں گرے تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے انہیں سہارا دے کر باہر نکالا۔ حضرت علیؓ دوڑتے ہوئے گئے اور قریبی چشمے سے اپنی ڈھال میں پانی بھر لائے اور پیغمبر ﷺ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے۔ انہوں نے حضرت محمدؐ کے سر سے خود اتارا اور آپ کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ ابھی حضرت محمد ﷺ پوری طرح سنبھل نہ پائے تھے کہ خالد بن ولید اپنے سپاہیوں کی معیت میں مسلمانوں کے سر پر پہنچ گیا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ پہاڑ پر چڑھنے والوں میں خالد بن ولید شامل نہیں تھا۔ تاہم ان لوگوں کی تعداد جو گھوڑوں سے اتر کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے تھے ایک سو کے قریب بتائی جاتی ہے یعنی کفار کے ایک سو سپاہیوں نے اسلام کے بارہ یا ایک اور روایت کے مطابق چودہ سپاہیوں پر حملہ کر دیا جو بڑی جوانمردی اور جانفشانی سے اپنے پیغمبرؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی حکمت عملی' جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں شروع میں یہ تھی کہ فالانژ یعنی مخصوص جنگی آرائش (جس کی تفصیل جنگ بدر کے باب میں بیان ہو چکی ہے) کی صورت میں صف آرائی کریں تاکہ دشمن کسی طور بھی ان کی پشت پر نہ پہنچ سکے۔ لیکن احد کی بلندیوں پر صورتحال مختلف تھی۔ کیونکہ وہاں کی پستی و بالائی کسی شکل میں مخصوص صف آرائی کی اجازت نہیں دیتی تھی لہٰذا ان بارہ یا چودہ سپاہیوں میں سے چار افراد پیغمبر اسلام ﷺ کی حفاظت پر مامور ہوئے جبکہ بقیہ آٹھ یا دس سپاہی دشمن کے مقابلے میں ڈھال بن گئے۔ البتہ پیغمبر اسلام ﷺ کی حفاظت کرنے والے افراد بھی بدستور لڑ رہے تھے تاہم جنگ کی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے دور نہیں ہو سکتے تھے۔ چونکہ اگر وہ ان کے پاس سے ہٹ جاتے تو آپؐ کو خطرہ لاحق ہو جاتا کیونکہ

آپؐ مجروح بھی ہو چکے تھے۔

اس لمحہ پیغمبر اسلام ﷺ کی حفاظت کرنے والوں میں حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابودجانہؓ شامل تھے۔ یہ چاروں جنگجو بلا وقفہ تلوار چلا رہے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی تلوار کے مقابلے میں کفار کی کم از کم دس تلواریں ہوا میں لہراتی تھیں تاکہ ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر حضرت محمد ﷺ تک رسائی حاصل کرلیں لیکن یہ چاروں جانثار اپنے زخموں کی پرواہ کیے بغیر مسلسل تلوار چلا رہے تھے اور دشمنوں کے مقابلے میں دیوار بنے اپنے پیغمبرؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔

جنگ احد کی تاریخ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ مذکورہ چار افراد کے سروں پر آہنی خود تھے لیکن وہ زرہ پہنے بغیر لڑ رہے تھے۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب انسان زرہ پہنتا تھا تو بھاری بھرکم ہو جاتا ہے اور چابک دستی سے نہیں لڑ سکتا۔ خاص طور پر صحرائے عرب جیسے گرم علاقے میں زرہ پہن کر تلوار چلانا بہت دشوار کام ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے محافظوں کے بدن پر ان گنت زخموں کی تعداد سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ زرہ پہنے بغیر لڑ رہے تھے کیونکہ اگر وہ زرہ پہنے ہوتے تو اتنے بے شمار زخم نہ اٹھاتے۔

جنگ احد کا آغاز ماہ مارچ کے اوائل میں ہوا یعنی ابھی بہار کا موسم شروع نہیں ہوا تھا۔ جزیرۃ العرب میں موسم بہار ۲۱ مارچ کے بعد شروع ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مدینہ میں موسم سرما کے آخری دن اتنے گرم تھے کہ زرہ پہن کر لڑنا بہت تکلیف دہ اور دشوار نظر آتا تھا۔ بہر طور بت پرست یہ جان چکے تھے کہ اگر وہ ان چار افراد کو راستے سے ہٹا سکیں تو با آسانی پیغمبر اسلام ﷺ پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں لہٰذا انہوں نے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابودجانہؓ اور حضرت انسؓ پر غلبہ پانے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔

حضرت ابودجانہؓ جو اپنے بقیہ ساتھیوں کی طرح چابک دستی سے تلوار نہیں چلا سکتے

تھے بہت جلد تھکن کا شکار ہو گئے اور جب فرط خستگی سے ان کے بازو جواب دے گئے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے۔ چند ہی لمحوں میں قریش کے سپاہیوں نے اس "زندہ ڈھال" پر اتنے تیر برسائے کہ ابودجانہؓ کا سارا بدن کسی خار پشت کی طرح تیروں سے بھر گیا لیکن وہ خوش تھے کہ دشمن کے تیر ان کے بدن میں اتر رہے ہیں' رسولؐ اللہ کو نہیں لگ رہے! آخر کار حضرت ابودجانہؓ اپنے پیروں پر کھڑے نہ رہ سکے' لڑکھڑا کر گرے اور اگلے ہی لمحے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کے بعد حضرت انسؓ نے بھی اپنے نبیؐ کی حفاظت کرتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ حضرت انسؓ کے چہرے پر تلواروں اور نیزوں کے اتنے وار ہوئے تھے کہ جب ان کی میت کو دفنایا جا رہا تھا تو کوئی انہیں پہچان نہ سکا اور صرف ان کی بہن نے کانوں کی بناوٹ سے ان کی شناخت کی تھی۔

حضرت ابودجانہؓ اور حضرت انسؓ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے محافظوں کی تعداد صرف دو رہ گئی۔ ایک حضرت عمرؓ تھے اور دوسرے حضرت علیؓ۔ حضرت علیؓ سر سے پیر تک رنگ لہو سے ارغوانی ہو چکے تھے اور ان کے بدن کے ہر حصے سے خون ٹپک رہا تھا لیکن ایسی حالت میں بھی انہوں نے حضرت محمد ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ حضرت عمرؓ جو بلند قامت اور کشادہ شانوں کے مالک تھے' شدید زخمی ہونے کے باوجود بے محابا تلوار چلا رہے تھے اور لڑائی کے دوران اپنی گرجدار آواز میں نعرے بھی لگاتے تاکہ دوسرے مسلمانوں کی ہمت بڑھا سکیں اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کر سکیں۔

اسی اثنا میں حضرت محمد ﷺ کی طبیعت قدرے سنبھل گئی اور آپؐ نے حضرت سعدؓ بن وقاص کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور ان سے تیر و کمان لے کر دشمن کی طرف تیر اندازی شروع کر دی۔

گنتی کے ان مسلمانوں نے' جو بڑی جانکنی سے قریش کے ایک سو سپاہیوں کا مقابلہ کر رہے تھے یہ جان کر کہ حضرت محمد ﷺ کی طبیعت سنبھل گئی ہے اور وہ اپنی جگہ سے

اٹھ کر لڑائی میں بھی شامل ہو گئے ہیں تو انہیں اتنی خوشی حاصل ہوئی کہ وہ اپنی تھکن اور زخم یکسر بھول گئے اور گویا تازہ دم ہو کر بت پرستوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ انہوں نے بڑی تیزی سے رسول اللہ ﷺ کو اپنے حلقے میں لے لیا اور نئے سرے سے ایک فالانژ (دائرہ نما صف) کی شکل اختیار کر لی۔ پھر ان کی دائرہ نما صف ایک متحرک قلعے کی طرح آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور انہوں نے متحد ہو کر مشرکوں پر تابڑ توڑ حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کا حملہ اتنا شدید اور جان لیوا تھا کہ ایک سو افراد پر مشتمل لشکر کفار گنتی کے دس مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور ان کی شجاعت اور استقامت کے سامنے پسپائی کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

میرے (کونسٹن ویرژیل کے) خیال میں جنگ احد کا یہ حصہ اس جنگ کے بقیہ تمام واقعات سے زیادہ حیرت انگیز اور قابل توجہ ہے کیونکہ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سمیت دوسرے مسلمانوں کی شجاعت و بسالت اور پائیداری و استقامت اتنی زیادہ تھی کہ انہوں نے اپنے سے دس گنا بڑے لشکر کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

اگر پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھیوں کی تعداد چودہ مانی جائے تو حضرت ابودجانہؓ اور حضرت انسؓ کی شہادت کے بعد صرف بارہ افراد باقی رہ جاتے ہیں اور اگر ان کی تعداد بارہ مانی جائے تو ان میں سے دس افراد نے جنگی صف کی تشکیل نو کی اور حضرت محمد ﷺ کو اپنے حلقے میں لے کر ایسا زبردست اور ہمہ گیر حملہ کیا کہ ایک سو سپاہیوں پر مشتمل فوجی دستہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔

کفار کے ایک سو سپاہی مسلمانوں کے شدید دباؤ کی وجہ سے پیچھے ہٹنا شروع ہوئے تھے کیونکہ انہیں احساس ہو چلا تھا کہ اگر مزید رکے رہیں تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا لہٰذا انہوں نے عقب نشینی میں ہی عافیت سمجھی اور اس وقت گرچہ ان کا سپہ سالار خالد بن ولید جیسا ماہر جنگ انسان تھا لیکن اس کی حکمت عملی بھی نقش بر آب ہو گئی اور مسلمانوں کی

بے مثال دلیری اور شجاعت نے خالد بن ولید کے آزمودہ کار سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔
یہی وجہ ہے کہ لشکر مکہ کے سپہ سالار ابوسفیان نے جنگ احد کے خاتمے پر کہا تھا کہ میں نے ان لوگوں جیسا کسی کو نہیں پایا جو جنگ احد کے آخری لمحات میں محمد ﷺ کے گرد گھیرا ڈالے جان کی بازی لگا رہے تھے اور اسی طرح میں نے ہرگز ایسا منظر نہیں دیکھا کہ گنتی کے چند افراد کسی ایک شخص کی خاطر اتنی زیادہ وفاداری اور جانثاری کا مظاہرہ کریں اور اپنی شجاعت و دلیری کے بل بوتے پر جنگ کا نقشہ بدل ڈالیں۔
ابوسفیان کا یہ اعتراف اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بارہ یا دس افراد پر مشتمل مسلمانوں کے چھوٹے سے گروہ نے جنگ احد کے آخری لمحات میں جبکہ رسول اللہ ﷺ مجروح اور خستہ حال تھے اتنی ثابت قدمی اور مافوق العادت شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ ایک سو سپاہیوں کے مقابلے میں نہ صرف اپنے پیغمبرؐ کی حفاظت کی بلکہ دشمن کو میدان جنگ چھوڑ بھاگنے پر مجبور بھی کر دیا۔
جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے کہ جنگ احد مارچ کے درمیانی حصے میں شروع ہوئی تھی یعنی ابھی موسم بہار کا آغاز نہیں ہوا تھا اور دن زیادہ لمبے نہیں تھے لہٰذا جس لمحہ اسلام کے دلیروں نے اپنی مختصر نفری کے باوجود لشکر مکہ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تو اس وقت سورج احد کے مغربی پہاڑوں میں اتر رہا تھا اور رات پھیلتی جا رہی تھی۔ بنا بریں جنگ ختم ہو گئی اور لشکر مکہ نے بھی دوبارہ حملہ کرنے پر اصرار نہیں کیا۔
خاتمہ جنگ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت فاطمہؓ اور حضرت ام کلثومؓ اپنے والد کے پاس پہنچ گئیں۔ یہاں اسلامی مؤرخین نے ایک بار پھر واقعات کو ثبت و ضبط کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا ہے (یہ بات ایک یورپی مؤرخ یعنی کونسٹن دیرژیل کہہ رہا ہے) اور صحیح وقت اور جگہ کا نام ذکر کرنے میں بے توجہی کا مظاہرہ کیا ہے۔
ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ جب جنگ احد کا آغاز ہوا تو کچھ مسلمان خواتین سپاہ اسلام کے ہمراہ میدان جنگ تک آئی تھیں جن میں حضرت فاطمہؓ اور ام کلثومؓ بھی شامل تھیں لیکن

اسلامی تواریخ سے یہ نہیں پتا چلتا کہ جب اسلامی فوج انتشار کا شکار ہوئی تو یہ خواتین کہاں چلی گئی تھیں کہ خاتمہ جنگ کے بعد حضرت فاطمہؓ اور ام کلثومؓ دوبارہ اپنے والد کے پاس پہنچ گئیں۔

بہرحال جب حضرت فاطمہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے زخم باندھنا چاہے تو آپؐ نے حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کیا جو سرتاپا خون میں رنگے ہوئے تھے اور بولے کہ بیٹی جاؤ اور علیؓ کی مرہم پٹی کرو کہ مجھ سے زیادہ اسے تمہاری ضرورت ہے۔

جب اسلامی فوج کے طبیب اور جراح ابوعبیدہؓ نے حضرت علیؓ کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ ان کے بدن پر اسی (۸۰) کاری زخم لگے ہیں۔ ابوعبیدہؓ حیران ہو کر بولے: ''یا علیؓ! تمہیں تو سر سے پیر تک باندھنا پڑے گا اور تخت رواں پر ڈال کر مدینہ لے جانا پڑے گا کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک ایسا نہیں دیکھا کہ کسی انسان کو میدان جنگ میں اتنے گھاؤ لگے ہوں اور وہ پھر بھی لڑتا رہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ تم بری طرح زخمی ہونے کے باوجود کیسے لڑ رہے تھے۔''

دوسری طرف حضرت عمرؓ بن خطاب کے بدن پر تلواروں اور نیزوں کے اکیس گہرے زخم لگے اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے بھی بارہ کاری زخم اٹھائے لیکن ان میں سے کسی کو بھی اپنے زخموں کی پرواہ نہیں تھی بلکہ وہ اس بات خوش تھے کہ ان کے پیغمبرؐ زندہ سلامت ہیں۔

ابھی سورج پوری طرح نہیں ڈوبا تھا کہ ابوسفیان کی بیوی ہندہ میدان جنگ میں چل نکلی اور پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کے جنازے کی جستجو کرنے لگی۔ جنازہ ڈھونڈ نکالنے کے بعد اس نے ایک تیز دھار چاقو کی مدد سے حضرت حمزہؓ کا پیٹ اور سینہ چاک کیا اور ان کا جگر نکال کر چبانا شروع کر دیا۔ اسی بنا پر وہ درندہ صفت عورت اسلامی تاریخ میں ''ہندہ جگر خور'' کے نام سے مشہور ہے۔

ہندہ نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ صرف چبایا ہی نہیں بلکہ اس کا کچھ حصہ نگل بھی گئی۔

پھر اس نے ان کی ناک اور کان بھی کاٹ لئے۔ ہندہ جگر خور نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آس پاس پڑے مسلمانوں کے جنازوں پر بھی ٹوٹ پڑی اور ان کے کان اور ناک دھاگے میں پرو کر ہار بنایا اور اس ہار کو گلے میں ڈال کر وحشیانہ انداز میں ناچنے لگی۔

ہندہ کے علاوہ قریش کی ایک اور عورت "سلافہ بن سعد" بھی میدان جنگ میں داخل ہوئی اور مسلمانوں کے جنازوں میں کسی خاص جنازے کو تلاش کرنے لگی۔ اسے فی الواقع اس مسلمان سپاہی کا جنازہ درکار تھا جس نے جنگ بدر میں اس کے لڑکے کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس سفاک عورت نے بھی اپنا مطلوبہ جنازہ ڈھونڈ نکالا تو اس کا سر کاٹ کر لے گئی اور چنگھاڑتے ہوئے بولی: "میں اس سر کا گوشت و پوست جدا کر کے جمجمے کی ہڈی خشک کروں گی اور جب تک زندہ ہوں تو اسی میں پانی پیا کروں گی۔ آج کے بعد یہی سر میرے لئے پانی کا کٹورا ہوگا"۔

لشکر مکہ کے چلے جانے کے بعد حضرت محمد ﷺ کی نظر اپنے چچا کے جنازے پر پڑی اور آپؐ نے دیکھا کہ ان کا پیٹ اور سینہ چاک ہے، کلیجہ چبا کر پھینک دیا گیا ہے، کان اور ناک بھی کٹے ہوئے ہیں تو آپؐ بے انتہا متاثر اور خشمگین ہوئے اور بولے: "آئندہ لڑائی میں جو ہمارے اور مشرکوں کے درمیان ہوگی تو میں حمزہؓ کے مثلہ کئے جانے کے جواب میں قریش کے تیس افراد کے ساتھ ایسا ہی سلوک کروں گا۔" لیکن اسی لمحہ وحی نازل ہوئی جو آج سورۃ "النحل" کی ۱۲۶ ویں آیت کے طور پر قرآن میں شامل ہے۔

"اور اگر بدلہ لو تم پس بدلہ لو برابر اس چیز کے کہ ایذا دیئے گئے ہو اور البتہ اگر صبر کرو تو یہی بہتر ہے صبر کرنے والوں کے۔"

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا کہ "اے اللہ میں بدلہ لینے سے صرف نظر کرتا ہوں اور صبر اختیار کرتا ہوں"۔

اس سے پہلے کہ سورج پوری طرح افق میں ڈوبے تو ابوسفیان ایک بار پھر میدان جنگ میں داخل ہوا اور اس جگہ پہنچا جہاں مسلمانوں کے جنازے پڑے ہوئے تھے۔ اس

نے وہاں پہنچ کر بانگ لگائی "کیا محمد (ﷺ) زندہ ہیں؟؟"

ابو سفیان نے یہ سوال اس وجہ سے کیا تھا کہ اس دن میدان جنگ میں پیغمبر اسلام ﷺ کے شہید ہو جانے کی افواہ پھیل چکی تھی اور مسلمانوں کے انتشار و سراسیمگی کا سب سے بڑا سبب یہی افواہ تھی۔

پہلے یہ طے پایا کہ کوئی بھی ابو سفیان کا جواب نہ دے لیکن حضرت عمرؓ خاموش نہ رہ سکے اور گرجدار آواز میں بولے: "اللہ کا شکر کہ ہمارے رسولؐ زندہ ہیں"۔ ابو سفیان نے اونچی آواز میں کہا "پھر سنو کہ جنگ بدر میں تم لوگوں نے ہمارے ستر سپاہیوں اور سرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور آج ہم نے تمہارے ستر آدمیوں کو جاں بحق کر کے حساب برابر کر دیا ہے لیکن پھر بھی تم لوگوں کو ہمارے ساتھ پنجہ آزمائی کی خواہش ہو تو ہم اگلے سال بدر کے بازار میں تمہارے مقابلے کو تیار ہیں" یہ کہنے کے بعد ابو سفیان جو بہت مغرور دکھائی دیتا تھا تیزی سے میدان جنگ سے نکل گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

جب دشمن کے سپاہی میدان جنگ چھوڑ گئے تو وہ مسلمان بھی جو متفرق ہو گئے تھے واپس چلے آئے جس کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے جاں بحق ہونے والوں کو دفن کرنے کا حکم دیا۔

ایک بار پھر اسلامی مؤرخین نے یہ واضح نہیں کیا کہ آیا اسی وقت جب سورج غروب ہو چکا تھا تو مسلمانوں نے اموات کو دفن کرنا شروع کیا (ایسی صورت میں یہ کام رات گئے جاری رہا ہو گا یا ان کے دفن کا کام اگلے دن پر چھوڑ دیا) جنگ احد میں لشکر اسلام کو ستر سپاہیوں کا نقصان اٹھانا پڑا جن میں سے ۶۴ افراد انصار اور چھ مہاجرین سے تعلق رکھتے تھے۔ قریش کی عورتوں نے ان میں سے اکثر کے اعضائے بدن کاٹ لئے اور یادگار کے طور پر اپنے ہمراہ مکہ لے گئیں۔

بہرحال جنازوں کو احد کے دامن میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اعراب کا یہ دستور تھا کہ دفن کرنے سے پہلے میت کو غسل دیتے تھے تاکہ مطہر ہو سکے۔ لیکن اس دن پیغمبر

اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ لوگ میدان جنگ میں کفار کا مقابلہ کرتے ہوئے جاں بحق ہوئے ہیں "شہید" ہیں اور شہادت کے رتبے نے انہیں نہ صرف پاک و مطہر بنا دیا ہے بلکہ وہ سیدھے بہشت میں قدم رکھ چکے ہیں لہٰذا انہیں غسل دینے کی ضرورت نہیں اور یونہی دفنا دیئے جائیں۔

پھر حضرت محمد ﷺ نے ہر میت کے لئے نماز جنازہ ادا کی اور فرداً فرداً سب کے لئے دعا مانگی۔ جب سارے شہید سپرد خاک کر دیئے گئے تو رسول اللہؐ نے شہدا کی تعریف و تمجید کی اور ان کے مقام کو بے حد سراہا۔



"جنگی نقطہ نظر سے غزوہ احد کا مطالعہ"

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سپاہ اسلام کو جنگ احد میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور یہ بات جنگی نقطہ نظر سے قابل غور ہے۔

اگر ہم کسی ماہر جنگ سے شکست کے بارے میں گفتگو کریں اور اس سے پوچھیں کہ شکست کیا ہے اور اس کی علامات کیا ہوتی ہیں تو وہ ہمیں بتائے گا کہ اگر دشمن کی فوج کسی ملک پر قبضہ کر لے اور اس کی مسلح افواج کا صفایا کر دے تو وہ قوم جس کا ملک دشمن کے قبضے میں چلا جائے اور جس کی فوج تہس نہس ہو جائے تو ایسی قوم شکست خوردہ سمجھی جاتی ہے۔

لیکن اگر کوئی فوج کسی ملک پر قبضہ کر لے مگر وہاں کی افواج کا خاتمہ نہ کر سکے تو جس قوم کے پاس باقاعدہ فوج ہو تو وہ شکست خوردہ محسوب نہیں ہوتی بالکل ایسے ہی جیسا کہ دوسری جنگ عظیم میں اگرچہ جرمنی کی افواج نے روس کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا

لیکن چونکہ وہ لوگ روس کی فوج کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے لہٰذا انہیں فاتح نہیں کہا جا سکتا۔

بنابریں کسی قوم کو شکست خوردہ ماننے کے لئے دو شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس کی سرزمین پر دشمن کا مکمل قبضہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی فوج حملہ آور کے ہاتھوں مکمل طور پر نیست و نابود ہو جائے۔

جنگ احد میں مشرکوں کی فوج نہ تو مسلمانوں کی ریاست یعنی مدینہ پر قبضہ جما سکی اور نہ ہی سپاہ اسلام کا قلع قمع کر سکی۔ گو کہ اس دن مسلمان بدحواسی اور انتشار کا شکار ہو گئے لیکن اگلے دن دوبارہ منظم ہو گئے اور جیسا کہ ہم بعد ازاں بتائیں گے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ میدان احد سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے تو ایک باقاعدہ فوج کی قیادت کر رہے تھے۔

میں (کونسٹن ویرژیل) سمجھتا ہوں کہ سپاہ اسلام کو جنگ احد میں شکست نہیں ہوئی کیونکہ مشرکین مکہ نہ تو مدینہ پر قبضہ کر سکے اور نہ ہی سپاہ اسلام کو مٹانے میں کامیاب ہو سکے۔ البتہ مذکورہ لڑائی میں پیامبر اسلام ﷺ کو ایک ناگوار اور تلخ آزمائش سے ضرور گزرنا پڑا۔

قرآن مجید میں بھی مسلمانوں کی صورت حال کو مکمل شکست سے تعبیر نہیں کیا گیا اور سورۃ ال عمران کی ۱۳۹ ویں آیت میں جو جنگ احد کے بارے میں نازل ہوئی، مسلمانوں کو کچھ اس طرح تسلی دی گئی ہے۔

"سستی میں نہ پڑو اور غم نہ کھاؤ۔ جو ایمان والے ہیں وہ ضرور غالب آئیں گے"۔

اور اسی سورۃ کی ۱۴۰ ویں آیت میں ذکر ہوا ہے:

یعنی اگر (جنگ احد میں تمہیں زخم لگے ہیں) تو یہی زخم کفار کو بھی لگے ہیں (یعنی انہیں بھی نقصان اٹھانا پڑا ہے)

اسی طرح سورۃ ال عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے جنگ احد سے بھاگنے

والوں کو عفو و درگزر سے نوازا اور اپنے رسولؐ سے بھی کہا کہ وہ بھی ان لوگوں کو معاف کر دیں۔ مذکورہ آیت کا مفہوم درج ذیل ہے:

"پس رحمت الٰہی کے سبب آپؐ نے ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا اور اگر آپ سختی سے کام لیتے تو یقیناً وہ لوگ آپ سے دور ہو جاتے لہٰذا آپ بھی انہیں معاف کر دیں اور ان کے لئے طلب بخشش کریں اور کاموں میں ان سے مشورہ کریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے بالائے ذکر آیات کے بموجب اور ال عمران کی دوسری آیات کے مطابق جنگ احد کو مسلمانوں کی قطعی شکست نہیں جانا حتیٰ کہ میدان جنگ سے بھاگنے والوں کی بخشش کردی اور رسول اللہؐ کو بھی تاکید کی کہ آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔

اگر جنگ احد کو جدید دور کے ماہرین جنگ کے نظریئے کے مطابق پرکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں نہ صرف یہ کہ شکست نہیں ہوئی بلکہ فتح بھی حاصل ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے ابوسفیان کی عظیم فوج کو لوٹ جانے پر مجبور کر دیا اور خود آخری لمحے تک میدان جنگ میں کھڑے رہے۔ آخری دم تک میدان جنگ میں حاضر رہنا فتح و نصرت کی علامت ہے شکست کی نہیں۔ تاہم جنگی نقطہ نظر سے مشرکوں کی ناکامی کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

پہلی وجہ یہ کہ اہل مکہ مسلمانوں سے کھلے میدان میں لڑنے کا سوچ کر نہیں آئے تھے بلکہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو غافل گیر کر کے منافقوں اور یہودیوں کی مدد سے تہہ تیغ کر ڈالیں۔ چنانچہ جب انہوں نے مدینہ سے دائرہ وار گزرتے ہوئے دامن احد میں پڑاؤ ڈالا تو انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ مسلمان بھی شہر سے باہر نکل آئیں گے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور وہ اپنے زعم یہ سوچ رہے تھے کہ مسلمان قلت سپاہ کے باعث شہر سے نکلنے کی ہمت نہیں کریں گے اور ناچار مدینہ ہی میں رہتے ہوئے اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

مسلمانوں کا مدینہ سے نکلنا ابوسفیان اور اس کی فوج کے لئے حیرت کا سبب بنا پھر بھی انہیں توقع تھی کہ وہ منافقوں اور یہودیوں کی مدد سے مسلمانوں کو مٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے کہ منافقین نے میدان جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہودی بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے کہنے پر واپس چلے گئے اور یوں صرف سات سو کے قریب مسلمان باقی رہ گئے جنہیں تین ہزار کی فوج کا سامنا کرنا تھا۔ اگرچہ مشرکین کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن ان کا ایمان و اتحاد اتنا مضبوط اور غیر متزلزل تھا کہ انہوں نے جنگ شروع ہوتے ہی قشون مکہ پر غلبہ پا لیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اگر مسلمان سپاہی مال غنیمت کے حصول میں جلد بازی سے کام نہ لیتے اور رسول اللہ ﷺ کے دستورات پر کاربند رہتے ہوئے درے کو خالی نہ چھوڑتے اور دوسری طرف قریش کی عورتیں اپنے مردوں کو غیرت دلا کر واپس لوٹنے پر مجبور نہ کرتیں تو اس دن ابوسفیان کی فوج مکمل طور پر تہس نہس ہو چکی تھی۔

البتہ لشکر مکہ کی عدم کامیابی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی پھیل رہی تھی لہٰذا عربوں کے قدیم دستور کے مطابق رات کے وقت لڑائی سے ہاتھ کھینچ لئے جاتے تھے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ لشکر مکہ کے پاس ہماری آج کی اصطلاح میں خبر رسانی (Intellegence) کا نظام نہیں تھا اور وہ لوگ سپاہ اسلام کی صورت حال سے آگاہی نہیں حاصل کر سکتے تھے جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس حصول اطلاعات کا باقاعدہ نظام موجود تھا اور آپ دشمن کی نقل و حرکت اور ارادوں سے بروقت مطلع ہو جاتے تھے۔

اور چوتھی وجہ جو ابوسفیان کی مکمل ناکامی پر ختم ہوئی یہ تھی کہ اس شخص سے ایک خبط ہوا اور وہ بھی ایسا خبط جو ایک جنگی سپہ سالار کے لئے ناقابل بخشش ہے۔ اگر ابوسفیان اپنی فوج کو دامن کوہ سے واپس نہ لے جاتا تو اگلے دن سورج نکلنے پر تھکے ہارے اور

زخموں سے نڈھال مسلمانوں پر حملہ کر کے اپنی کامیابی کی توثیق کر سکتا تھا۔ تاہم ابوسفیان کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ میدان احد سے نکل کر "روحا" کے مقام پر پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اسے شدید پشیمانی کا احساس ہوا اور اس نے پلٹ کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری طرف پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس خبر رسانی کا باقاعدہ انتظام ہونے کا بڑا ثبوت یہی ہے کہ آپ کو فی الفور یہ علم ہو گیا کہ ابوسفیان پچھتاوے کا شکار ہو چکا ہے اور دوبارہ لڑائی شروع کرنا چاہتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جنگ احد کے خاتمے پر بکھرے ہوئے مسلمان دوبارہ جمع ہو گئے اور جب وہ لوگ مدینہ میں داخل ہوئے تو ان کی صفوف ایک باقاعدہ فوج کی طرح بالکل اسی طرح منظم تھیں جیسا کہ قبل از جنگ مدینہ سے نکلتے وقت تھیں۔

مسلمانوں کا لشکر جب مدینہ پہنچا تو حضرت محمد ﷺ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ مشرکین کی فوج واپس مدینہ آ رہی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا ارادہ اور ایمان اتنا قوی تھا کہ آپ ﷺ مکہ کی فوج کے پلٹ آنے پر ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے بلکہ مسلمانوں سے کہا کہ ہمیں لڑائی کے لئے ایک بار پھر مدینہ سے باہر نکلنا ہو گا۔

جنگ احد میں شرکت کرنے والے سارے مسلمان منجملہ وہ لوگ بھی جو زخمی ہو چکے تھے ایک بار پھر مشرکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ بن خطاب اور سعدؓ بن وقاص شدید زخمی ہونے کے باوجود لشکر اسلام کے ساتھ ہو لئے لیکن مسلمانوں کے طبیب خاص ابوعبیدہؓ نے حضرت علیؓ کو اٹھنے سے منع کر دیا اور کہا کہ اگر علیؓ بستر بیماری سے اٹھ کر چلیں گے تو مجھے یقین ہے کہ مدینہ کے گلی کوچوں سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے زخم اتنے گہرے اور خطرناک ہیں کہ انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اپنی سپاہ کے ہمراہ ابوسفیان کی پیشوائی اور گوشمالی کے لئے

"حمراء الاسد" نامی مقام پر پہنچ کر لشکر قریش کی آمد کا انتظار کرنے لگے لیکن ابوسفیان جو روحا نامی مقام سے مدینہ پلٹ جانے کا ارادہ رکھتا تھا ایک بار پھر شک و تردید کا شکار ہو گیا اور اس نے مدینہ کا رخ کرنے کی بجائے مکہ لوٹ جانے کو ترجیح دی اور مسلمانوں کو بھی جب یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ لشکر قریش واپس نہیں آئے گا تو وہ بھی مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

تاہم اس سے پہلے کہ سپاہ اسلام حمراء الاسد سے روانہ ہوتی "وحشی" یعنی وہی حبشی غلام جس نے اپنے نیزے سے عم رسولؐ حضرت حمزہؓ کو جاں بحق کیا تھا ابوسفیان کی فوج سے بھاگ نکلا اور مسلمانوں سے آملا۔ پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ اقرار کر لیا کہ ان کے چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل وہی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اس شخص کو سزا دی نہ انتقام کا نشانہ بنایا کیونکہ آپ ذاتی طور پر انتہائی مہربان اور سلیم القلب انسان تھے تاہم آپ نے اس حبشی غلام سے' جو آزاد ہو چکا تھا کہا کہ وہ کبھی بھی ان کی نظروں کے سامنے نہ آئے۔ لہٰذا اس دن کے بعد وحشی کبھی بھی حضرت محمد ﷺ کے سامنے نہیں آیا لیکن اس نے حضرت حمزہؓ کے خون کا خمیازہ ادا کرنے کے طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کے کچھ دشمنوں منجملہ مسیلمہ کذاب کو جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جنگ احد مسلمانوں کی نظر میں شکست کی بجائے ایک تلخ آزمائش کے روپ میں ظاہر ہوئی لیکن مدینہ کے یہودیوں نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ کو جنگ احد میں شکست فاش ہوئی ہے اور اگر آپ رسول اللہؐ ہوتے تو کبھی بھی شکست نہ کھاتے! اسی موقع پر ایک آیت نازل ہوئی جو آج قرآن کی تیسری سورہ ال عمران میں شامل ہے اور جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

"کافروں کا مقابلہ کرنا نبیوں کا قدیم دستور ہے۔ اس سے پہلے بھی نبیوں پر تکالیف گزری ہیں لیکن وہ یاس و ناامیدی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ استقامت و پائیداری کے بل

بوتے پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور اللہ پائیداری کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ اس شرانگیز افواہ کا خاتمہ ہو جائے کہ اگر آپؐ اللہ کے رسول ہوتے تو شکست نہ کھاتے۔ مندرجہ بالا آیت نے مسلمانوں کے دلوں کو بے حد تسکین پہنچائی اور ان کے حوصلے بلند ہو گئے لیکن یہودی لوگ اپنی ضد پر قائم رہے اور مسلمانوں کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں سے دستبردار نہیں ہوئے یہاں تک کہ ان کے ایک زراعت پیشہ قبیلے نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔



یہودیوں کی سازشیں، قریش کی قساوتیں

ہم نے پہلے بھی بتایا تھا کہ مدینہ کے یہودی تین بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جو اپنے پیشے کے اعتبار سے پہچانے جاتے تھے۔ ایک قبیلہ زرگروں کا تھا' دوسرا کاشتکاروں کا اور تیسرا دباغت کا کام کرنے والوں کا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کو جیسے ہی یہ علم ہوا کہ کاشتکاروں کا قبیلہ مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو آپؐ نے پیش قدمی کرتے ہوئے مذکورہ قبیلے کے رہائشی علاقے کو محاصرے میں لے لیا اور انہیں متنبہ کیا کہ تم لوگ میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہو لیکن تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنے ارادوں سے باز آ جاؤ اور مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے امن پسند شہریوں کی طرح مدینہ میں زندگی بسر کرو۔

یہودیوں نے امن و سلامتی کی تجویز مسترد کر دی اور کہنے لگے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ ایک جگہ نہیں رہ سکتے جس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ سے نکل جانے کا

حکم دیا اور کہا کہ تم لوگ بھی قبیلہ زرگر کی طرح مدینہ چھوڑ دو اور کسی اور جگہ سکونت اختیار کرلو۔

مدینہ کے کاشتکار یہودیوں نے ایسا ہی کیا تاہم پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی مہربان فطرت اور نرم مزاجی کے باعث یہودیوں کو سزا نہیں دی بلکہ یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ لوگ جو کچھ لے جا سکتے ہیں اپنے ہمراہ لے جائیں اور یہودی باشندے بھی اپنے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے تک اکھاڑ کر لے گئے۔ اس کے بعد مدینہ میں یہودیوں کا صرف ایک قبیلہ باقی رہ گیا جو وہی دباغوں کا قبیلہ تھا۔

زرگروں کا قبیلہ بہت پہلے مدینہ سے نکل چکا تھا اور ان کے کچھ خاندان مکہ میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ زراعت کاروں کا قبیلہ بھی مدینہ سے نکل کر دوسرے مقام پر چلا گیا تاہم ان کے بھی بعض خاندان مکہ کی طرف نکل گئے اور وہاں کی شہریت اختیار کرلی۔ مکہ میں رہنے والے یہودی باشندے جماعت قریش کو مسلمانوں کے خلاف مسلسل بھڑکاتے اور انہیں مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے پر اکساتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ یہودیوں کے دونوں قبیلوں نے مسلمانوں کی ریشہ کنی کرنے کے لئے مکہ کے مشرکوں سے عہد و پیمان باندھ لیا اور حالانکہ وہ لوگ یہودی تھے لیکن اس کے باوجود خانہ کعبہ میں حاضر ہوئے اور یہ قسم اٹھائی کہ اپنے عہد پر سختی سے قائم رہیں گے۔

آخرکار یہودیوں کے بھڑکانے اور شہ دلانے پر جماعت قریش نے یہ منادی کروا دی کہ جو بھی کسی مسلمان کو زندہ پکڑ لائے اور ہمارے حوالے کر دے تو اسے بہت بڑے انعام سے نوازا جائے گا۔ ہر زندہ مسلمان کے بدلے میں قریش نے جو انعام مقرر کیا وہ اتنا زیادہ تھا کہ صحرا میں رہنے والے بدو باشندے مسلمانوں کے کھوج میں رہنے لگے تاکہ انہیں پکڑ کر قریش کے حوالے کر دیں اور مقررہ انعام حاصل کرلیں۔

خود مکہ میں مسلمان نہیں تھے (یا کم از کم ظاہری طور پر نہیں تھے) جو قریش کے ہاتھ لگ سکتے لہٰذا مدینہ کے گرد و نواح میں رہنے والے بدوی قبائل نے بھاری انعام کے لالچ

میں مسلمانوں کو اغوا کر کے قریش کے حوالے کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

اتفاق سے اسی اثناء میں مدینہ کے جنوب میں رہنے والے ایک قبیلے نے حضرت محمد ﷺ سے درخواست کی کہ آپؐ کچھ مسلمانوں کو بغرض تبلیغ اسلام وہاں بھیج دیں تاکہ وہ لوگ بھی دینی تعلیمات سے آشنا ہو سکیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تیس افراد پر مشتمل ایک جماعت کو حضرت عمیرؓ بن ثابت جیسے نامور مبلغ کی قیادت میں مذکورہ قبیلے کی جانب روانہ کیا اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ جائیں اور قبیلے کے ارکان کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کریں۔

یہ لوگ مذکورہ قبیلے کی جانب روانہ ہو گئے لیکن راستے میں ان لوگوں کے نرغے میں آ گئے جو مسلمانوں کو پکڑنے کے لئے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اغوا کرنے والوں نے مسلمانوں کو زندہ پکڑنا چاہا لیکن انہوں نے مزاحمت کی اور آدم چوروں سے مقابلہ کرتے ہوئے سب کے سب ہلاک (شہید) ہو گئے ماسوائے تین افراد کے۔ بدوی لٹیروں نے ان تینوں کو گرفتار کر لیا اور مکہ کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ قریش کے بزرگوں سے انعام حاصل کر سکیں۔

ان تین مسلمانوں میں سے ایک جو یہ جانتا تھا کہ مکہ میں ہولناک اذیتوں اور دردناک شکنجوں کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن صحرائی لٹیروں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے دوبارہ پکڑنا چاہا لیکن جب اس بہادر انسان نے مزاحمت کی تو ان لوگوں نے اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے صحرا میں بکھیر دیئے۔ وہ مقام جہاں یہ مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہوا "الراجی" کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

صحرائی لٹیرے بقیہ دو مسلمانوں کو باندھ کر مکہ لے آئے لیکن وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے یرغمالیوں کو قریش کے حوالے کرنے اور مقررہ انعام لینے سے اجتناب کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مکہ کے سارے اعیان و اشراف ان دونوں کو حاصل کرنے کے لئے اتنے بے

قرار ہیں کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کر رہے ہیں تاکہ ان دو مسلمانوں کو شدید ترین شکنجے دے کر موت کے گھاٹ اتار دیں۔ یہی وجہ تھی کہ صحرائی لٹیروں نے انعام لینے کی بجائے دونوں مسلمانوں کو نیلام کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کر سکیں۔

سب سے زیادہ بولی لگانے والا شخص صفوان بن امیہ تھا جو ابوسفیان کے بعد مکہ کا سب سے برجستہ سردار مانا جاتا تھا۔ اس نے ان دو میں سے ایک مسلمان کو خرید لیا۔ صفوان بنؓ امیہ کے حصے میں آنے والا مسلمان، تبلیغی جماعت کے سربراہ حضرت عمیرؓ بن ثابت تھے جبکہ دوسرے مسلمان کو مکہ کے ایک اور سرکردہ شخص نے بھاری قیمت کے عوض خرید لیا۔

اہل مکہ نے جب یہ دیکھا کہ دو مالدار لوگ دو مسلمانوں کو خرید کر اپنے طور پر قتل کر کے لذت انتقام سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو انہوں نے اعتراض اٹھایا اور کہنے لگے کہ ہم نے بھی مسلمانوں کے ہاتھوں چوٹ کھائی ہے اور ہمارے عزیز و اقارب بھی جنگ بدر و احد میں مارے گئے ہیں لہٰذا ہمارا بھی حق بنتا ہے کہ ان دو مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا منظر دیکھیں لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ان دونوں کو مکہ کے بڑے میدان میں لے جا کر قتل کرو تاکہ ہم بھی یہ تماشا دیکھ سکیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں۔

صفوان بن امیہ نے اہل مکہ کا مطالبہ مان لیا اور "نستاس" نامی شخص سے کہا کہ وہ عمیرؓ بن ثابت کو مکہ کے بڑے میدان میں لے جا کر قتل کر دے۔ صفوان بن امیہ نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس مسلمان کے لئے بھاری رقم ادا کی ہے۔ لہٰذا مرنے کے بعد اس کے سر کی بولی لگاؤں گا تاکہ جو بھی چاہے اس کے سر کو خرید لے اور اس کاسہ سر کو پانی پینے کے لئے استعمال کرے۔ جنگ احد میں سلافہ بن سعد نامی عورت بھی ایک مسلمان سپاہی کا سر کاٹ کر لے گئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ میں اس سر کو پانی کے پیالے کے طور پر استعمال کروں گی۔

جب حضرت عمیرؓ بن ثابت اہل مکہ کے سامنے نستاس نامی شخص کے ہاتھوں قتل (شہید) کر دیئے گئے تو ان کے سر کی بولی لگنا شروع ہوئی اور وہاں پر موجود ایک شخص نے بولی جیت لی اور مقررہ رقم ادا کرنے کے بعد حضرت عمیرؓ کے جنازے کی طرف بڑھا۔ اس نے تلوار بھی برآمد کر لی تاکہ سر کاٹ کر لے جائے اور کاسہ سر کو پیالے کے طور پر استعمال کرے۔

لیکن جب وہ شخص جنازے کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حضرت عمیرؓ کی لاش سنہرے رنگ کی بے شمار بھڑوں سے اٹی پڑی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں دوسری بھڑیں جنازے کے اردگرد منڈلا رہی ہیں۔

حضرت عمیرؓ کا سر خریدنے والا سنہری بھڑوں کی فوج دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا کہ جب تاریکی چھا جائے گی تو یہ بھڑیں منتشر ہو جائیں گی اور میں اس وقت آؤں گا اور سر کاٹ کر لے جاؤں گا لیکن جیسا کہ اسلامی تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ جب شام ڈھلی اور رات کی تاریکی پھیلنے لگی تو اتنی موسلا دھار بارش ہوئی کہ سیلاب جاری ہو گیا اور پانی کا تیز دھارا حضرت عمیرؓ کی لاش کو بہا کر نامعلوم مقام پر لے گیا۔ اس طرح وہ دشمن اسلام اپنی خواہش کی تکمیل نہ کر سکا اور ان کے کاسہ سر میں پانی پینے کی حسرت دل میں ہی لے کر رہ گیا۔ البتہ دوسرے مسلمان کو اہل مکہ شہر سے باہر لے گئے اور "تنعیم" نامی مقام پر مصلوب کر دیا۔

یہاں ایک بار پھر ہمیں اسلامی مؤرخین کی بے توجہی اور سہل انگاری کا سامنا ہے کیونکہ انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ دوسرا مسلمان کون تھا یا اس کا نام کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ایمان کی راہ میں مصلوب ہونے والے پہلے مسلمان کا نام جاننا ضروری ہے اور تاریخی نقطہ نظر سے ہمیں اسے ضرور پہنچانا چاہئے (یہ الفاظ کونسٹن ویرژیل کے ہیں)

بہرحال اس گمنام مسلمان کے مصلوب ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے صلیب کو زمین پر بچھایا گیا پھر اس پر اللہ اور رسولؐ کے نام لیوا کو پیٹھ کے بل صلیب پر لٹا کر اس کے

دونوں ہاتھوں کو لمبی لمبی کیلوں سے صلیب کے دونوں بازوؤں پر ٹھونک دیا گیا لیکن شدید درد کے باوجود اس باایمان انسان کی زبان پر صرف یہی کلمات جاری تھے "لا الہ الا اللہ"۔

جب دونوں ہاتھ صلیب پر ٹھونک دیئے گئے تو دونوں پیروں کو آپس میں لپیٹ کر ایک ضخیم اور طویل میخ کے ذریعے صلیب کے قائمہ پر ٹھونک دیا گیا۔ پھر صلیب کو کھڑا کیا گیا جس کے بعد وہاں موجود عورتوں اور بچوں نے مصلوب پر پتھر برسانا شروع کر دیئے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں نیزے تھے وہ اس کے بدن میں نیزے بھی چبھونے لگے۔

اہل مکہ نے مسلمانوں کو مصلوب کرنے کا طریقہ یہودیوں سے سیکھا اور اس کے بعد جو مسلمان بھی ان کے ہتھے چڑھتا تو وہ اسے بلا دریغ صلیب پر چڑھا دیتے اور پھر پتھراؤ شروع کر دیتے تھے۔

سن ۶۲۵ء جون کے مہینے (۳ھ) میں چالیس افراد پر مشتمل مسلمانوں کا ایک دستہ مدینہ سے ایک صحرائی قبیلے کی طرف روانہ ہوا تاکہ انہیں دعوت اسلام دے سکے لیکن "معونہ" نامی کنوئیں کے پاس کچھ بدوی باشندوں نے ان پر حملہ کر دیا اور چونکہ مسلمان جانتے تھے کہ اگر ان لوگوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے تو مکہ میں خوفناک اذیتوں کے بعد قتل کر دیئے جائیں گے لہٰذا انہوں نے آخری دم تک مزاحمت کی اور سب کے سب شہید ہو گئے لیکن صحرائی لٹیروں کے ہاتھوں گرفتار نہ ہوئے۔



رسول اللہؐ کے خلاف قریش کی نئی چال

جنگ احد کے خاتمے پر ابوسفیان نے مسلمانوں کو للکارا تھا کہ اگر تم لوگ ہم سے دوبارہ مقابلہ کرنے کی خواہش رکھتے ہو تو اگلے سال بدر کے بازار میں ہم تمہارا انتظار کریں گے۔

بدر کا بازار ہر سال ایک ہفتے کے لئے منعقد ہوتا تھا لہٰذا اگلے سال یعنی ۶۲۶ء اپریل میں حضرت محمد ﷺ ایک ہزار پانچ سو مسلمان سپاہیوں کے ہمراہ بازار بدر میں پہنچ گئے۔ اس مرتبہ ان کی سپاہ میں پچاس گھوڑے بھی شامل تھے جبکہ جنگ احد میں مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے موجود تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ درحقیقت ابوسفیان کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ مسلمان اس کی طاقت اور فوجی برتری سے قطعاً ہراساں نہیں اور وہ جب بھی اور جہاں بھی چاہے مسلمان اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن ابوسفیان جو دو ہزار جنگجو سپاہیوں کے ہمراہ بدر کے

بازار میں پہنچا تھا مسلمانوں سے ٹکرانے کی جرات نہ کر سکا اور یہ بہانہ بنا کر واپس چلا گیا کہ اس مرتبہ خشک سالی کے باعث بدر اور اس کے گرد و نواح میں اونٹوں کے لئے چارہ دستیاب نہیں ہے۔

ابوسفیان کا جنگ سے گریز کرنا سیاسی طور پر مسلمانوں کے بہت فائدے میں رہا کیونکہ سب لوگ یہ جان گئے کہ ابوسفیان فوجی برتری کے باوجود مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں کی ساکھ بڑھی اور انہوں نے بدر کے بازار میں تجارت سے بھی کافی منافع حاصل کیا۔

دوسری جانب قریش بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے مدینہ کو سیاسی طور پر محاصرے میں لینے کی سازشیں شروع کر دیں۔ مکہ کے قریش جو مدینہ کے جنوب میں چار سو کلو میٹر کے فاصلے پر رہتے تھے خیبر کے یہودیوں سے جنگی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خیبر، مدینہ کے شمال میں دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایسا شہر تھا جہاں صرف یہودی رہتے تھے اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا قبیلہ وہاں زندگی بسر نہیں کرتا تھا۔

قبیلہ قریش نے نہ صرف خیبر کے یہودیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا بلکہ بنی فزارہ اور غطفان نامی قبیلوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور اپنے ساتھ متحد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

بنی فزارہ اور غطفان نامی قبائل مدینہ کے شمالی صحرا میں سکونت پذیر تھے اور نہ صرف یہ کہ جماعت قریش نے ان سے رابطہ برقرار کیا اور انہیں اپنا اتحادی بنا لیا بلکہ خیبر کے یہودیوں نے بھی ان لوگوں سے مذاکرات انجام دیئے اور یہ طے پایا کہ اس سال کھجوروں کی ساری فصل قبیلہ غطفان اور بنی فزارہ کو دے دی جائے اور اس کے بدلے میں وہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف محاذ آرائی میں یہودیوں اور قریش کا ساتھ نبھائیں۔

قبائل غطفان اور بنی فزارہ نے مذکورہ پیشکش قبول کر لی اور اس طرح مکہ کے قریش، خیبر کے یہودیوں اور ان دو قبیلوں کے درمیان ایک معاہدہ منعقد ہوا جس کا مقصد مسلمانوں کو تہس نہس کرنا یا کم از کم انہیں مزید پنپنے سے روکنے کا تھا۔

مدینہ کے مشرق میں ایک قبیلہ آباد تھا جو "بنو سلیم" کے نام سے مشہور تھا۔ جماعت قریش نے بھی اس قبیلے کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس کے علاوہ دو اور قبیلے جن کا نام کنان اور ثاقف تھا قریش کے اتحادی بن گئے اور یوں مدینہ سیاسی نقطہ نظر سے اسلام دشمن طاقت کے نرغے میں آ گیا اور بہت جلد یہ سیاسی محاصرہ ایک مکمل اقتصادی ناکہ بندی میں بدل گیا کیونکہ مدینہ کے تجارتی قافلے نہ تو شمال کی طرف جا سکتے تھے نہ مشرق کی جانب اور نہ ہی جنوب کا رخ اختیار کر سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شمال میں بنی فزارہ اور غطفان کے بدوی قبائل ان کا راستہ روک لیتے اور جنوب میں خود قریش اور ان کے اتحادی قبیلے کنان و ثاقف مسلمانوں کی راہ میں حائل ہو جاتے اور مشرق میں بنو سلیم نامی قبیلہ مدینہ کے کاروانوں کی ناکہ بندی کر دیتا۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز جس نے محاصرے کی تکمیل کی بلکہ رہی سہی کسر پوری کر دی یہ تھی شام کی سرحد کے نزدیک (البتہ جزیرۃ العرب ہی کی سرزمین میں) ایک شہر ایسا تھا جو فی الواقع شام اور بین النہرین کو جانے والے تمام تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا یعنی مذکورہ ممالک کو جانے والے جزیرۃ العرب کے سارے قافلے اسی شہر سے گزرنے پر مجبور تھے۔ مذکورہ شہر کا نام "دومتہ الجندل" تھا۔

مذکورہ شہر کے حکمران نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ آج کے بعد ان کے قافلوں کو دومتہ الجندل سے گزرنے کی اجازت نہیں ہو گی اس طرح مسلمان چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں آ گئے چونکہ شام اور بین النہرین کی طرف جانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا جو مشرکوں اور یہودیوں کی سازشوں سے بالکل مسدود ہو گیا۔ اس صورت حال نے پیغمبر اسلام ﷺ اور دوسرے عام مسلمانوں کو بہت متاثر کیا گو کہ مدینہ میں

بارشیں ہونے کی وجہ سے شجر کاری اور کھیتی باڑی کثرت سے ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود مدینہ کے شہری اپنی تمام ضروریات زندگی مقامی وسائل سے پوری نہیں کر سکتے لہٰذا مجبور تھے کہ تجارت کے ذریعے شام اور بین النہرین سے اشیائے ضرورت درآمد کریں۔

حضرت محمد ﷺ گو کہ مدینہ کی اقتصادی ناکہ بندی پر بہت متفکر تھے لیکن چونکہ اللہ پر توکل رکھتے تھے لہٰذا آپ کو یہ امید تھی کہ حالات میں بہتری پیدا ہو جائے گی اور مسلمان اس کڑی آزمائش میں بھی سرخرو ہوں گے۔

ہم یورپ والے "توکل" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تھے اور اپنی جگہ سے ہلتے تک نہیں بلکہ آسمان کی طرف منہ کھولے یہ انتظار کرتے رہتے ہیں کہ شاید کوئی لقمہ کوئی نوالہ خود بخود ان کے منہ میں آگرے۔

حالانکہ ایسا ہرگز نہیں بلکہ جو مسلمان اللہ پر توکل رکھتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہتے بلکہ اپنی طرف سے پوری سعی و کوشش کرتے ہیں اور کبھی بھی جہد مسلسل سے دستبردار نہیں ہوتے البتہ جدوجہد کے دوران وہ لوگ اللہ پر بھی "توکل" رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک باایمان مسلمان دشوار ترین حالات میں بھی ناامید نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی مدد و استعانت کا طالب رہتا ہے تاکہ مشکلات پر قابو پا سکے۔

جب مدینہ کی سیاسی اور اقتصادی ناکہ بندی مکمل ہو گئی تو قریش نے اپنے اتحادیوں اور جملہ منافقوں کے سربراہ عبداللہ بن ابی کے ساتھ مل کر پیغمبر اسلام ﷺ اور عام مسلمانوں کے خلاف ایک نئی چال چلنے کا منصوبہ بنایا۔ مختصر طور پر ان کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی بہانے سے حضرت محمد ﷺ کو مدینے سے باہر لے جایا جائے اور مسلمان مدینے میں اکیلے رہ جائیں اور جیسے ہی رسول اللہ ﷺ مدینہ سے دور ہوں تو وہ لوگ اچانک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں اور ان کا قتل عام کر ڈالیں۔

دریائے احمر کے ساحلی کنارے پر ایک قبیلہ رہتا تھا جس کا نام بنو مصطلق تھا۔ اس

قبیلے کا سربراہ حرث (یا حارث) کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ جماعت قریش نے مذکورہ قبیلے کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور ان کی شہ پر حارث نے بھی مدینے پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

مسلمانوں کے پیشوا حضرت محمد ﷺ کو اپنے خصوصی ذرائع سے جب یہ علم ہوا کہ بنو مصطلق مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو آپؐ نے پیش دستی کرنے اور خود اس قبیلے کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علاوہ ازیں مدینہ سے روانگی کے وقت آپؐ نے عبداللہ بن ابی کو یہ پیشکش کی کہ وہ مسلمانوں کے ایک چھوٹے گروہ کی قیادت سنبھالے اور ان کے ساتھ جنگی سفر پر چلنے کو تیار ہو جائے۔

عبداللہ بن ابی جو منافقوں کا سربراہ تھا اور درپردہ مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کی سوچ رہا تھا رسول اللہ ﷺ کی پیشکش مسترد نہ کر سکا اور بادل نخواستہ ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

حضرت محمد ﷺ، عبداللہ بن ابی کو اس بہانے کہ وہ ایک گروہ کی قیادت سنبھالے اپنے ہمراہ محاذ جنگ پر لے گئے اور اس طرح منافقوں کی جماعت مدینہ میں بے سرپرست رہ گئی۔ اس حکمت عملی کا دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حضرت محمد ﷺ کی غیر موجودگی میں مدینہ پر حملہ کرنے کا قریش اور یہودیوں کا منصوبہ بھی مکمل طور پر نقش بر آب ہو گیا۔

اس جنگی سفر میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کی کل نفری تیس افراد سے زیادہ نہیں بنتی جن میں دس افراد مہاجر تھے اور بیس انصار سے تعلق رکھتے تھے جبکہ بنو مصطلق کا لشکر دو سو سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ مدینہ کے مغرب میں آٹھ منزل کے فاصلے پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا اور اگرچہ بنو مصطلق کے سپاہیوں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں سات گنا کے قریب تھی لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اس قبیلے کے دس افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر پورے کا پورا قبیلہ مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو گیا۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو صرف ایک انسانی جان کا نقصان اٹھانا پڑا۔

قبیلہ بنو مصطلق مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کرنے سے پہلے قریش کا فرمانبردار تھا یا یوں کہئے کہ وہ لوگ مسلمانوں کو مٹانے کے لئے قریش کے ہم دوش بن چکے تھے اور اسی بنا پر وہ لوگ مسلمانوں کی نظر میں "حربی کافر" تھے یعنی وہ کفار جو دیدہ دانستہ اسلام کا مقابلہ کریں لہٰذا اس قبیلے کے تمام مرد اور عورتیں مسلمانوں کی غلامی اور کنیزی میں آ گئے جن میں قبیلے کا سربراہ حارث بھی شامل تھا۔

تمام اسراء کو عربوں کے دستور کے مطابق مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا اور قبیلے کے سربراہ کی بیٹی "برہ" پیغمبر اسلامؐ کے حصے میں آئیں۔ برہ ایک بیوہ عورت تھیں۔ اسیر ہونے کے بعد حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچیں اور بولیں کہ میں نے سنا ہے آپ رسول اللہ ہیں اور ایک عادل و منصف انسان بھی لہٰذا اب جبکہ میں آپ کے ہاتھوں اسیر ہو چکی ہوں تو خدارا کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ میں پھر سے آزاد ہو جاؤں۔

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ ہم نے تمہیں جبر و تشدد سے اسیر نہیں کیا بلکہ تم اپنے باپ کے منفی رویئے کی وجہ سے گرفتار ہوئی ہو۔ اگر تمہارا باپ مسلمانوں سے دشمنی مول نہ لیتا اور ہم پر حملہ کرنے کی نہ سوچتا تو آج نہ خود گرفتار ہوتا نہ تم مجھ سے یہ چاہتیں کہ میں تمہیں آزاد ہونے کی تدبیر بتاؤں۔

برہ بے بسی کے عالم میں رو پڑیں اور بولیں کہ میں ہرگز کنیز نہیں تھی اور میں نے کبھی بھی کنیزی نہیں کی اور نہ ہی آئندہ ایسا کر سکوں گی۔

یہ صورتحال دیکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کچھ دیر سوچوں میں ڈوبے رہے پھر برہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے "کیا تم رسول اللہ کی زوجیت میں آنا پسند کروں گی؟"

جو لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کے آس پاس کھڑے تھے یہ بات سن کر حیران رہ گئے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اس وصلت میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ بنو مصطلق کے سربراہ کی بیوہ بیٹی نے حامی بھر لی اور اگلے ہی لمحے صیغہ عقد جاری ہو گیا اور یوں مسلمانوں کی

اسارت میں آنے والی خاتون حرم رسول اللہ ﷺ میں داخل ہو گئیں اور یہ وہی خاتون ہیں جو ازواج مطہرات میں جویریہؓ بنت حارث کے نام سے پہچانی جاتی ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بوقت نکاح آپ کا نام تبدیل کر کے جویریہؓ رکھ دیا تھا۔

وضاحت (اسلامی تواریخ میں آیا ہے کہ حضرت جویریہؓ غزوہ مریسیع میں اسیر ہو کر آئی تھیں۔ یہ وہی لڑائی ہے جس کا ذکر بالائی سطور میں ہو چکا ہے۔ حضرت جویریہؓ کا پہلا نکاح اپنے قبیلے کے مسافع بن صفان نامی شخص سے ہوا تھا۔ بنو مصطلق پر مسلمانوں کے غلبہ پانے کے بعد پہلے حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصے میں آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی خاندانی حیثیت کے پیش نظران کا فدیہ بذات خود ادا کر کے آزاد کر دیا اور پھر اپنے نکاح میں لے لیا۔ خلیل)

بہرحال اس ازدواج کے بعد عام مسلمانوں کی توجہ اس بات پر مبذول ہوئی کہ آج کے بعد حضرت جویریہؓ کے والد پیغمبر اسلام ﷺ کے سسر کہلائیں گے اور انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سسر کو ایک غلام یا قیدی کی حیثیت میں اپنے پاس رکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ حارث کے مالک نے اعلان کیا کہ چونکہ یہ ہمارے رسول ﷺ کے سسر بن چکے ہیں لہٰذا میں انہیں آزاد کرتا ہوں۔

لیکن جزیرۃ العرب میں ایک قبیلے کے سارے ارکان آپس میں خونی رشتوں میں منسلک ہوتے تھے اور فی الواقع ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا وہ تمام لوگ جو اس دن مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے حضرت جویریہؓ کی نسبت سے رسول گرامی کے قریبی رشتہ دار کہلائے اور واضح رہے کہ مسلمان ان لوگوں کو اپنا غلام یا کنیز بنا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے مسلمانوں نے بھی بنو مصطلق کے تمام افراد کو جنہیں وہ اپنا قیدی بنا چکے تھے بخوشی آزاد کر دیا۔

قبیلہ بنو مصطلق کے ارکان نے مسلمانوں کی جوانمردی اور عاطفت دیکھی تو وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ پہلے رئیس قبیلہ نے قبول اسلام کیا پھر قبیلے کے دوسرے افراد

حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد قبیلہ مصطلق اسلام کے وفادار قبائل میں شامل ہو گیا اور اس قبیلے کے ارکان نے مختلف جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

جب بنو مصطلق کے تمام مرد اور عورتیں مسلمان ہو گئے تو تب کہیں جاکر عام مسلمان یہ سمجھ سکے کہ حضرت محمد ﷺ نے حضرت جویریہؓ سے جو ازدواجی رشتہ برقرار کیا ہے تو اس کا مقصد کیا تھا۔ فی الواقع آپؐ نے اس تعلق کی بنا پر ایک مشرک اور اسلام دشمن قبیلے کو نہ صرف یہ کہ اسلام کا حامی بنا لیا بلکہ اسلام کی ترقی و ترویج میں ایک منزل اور آگے بڑھ گئے۔

دوسری طرف منافقوں کے سربراہ عبداللہ بن ابی نے جو طوعا" کرہا" مدینہ سے نکل کر مسلمانوں کے ہمراہ چلا آیا تھا جب مسلمانوں کی یہ کامیابی دیکھی اور مشاہدہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کس طرح ایک اسلام دشمن قبیلے کو مسلمان بنا لیا ہے تو اس کے دل میں آگ لگ گئی اور وہ حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ عہد کر لیا کہ ایک نئی چال کے ذریعے مسلمانوں میں نفاق کا بیج بو کر انہیں آپس میں الجھائے رکھے تاکہ پیغمبر اسلام ﷺ اتنی جلدی مدینہ واپس نہ جا سکیں اور اس طرح اسلام دشمن عناصر کو مدینہ پر حملہ کرنے کی مزید فرصت حاصل ہو جائے۔ ہم نے گزشتہ سطور میں بتایا تھا کہ قریش نے اپنے اتحادیوں اور عبداللہ بن ابی کی موافقت سے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جیسے ہی رسول اللہ ﷺ مدینہ سے دور ہوں تو وہ مدینہ کے مسلمان باشندوں پر حملہ آور ہو جائیں۔

بہرحال عبداللہ بن ابی نے اپنی فتنہ انگیزی کا آغاز اس طرح کیا کہ وہ پہلے سپاہ اسلام کے ساتھ آنے والے مہاجرین کے پاس پہنچا اور انہیں علیحدہ بلا کر رازداری کے لہجے میں کہنے لگا "دیکھا تم نے! رسول اللہ (ﷺ) نے کس طرح تم لوگوں کو تمہارے حق سے محروم کر دیا ہے"۔

مہاجرین نے پوچھا "رسول اللہ (ﷺ) نے ہمیں کون سے حق سے محروم کر

دیا ہے؟"

عبداللہ بن ابی دلسوزی کے انداز میں بولے "بھائیو! تم لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ سے نکلے، ایک کٹھن سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے یہاں تک پہنچے اور اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر اس امید پر بنو مصطلق سے لڑائی کی کہ تھوڑا بہت مال غنیمت حاصل کر سکو لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے قبیلے کے سربراہ سے ناطہ جوڑ لیا اور تم لوگ بغیر کچھ لئے دیئے اپنے قیدی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور اب جبکہ مدینہ واپس جا رہے ہو تو تمہارے ہاتھ بالکل خالی ہیں اور تمہیں اس جانفشانی سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا"۔

مہاجرین میں وسوسہ ڈالنے کے بعد عبداللہ بن ابی انصار کے پاس پہنچا اور انہیں ایک جگہ اکٹھا کرکے ہمدردی جتاتے ہوئے کہنے لگا "ویسے اس مرتبہ اتنے جان جوکھوں کے سفر میں تم لوگ گھاٹے میں رہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے؟"

انصار نے حیران ہو کر پوچھا "دھوکا؟ کیسا دھوکا؟"

عبداللہ بن ابی نے جواب دیا "کیا یہ دھوکا نہیں ہے کہ تم لوگ مال غنیمت سے محروم کر دیئے گئے ہو۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے اپنے غلام اور کنیز کیونکر رہا کر دیئے۔ کیا تم لوگوں نے انہیں حاصل کرنے کے لئے اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالی تھی۔ تمہیں کیا جو رسول اللہ ﷺ نے حارث سے ناطہ جوڑ لیا ہے تم لوگ جنگی غنائم سے کیوں محروم رہو؟"

انصار نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت جویریہؓ کے ازدواجی رشتے نے اسلام کو وسعت بخشی ہے اور ایک پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا ہے لہٰذا ہمیں اس بات کی کوئی شکایت نہیں کہ ہم مال غنیمت سے کیوں محروم رہ گئے ہیں بلکہ ہم تو اس بارے میں سوچتے تک نہیں کیونکہ ہم نے دنیوی مال و متاع کے لئے نہیں بلکہ اسلام کی خاطر جانفشانی کی ہے۔

منافقوں کے سرغنہ عبداللہ بن ابی نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کا حربہ کارگر نہیں ہوا تو اس نے مسلمانوں کے دو گروہوں انصار اور مہاجرین میں پھوٹ ڈالنے کا منصوبہ بنایا اور اسی غرض سے مہاجرین کے پاس پہنچا اور ان سے ایسی من گھڑت اور بے سروپا باتیں کرنے لگا کہ جن سے مہاجرین کے دلوں انصار کے بارے میں بدگمانیاں اور شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔

عبداللہ بن ابی کی انہی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں نزدیک تھا کہ مسلمانوں کی مختصر سی سپاہ میں انتشار پھیل جائے اور وہ ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو جائیں کہ عبداللہ بن ابی کے جوان بیٹے نے جو اس سفر میں شریک تھا رسول اللہ ﷺ کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا اور بولا کہ اگر فوری طور پر کوئی چارہ اندیشی نہیں ہوئی تو مسلمانوں کی تلواریں ایک دوسرے کے خلاف میان سے نکل آئیں گی اور برادر کشی شروع ہو جائے گی۔

پیامبر اسلام ﷺ نے اپنے تدبر اور نفوذ کلام سے مسلمانوں میں پھیلی ہوئی کشیدگی پر قابو پایا اور پھر فوری طور پر مدینہ واپس چلنے کا حکم جاری کر دیا۔ ضمناً آپ نے یہ بھی تاکید کی کہ جتنا ممکن ہو سکے تیز رفتاری سے راہ پیمائی کی جائے کیونکہ آپؐ بخوبی جانتے تھے کہ فرصت اور بیکاری دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو واہی خیالات اور بے ہودہ احساسات میں الجھائے رکھتی ہیں۔

راستے میں عبداللہ بن ابی کا بیٹا حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچا اور بولا "یا رسول اللہ (ﷺ) جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرا باپ مسلمانوں کو آپ سے بدظن کر کے نعوذ باللہ آپ کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا اور چونکہ اس نے آپ کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی ہے تو میرے خیال میں اس کی کم سے کم سزا موت ہے اور اگر آپ حکم کریں تو میں اپنے ہاتھوں سے یہ سزا دینے کو تیار ہوں۔ گو کہ وہ میرا باپ ہے لیکن جب میں نے یہ جان لیا کہ وہ میرے آقا' میرے رسولؐ کے خلاف سازشیں کر رہا ہے اور یہاں

تک کہ ان کی جان کے درپے ہے تو میرے خیال میں اس کی سزا موت ہے اور آپ جب بھی حکم کریں تو میں اس کا سر آپ کے قدموں میں لا ڈالوں گا۔

پیامبر اسلام ﷺ' عبداللہ بن ابی کے جوان بیٹے کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے کیونکہ اس کی باتوں میں صداقت' خلوص نیت اور رسول اللہ ﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت پائی جاتی تھی لیکن آپؐ نے جواب دیا کہ میں تمہارے باپ کو قتل کرنے کا حکم صادر نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی یہ چاہوں گا کہ وہ کسی اور طریقے سے ہلاک ہو بلکہ میری یہ خواہش ہے کہ وہ زندہ سلامت رہے اور ہمارے ساتھ زندگی بسر کرے شاید اللہ اسے ہدایت کی راہ دکھا دے۔

اگرچہ حضرت محمد ﷺ یہ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ابی خیانت کا مرتکب ہوا ہے لیکن آپؐ نے اس کی موت کا حکم جاری نہیں کیا کیونکہ آپ فطری طور پر انتہائی مہربان' اعلیٰ ظرف اور رؤف القلب انسان تھے اور اپنے دشمنوں سے ہرگز انتقام نہیں لیتے تھے۔

لیکن رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی حق شناس نہیں تھا۔ گرچہ رسول اللہ ﷺ نے اسے عفو و درگزر سے نوازا اور اس کی جان بخش دی لیکن اس نے آپ کا احسان مند اور شکر گزار ہونے کی بجائے یہ ٹھان لی کہ مناسب موقع ملنے پر ایک بار پھر آپؐ پر وار کرے اور اتفاق سے ایک غیر متنظرہ واقعہ نے اس کے لئے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جب بھی سفر پر روانہ ہوتے تو اپنی زوجات میں سے ایک کو ہمراہ لے جاتے تھے۔ اس مرتبہ حضرت عائشہؓ کی باری تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوں۔ حضرت عائشہؓ اونٹ پر بندھے کجاوے میں بیٹھیں اور کاروان اسلام کے ساتھ میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

میدان جنگ سے واپسی پر جبکہ مسلمانوں کا قافلہ مدینہ کی طرف روانہ ہو رہا تھا تو حضرت عائشہؓ کسی ضرورت کے تحت اونٹ سے اتریں اور جب واپس لوٹیں تو یہ دیکھ کر مبہوت رہ گئیں کہ قافلہ جا چکا ہے۔

جب قافلہ روانہ ہوا تو چونکہ حضرت عائشہؓ کے کجاوے کا پردہ گرا ہوا تھا لہٰذا قافلے والے یہ سمجھے کہ وہ سو رہی ہیں اور اس طرح کجاوے میں ان کی غیر موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ قافلہ روانہ ہو گیا اور حضرت عائشہؓ قافلے سے پیچھے رہ گئیں۔

جب حضرت عائشہؓ کو احساس ہوا کہ قافلہ جا چکا ہے اور وہ بچھڑ گئی ہیں تو بہت گھبرائیں اور فریاد کناں قافلے کے پیچھے بھاگنے لگیں لیکن اس تک نہ پہنچ سکیں۔ آخر کار تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گئیں اور مایوسی کے عالم میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر التجا کرنے لگیں: ''اے اللہ مجھے اس مشکل سے نجات دلا''۔

کچھ ہی دیر بعد ایک نوجوان شخص جو تیز رفتار اونٹ پر سوار تھا وہاں پہنچ گیا جس کا نام صفوانؓ بن معطل سہمی تھا۔ حضرت صفوانؓ اسلامی قافلے کے عقب میں چل رہے تھے اور ان کے ذمے یہ کام تھا کہ قافلے والوں کی گمشدہ اشیاء اور دوسرے سامان کو جسے وہ غلطی سے بھول جائیں اٹھا کر اپنے ہمراہ لیتے آئیں اور اصلی مالک کے حوالے کر دیں۔

حضرت صفوانؓ جب عائشہ صدیقہؓ کے قریب پہنچے تو انہیں پہچان لیا اور بولے: ''یا ام المومنین آپ یہاں اکیلی کیسے؟ اور کس لئے بیٹھی رو رہی ہیں؟'' حضرت عائشہؓ نے سارا ماجرا سنایا اور بتایا کہ وہ کس طرح کارواں سے بچھڑ گئی ہیں۔ صفوانؓ بن معطل نے انہیں اپنے اونٹ پر بٹھایا اور خود اونٹ کی لگام تھام کر مدینے کی طرف روانہ ہو گئے اور اسلامی کارواں کے مدینے پہنچنے کے ایک دن بعد یہ لوگ بھی مدینے میں داخل ہو گئے۔

جب عبداللہ بن ابی نے یہ سنا کہ صفوانؓ بن معطل حضرت عائشہؓ کو مدینے لائے ہیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ جس لمحے کی تلاش میں تھا وہ لمحہ آ پہنچا اور محمد (ﷺ) پر افترا لگانے کا اس سے بہتر موقع نصیب نہیں ہو گا۔

کچھ دوسرے لوگ بھی رسول اللہ ﷺ کو ذہنی کوفت پہنچانے کی مہم میں عبداللہ بن ابی کے ہمنوا بن گئے جن میں زید بن رفاعہ اور حسان بن ثابت نامی شاعر بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ مسطح بن اثاثہ نامی شخص بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو لیا جو

درحقیقت حضرت عائشہؓ کا رشتہ دار یعنی حضرت ابوبکرؓ کی خالہ کا نواسہ تھا۔

عبداللہ بن ابی اور اس کا ٹولہ صبح سے شام تک مدینہ کے گلی کوچوں میں مختلف افواہیں پھیلانے میں مصروف رہتا اور حضرت عائشہؓ اور صفوانؓ بن معطل پر طرح طرح کی بہتان تراشی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔

یہودی لوگ بھی، جو دل ہی دل میں مسلمانوں کے دشمن تھے ان شر انگیز افواہوں کو مزید آب و تاب سے منتشر کرنے لگے اور ان کے ایک ہجو گو شاعر نے اپنے تخیلات کے زور پر ایک موہوم واقعہ کو کچھ اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ جس نے نہ صرف پیغمبر اسلام ﷺ کے دل کو شدید ٹھیس پہنچائی بلکہ عام مسلمان بھی سخت آزردہ خاطر رہنے لگے۔

اسلامی تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ صورتحال تقریباً" ایک ماہ تک جاری رہی اور اس دوران حضرت عائشہؓ پر سخت ترین کرب والم کے لمحات گزرے یہاں تک کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے پاس پہنچے اور ان سے کہا "آیا جانتی ہو کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟"

حضرت عائشہؓ کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل جاری ہو گیا اور وہ بڑی مشکل سے یہ کہہ پائیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سراسر جھوٹ ہے افترا ہے بخدا میں نے کوئی خطا نہیں کی!

پھر اسی لمحہ وحی نازل ہوئی اور حضرت عائشہؓ کی بے گناہی کے بارے میں پہلی آیت آسمان سے اتری جو آج چوبیسویں سورۃ النور کی گیارہویں آیت کے طور پر قرآن میں شامل ہے۔

یعنی وہ لوگ جنہوں نے طوفان مچایا (یعنی الزام لگایا) تمہی میں سے ہیں اور یہ گمان مت کرو کہ ان کا دروغ و بہتان تمہیں نقصان پہنچائے گا بلکہ یہ تمہارے نفع اور بہتری میں ہے اور اللہ جھوٹ بولنے والوں کو سزا دے گا اور جس نے بڑا جھوٹ بولا (یعنی عبداللہ بن

ابی) تو وہ بڑے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

اسی سورۃ النور کی بارہویں آیت میں آیا ہے۔

"تم مسلمانوں نے جو با ایمان مرد اور عورت ہو' جب اس جھوٹ اور افترا کو سنا جو تمہاری طرح کے مومنوں (یعنی حضرت عائشہؓ اور صفوانؓ) پر لگایا گیا تو تم نے اچھی بات کیوں نہ سوچی اور یہ کیوں نہ کہا کہ وہ بات ایک بے بنیاد تہمت ہے؟ اور سورۃ النور کی تیرہویں آیت تہمت لگانے والوں کے بارے میں کہتی ہے۔

اگر وہ لوگ جو اپنی تہمت کو روا سمجھتے ہیں تو چار گواہ (شاہد) کیوں نہ لائے تاکہ ثابت ہو سکے اور چونکہ وہ چار گواہ نہ لائے لہٰذا اللہ کے نزدیک تہمت لگانے والوں اور جھوٹ بولنے والوں میں شمار ہوئے۔

جو لوگ اسلامی احکام سے واقفیت رکھتے ہیں یہ ضرور جانتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان مرد یا عورت پر گناہ کاری کا الزام لگایا جائے تو نص قرآنی کے مطابق چار شاہد پیش کرنا ضروری ہیں اور ان چار شاہدوں کو یہ گواہی دینی ہوگی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے مدعا علیہ کو گناہ کرتے دیکھا ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی پر تہمت لگائے اور فرد جرم عائد کرے لیکن اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لئے چار گواہ پیش نہ کر سکے تو وہ خود جھوٹی تہمت لگانے کے جرم میں سزا کا مستحق قرار پائے گا۔

زوجہ پیامبر ﷺ' حضرت عائشہؓ کی بے گناہی کے ثبوت کے لئے یہی کہ خود خداوند تعالیٰ نے سورۃ النور کی متعدد آیات ان کی صفائی اور بے گناہی ثابت کرنے کے لئے نازل کیں اور اس طرح اپنے رسول ﷺ اور دوسرے عام مسلمانوں کو آسودہ خاطر کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ کسی خطا کی مرتکب نہیں ہوئی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات کے نازل ہونے کے بعد جن میں حضرت عائشہؓ کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی سارے مسلمانوں کو تسکین قلب حاصل ہوئی اور ان کا اضطراب یکسر ختم ہو گیا۔ دوسری طرف عبداللہ بن ابی جو یہ سمجھ رہا تھا کہ اس شرمناک بہتان تراشی سے

حضرت محمد ﷺ اور عام مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا' اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور اس نے دیکھ لیا کہ اس کا یہ حربہ بھی کارگر نہ ثابت ہو سکا۔

ان آرام بخش اور تسکین آور آیات کے نازل ہونے کے بعد مسلمان آسودہ خاطر ہو کر اپنے آپ کو آئندہ جنگ کے لئے آمادہ کرنے لگے۔



جب پہلی بار جزیرۃ العرب میں خندق کھودی گئی

حضرت محمد ﷺ اپنے خصوصی ذرائع یعنی حصول اطلاعات کی باقاعدہ تنظیم کے ذریعے یہ جان چکے تھے کہ قریش مکہ دس ہزار افراد پر مشتمل ایک عظیم سپاہ کی تشکیل میں مصروف ہیں تاکہ مدینہ پر حملہ کرکے اسلام اور مسلمین کا نام و نشان مٹادیں۔

اگرچہ قریش مکہ دس ہزار کی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے لیکن وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی جنگی صلاحیتوں سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہیں آپ کی موجودگی میں مدینہ پر حملہ کرنے کی جسارت نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے کہ جب آپؐ مدینہ سے باہر نکلیں تو وہ آپ کی غیر موجودگی میں یہودیوں اور منافقوں کی مدد سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں۔

قریش کو پیغمبر اسلام ﷺ کے مدینہ سے نکلنے کا انتظار اس لئے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ مدینہ کی اقتصادی ناکہ بندی توڑنے کے لئے دومتہ الجندل نام کے ایک

رحدی شہر کا رخ اختیار کرنے پر مجبور ہیں تاکہ وہاں کے حکمران سے مقابلہ آرائی کر
یں۔ دومتہ الجندل کے حکمرانوں نے خیبر کے یہودیوں اور مکہ کے مشرکوں کے ساتھ مل
ر ایسے "اتحاد ثلاثہ" کی بنیاد رکھی تھی کہ جس کا مقصد ملک شام اور بین النہرین کو جانے
لے مدنی کاروانوں کا راستہ روکنا تھا۔

گو کہ پیغمبر اسلام ﷺ یہ جانتے تھے کہ کفار مکہ ایک عظیم فوج کی تشکیل میں
صروف ہیں اور عنقریب مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں لیکن اس کے باوجود آپؐ نے مدینہ
ے نکل کر دومتہ الجندل جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ مذاکرات یا ناکامی کی صورت میں مقابلہ
ائی کے ذریعے مدینہ کے کاروانوں پر عائد پابندی منسوخ کر دیں تاکہ ان کی آمد و رفت
ل ہو جائے۔

دومتہ الجندل کے حکمران نے شام اور بین النہرین کو جانے والے مدینہ کے کاروانوں
پابندی عائد کر کے گویا اہل مدینہ کا اقتصادی گلا جکڑ رکھا تھا اور انہیں سانس لینے کی
رت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ مجبور ہو گئے کہ شہر مدینہ کی گلو خلاصی کے
ے فوری طور پر کوئی قدم اٹھائیں وگرنہ مدینہ کی معیشت کا دم گھٹ جاتا اور پورا معاشرتی
م تہہ و بالا ہو جاتا۔

البتہ مدینے پر حملے کے خطرے کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ اس بنا پر دومتہ
دل جا رہے تھے کہ ایک تو مدینہ اور دومتہ الجندل کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا
رے یہ کہ اسلامی سراغ رسانوں کی اطلاعات بتا رہی تھیں کہ مکہ میں مشرکوں کی جنگی
یاں فی الحال مکمل نہیں ہوئیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ایک ہزار جنگجو افراد کے ہمراہ
ہ سے نکلے اور دومتہ الجندل کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں قبیلہ غطفان کی سر
ن سے گزرتے ہوئے آپ نے یہی بہتر سمجھا کہ اس قبیلے کے سربراہ سے بھی ملاقات
ں تاکہ جنگ کی صورت میں اسے بے طرف رہنے کی ترغیب دے سکیں۔

ہم نے اس تاریخی بحث میں میں بتایا تھا کہ ایک بادیہ عرب جیسا سوچتا، ویسا ہی کہتا

اور اس کے افکار و گفتار میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا آج بھی جزیرۃ العرب کے ان حصوں مثلاً جنوب میں واقع "ربع الخالی" کے علاقے میں جہاں ابھی تک نئی تہذیب نے قدم نہیں رکھا ایک بادیہ عرب جو سوچتا ہے اسی کو زبان پر لاتا ہے اور اس کی باتوں میں یک رنگی و صداقت ہوتی ہے کیونکہ وہ دو پہلو بات کہہ ہی نہیں سکتا۔

لہٰذا قبیلہ غطفان کے رئیس نے بھی حضرت محمد ﷺ کے ساتھ مذاکرات کے دوران بڑی سادہ لوحی اور صاف گوئی سے اس بات کا اظہار کر دیا کہ وہ قریش مکہ اور خیبر کے یہودیوں کے ساتھ متحد ہو چکا ہے اور اس کے بدلے میں اسے یہودیوں کی طرف سے بہت زیادہ مقدار میں کھجوریں دریافت ہوئی ہیں۔ اگر مسلمان زیادہ کھجوروں کی پیش کش کریں تو وہ بے طرف رہنے کو تیار ہے!..... لیکن ابھی گفتگو جاری تھی کہ قبیلے کے سردار نے کہا یا محمد (ﷺ) میرے پاس زیادہ وقت نہیں جو مزید گفتگو کر سکوں۔ مجھے اپنے آدمیوں کو لے کر قریش سے ملحق ہونا ہے کیونکہ وہ بہت جلد مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے قبیلہ غطفان کے سربراہ کی بات پر تحقیق کروائی اور معلوم ہوا کہ یہ اطلاع درست ہے۔ رسول اللہ ﷺ گرچہ جانتے تھے کہ رئیس قبیلہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا پھر بھی آپ کو گمان گذرا کہ ہو سکتا ہے قریش نے اس شخص کو غلط اطلاع پہنچا دی ہو اسی لئے آپ نے اس بارے میں تفتیش کا حکم دیا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ سپاہ قریش واقعی مدینہ روانہ ہو چکی ہے تو آپؐ نے بھی مراجعت کا فیصلہ کیا اور بلا تاخیر مدینہ واپس پہنچ گئے۔

منافقوں اور یہودیوں کے ٹولے کو حضرت محمد ﷺ کی واپسی پر بہت حیرت ہوئی چونکہ وہ ان کی عادت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ آپ جب بھی کسی جنگی مشن پر روانہ ہوں تو واپس نہیں آتے مگر جنگ کے خاتمے پر!

پیغمبر اسلام ﷺ کی واپسی کے بعد خوزہ نامی قبیلے کے کچھ افراد مدینہ میں داخل

ہوئے اور اطلاع دی کہ قریش کی فوج مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہو چکی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مکہ کی فوج کو مدینہ پہنچنے کے لئے گیارہ دن کا سفر طے کرنا ہو گا جبکہ وہ لوگ صرف چار دن میں یہاں پہنچ گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ روز و شب بلا وقفہ سفر کرتے رہے ہیں تاکہ جتنا جلدی ہو سکے یہ اطلاع آپ تک پہنچا سکیں۔ خبر لانے والوں نے یہ بھی بتایا کہ اس مرتبہ قریش کی فوج دس ہزار افراد پر مشتمل ہے وہ پوری طرح جنگی ساز و سامان سے لیس ہیں اور یہ عہد کر کے چلے ہیں کہ مکہ واپس نہیں آئیں گے مگر اسلام کی مکمل ریشہ کنی کے بعد!

مذکورہ خبر دریافت ہونے پر پیغمبر اسلام ﷺ نے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ وقت ضائع کئے بغیر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو یہ بھی بتایا کہ مشرکوں کی تعداد گزشتہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے لہٰذا اس بار ہمیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے "دفاع" کا طریقہ اپنانا ہو گا۔

دفاع کا طریقہ جسے پیغمبر اسلام ﷺ نے دشمن مکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنایا دراصل ایک بہت بڑی خندق کھودنے پر مشتمل تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس جنگ کو جو سن ۶۲۷ء ہجرت کے پانچویں سال شوال کے مہینے میں مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان واقع ہوئی "جنگ خندق" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور چونکہ اس جنگ میں قریش کی طرف سے مختلف جماعتوں اور گروہوں نے شرکت کی تھی لہٰذا اسے "جنگ احزاب" کا بھی نام دیا گیا ہے۔

جنگ خندق میں حضرت محمد ﷺ کی حکمت عملی نہ صرف عام لوگوں بلکہ فن حرب کے ماہروں کے لئے بھی حیرت کا سبب بنتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسی جنگی چال کو جو جزیرۃ العرب میں بالکل بے سابقہ تھی کیونکر سمجھا اور کتنے ماہرانہ انداز میں اس پر عملدر آمد بھی کیا۔ دراصل جنگ کے دوران کسی جنگی حکمت عملی کو صرف سمجھ لینا ہی کسی کی جنگی صلاحیتوں کی ثبوت نہیں ہوتا کیونکہ بہت سے ایسے لوگ جو گھر بیٹھے کاغذ پر لڑائی کا

نقشے بناتے ہیں اور اپنی "ماہرانہ" چالوں سے دشمن کو ڈھیر کر دیتے ہیں لیکن جب یہی لوگ حقیقی میدان جنگ میں اترتے ہیں تو اپنی کسی بھی چال کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے بلکہ جنگ شروع ہوتے ہی ان کے سارے منصوبے ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔

جزیرۃ العرب میں دشمن کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے خندق کھودنے کا مسئلہ جنگ بدر اور احد میں مخصوص صف آرائی یعنی "PHALANX" کی تشکیل کی طرح بالکل نیا اور بے سابقہ تھا اور یہ کام بھی اس سرزمین کی تاریخ میں پہلی بار حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔

مسلمانوں میں ایک معزز صحابی تھے جن کا نام "روزبہ مہیار" تھا۔ عام مسلمان انہیں "سلمان فارسیؓ" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کو بتایا کہ ملک عجم میں کسی قلعے یا شہر کا دفاع کرنے کے لئے اس کے گردونواح میں خندق کھودی جاتی ہے لیکن یہ خندق گہری اور عریض ہونی چاہئے تاکہ دشمن کی پیادہ یا سوار فوج اسے پھلانگنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

سلمان فارسیؓ بلند قامت، کشادہ شانوں والے مضبوط جسم کے انسان تھے۔ وہ خلوص نیت سے حضرت محمد ﷺ کے گرویدہ تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی نسبت ان کی عقیدت و اخلاص زبان زد عام تھا۔ چنانچہ جیسے ہی انہوں نے خندق کھودنے کی تجویز پیش کی تو پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کی منظوری دے دی۔

سلمان فارسیؓ کی تجویز مان لینا تو بظاہر آسان تھا لیکن اس پر عملدرآمد کرنا یعنی خندق کھودنا اتنا سہل نہیں تھا۔ اس کام میں عملی طور پر بہت سی دشواریاں درپیش تھیں۔ وہ خندق دشمن کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے بنائی جانی تھی لہٰذا یہ ضروری تھا کہ وہ مدینہ کے پورے شہر کا احاطہ کرے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اور خندق کھودنے کے لئے وقت بھی ناکافی تھا لیکن اس کے باوجود حضرت محمد ﷺ کے اشارے پر مسلمانوں نے خندق کھودنے کا کام شروع کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جس لمحہ خندق کھودنے کا حکم دیا تو اسی گھڑی ایک اور فرمان بھی جاری کیا جو یہ تھا کہ مدینہ کے اطراف و اکناف میں جتنے بھی کھیت اور باغات ہیں ان کی ساری پیداوار مدینہ کے اندر منتقل کر دی جائے تاکہ جب دشمن مدینہ پہنچے تو وہاں کے باغات اور کشت زاروں کی پیداوار کو نہ تو نقصان پہنچا سکے اور نہ ہی ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

اس قسم کی جنگی حکمت عملی کو دوسری جنگ عظیم میں روس کی حکومت نے جرمنی کے خلاف استعمال کیا اور جرمنی کی فوج کے راستے میں جتنے بھی باغات اور کھیت تھے ان کی پیداوار کو محاذ جنگ کے عقب میں منتقل کر دیا یا پھر نیست و نابود کر دیا تاکہ دشمن اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ان کا استعمال نہ کر سکے لیکن آج سے چودہ سو سال پہلے یہ حضرت محمد ﷺ ہی تھے جنہوں نے ایسی حکمت عملی اختیار کی اور مدینہ کے نواحی علاقوں میں موجود ساری پیداوار کو شہر میں منتقل کروا دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مکہ کی فوج مدینہ پہنچی تو سپاہیوں کی ضروریات کی عدم فراہمی کے سبب عسرت و تنگ دستی کا شکار ہو گئی۔

مدینہ کے تمام مسلمان مرد اور عورتیں حتیٰ کہ جواں سال لڑکے اور لڑکیاں بھی جو بیلچہ اور کدال اٹھانے کے قابل تھے خندق کھودنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

خندق کا نقشہ کچھ اس طرح بنایا گیا کہ مدینے کا شمالی، جنوب مغربی اور مغربی حصہ مکمل طور پر اور جنوب کا کچھ علاقہ ضمنی طور پر اس کے احاطے میں آتا تھا۔ یہ خندق مدینہ کے شمال میں واقع شیخین نامی قلعے سے شروع اور وادی قبا کے نواح میں ختم ہوتی تھی۔ خندق کھودتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ جہاں تک ہو سکے زمین کی قدرتی رکاوٹیں خندق کے پیچھے (یعنی شہر کے اندر) واقع ہوں تاکہ شہر کے رہنے والے ان رکاوٹوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

مدینہ میں طول و عرض کی پیمائش "ذراع" میں کی جاتی تھی ایک ذراع ہاتھ کی کہنی

سے درمیانی انگلی کی نوک تک کا درمیانی فاصلہ ہوتا تھا یعنی مدینے کا ایک ذراع آج کے زمانے کے تقریباً" آدھا میٹر کے برابر تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے خندق کھودنے کی غرض سے مسلمانوں کو دس دس افراد پر مشتمل مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ہر گروہ کو چالیس ذراع (تقریباً" بیس میٹر) خندق کھودنے کی ذمہ داری سونپ دی۔

میں (کونسٹن ویرژیل) ایک بار پھر اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں کہ اسلامی تذکرہ نویسوں نے جو واقعات کو ثبت کرنے میں غفلت سے کام لیتے رہے ہیں یہ نہیں لکھا کہ خندق کی چوڑائی کتنی تھی لیکن اس کی لمبائی بارہ ہزار ذراع یعنی آج کی پیمائش کے مطابق تقریباً" چھ کلو میٹر بیان ہوئی ہے۔

(وضاحت: سیارہ ڈائجسٹ کے جہاد نمبر میں غزوہ خندق کے ضمن میں مذکورہ خندق کی چوڑائی اور گہرائی پندرہ فٹ بیان ہوئی ہے لیکن لمبائی کا ذکر نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے کونسٹن ویرژیل کے زیر مطالعہ ماخذ کتابوں میں خندق کا ذکر نہ ہوا ہو۔ خلیل)

خندق کی گہرائی پانچ ذراع سے زیادہ یعنی اڑھائی میٹر سے کچھ زیادہ تھی للذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی گہرائی تین میٹر کے قریب ہو گی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خندق طویل ہونے کے علاوہ خاصی عریض بھی تھی اور اس کی دیواریں بھی بالکل عمودی تھیں۔ اگر خندق کا عرض کم ہوتا تو گھڑ سوار جست لگا کر دوسری طرف پہنچ سکتے تھے اور اگر خندق کی دیواریں عمودی نہ ہوتیں تو سوار یا پیادہ فوج ان سے گزر کر شہر میں داخل ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں نے مدینہ کے اردگرد چھ کلو میٹر لمبی خندق کھودنے کے لئے (جو آج بھی ایک طویل خندق مانی جاتی ہے) روز و شب محنت کی اور ایثار و فداکاری کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ ہر دس مسلمانوں کے دستے میں، جو ایک مقررہ لمبائی کی خندق کھودنے پر مامور تھا چند افراد کو پہرہ دینے کی غرض سے جاگتے بھی رہنا تھا اور انہیں سونے کی اجازت نہیں تھی مگر اپنی باری پر۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ بھی دن رات کام کرتے اور دوسروں کا ہاتھ

بٹاتے ہوئے کبھی کدال چلاتے اور کبھی مٹی ڈھونے میں مصروف رہتے تھے۔

ایک دن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بن خطاب مٹی ڈھونے کا وسیلہ نہ لائے کیونکہ انہوں نے اپنی ٹوکریاں دوسروں کو دے دی تھیں لہٰذا وہ دونوں افراد جن کا شمار مکہ کے برجستہ سرداروں میں ہوتا تھا اپنی جھولی میں مٹی ڈھونے کا کام انجام دینے لگے۔

ہم نے بتایا تھا کہ بالائے ذکر خندق مدینہ کے شمال میں واقع شیخین نامی مقام سے شروع اور قبا کے نزدیک ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ مدینے کا کچھ حصہ یعنی مشرقی، شمال مشرقی اور جنوب مشرقی حصہ خندق کے احاطے میں نہیں آتا تھا لیکن اس علاقے میں دشمن کی راہ میں حائل ہونے کے لئے بہت سی دوسری رکاوٹیں موجود تھیں۔ خاص طور پر مدینہ کے نواح میں موجودہ باغات اور پیچ در پیچ تنگ گلیاں دشمن کے لئے سد راہ بن سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے تیر انداز کھجور کے درختوں یا دوسری بلند جگہوں پر چڑھ کر تیر اندازی کرتے تو آسانی سے دشمن کا راستہ روک سکتے تھے۔

اس کے علاوہ دشمن کے سپاہی مدینے کے نواح میں پھیلے ہوئے گھنے باغات اور پر پیچ و خم راستوں کو با آسانی عبور نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس علاقے میں خندق کھودنا ضروری نہ سمجھا اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپؐ کا فیصلہ بالکل درست تھا۔

حضرت محمد ﷺ نے خندق کھودنے والوں کو یہ اجازت دے دی کہ وہ کام کے دوران بلند آواز میں رزمیہ ترانے بھی گا سکتے ہیں اور جو شخص اچھی آواز کا حامل ہے تو وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے تاکہ تھکن سے چور لوگوں کے بدن سے احساس خستگی جاتا رہے۔ اس کے علاوہ جو بھی شعر کہہ سکتا ہے تو وہ جذبات سے بھرپور اشعار پڑھے تاکہ کام کرنے والوں کے حوصلے بلند ہوں اور عام مسلمانوں کے عزم و ہمت میں اضافہ ہو۔

خندق کھودنے والوں میں ''عمارہ حزم'' ایک بارہ سالہ نوجوان تھے جن کی آواز بہت دلنشین تھی۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ کا گزر اس علاقے سے ہوا جہاں عمارہ حزم کام

کر رہے تھے۔ آپؐ نے ان کی آواز سنی اور پسند کی۔ اس کے بعد آپؐ جہاں بھی جاتے تو اس نوجوان کو اپنے ہمراہ لے جاتے تاکہ وہاں کام کرنے والے بھی اس کی آواز سے لطف اندوز ہوں اور انہیں بھی جسمانی و روحانی تسکین حاصل ہو جائے۔

جب دس افراد کا کوئی ٹولہ اپنا مقررہ کام قبل از وقت مکمل کرلیتا تو آرام کرنے کی بجائے رضاکارانہ طور پر دوسروں کا ہاتھ بٹانے اور ان کی مدد کرنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

ایسے بے مثال تعاون' یکجہتی اور امداد باہمی کا جذبہ دنیائے قدیم میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے اور دور حاضر میں بھی ایسی مثال "لیننن گراڈ" کے باشندوں کی دی جا سکتی ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران اپنے شہر سے نکل آئے اور زن و مرد' پیر و جوان بلا امتیاز خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے تاکہ اپنے شہر کو دشمن کے حملے سے بچا سکیں۔

بہر حال مکہ کی فوج ایسے وقت پر مدینہ پہنچی کہ جب خندق کھودنے کا کام مکمل ہو چکا تھا اور سارے مسلمان مرد شہر کے تحفظ کے لئے ہتھیار تھامے آمادہ کھڑے تھے۔

جب ہم جنگ احد کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو ہم نے بتایا تھا کہ مکہ کی فوج جنوب کی جانب سے مدینہ پر حملہ آور نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہاں کی سنگلاخ زمین اونٹوں کی حرکت کے لئے قطعاً نامناسب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ کی فوج نے ایک بار پھر مدینے کا چکر کاٹتے ہوئے شمال اور مغرب یعنی دامن کوہ کی جانب سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لشکر قریش کی کمان بدستور ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی اور جب وہ دامن احد میں پہنچا تو اسے توقع تھی کہ وہاں مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہو جائے گی اور اس بار وہ اپنے عظیم لشکر کی مدد سے مسلمانوں کا حساب پاک کر دے گا۔ مکہ کی فوج دس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بعض مکہ کے رہنے والے تھے اور کچھ کا تعلق دوسرے قبائل سے تھا۔ جو قبائل ابوسفیان کا ساتھ دے رہے تھے ان میں بنو فزارہ' غطفان' احابش' تہامہ اور کنانہ قابل ذکر ہیں۔

ابوسفیان کو پختہ یقین تھا کہ اگر دامن کوہ میں مسلمان اس کے نرغے میں آگئے تو وہ ایک شدید حملہ کرکے ان کا صفایا کر دے گا۔ لیکن جب مسلمانوں کی فوج دامن کوہ میں نظر

مخالفوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے لہٰذا تیر اندازی سے ہاتھ کھینچ لیتے جس کے بعد ایک دوسرے کو ملامت کا نشانہ بنانے اور پھبتیاں کسنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہجوگو شعراء بھی اونچی آواز میں شعر پڑھتے اور مد مقابل کو سناتے تھے۔

دن کے وقت حقیقی تیر اندازی اور رات کو طعنے تشنے کے زبانی تیر چلانے کے علاوہ طرفین ایک دوسرے کے ساتھ "معاملات" بھی انجام دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک دن مسلمانوں نے بنو غطفان کو باصدائے بلند یہ تجویز پیش کی کہ اگر وہ قشون مکہ کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں سے آملیں تو انہیں مدینہ کی ساری کھجوریں مل جائیں گی!

اس قسم کی سودے بازی عین لڑائی کے دوران جبکہ سبھی لوگ اس تجویز کو سن رہے ہوں بڑی عجیب سی دکھائی دیتی ہے کیونکہ ایسی معاملہ بندی جس کا مقصد دشمن کی اتحادی فوج میں تفرقہ ڈالنا اور اس کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ہوتا ہے۔ خفیہ طور پر یا بقول ہمارے "Top Secrete" انجام پانی چاہیے نہ کہ سارے لوگ ان باتوں کو سن لیں اور سمجھ جائیں کہ کیا معاملہ ہو رہا ہے!..... لیکن بادیہ عرب بہت سادہ لوح تھے۔ ان کے افکار و گفتار میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا وہ جیسا سوچتے ویسا بولتے اور اسی پر عمل بھی کرتے تھے۔ تاہم مسلمانوں اور قبیلہ غطفان کے درمیان معاملہ نہیں طے پاسکا۔ کیونکہ عین وقت پر ابو سفیان نے مداخلت کر دی اور بات آگے نہیں بڑھنے دی۔

دن گزرتے رہے اور مکہ کی فوج خندق عبور کر کے مدینہ میں داخل نہ ہو سکی۔ چنانچہ ابو سفیان نے سوچا کہ مدینہ کے یہودیوں سے رابطہ قائم کرے اور ان سے کہے کہ وہ مسلمانوں کے عقب سے ان پر حملہ کر دیں۔

مدینہ میں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے رہتے تھے اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ان میں سے دو قبیلے مدینہ چھوڑ کر چلے گئے اور صرف بنو قریظہ نامی قبیلہ رہ گیا جس کے زیادہ تر افراد کا پیشہ دباغت تھا۔

ابو سفیان خندق سے گزرنے اور مدینہ پر حملہ کرنے میں تو ناکام رہا لیکن مدینہ کے

یہودیوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تاکہ ان کی مدد سے مسلمانوں پر دباؤ ڈال سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ بھی اپنے سراغ رسانوں کے ذریعے فوراً یہ جان گئے کہ ابو سفیان قبیلہ بنو قریظہ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور جنگ میں شریک ہونے پر اکسانے کی کوشش کر رہا ہے لہٰذا آپؐ نے دو مسلمانوں کو، جن میں سے ایک کا نام سعد عبادہؓ تھا بطور ایلچی یہودیوں کے پاس بھیجا اور انہیں یاد دلایا کہ وہ مدینہ کے بنیادی آئین کا پاس رکھیں اور یہ مت بھولیں کہ انہوں نے یہ معاہدہ کر رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف صف آرائی نہیں کریں گے اور نہ ہی اسلام دشمن طاقتوں کا ساتھ دیں گے لہٰذا انہیں ہر حال میں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے۔

لیکن مدینہ کے یہودیوں نے کوئی واضح جواب دینے کی بجائے پہلو دار باتیں کیں جن کا مطلب یہ تھا کہ قشون مکہ کے ساتھ تعاون کرنے پر زیادہ راغب نظر آتے ہیں۔

اس صورتحال کے پیش نظر پیغمبر اسلام ﷺ جان گئے کہ عنقریب ابو سفیان اور بنو قریظہ کے درمیان معاہدہ ہونے والا ہے جس کے بعد یہودیوں کا قبیلہ مسلمانوں کے عقب سے ان پر حملہ آور ہو جائے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو یہ بھی احساس تھا کہ ہرگاہ یہودی مسلمانوں پر حملہ کریں تو وہ دو جانب سے گھیرے میں آ جائیں گے اور خندق کھودنے کا اصلی مقصد، جو بڑی محنت سے کھودی گئی تھی، فوت ہو جائے گا چونکہ مسلمانوں کی توجہ دو طرف بٹ جائے گی اور خندق اپنا مطلوبہ کردار ادا نہیں کر سکے گی۔

دوسری طرف عام مسلمانوں کو جب یہ پتہ چلا کہ بنو قریظہ اور مشرکوں کے درمیان جنگی معاہدہ ہونے والا ہے تو وہ بہت گھبرائے اور اپنی تشویش کا اظہار کرنے پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ہم لوگ سخت خطرے میں ہیں۔ اگر بنو قریظہ ہماری پشت سے اور قریش روبرو سے حملہ کریں تو ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑے گا اور ہو سکتا ہے ہم بالکل فنا ہو جائیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے انتہائی سکون اور اعتماد سے جواب دیا کہ مشرکوں کو یہودیوں کی کمک پر بھروسہ ہے جبکہ میں اللہ کی مدد پر یقین رکھتا ہوں اور تم لوگ بھی اطمینان رکھو کہ اللہ ہمیں بے یارو مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اگرچہ تم نے دیکھا کہ ہمیں جنگ احد میں قدرے ہزیمت اٹھانا پڑی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض مسلمانوں نے نظم و ضبط کا مظاہرہ نہیں کیا اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کو فراموش کر بیٹھے تھے۔

اتفاق سے پیغمبر اسلام ﷺ کا کہا جلد ہی حقیقت میں بدل گیا اور اللہ نے اپنے رسولؐ اور اس کی امت کے لئے مدد و استعانت کا دروازہ کھول دیا۔ ہوا یوں کہ عین ایسے وقت پر جبکہ عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اندرونی اور بیرونی طور پر دشمنوں کے نرغے میں آنے والے ہیں تو "نعیم بن مسعود" نامی شخص جو یہودیوں اور مشرکوں کے درمیان معاہدہ منعقد کرنے جا رہا تھا اپنا راستہ بدل کر پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچا اور بولا "یا محمد (ﷺ) اگرچہ مجھے بنو قریظہ اور قشون مکہ کے درمیان معاہدہ منعقد کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے تاکہ مدینہ کے یہودی مسلمانوں کی پشت سے ان پر حملہ کر دیں لیکن میں ایک عرصے سے آپ کے عقیدت مندوں اور طرفداروں میں شامل ہوں اور ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ رسول اللہ ﷺ کو شکست ہو بلکہ آپ کی فتح و نصرت اور اسلام کی سربلندی ہی میری آرزو ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے نعیم بن مسعود کی باتیں سنیں تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ اللہ کا لطف و کرم اور اس کی غیبی مدد ہی ہے کہ ایک ایسا شخص جو مسلمانوں کی بربادی اور نابودی کا سبب بننے چلا تھا خود مسلمانوں کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ (یہ عجیب اتفاق ہے کہ قبول اسلام سے پہلے حضرت عمرؓ شدت غضب میں آنحضرت صلعم کو قتل کرنے چلے تھے تو ان کا راستہ روکنے اور ان کا ارادہ بدلنے والے شخص کا نام بھی "نعیم" تھا اور یہ حضرت نعیمؓ بن عبداللہ ہی تھے جو اتفاقی طور پر حضرت عمرؓ کی راہ میں آئے اور اسلام کی وہ خدمت کر گئے کہ بعد ازاں دنیائے اسلام کو حضرت عمرؓ کے روپ میں ایسا جلیل القدر خلیفہ نصیب ہوا کہ

جن کے دور خلافت میں دنیائے قدیم کی تین عظیم سلطنتیں مسلمانوں کے ہاتھوں سرنگوں ہو کر امت اسلامیہ کا حصہ بن گئیں اور اس مرتبہ جنگ خندق میں نبی اکرم ﷺ کی مدد کو آنے والے شخص کا نام بھی "نعیم" ہی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ نعیم بن مسعود کا اچانک مسلمانوں کی مدد کو آنا انتہائی دوررس نتائج کا حامل ثابت ہوا کیونکہ اس کی سیاسی چال نے یہودیوں اور مشرکوں کے درمیان ہونے والے اتحاد کو نااتفاقی اور بدنیتی میں بدل دیا جس کا حال آپ آئندہ سطور میں پڑھیں گے۔ فی الحال یہ بتانا خالی از لطف نہ ہو گا کہ لغوی اعتبار سے نعیم کے معنی ہیں "نعمت" اور نعیم نام کے یہ دونوں افراد مشکل وقت میں مسلمانوں کے لئے واقعی نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے۔ خلیل)

بہرکیف نعیم بن مسعود نے پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھا کہ میں آپ کی اور مسلمانوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا: "یا نعیم! تم جانتے ہو کہ ہم جنگ کی ہنگامی حالت میں ہیں لہٰذا دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور اس کے منصوبوں و ارادوں سے باخبر ہونا ہمارے لئے بالکل جائز ہے۔ اگر ہم حاصل شدہ اطلاعات کو نیا رنگ دے کر دشمن کے کانوں تک پہنچائیں تو ہمارا یہ عمل نیرنگ نہیں ہو گا بلکہ جنگی حربہ کہلائے گا چونکہ جنگ صرف زور آزمائی کا نام نہیں ایک داؤ بھی ہے"۔

نعیم بن مسعود نے اطاعت میں سر جھکا دیا اور ضروری تعلیمات حاصل کرنے کے بعد اسی دن بنو قریظہ کے یہودیوں کے پاس پہنچا اور پوچھا: "بھائیو! تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک عرصے سے تمہارا قریبی دوست ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اپنا خیر خواہ سمجھتے ہو!" یہودی سردار نے اثبات میں سر ہلایا تو نعیم بن مسعود نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "تمہیں خندق کے اس پار مکہ کی عظیم فوج دیکھ کر مغرور نہیں ہونا چاہئے کیونکہ مکہ کے سپاہی مدینے کے باشندے تو نہیں ہیں جو یہاں ٹھہرے رہیں اور نہ ہی وہ قبیلے جو ان کے ساتھ آئے ہیں ہمیشہ کے لئے یہیں پڑاؤ ڈالے بیٹھے رہیں گے بلکہ یہ لوگ جلد ہی واپس چلے جائیں گے اور اس وقت تم رہ جاؤ گے اور تمہارے سامنے یہ سرفروش مسلمان!"

یہ بات سن کر یہودی سردار کی بھنوئیں سکڑ گئیں اور اس کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیلنے لگے۔ نعیم بن مسعود نے بھی موقع غنیمت جانا اور اپنی باتوں میں دلسوزی کا رنگ بھرتے ہوئے بولا: "فرض کرو کہ مکہ کی فوج اتنی جلدی واپس نہ جائے اور طویل عرصہ تک جنگ جاری رکھے لیکن کیا معلوم کہ وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں یا نہیں؟..... تم لوگوں نے جنگ احد میں دیکھ لیا کہ اگرچہ ابوسفیان کے سامنے خندق نہیں تھی جو اس کی راہ میں رکاوٹ بنے اور اس کی طاقت بھی مسلمانوں کے مقابلے میں چار گنا سے زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ محمد (ﷺ) کو نقصان پہنچانے اور دین کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو بھلا اب کیسے مسلمانوں پر ہاتھ ڈال سکتا ہے اور کیونکر انہیں صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے؟ لہٰذا میری مانو تو مسلمانوں سے ہمیشہ کے لئے ترک تعلقات کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو کہ ان سے دشمنی مول لینا تمہارے فائدے میں ہے یا نقصان میں؟ میں چونکہ تمہارا خیر خواہ ہوں اسی لئے تمہیں باخبر کئے دیتا ہوں کہ مجھے ابوسفیان اور قریش کے دوسرے سرداروں پر بالکل بھروسہ نہیں کیونکہ انہیں جیسے ہی خطرے کا احساس ہوا تو ٹھیک جنگ کی گھماگھمی میں وہ تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ نکلیں گے لہٰذا تمہیں چاہئے کہ مسلمانوں سے بگاڑنے سے پہلے قریش کے چند سرکردہ افراد کو اپنے پاس بلاؤ اور یرغمالی بنا کر اپنے پاس رکھ لو تاکہ قریش ان لوگوں کی خاطر ہی سہی آخری دم تک تمہارا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائیں وگرنہ یقین جانو کہ انہیں جیسے ہی خطرے کا احساس ہوا تو وہ تم لوگوں کو مسلمانوں کے سامنے بے سہارا چھوڑ کر رفوچکر ہو جائیں گے"۔

یہودیوں نے نعیم بن مسعود کی باتیں سنیں تو انہیں احساس ہوا کہ یہ باتیں عقل و منطق کے عین مطابق ہیں لہٰذا انہوں نے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اس بارے میں مزید سوچ بچار کا فیصلہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے دلوں میں قریش سے معاہدہ کرنے کے سلسلے میں بدگمانی پیدا ہو گئی ہے۔

یہودیوں سے گفتگو کرنے کے بعد نعیم بن مسعود ابوسفیان کے پاس پہنچے اور انتہائی

دوستانہ انداز میں بولے: "بھئی تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں تمہارے اور تمام اہل مکہ کے مخلص دوستوں میں سے ہوں اور میرا دل نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کو اس لڑائی میں شکست کا سامنا کرنا پڑے لیکن....."

"لیکن کیا؟" ابوسفیان نے بے چینی سے پوچھا۔

"لیکن یہ کہ بنو قریظہ چوری چھپے مسلمانوں سے گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف ہیں اور مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ لوگ مسلمانوں سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے قریش کے چند سرکردہ افراد کو ضمانت کے بہانے اپنے پاس بلا کر ان لوگوں کے حوالے کرنے کی فکر میں ہیں"۔

نعیم بن مسعود کی زبانی یہ باتیں سن کر ابوسفیان بری طرح چونکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے نعیم بن مسعود نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا "اے مکہ کے بزرگ سردار! میری مانو تو ایسا کرو کہ فی الفور یہودیوں کو پیغام بھجوا دو کہ وہ اس شنبے کو (بروز ہفتہ) مسلمانوں پر حملہ کر دیں اور اگر انہوں نے بہانہ بنایا کہ ہم بروز شنبہ لڑائی نہیں کر سکتے تو جان لو کہ وہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں اور حقیقت میں مسلمانوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتے"۔

ابوسفیان نے یہ باتیں سنیں تو گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے ذہن میں مختلف خدشات سر اٹھا رہے ہیں۔ مدینہ کے عام باشندے بھی اس افواہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے کہ بنو قریظہ مکہ کے کچھ سرداروں کو یرغمالی بنا کر مسلمانوں کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھا گیا کہ یہ افواہ درست ہے یا نہیں تو آپؐ نے جواب دیا: "لعلنا امرنا ھم بذالک" یعنی شاید ایسا ہی حکم جاری ہوا ہو!

یہ جواب جو پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے دیا گیا ایک کلی مفہوم کا حامل تھا اور ہر انسان اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اس کا مطلب نکال سکتا تھا۔

انہی حالات کے پیش نظر ایک طرف یہودیوں کے دلوں میں قریش کے بارے میں بددیانتی اور دھوکہ دہی کے شبہات ابھر رہے تھے تو دوسری طرف ابوسفیان اور مکہ کے دوسرے سردار یہ سمجھ رہے تھے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم ہونے کی افواہ بالکل درست ہے اور یہودیوں نے مسلمانوں ہی کے ایماء پر قریش کے سرداروں کو ان کے حوالے کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

آخر کار اسی کشمکش میں یہودیوں نے ابوسفیان کو پیغام بھجوا دیا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ بنو قریظہ مسلمانوں کے عقب سے ان پر حملہ کریں تو اسے اپنی فوج کے چند سرداروں کو ہمارے پاس بھیجنا ہو گا تاکہ اس بات کی ضمانت رہے کہ مکہ کی فوج ہمیں میدان جنگ میں اکیلا نہیں چھوڑے گی۔

یہودیوں کی طرف سے یرغمالیوں کا مطالبہ کرنے سے نعیم بن مسعود کی باتوں کی تصدیق ہوتی تھی لہٰذا ابوسفیان اور اس کے سرداروں کا ماتھا ٹھنکا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ بلاشبہ مدینہ کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو چکے ہیں اسی لئے ضمانت کے بہانے قریش کے سرداروں کو مسلمانوں کے حوالے کر کے مروانا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ ابوسفیان نے یرغمالی بھیجنے سے انکار کر دیا اور یہودیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ آنے والے شنبے کو (یعنی بروز ہفتہ) مسلمانوں پر حملہ کر دیں اور کیونکہ لڑائی طول پکڑتی جا رہی ہے اور اس سے زیادہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا خلاف مصلحت ہو گا۔ ابوسفیان نے پر زور سفارش کی کہ اب مزید تاخیر کی گنجائش نہیں اور تم لوگ بروز شنبہ مسلمانوں پر ہلہ بول دو ہم بھی سامنے سے دباؤ ڈالیں گے اور بھاری نقصان کی پرواہ کئے بغیر شہر میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ لیکن یہودیوں نے جواب دیا کہ ہم بروز شنبہ لڑائی نہیں کرتے کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ اگر کوئی یہودی ہفتے کے دن کشتم کشت میں حصہ لے تو اسے نہ صرف اس دنیا میں تیرہ بختی اور نحوست کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ اس کی آخرت بھی برباد ہو جائے گی لہٰذا ہمیں بروز شنبہ لڑائی سے معذور سمجھو!

یہ جواب موصول ہونے پر ابوسفیان کو نعیم بن مسعود کی باتیں یاد آگئیں اور اس کا شبہ یقین میں بدل گیا کہ یہودی اسے فریب دے کر مسلمانوں کے جال میں پھانسنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بنو قریظہ اور قریش کے درمیان بدگمانی اور عدم اعتماد کی فضا پیدا ہو گئی اور دونوں اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکیں۔

جب دس ہزار افراد پر مشتمل مکہ کی عظیم فوج دو ہفتے تک خندق کے اس پار معطل و بیکار پڑی رہی تو سپاہیوں کے لئے غذا کی عدم فراہمی اور مویشیوں کی خوراک میں کمی نے فوج کے سپہ سالار کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ مدینہ میں اشیائے خورد و نوش کی کمی نہیں تھی اور مسلمانوں کو اس بارے میں تشویش بھی نہ تھی لیکن ابوسفیان کے سپاہی خندق کے اس پار آہستہ آہستہ بھوک کے پنجوں میں گرفتار ہونے لگے اس پر رات کو بڑھتی ہوئی سردی بھی ابوسفیان کے سپاہیوں کو پریشان کئے ہوئی تھی۔ مکہ کے سپاہی گرم علاقے کے رہنے والے تھے۔ وہ مدینہ کی سردی میں آرام سے نہیں سو سکتے تھے بلکہ صبح تک اپنے خیموں میں پڑے ٹھٹھرتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ شوال کا مہینہ ختم ہو رہا تھا اور ماہ ذیقعدہ شروع ہونے والا تھا۔ مکہ کے سپاہی جانتے تھے کہ اگر شوال کا مہینہ گزر گیا تو وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ جاری نہ رکھ سکیں گے کیونکہ ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے مہینوں میں لڑائی کرنا حرام ہے۔ چنانچہ انہی باتوں کے پیش نظر قشون مکہ کے سرداروں اور عام سپاہیوں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ مسلمانوں پر حملہ کرنے اور ان پر غلبہ پانے کے لئے وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اگر وہ اگلے چند دنوں میں حملہ نہ کریں تو پھر انہیں آئندہ تین مہینوں تک مدینہ کی سرد راتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور کیا معلوم اگر وہ سردی سے بچ جائیں تو بھوک کے ہاتھوں زندہ بچ سکیں گے یا نہیں۔ کیونکہ پیداوار سے خالی اس علاقے میں دس ہزار افراد کے لئے اشیائے ضرورت فراہم کرنا ممکن نہ تھا مگر یہ کہ دور دراز کے علاقوں سے خوراک فراہم کی جائے۔

ان پندرہ دنوں میں جبکہ مکہ کی فوج مدینہ کے سامنے خندق کے اس پار معطل کھڑی تھی تو مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان کئی بار تن بہ تن لڑائی چھڑ گئی۔ ان لڑائیوں میں قریش کے دو مشہور سردار عمرو بن عبدوہ اور نوفل بن مخزومی حضرت علیؓ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئے۔

نوفل مخزومی اپنے گھوڑے پر سوار خندق پھلانگنے کی کوشش میں اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور اگلے ہی لمحے حضرت علیؓ اس کے سر پر پہنچ گئے۔ اگرچہ حضرت علیؓ کے پاس اس کا کام تمام کر دینے کا سنہری موقع تھا لیکن انہوں نے اس کے اٹھنے اور تلوار تھام لینے کا انتظار کیا۔

جس وقت نوفل خندق میں کودا تو سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی تیز کرنیں علیؓ بن ابی طالب کی آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں جبکہ نوفل کی پیٹھ سورج کی طرف تھی لہٰذا حضرت علیؓ نوفل کے مقابلے میں نامساعد صورت حال سے دوچار تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے سورج ڈوبنے سے پہلے ہی نوفل مخزومی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

چونکہ قریش کی عورتوں نے جنگ احد میں مسلمانوں کے جنازوں کو مثلہ کیا تھا لہٰذا ابوسفیان کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں نوفل مخزومی کے جنازے کو' جو قریش کا برجستہ سردار تھا مثلہ نہ کر دیا جائے۔ اسی لئے اس نے علیؓ کو پیغام بھجوایا کہ میں تمہارے لئے ایک سو اونٹ بھیجے دیتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ نوفل مخزومی کے جنازے کو نہ بگاڑا جائے اور نہ اس کا سر تن سے جدا کیا جائے بلکہ اس کا جنازہ بغیر کسی نقص کے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ نے ابوسفیان کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن یہ اجازت دی کہ نوفل کی لاش جیسی ہے ویسے ہی قریش کے حوالے کر دی جائے۔

قریش کا دوسرا سردار جو حضرت علیؓ کے ہاتھوں معدوم ہوا عمرو بن عبدوہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص دلیری و شجاعت کے علاوہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی جزیرۃ العرب کا نامی گرامی پہلوان مانا جاتا تھا۔ جب اس نے حضرت علیؓ کے مقابلے میں تلوار چلائی

شروع کی تو دو مرتبہ انہیں زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن حضرت علیؓ بھی ایسے نہ تھے جو دو زخم اٹھانے کے بعد لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیتے بلکہ انہوں نے ثابت قدمی سے مقابلہ جاری رکھا یہاں تک کہ ان کا ایک زبردست وار عمرو بن عبدوہ کے ہاتھ پر پڑا' تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ کراہتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

حضرت علیؓ ایک قدم آگے بڑھے اور اس کی تلوار پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ پھر عمرو بن عبدوہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے:

"یا عمرو اگر تو اسلام لے آئے تو میں تیری جان بخش دوں گا"۔ لیکن عمرو بن عبدوہ نے جواب دینے کی بجائے فرط غضب میں حضرت علیؓ کے چہرے پر آب دہن پھینکا اور بے قابو ہو کر دھاڑا۔ "میں اسلام نہیں لاؤں گا"۔

حضرت علیؓ نے آستین سے چہرہ صاف کیا اور سر جھکا کر کچھ دیر کو ساکت و صامت کھڑے رہے۔ عمرو بن عبدوہ نے یہ کیفیت دیکھی تو بولا "یا علیؓ میں نے کہہ دیا کہ میں اسلام نہیں لاؤں گا' پھر تم مجھے جان سے کیوں نہیں مار دیتے"۔

حضرت علیؓ بولے "اس لئے کہ جب تو نے میرے چہرے پر تھوکا تو مجھ پر خشم و غضب نے غلبہ پا لیا۔ اگر میں اس آن تجھے موت کے گھاٹ اتار دیتا تو یہ ذاتی انتقام ہوتا لیکن میں ذاتی انتقام لینے یا اپنے غضب کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے تجھے نہیں مارنا چاہتا بلکہ ہم مسلمان صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کسی کا خون بہاتے ہیں تو صرف اس کے دین کے لئے اپنی ذاتی دشمنی کے لئے نہیں"۔

پھر حضرت علیؓ نے بڑی نرم مزاجی سے عمرو بن عبدوہ کو مخاطب کیا اور بولے: "یا عمرو! اگرچہ تو نے میرے منہ پر آب دہن پھینکا ہے مگر میں پھر بھی تجھے دین اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تو اسلام لے آئے تو میں تیرے خون سے چشم پوشی کر لوں گا"۔ لیکن عمرو کی ہٹ دھرمی قائم رہی اور اس نے بضد ہو کر جواب دیا کہ میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں گا جس پر حضرت علیؓ نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر قلم کر دیا۔

واضح رہے کہ حضرت علیؓ سے لڑائی کے دوران عمرو بن عبدوہ ایک گراں قیمت زرہ پہنے ہوئے تھا جس پر سونے کے کڑے لٹک رہے تھے۔ حضرت علیؓ نے وہ زرہ عمرو کی بہن کو بھجوا دی تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ علیؓ نے اس قیمتی زرہ کے لالچ میں عمرو کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

بہرحال مکہ کی فوج خندق کے اس پار بھوک اور سرما سے تو پہلے ہی دست و گریبان تھی کہ اس پر اچانک طوفان نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ مشرکین مکہ کی ہمت و پائیداری کے جذبے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگے۔

ایک رات اتنی تیز آندھی چلی کہ مشرکوں کے خیمے اکھڑ کر ہوا میں اڑنے لگے' آگ بجھ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی کہ سیلاب جاری ہو گیا اور ابوسفیان پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر پسپائی کا حکم جاری کر دیا۔

کہتے ہیں کہ خود ابوسفیان کو بھاگنے کی اتنی جلدی تھی کہ جب وہ اونٹ پر بیٹھا تو اسے اتنا ہوش نہ رہا کہ اونٹ بندھا ہوا ہے۔ وہ اونٹ کو بھگانے کے لئے پے در پے تازیانے مار رہا تھا جبکہ بے چارہ اونٹ کھونٹے سے بندھا تھا اور اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔

اس رات مشرکوں کی فوج مدینے کا محاصرہ چھوڑ کر الٹے پاؤں بھاگ نکلی اور اس طرح جنگ خندق' جسے جنگ احزاب بھی کہتے ہیں اپنے انجام کو پہنچی۔

جنگ خندق میں مشرکوں کو آٹھ اور سپاہ اسلام کو چھ افراد کا نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ چودہ افراد تن بہ تن لڑائی میں مارے گئے جبکہ دونوں طرف کی فوجوں کو ایک دوسرے کے مدمقابل آنے کا موقع نہ مل سکا۔

اگرچہ جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مکہ کی فوج بھی واپس جا چکی تھی لیکن مدینہ بدستور معاشی ناکہ بندی کی زد میں تھا۔ شہر مدینہ گویا ایسی "سنسنی" میں پھنسا تھا جس کا ایک جبڑہ مدینہ سے خیبر اور دوسرا مکہ سے مدینہ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ دونوں شہر کاروان مدینہ کی

آمدورفت میں کڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور دونوں ہی شہر اسلام دشمن طاقتوں کا گڑھ تھے۔ خیبر کے باشندوں کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی اور وہ بھی ایسے یہودی جو اپنی بے پناہ دولت کے بل پر ہزاروں کی فوج اکٹھی کر سکتے تھے۔ دوسری طرف مکہ کے باشندے بھی قریش کے اثر و نفوذ تلے صرف اسلام دشمنی کی باتیں سوچتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل مکہ اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ بھی طے پا چکا تھا جس کی رو سے اگر مسلمان خیبر پر حملہ آور ہوں تو مشرکین مکہ بے دریغ مدینہ پر ہلہ بول دیں اور اگر مکہ پر حملہ کرنا چاہیں تو خیبر کے باشندے مدینہ کو حملے کا نشانہ بنا دیں تاکہ مسلمان ان میں سے کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہ کر سکیں۔

دوسری طرف مدینہ میں بھی مسلمانوں کے دو بڑے دشمن تھے۔ ایک یہودی دوسرے منافقین۔ منافقین کا سربراہ عبداللہ ابی تھا۔ ایک اسلامی مؤرخ طبری لکھتا ہے کہ منافقین جب سے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تو کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر رہے اور ہمیشہ دوغلی پالیسی اختیار کئے رہے لیکن جنگ خندق میں آخر کار انہوں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور وہ یہ تھا کہ قریش مکہ کی طرفداری کی جائے۔

طبری کا یہ کہنا کہ منافقین جب سے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر رہے ہیں دراصل ایک ادبی مبالغہ ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب بھی مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان کوئی ایسی بات پیش آ جاتی جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا تو منافق طرح طرح کے بہانے بنا کر کنارہ گیری اختیار کر لیتے حالانکہ وہ مسلمان سمجھے جاتے تھے۔ البتہ جنگ خندق میں انہوں نے پہلی بار یہ فیصلہ کیا کہ کوئی ایک راہ اختیار کرنی چاہئے اور اس طرح انہوں نے قشون مکہ کی طرفداری کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں یقین تھا کہ دس ہزار افراد پر مشتمل مشرکوں کی فوج اس بار ضرور مسلمانوں پر غلبہ پا لے گی مگر جب ایسے طمطراق والی فوج مدینہ کے سامنے، خندق کے اس پار دو ہفتے تک معطل پڑی رہی اور آخر کار ہزیمت اٹھانے پر مجبور ہو گئی تو اس وقت منافقوں کو اپنی غلطی کا احساس

ہوا لیکن یہ ضرور ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مسلحانہ اقدام نہیں کیا بلکہ مشرکین مکہ سے ان کی طرفداری صرف لفظی ہمدردی تک محدود رہی۔ لہٰذا چونکہ منافقوں کی طرف سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا جو بظاہر قشون مکہ کے ساتھ ان کی یکجہتی کی علامت ہو اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں سزا کا مستحق نہ جانا لیکن اکثر مسلمان منافقوں کے رویئے کو نہ بھلا سکے اور جیسا کہ ہم بعد ازاں بتائیں گے کہ اس واقعہ کے بعد منافقوں کے سلسلے میں عام مسلمانوں کے رویئے میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی۔

لیکن بنو قریظہ نے جنگ خندق کے دوران میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کی اور مشرکوں کے ساتھ اتحاد جوڑ کر مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنے کی کوشش کی حالانکہ مدینہ کے آئین کے مطابق اگر یہ شہر جارحیت کا نشانہ بنے تو شہر میں رہنے والے تمام قبیلوں کو آپس میں متحد ہو کر اس کا دفاع کرنا چاہئے لہٰذا بنو قریظہ کو بھی مدینہ کے دفاع کے لئے مسلمانوں کا ساتھ دینا ضروری تھا۔

جنگ احد میں، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودیوں سے کہا تھا کہ قشون مکہ سے ہماری لڑائی ایک مذہبی لڑائی ہے اور تم لوگ اس جنگ میں شرکت کرنے پر مجبور نہیں ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس وجہ سے یہودیوں کو واپس جانے کے لئے کہا تھا کہ انہیں یہودیوں پر زیادہ اعتماد نہیں تھا۔ جنگ خندق میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بدگمانی بالکل درست تھی۔ یہودیوں نے مشکل وقت میں میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو دیئے ہوئے وعدے بھلا دیئے۔

قبیلہ بنو قریظہ کو چونکہ یہ احساس تھا کہ انہوں نے عہد شکنی کی ہے لہٰذا وہ اپنے قلعہ نما گھروں میں مورچہ بندی کر کے بیٹھ گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے داماد، علیؓ بن ابی طالب کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ بنو قریظہ کے یہودیوں کو ہتھیار ڈالنے اور مسلمانوں کے سامنے تسلیم ہونے پر مجبور کریں۔

علیؓ وہی تھے جنہوں نے جنگ احد اور خندق میں بہادری اور جوانمردی کے جوہر دکھائے اور اسلام و پیامبر اسلام ﷺ کی راہ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔

عربی زبان میں قریظہ دراصل "کیکر" کے درخت کو کہتے ہیں اور چونکہ اس درخت کے کچھ حصے "دباغت" کے کام میں استعمال ہوتے تھے لہٰذا وہ یہودی جن کا پیشہ دباغت تھا بنو قریظہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ مدینہ کے یہودی زرگری، کھیتی باڑی اور کھالوں کا کام کرنے کی وجہ سے بہت مالدار ہو چکے تھے۔ وہ ایسے گھر بناتے تھے جو رہائش گاہ کے علاوہ ایک جنگی قلعے کی بھی حیثیت رکھتے ہوں۔ یہودیوں نے جب یہ دیکھا کہ مشرکوں کی فوج واپس جا چکی ہے تو انہوں نے اپنے قلعہ نما گھروں میں مورچے سنبھالے اور مسلمانوں کی مخالفت میں کمربستہ رہنے کا فیصلہ کیا۔

حضرت علیؓ نے بنو قریظہ کے محلے کو محاصرے میں لینے کے بعد انہیں اسلام کی دعوت دی لیکن بنو قریظہ کے یہودیوں نے جواب دیا کہ ہم محمد (ﷺ) کو نبی نہیں مانتے چونکہ ان کا تعلق قوم عرب سے ہے اور ہماری نظر میں ایک عربی پیغمبر نہیں ہو سکتا بلکہ صرف وہی شخص پیغمبر بن سکتا ہے جو بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہو کیونکہ اللہ صرف قوم بنی اسرائیل سے ہمکلام ہوتا ہے کسی اور سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک جتنے بھی پیغمبر گزرے ہیں ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا! مسلمانوں نے بنو قریظہ کا محاصرہ جاری رکھا اور چار ہفتوں (دوسری روایت کے مطابق چھ ہفتوں) کے بعد بنو قریظہ کے افراد اشیائے خورد و نوش کی کمی کا شکار ہو گئے۔ ایک دن قبیلے کا سربراہ کعب اسد ایک قلعے کی برجی پر ظاہر ہوا اور اس نے حضرت علیؓ کو پکارتے ہوئے اونچی آواز میں کہا: "ہمارے شیر خوار بچے دودھ سے محروم ہیں کیونکہ ان کی ماؤں کی چھاتیاں خشک ہو چکی ہیں۔ دودھ پلانے والی ماؤں کو مناسب خوراک میسر نہیں جو ان کی چھاتیاں دودھ سے بھر سکیں لہٰذا ان کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں"۔

حضرت علیؓ نے کعب اسد کی آواز سن لی اور اسے جواب دیتے ہوئے باصدائے بلند

کہا "اے اسد! میرے اور میرے ساتھیوں کے بھی، جنہوں نے تمہیں محاصرے میں لے رکھا ہے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جب بچہ بھوکا ہو تو کس طرح بلکتا ہے لیکن تم جان لو کہ ہمیں تمہارے بچوں سے کوئی بیر نہیں اور نہ ہی موجودہ صورت حال کے پیدا ہونے میں ہمارا کوئی قصور ہے بلکہ یہ تم ہو جنہوں نے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کی، مسلمانوں سے غداری کی، ان کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کی کوشش کی اور اب خود ہی اپنے قلعہ نما گھروں میں بند ہو کر ہمارے خلاف مورچے سنبھالے بیٹھے ہو لہٰذا ہم کیسے تم پر اعتماد کریں اور تمہیں آزاد چھوڑ دیں؟..... لیکن پھر بھی اس مخمصے سے نکلنے کے لئے میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آیا تم کسی کی ثالثی قبول کرنے کو تیار ہو اور وہ جو بھی فیصلہ دے اسے مان لو گے؟"

کعب اسد نے کہا کہ میں فی الحال جواب نہیں دے سکتا مجھے کچھ مہلت دو تاکہ میں قبیلے کے بزرگوں سے مشورہ کر سکوں۔ حضرت علیؓ نے اسے ایسا کرنے کی اجازت دے دی۔ میثاق مدینہ کے مطابق قوانین کا اجرا خود پیغمبر اسلام ﷺ کے ہاتھ میں تھا اور آپؐ کو اس سلسلے میں پورے اختیارات حاصل تھے۔ لہٰذا آپ مجبور نہ تھے کہ مسلمانوں اور بنو قریظہ کے اختلافات حل کرنے کے لئے کسی دوسرے شخص کی منصفی تسلیم کریں تاہم حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے یہودیوں کو یہ تجویز پیش کی کہ طرفین کسی بے طرف شخص کی ثالثی قبول کرتے ہوئے اس کے فیصلے کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔

مقررہ مہلت گزرنے کے بعد کعب اسد اسی برجی پر دوبارہ ظاہر ہوا اور اس نے اعلان کیا کہ ہم کسی بے طرف شخص کی ثالثی ماننے کو تیار ہیں۔ حضرت علیؓ نے بھرپور تاکید کرتے ہوئے کہا "اے کعب اسد جان لے کہ ہم تم لوگوں پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالنا چاہتے۔ تمہیں پوری آزادی ہے کہ جسے چاہو ثالث کے طور پر چن لو اور جب تم اس کا انتخاب کر لو تو ہم اپنی طرف سے دو نمائندے بھیجیں گے۔ تم بھی اپنی جانب سے دو

نمائندے بھیج دینا۔ ہمارے نمائندے تم لوگوں کی طرف سے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرنے اور باہمی معاہدہ توڑنے کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ تمہارے نمائندے بھی جو کہنا چاہیں کہہ سکتے ہیں لیکن جب مذاکرات ختم ہو جائیں اور منصف اپنا فیصلہ سنا دے تو کیا تم اس کے فیصلے کو صدق دل سے مان لو گے"۔

یہودیوں نے جواب دیا "یا علی! ہم اس کے فیصلے کو مان لیں گے"۔

حضرت علیؓ بولے: "تو پھر ہم بھی اس کے حکم کو مان لیں گے"۔

اگرچہ لڑائی ختم نہیں ہوئی تھی اور یہودی بدستور محاصرے میں تھے لیکن اس کے باوجود حضرت علیؓ نے یہ اجازت دے دی کہ یہودیوں کو اتنی مقدار میں اشیائے ضرورت فراہم کر دی جائیں جو ایک ہفتے تک ان کا کام آ سکیں۔ حضرت علیؓ نے یہ بھی تاکید کی کہ وہ کچھ بھی چاہیں دے دیا جائے تاکہ ماؤں کی چھاتیاں دودھ سے بھری رہیں اور ان کے بچے بھوک سے نہ تڑپیں۔

بنو قریظہ کے یہودیوں نے ایک بار پھر مشورہ کیا اور پیغام بھجوایا کہ ہم "سعد معاذ" کو ثالث یا منصف مقرر کرتے ہیں۔

سعد معاذ قبیلہ اوس کا سربراہ تھا اور اس کے یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ مسلمانوں نے سعد معاذ کے سامنے بنو قریظہ کی شکایت کی اور اسے میثاق مدینہ کی مختلف شقوں سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس میثاق کی رو سے اگر مدینہ حملے کا نشانہ بنے تو شہر میں رہنے والے تمام قبیلوں کو اس کے دفاع کے لئے مسلمانوں کا ساتھ دینا ہو گا لیکن بنو قریظہ نے مسلمانوں کا ساتھ دینے کی بجائے ان کے دشمنوں سے رابطہ قائم کیا اور مشرکین مکہ سے عہد و پیمان باندھنے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں پر دوہرا دباؤ ڈال سکیں۔

بنو قریظہ کے نمائندوں نے اپنا دفاع کرنا چاہا اور جنگ احد کا تذکرہ کرتے ہوئے بولے کہ ہم اس جنگ میں مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے ہمیں اپنے

ساتھ لینا پسند نہ کیا اسی لئے حالیہ جنگ میں ہم نے سوچا کہ اگر ہم مسلمانوں کا ساتھ دینا بھی چاہیں تو وہ ہماری مدد لینے سے انکار کردیں گے۔

مسلمانوں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نے یہودیوں سے مدد نہیں مانگی تو یہ کوئی خلاف ورزی تو نہ تھی لیکن انہوں نے جنگ خندق میں میثاق مدینہ کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور دشمن کی شہہ پر ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپنا چاہا۔

بنو قریظہ کے نمائندوں نے اس بات کا انکار کیا اور کہا کہ ہم نے نہ تو قشون مکہ سے رابطہ قائم کیا ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ معاہدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں مسلمان نمائندوں نے بلا تامل نعیم بن مسعود کو گواہ کے طور پر پیش کر دیا اور اس نے بھی تفصیل سے ان ذمہ داریوں کے متعلق بتایا جو اسے سونپی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ نعیم بن مسعود نے ایک ایک کرکے ان یہودیوں کے نام بھی لئے جن کی طرف سے اسے مختلف ہدایات جاری ہوئی تھیں۔

عدالتی کارروائی کئی دن تک جاری رہی۔ سعد معاذ نے دونوں فریقوں کے دلائل اور ان کے پیش کردہ گواہوں کے بیانات بڑے غور سے سنے۔ پھر اس نے یہ فیصلہ سنایا کہ چونکہ بنو قریظہ نے اپنے عہد کو توڑا' میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کی اور ایسے دشمن سے گٹھ جوڑ کرنا چاہا جو مسلمانوں کو مٹانے آیا تھا لہٰذا یہ سب کے سب سزائے موت کے مستحق ہیں۔

یہ حکم کسی مسلمان کی طرف سے نہیں تھا بلکہ ایسے شخص کی طرف سے جاری ہوا جسے یہودی اپنا خیر خواہ سمجھتے تھے اور خود انہوں نے سعد معاذ کو منصف کے طور پر چنا تھا۔

مذکورہ حکم جاری ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے یہ چھوٹ دے دی کہ عورتیں اور بچے' نابالغ لڑکے اور لڑکیاں اور اسی طرح بوڑھے مرد اور عورتیں سزا سے معاف ہیں۔ البتہ اگر دوسرے لوگ اسلام لے آئیں تو وہ بھی سزا سے بچ سکتے ہیں۔ لہٰذا بنو قریظہ کے کچھ یہودی اسلام کی پناہ میں آگئے لیکن بقیہ یہودیوں نے جو صرف مرد تھے اپنے قلعہ

نما گھروں سے باہر نکلنا نہیں گوارا کیا بلکہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

اسی موقع پر حضرت علیؓ بنو قریظہ کی لڑائی سے سبکدوش ہو گئے چونکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک اور ذمہ داری سونپ دی جو یہ تھی کہ وہ مکہ روانگی کے لئے ضروری وسائل فراہم کریں تاہم حضرت علیؓ نے چلتے چلتے پھر تاکید کی کہ عورتوں' بچوں' نابالغ لڑکے لڑکیوں اور بوڑھے مردوں کو قلعے سے نکلنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ لڑائی چھڑنے کی صورت میں یہ لوگ بھوک اور پیاس کے صدمے اٹھانے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں نے بھی حضرت علیؓ کے حکم کی تعمیل کی۔ تاہم وہ یہودی جنہوں نے مسلمانوں سے مقابلہ آرائی کی تو انہیں اپنی ہٹ دھرمی کا برا نتیجہ دیکھنے کو ملا اور ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔



جب رسول اللہؐ نے حج عمرہ کا فیصلہ کیا

عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ مدینے کا اقتصادی محاصرہ توڑنے کے لئے رسول اللہ ﷺ یا تو مکہ پر جو مدینہ سے چار سو کلومیٹر پر واقع ہے، حملہ کریں گے یا پھر دو سو کلو میٹر دور شمال میں واقع خیبر کے شہر کو اپنے حملے کا نشانہ بنائیں گے لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ جس کے بارے میں عام مسلمانوں کو گمان تک نہ تھا اور وہ یہ تھا کہ آپؐ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ حج و عمرہ کے لئے مکہ جانے کا فیصلہ کیا۔

مکہ ایسا شہر تھا جہاں حضرت محمد ﷺ کے خون کے پیاسے رہتے تھے اور انہوں نے کئی بار آپؐ کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔

مکہ ایسا شہر تھا جہاں سے متعدد بار عظیم افواج نکل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئی تھیں تاکہ اللہ کے رسولؐ اور اس کے حامیوں کو تہس نہس کر دیں اور درحقیقت اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالیں لیکن اس کے باوجود آپؐ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ مکہ جانے کا عزم

کر لیا۔

شروع میں مسلمان یہ سمجھے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جنگ کی غرض سے مکہ جا رہے ہیں۔ اس لئے جب یہ پوچھا گیا کہ آپؐ مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا' نہیں ہم صرف عمرہ ادا کرنے مکہ جا رہے ہیں۔ چنانچہ ۶۲۸ء یا ہجرت کے چھٹے سال سردیوں کے دوسرے مہینے میں پیغمبر اسلام ﷺ اپنے دو ہزار ساتھیوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس بار مسلمانوں کے قافلے میں کئی سو اونٹ بھی شامل تھے۔

اگرچہ اس موقع پر مسلمانوں کی مجموعی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی لیکن کچھ بدوی مسلمان اس سفر میں پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ نہ آئے۔ دراصل انہیں علم تھا کہ اہل مکہ اور خاص طور پر بنو قریش مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہیں۔ لہٰذا وہ یہ سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ قریش سے مقابلہ کرنے کی نیت سے مکہ جا رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چلنے سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایسے شہر پر حملہ کریں جو حرم ہے۔ یعنی جہاں کشت و خون کرنا حرام ہے۔

اس کے علاوہ جن ایام میں رسول اللہ ﷺ مکہ کی طرف جا رہے تھے تو وہ حرمت والے مہینوں کے ایام تھے۔ بدوی باشندے ان مہینوں میں نہ خود لڑائی کرتے اور نہ ہی کسی کے ساتھ لڑائی میں حصہ لیتے تھے۔ تاہم جن بدوی لوگوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مکہ جانے سے معذوری ظاہر کی تو وہ حال ہی میں مسلمان ہوئے تھے اور ان کا ایمانی جذبہ اتنا پختہ اور گہرا نہیں ہوا تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ہر دستور کی بے چوں و چرا اطاعت کریں۔ البتہ مسلمانوں کا ایک خاص گروہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ہمراہ مکہ جانے پر ازحد شاد اور مسرور تھا اور وہ تھا مہاجرین کا گروہ۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے چھ سال قبل حضرت محمد ﷺ کے ساتھ اپنے وطن اور گھر بار کو خیرباد کہا اور مدینہ کی جانب ہجرت کی تھی۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ مکہ جزیرۃ العرب کے تمام باشندوں کے لئے ایک مقدس شہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ چونکہ یہ وہی شہر ہے جہاں حضرت آدمؑ نے روئے زمین پر پہلی عبادت گاہ تعمیر کی اور یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی کہ خدائے لایزال کی عبادت کی جاسکے۔ تاہم مندرجہ بالا باتوں سے قطع نظر مکہ مہاجرین کا آبائی وطن بھی تھا۔ انہوں نے اسی شہر میں آنکھیں کھولی تھیں اور ان کے دلوں میں یہ تڑپ تھی کہ وہ اپنے وطن کو لوٹ آئیں تاکہ جب ان کی آنکھیں بند ہوں تو اپنے وطن کی مٹی میں ابدی نیند سوئیں اور اپنے عزیز و اقارب کی آغوش میں اس دنیا سے رخصت ہوں۔

ایک اصیل عرب اپنے وطن، قبیلے یا خاندان سے دور رہتے ہوئے موت سے ہم آغوش ہونے کو غایت درجے کی بدنصیبی تصور کرتا تھا اور عہد قدیم کے اعراب کی سب سے بڑی نفرین یا بددعا یہی تھی کہ جب اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے کسی کو کوستے تو کہتے 'رب کرے تجھے قبیلے سے باہر غربت میں موت آئے۔'

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب مسلمانوں کی جماعت مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئی تو اس میں شامل مہاجرین اس راستے کو سر کے بل نہیں بلکہ رقص کناں طے کر رہے تھے کیونکہ انہیں احساس تھا کہ وہ اس شہر کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں کہ جس کا نام سنتے ہی ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔

ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ مکہ مذہبی لحاظ سے ایک بین الاقوامی شہر تھا۔ خانہ کعبہ کے آس پاس تمام مذاہب کے حجرے موجود تھے۔ جہاں ان کے خداؤں اور دیوتاؤں کے مجسمے اور تصاویر رکھی جاتی تھیں۔ ہر انسان خواہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو بلا روک ٹوک مکہ میں داخل ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کر سکتا تھا۔ اسلام بھی اہل مکہ کی نظر میں دوسرے ادیان کی طرح ایک دین تھا لہٰذا قریش مسلمانوں سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ تمہیں مکہ میں قدم رکھنے اور کعبہ کی زیارت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر پیغمبر اسلام ﷺ بت پرستی کی مخالفت نہ کرتے اور بتوں کو باطل قرار دیتے ہوئے انہیں دور پھینک دینے کا نہ کہتے تو کسی کو ان سے کوئی عداوت نہ ہوتی۔ قریش کی اسلام دشمنی یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ حضرت محمد ﷺ ایسے تمام مذاہب کی نفی کرتے اور انہیں باطل قرار دیتے تھے جو بت پرستی پر قائم ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تمام بتوں کو توڑنے اور دور پھینکنے کے نظریئے پر سختی سے کاربند تھے۔

لیکن اس موقع پر جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ خانہ کعبہ کی زیارت کرنے مکہ جا رہے تھے تو ان کا مطمع نظر یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنائیں بلکہ آپؐ دوسرے عربوں کی طرح صرف خانہ کعبہ کی زیارت یا بقول مسلمانوں کے حج و عمرہ ادا کرنے مکہ جا رہے تھے۔

جس لمحہ پیغمبر اسلام ﷺ سوئے مکہ روانہ ہوئے تو ابوسفیان شہر میں نہ تھا اور شہر کے سرکردہ افراد اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ محمد ﷺ اور دوسرے مسلمانوں کے بارے میں کیا تدبیر اختیار کریں۔ البتہ اہل مکہ کی مصلحت اسی میں تھی کہ زائرین کعبہ خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں مکہ میں آزادانہ آمدورفت کریں۔ وہاں کے بازاروں میں خرید کریں جس کا فائدہ مکہ والوں کو پہنچے اور انہیں قربانی کا گوشت بھی نصیب ہو۔ لہٰذا دو ہزار مسلمانوں کے داخلے پر پابندی لگانا اہل مکہ کے فائدے میں نہ تھا بلکہ تجارتی نقطہ نظر سے نقصان دہ ثابت ہوتا۔ خاصہ یہ کہ حرمت کے مہینوں میں ہر انسان کو مکہ میں داخل ہونے کی آزادی تھی اور مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنا اس زمانے کے مروجہ آئین کی واضح خلاف ورزی تھی۔

مگر قریش مکہ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایسے لوگوں کو اپنے شہر میں آزادانہ گھومتے دیکھیں جن کے ہاتھوں مختلف جنگوں میں سخت ہزیمت اٹھا چکے تھے۔ قریش کے سرداروں کے لئے یہ گھڑی بہت کٹھن تھی اور وہ دوراہے پر کھڑے قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر تھے۔ اگر وہ مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے جدا کرتے اور کہتے کہ ان کا

ب اور ہے اور انہیں مکہ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں تو مکہ اپنی ہمہ گیر حیثیت کھو
۔ اس سلسلے میں صرف ایک خلاف ورزی کافی تھی کہ قریش کا بنایا ہوا اپنا ہی قانون بے
بار ہو جائے۔ مکہ کے بازار کی گہما گہمی ماند پڑ جائے اور اس کی بین الاقوامی حیثیت بھی
ں رہے۔

لیکن اگر یہ اجازت دی جاتی کہ مسلمان کئی سو اونٹوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہو
یں تو یہ اندیشہ تھا کہ وہ مکہ پر قبضہ نہ کرلیں اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو بھی اسلام کی روز
وں مقبولیت کا کیا توڑ تھا؟! اگر دو ہزار مسلمان مکہ میں داخل ہو جاتے تو اس بات کی کیا
نت تھی کہ جب وہاں سے نکلیں تو دو ہزار سے زیادہ نہ ہو جائیں!

انہی اندیشوں کے پیش نظر قریش مکہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آخرکار ان کی مصلحت
یشی اسلام دشمنی کے ہاتھوں مغلوب ہو گئی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مسلمانوں کا
ستہ روک دینا چاہئے۔ چنانچہ چالیس شہہ سواروں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ جائیں
ر مسلمانوں کا راستہ کاٹ کر انہیں مکہ کی جانب بڑھنے سے روک دیں۔ لیکن جب یہ
ب مسلمانوں کے سامنے ظاہر ہوئے تو جلد ہی ان کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور ان کے
میار بھی ضبط کر لئے گئے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ انہیں فدیہ وصول
ے بغیر چھوڑ دیا جائے اور ان کے ہتھیار بھی واپس کر دیئے جائیں۔ یہ بات خود مکہ کے
اروں کے لئے بھی جو اب آزاد ہو چکے تھے بہت تعجب آور تھی کیونکہ جزیرۃ العرب میں
ب کوئی شخص کسی کے ہاتھوں گرفتار ہوتا تو اسے آزاد نہیں کیا جاتا تھا مگر فدیہ دریافت
رنے کے بعد یا پھر دوسرے قیدی کے تبادلے کی صورت میں۔ اسی لئے مسلمانوں میں
ے کسی نے پوچھا' یا رسول اللہ! آپؐ نے کس لئے ان افراد کو فدیہ لئے بغیر آزاد کر دیا اور
ن کا اسلحہ بھی لوٹا دیا؟

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''اس لئے کہ ہم صرف زائر ہیں اور خانہ کعبہ
ں زیارت کرنے جا رہے ہیں اور جو زیارت کرنے جا رہا ہو تو وہ قیدی نہیں پکڑا کرتا۔''

اس واقعہ کے چند دنوں بعد دو سو سواروں کا ایک اور ٹولہ مسلمانوں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ یہ لوگ بھی قریش کے کہنے پر مکہ سے چلے تھے اور ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کی راہ میں حائل ہو جائیں۔ اس ٹولے کی قیادت ابو جہل کا بیٹا "عکرمہ" کر رہا تھا اور جب وہ مسلمانوں کی خیمہ گاہ کے پاس پہنچا تو اس وقت مسلمان نماز پڑھنے میں مشغول تھے۔ عکرمہ نے دیکھا کہ وہ سوئے کعبہ صفیں باندھے کھڑے ہیں۔

مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا منظر اتنا باعظمت اور روح پرور تھا کہ عکرمہ مرقع حیرت بنا دیکھتا گیا اور اسے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرات نہ ہو سکی۔ اس نے گھوڑے کی لگام موڑ لی لیکن وہاں سے دور نہ ہوا تاکہ بعد میں مسلمانوں کا راستہ روک سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اہل مکہ کے اندیشوں اور خدشات کو دور کرنے اور انہیں یہ سمجھانے کے لئے کہ مسلمان لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ایک ایلچی مکہ روانہ کیا تاکہ وہ قریش مکہ کے سامنے یہ وضاحت کرے کہ مسلمان لڑائی کے لئے نہیں آ رہے بلکہ ان کا مقصد صرف کعبہ کی زیارت کرنا ہے۔ اسی لئے ان کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔ اگر مسلمان جنگ کے لئے آتے تو نہتے نہ آتے بلکہ مختلف ہتھیاروں سے لیس ہو کر آتے۔

لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کا ایلچی مکہ نہ پہنچ سکا کیونکہ عکرمہ نے راستے میں ہی اسے جا لیا اور اس کے ہمراہ جتنے بھی اونٹ تھے ان کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ ایلچی اور اس کے ساتھی اونٹوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد ریگستان بھٹک گئے اور نزدیک تھا کہ پیاس کی شدت سے ہلاک ہو جائیں وہ کسی نہ کسی طور مسلمانوں کے قافلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسری طرف عکرمہ جو پیغمبر اسلام ﷺ کے ایلچی کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا تو وہ اسی گریز و تعاقب میں قافلہ اسلام سے دور ہو گیا اور مسلمان بلا روک و ٹوک اپنا سفر جاری رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب مسلمانوں کا قافلہ ایسے مقام پر پہنچا جسے سرزمین مکہ کی سرحد سمجھا جاتا تھا اور وہاں سے قربانی کے اونٹوں پر "علامت گزاری" کی رسم ادا کی

جائے۔

قربانی کے اونٹوں پر "علامت گزاری" یعنی ان کے بدن پر نشان لگانا دور جاہلیت کے عربوں کی مخصوص رسم تھی اور اس موقع پر پیغمبر اسلام ﷺ کی جانب سے اس رسم کی بجا آوری کا مقصد دراصل اہل مکہ کو یہ سمجھانا تھا کہ مسلمان صرف کعبہ کی زیارت کرنے یہاں آئے ہیں' لڑائی کرنے یا مکہ پر قبضہ جمانے کی نیت سے نہیں۔

یہاں یہ بتانا بھی خالی از لطف نہ ہو گا کہ کچھ مناسک حج جو آج بھی مسلمانوں کی طرف سے حج اکبر اور عمرہ کے موقعوں پر ادا کئے جاتے ہیں دراصل وہی ہیں جو دور جاہلیت کے عربوں کی طرف سے ادا کئے جاتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی جانب سے ان رسومات کی پابندی کا مقصد یہی تھا کہ عرب باشندے اسلام سے خوفزدہ نہ ہوں اور یہ اطمینان رکھیں کہ اسلام حج کی کہنہ رسومات کو منسوخ کرنے نہیں آیا اور نہ ہی مکہ کی مرکزی حیثیت ختم کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنا چاہتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے حج کی کہنہ رسومات کو قائم رکھتے ہوئے اس زمانے کے اعراب کو یہ سمجھانا چاہا کہ مسلمانوں کے نزدیک خانہ کعبہ اتنا ہی مقدس اور محترم ہے جتنا دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی نظر میں ہے اور جتنی لگن ایک بت پرست کو خانہ کعبہ سے ہے تو اتنی ہی ایک مسلمان کے دل میں اسی کی محبت رچی ہوئی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اتنے بھی سادہ لوح نہ تھے جو یہ نہ سمجھ سکیں کہ مکہ کے قریش خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں سے جو عقیدت جتاتے ہیں تو وہ قلبی ایمان اور اعتقاد کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی منافع کو محفوظ رکھنے کی خاطر ہے۔ یعنی قریش کی خانہ کعبہ سے عقیدت ان کے مالی فائدے سے وابستہ ہے۔ اگر مکہ کا بین الاقوامی مقام کمزور پڑ جائے تو قریش کے لئے زندگی صحیح معنوں میں کانٹوں کی سیج بن جائے گی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو بخوبی احساس تھا کہ کعبہ کی زیارت یعنی حج کی ظاہری رسومات اہل مکہ کے لئے انتہائی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ رسومات باقی ہیں تو مختلف مذاہب کے درمیان کعبہ کی

مرکزی حیثیت بھی قائم رہے گی اور مکہ بھی ایک بین الاقوامی شہر سمجھا جائے گا اور جب مکہ کی بین الاقوامی حیثیت قائم رہے گی تو مکہ کا بازار بھی ایک عالمی بازار کی حیثیت سے اپنی رونق برقرار رکھے گا اور یہ وہی چیز تھی جسے قریش اپنی آمدنی کا وسیلہ اور ہمیشہ جاری رہنے والے مالی فائدے کی ضمانت سمجھتے تھے۔

ابن ہشام' حمید اللہ' سرخسی' طبری' ابوداؤد اور سہیلی کہ یہ سب لوگ اسلامی تذکرہ نویسوں میں شمار ہوتے ہیں' رقمطراز ہیں کہ جب اونٹوں پر نشان لگائے جا رہے تھے' تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ قربانی کے لئے وقف ہیں تو پیغمبر اسلام ﷺ نے کچھ مسلمانوں کو اس غرض سے آس پاس کے علاقوں میں بھیج دیا کہ بدوی قبائل کو اونٹوں پر علامت گزاری کی خاص رسم دیکھنے کی دعوت دی جائے تاکہ وہ یقین کر لیں کہ مسلمان صرف کعبہ کی زیارت کرنے اور قربانی کی رسم ادا کرنے یہاں پہنچے ہیں کسی اور مقصد کے تحت نہیں۔

جب اونٹوں پر علامت لگانے یا بقول عربوں کے "سلیقہ" کی رسم ادا ہو گئی تو ہر اونٹ کی گردن میں ایک رسی بھی باندھ دی گئی جو اس زمانے کی رسم کے مطابق اس بات کی علامت تھی کہ یہ اونٹ قربانی کے لئے مخصوص ہیں۔

"سلیقہ" آج کی عربی زبان میں آداب معاشرت یا بقول انگریزوں کے Attiquates کو کہتے تھے یا پھر کھانے پینے کے مہذب طریقوں یا علم و ہنر کی خاص روش کو سلیقہ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عام محاورے میں اس لفظ کو کلمہ ذوق کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں "ذوق اور سلیقہ۔" لیکن قدیم عربی زبان میں سلیقہ اس نشان یا علامت کو کہتے تھے جو کسی اونٹ پر بندھی کاٹھی یا کجاوے کے تسموں کی رگڑ سے اس کے جسم پر بن گئی ہو۔ چنانچہ جب قربانی کے اونٹوں پر علامت لگانا مقصود ہوتا تو چونکہ وہ علامت کاٹھی کی رگڑ کے نشان سے ملتی جلتی تھی اسی لئے اسے بھی سلیقہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ہم یہ تو پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ جزیرۃ العرب میں اونٹنی کو انتہائی قیمتی جانور سمجھا جاتا تھا۔ خاص طور پر دوڑوں میں حصہ لینے والی اونٹنی تو بہت مہنگی ہوتی تھی اور اسے

"شیحانہ" کہتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے مذکورہ حج کے سفر میں کئی شیحانہ قربانی کے لئے وقف کر دیں تاکہ بدوی، اعراب یہ جان لیں کہ رسومات حج کی ادائیگی میں مسلمان ان سے پیچھے نہیں بلکہ آگے بھی بڑھ سکتے ہیں۔

جب قربانی کے اونٹوں پر نشان لگانے یعنی سلیقہ کی رسم ادا ہو گئی تو مسلمانوں کا قافلہ دوبارہ مکہ کی جانب روانہ ہوا لیکن اس بار ابوجہل کا لڑکا عکرمہ ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔

مشہور مؤرخ ابن ہشام، عکرمہ کی زبانی لکھتا ہے: "واتینا عند السلہ" یعنی جب ہم مسلمانوں کے سر پر پہنچے تو ان کی تلواریں نیام سے باہر تھیں۔ سلہ کا مطلب نیام سے تلوار برآمد کرنا ہے۔ عکرمہ کے اس بیان اور دوسری تاریخی روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمان مکہ جا رہے تھے تو ان کے پاس تلواریں موجود تھیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس زمانے میں تلوار صرف جنگی ہتھیار نہیں تھا بلکہ ایسا اسلحہ تھا جسے اس زمانے کے تمام مرد اپنے پاس رکھتے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج بھی جزیرۃ العرب کے اکثر باشندے اور عرب ممالک کے شیوخ ایک خنجر اپنی کمر سے باندھے رکھتے ہیں۔ یہ خنجر حقیقت میں ان کے لباس کا حصہ ہے اور اسے جنگی اسلحہ تصور نہیں کیا جاتا۔

لیکن اگر مسلمانوں نے تلواریں کھینچ لی ہوں تو یقیناً عکرمہ اور اس کے ہمراہیوں کو دیکھنے کے بعد ہی ایسا کیا ہو گا۔ ورنہ تلواریں برآمد کر لینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تاہم اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ تلواروں کے استعمال کی نوبت نہ آئی کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سفر میں خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر ٹپکے۔ لہٰذا عکرمہ کی بات بے وزن اور حقیقت سے دور دکھائی دیتی ہے۔ خاص طور پر اسلامی تذکرہ نویسوں نے اس کی تصدیق بھی نہیں کی ہے۔

جس مقام پر مسلمانوں نے قربانی کے اونٹوں پر نشان لگانے کی رسم ادا کی تھی اسے "ذوالحلیفہ" کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے اسی مقام پر عمرہ کے لئے احرام باندھے اور مکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

مسلمانوں کی طرف سے تلوار کھینچ لینے کی بات، جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان جیالے مکہ کے شہسواروں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے حساس موقع پر پیغمبر اسلام ﷺ قطعی طور پر خونریزی سے بچنا چاہتے تھے لہٰذا آپ نے ہر قسم کے ٹکراؤ سے بچنے کے لئے ذوالحلیفہ کا پہاڑی علاقہ اختیار کیا اور مکہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ پھر ذوالحلیفہ کی سرزمین سے گزرنے کے بعد وہ لوگ ایک انتہائی تنگ اور دشوار گزار پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے جہاں سے اونٹوں کا گزرنا ازحد مشکل اور خطرناک تھا۔

اس پہاڑی علاقے میں مسلمانوں کو سورج کی حدت اور پیاس کی شدت کی وجہ سے بہت رنج اٹھانے پڑے لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح یہ راستہ بھی طے کر لیا اور ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جو "حدیبیہ" کے نام سے مشہور تھا۔

حدیبیہ آج کی پیمائش کے مطابق مکہ سے گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا اور اس مقام سے مکہ کے خدوخال بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ان لوگوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں جو مکہ کے رہنے والے تھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے سینے میں دل نہیں مرغ بسمل ہے جو بری طرح پھڑپھڑا رہا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگلے ایک آدھ گھنٹے میں مکہ پہنچ کر اپنے وطن کی مٹی کو چوم سکیں گے۔ لیکن ٹھیک ایسے لمحات میں جبکہ کچھ مسلمان عقیدت و احترام کے جذبے کے تحت اور کچھ مکہ سے والہانہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سوچ رہے تھے کہ کاش ہمارے پر ہوتے تو ہم اڑ کر مکہ پہنچ جاتے کہ اچانک پیغمبر اسلام ﷺ کا اونٹ، جس کا نام "ثعلب" تھا، چلتے چلتے رکا اور پھر آہستگی سے زمین پر بیٹھ گیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اونٹ کو اٹھانا چاہا لیکن وہ اٹھنے کے بعد آگے بڑھنے کی بجائے ایک دو قدم پیچھے ہٹا اور دوبارہ زمین پر لگ گیا۔ اس مرتبہ رسول اللہ ﷺ اونٹ سے اتر آئے اور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے "اللہ کی مرضی یہی ہے کہ

ہم لوگ اسی جگہ پر قیام کریں۔" تب سارے مسلمان بھی اونٹوں سے اتر آئے لیکن وہ بہت غمگین اور دلبرداشتہ تھے کیونکہ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ مکہ کے دروازے پر پہنچ کر اچانک ٹھہرنا پڑ جائے گا۔

وہ جگہ جہاں پیغمبر اسلام ﷺ نے پڑاؤ ڈالا حدیبیہ کے علاقے میں واقع تھی اور اسے "عذیر الاشطاط" کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ بہار کے موسم میں وہاں پانی آسانی سے مل جاتا تھا لیکن اس موقع پر جب مسلمانوں نے عذیر الاشطاط میں پڑاؤ ڈالا تو وہاں پانی دیکھنے کو بھی نہ ملتا تھا۔ چنانچہ مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے: "یا رسول اللہ! ہم دو ہزار کے قریب ہیں اور کئی سو اونٹ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ اس علاقے میں جہاں ہم ٹھہرے ہیں پانی کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں اور آپؐ بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے خشک اور سوزاں علاقے میں پانی کے بغیر ایک پل بھی گزارا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہماری گزارش ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں کم سے کم پانی میسر ہو۔"

پیغمبر اسلام ﷺ کو بخوبی احساس تھا کہ اگر مسلمان ایک قدم بھی آگے بڑھے تو ان کے اور اہل مکہ کے درمیان لڑائی چھڑ جائے گی اور مکہ کی حدود میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی۔ اس بات کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ مکہ کے مضافات کا علاقہ بھی خانہ کعبہ کی طرح حرم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ماہ حرام میں کشت و خون کی شدت سے ممانعت تھی لہٰذا اگر مسلمان آگے بڑھتے تو ایام حج کی حرمت کے پامال ہونے کا بھی اندیشہ تھا۔ انہی وجوہات کے پیش نظر پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو جواب دیا کہ ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کیونکہ اللہ کی مرضی یہ ہے کہ ہم فی الحال یہیں پر ٹھہرے رہیں۔

مسلمانوں نے استفسار کیا "پھر پانی کے بغیر گزارا کیسے ہو گا؟"

روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور انتہائی عجز و انکساری سے بارگاہ الٰہی میں پانی کی درخواست کی اور کہا: "اے باری تعالیٰ اگر تو پانی مہیا نہ کرے تو مسلمان بے اختیار حرم میں داخل ہو جائیں گے۔" پھر جیسے ہی

پیغمبر اسلام ﷺ دعا سے فارغ ہوئے تو مسلمانوں میں سے ایک شخص جو غالباً" کاریز یعنی زیر زمین پانی کی تلاش کا ماہر تھا' پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچا اور بولا "یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے قدموں تلے پانی موجود ہے۔" یہ بات سنتے ہی مسلمانوں نے بے تابی سے اس جگہ کو کھودنا شروع کر دیا جہاں پیغمبر اسلام ﷺ کھڑے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے پانی پھوٹ پڑا اور یہ پانی اتنا زیادہ تھا کہ جب تک مسلمان وہاں ٹھہرے رہے تو انہیں ضرورت سے زیادہ پانی میسر ہوتا رہا۔

جب پانی کا مسئلہ حل ہو گیا اور اس سلسلے میں مسلمانوں کی پریشانی دور ہو گئی تو پیغمبر اسلام ﷺ نے عمرؓ بن خطاب سے کہا کہ وہ ایلچی کی حیثیت سے مکہ جائیں اور قریش کو سمجھائیں کہ ہم صرف کعبہ کی زیارت کرنے مکہ پہنچے ہیں' مقابلہ آرائی کی نیت سے نہیں آئے لہٰذا قریش ہمیں مکہ میں داخل ہونے اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے کی اجازت دے دیں!

حضرت عمرؓ بن خطاب حیران ہو کر بولے: "یا رسول اللہ ﷺ! میں کیسے یہ کام انجام دے سکتا ہوں' کیونکہ میرے خیال میں جب آپ مکہ میں داخل ہو سکتے ہیں اور خانہ کعبہ کی زیارت کر سکتے ہیں تو قریش سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

حضرت عمرؓ مضبوط جسم' بلند قامت اور کشادہ سینے کے مالک ہونے کے علاوہ قول کے پکے' بات کے اٹل اور انتہائی صاف گو انسان تھے لیکن کچھ پیچیدگیوں کو بروقت سمجھ نہیں پائے تھے۔ حضرت عمرؓ اہل تزکیہ بھی تھے۔ اسی لئے عام لوگ انہیں "زکی" کے لقب سے پہچانتے تھے۔ عرب باشندے ایسے افراد کو جو راست گفتار اور بلند کردار ہوں "زکی" کے نام سے پکارتے تھے۔

بہت سے لوگوں کی نظر میں اچھے اور برے کے درمیان ایک فاصلہ ہے اور اس فاصلے میں کچھ ایسے بھی مرحلے ہیں جو اچھے اور برے کے درمیانی فاصلے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی نظر میں ہر چیز کھری تھی یا کھوٹی' اچھی تھی یا بری' انصاف کی تھی یا بے انصافی

کی لیکن وہ ان کی درمیانی حد کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ حضرت عمرؓ کی نظر میں اسلام ایک سچا اور برحق دین تھا اور مسلمانوں کو اللہ کی حمایت حاصل تھی لہٰذا ان کے خیال میں اس بات کی قطعی ضرورت نہ تھی کہ مسلمان مکہ میں داخل ہونے کے لئے قریش سے پیشگی اجازت لیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایلچی بن کر قریش کے پاس جانے سے معذوری ظاہر کردی۔

تب پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ ذمہ داری حضرت عثمانؓ کے سپرد کردی۔ حضرت عثمانؓ پیغمبر اسلام ﷺ کے داماد تھے اور ان لوگوں میں شمار ہوتے تھے جنہوں نے پہلی بار ہجرت کی، مکہ سے حبشہ روانہ ہوئے اور وہاں سے مدینہ پہنچے۔ حضرت عثمانؓ پیغمبر اسلام ﷺ کی صاحبزادی رقیہؓ کے شوہر تھے اور ان کی وفات کے بعد انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی دوسری بیٹی حضرت ام کلثومؓ سے نکاح کرلیا تھا۔

حضرت عثمانؓ عمدہ لباس پہننے اور مختلف محفلوں میں شریک ہونے کے شوقین تھے۔ اسی لئے انہیں مجلسی آداب سے پوری واقفیت تھی۔ وہ گفتگو کے دوران کسی بھی بات کی صراحت سے مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ زیادہ تر مصلحت اندیشی سے کام لیتے تھے جبکہ حضرت عمرؓ کسی پردہ پوشی یا مصلحت اندیشی کے بغیر اپنے نظریات کا اظہار کردیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک سماجی یا بقول ہمارے سوشل انسان تھے اور مختلف مجالس میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے ان کی یہ عادت بن چکی تھی کہ کچھ اس انداز میں گفتگو کریں کہ کسی کی رنجش کا سبب نہ بنے۔ بہرحال وہ حضرت محمد ﷺ کی تجویز سنتے ہی اپنے اونٹ پر بیٹھے اور مکہ کی جانب روانہ ہوگئے لیکن ان کی واپسی نہ ہوسکی۔

جہاں مسلمان ٹھہرے ہوئے تھے وہاں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو مکہ میں نظربند کردیا گیا ہے۔ پھر یہ خبر بھی موصول ہوئی کہ حضرت عثمانؓ قتل ہوگئے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کو حضرت عثمانؓ کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اپنی روش تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ انہوں نے کس

مقصد کے تحت حج و عمرہ کے بہانے مدینہ سے مکہ تک کا سفر طے کیا ہے۔ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ جیسے بھی ہو اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان دوستی اور مفاہمت کی فضا برقرار ہو جائے تاکہ مدینہ اقتصادی ناکہ بندی سے چھٹکارا پالے' دوسرے یہ کہ اہل مکہ جان لیں کہ اسلام' عرب قوم کا دشمن نہیں بلکہ حامی ہے اسی لئے مسلمانوں کے دل میں کعبہ کی وہی اہمیت ہے جو قریش کے دلوں میں ہے۔ دراصل بنو قریش کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ حضرت محمد ﷺ نئے دین کی آڑ میں مکہ کو اس کے حقیقی مقام سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ قریش کے نزدیک مکہ کی مرکزی حیثیت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی مگر یہ کہ اس کی تجارتی حیثیت برقرار رہے۔ لہٰذا اگرچہ اہل مکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے زبردست دشمن تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ نے عمرہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ اہل مکہ اور خاص طور پر بنو قریش کو یہ سمجھا سکیں کہ مسلمان بھی خانہ کعبہ کو بادیدۂ احترام دیکھتے ہیں اور اسے اپنے معبود کا گھر تصور کرتے ہیں۔

لیکن جب حضرت عثمانؓ کے قتل ہونے کی خبر پھیلی تو حضرت محمد ﷺ نے تمام مسلمانوں کو ایک درخت تلے جمع ہونے کو کہا۔ یہ درخت حدیبیہ کی حدود میں عذیر الاشطاط نامی علاقے میں واقع تھا۔

ایسے درخت جو عظیم جثہ اور کہن سال ہوں اور جن کی جڑیں زمین کی گہرائی میں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہوں تو انہیں عام درختوں کی طرح پانی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ایسے درخت اپنی جڑوں کی مدد سے زمین کی گہرائیوں سے پانی حاصل کر لیتے ہیں اور ہمیشہ ایک مضبوط اور گھنے درخت کی شکل میں اپنا وجود قائم رکھتے ہیں۔ اسلامی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت جس کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہمراہیوں کو اکٹھا ہونے کی دعوت دی تھی' تو وہ اتنا بڑا اور گھنا تھا کہ سارے مسلمان اس کے سائے تلے جمع ہو گئے تھے۔ لہٰذا ہمیں ایسے خشک علاقے میں اتنے گھنے درخت کے ہونے پر تعجب نہیں کرنا چاہئے۔

جب سارے مسلمان جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس لئے تم لوگوں کو یہاں بلایا ہے کہ تم سے ایک وعدہ لوں اور وہ یہ ہے کہ تم رسول اللہؐ کے احکام پر بے چوں و چرا عمل کرو گے خواہ وہ احکام تمہاری ذاتی پسند یا مرضی کے خلاف ہوں یا تمہاری عقل انہیں سمجھنے سے قاصر رہے۔

جب پیغمبر اسلام ﷺ کی گفتگو اختتام کو پہنچی تو مسلمانوں میں سے ایک شخص' جن کا نام سنانؓ تھا' اپنی جگہ سے اٹھے اور گویا ہوئے: "یا رسول اللہ! میں قسم اٹھاتا ہوں کہ آپ جو بھی حکم کریں میں بلا جھجک اس کی تعمیل کروں گا چاہے وہ حکم میری نظر میں عجیب ہو یا میری عقل اسے ماننے سے انکار کردے۔"

پھر سنانؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے اور ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا یعنی بیعت کرلی۔ اطاعت اور فرمانبرداری کا یہ منظر دیکھ کر مسلمانوں کی صفوں میں ایمانی جوش اور ولولے کی لہر دوڑ گئی اور ایسی ہیجانی کیفیت طاری ہوئی کہ سارے مسلمان یکایک اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ بیعت کرنا شروع کردی۔ یعنی انہوں نے عہد کیا کہ وہ لوگ اپنے رسولؐ کے حکم کی بے چوں و چرا پیروی کریں گے چاہے وہ حکم ان کی مرضی کے مطابق ہو یا نہ ہو اور ان کی عقل اسے مانے یا نہ مانے۔

چنانچہ اس گھنے درخت کے نیچے لی جانے والی بیعت کو اسلامی تاریخ میں "بیعت رضوان" کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں اس بیعت کو سراہا ہے۔ قرآن کی سورت "الفتح" میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اپنی خوشنودی اور رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"اے محمدؐ! جب مومنین نے اس درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی تو اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اللہ یہ جانتا ہے کہ مومنین کے دل میں کیا ہے (یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دل اپنے پیغمبرؐ کے لئے بے انتہا محبت اور خلوص سے مالا مال ہیں) للہذا ان پر ایسی چیزیں نازل کیں جو ان کے دلوں کی تسکین کا سبب بنیں اور اس (بیعت) کے صلے میں اللہ نے

انہیں فتح و نصرت سے نوازا۔"

الغرض چونکہ مسلمانوں نے حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کی نسبت عدیم المثال وفاداری اور بے مثال فرمانبرداری کا ثبوت فراہم کیا تو اس لئے اللہ نے انہیں ایک بڑے انعام سے نوازا۔ وہ بڑا انعام دراصل فتح خیبر تھی جس کے بارے میں ہم آئندہ باب میں گفتگو کریں گے۔

دوسری جانب جب اہل مکہ اور خاص طور پر بنو قریش کو بیعت رضوان کا علم ہوا تو ان کے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں کیونکہ انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ اس بیعت کے مطابق سارے مسلمان یہ عہد کر چکے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے ہر حکم پر بے چوں و چرا عمل کریں گے اور ان کے ایک اشارے پر اپنی جان تک نچھاور کر دیں گے۔ اسی لئے قریش کو یہ گمان گزرا کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے جو بیعت لی ہے تو اس کا مقصد یہی ہے کہ مکہ پر حملہ آور ہوں اور جو بھی راستے میں آئے اسے موت کے گھاٹ اتار دیں اور جو بچ جائیں انہیں غلام یا لونڈی بنا کر ساتھ لے جائیں!

مکہ کے قریش تین جنگوں یعنی بدر' احد اور خندق میں پیغمبر اسلام ﷺ کی قائدانہ صلاحیتوں کے جوہر دیکھ چکے تھے اور ان کے دلوں پر عام مسلمانوں کی شجاعت اور دلیری کی دھاک پہلے ہی بیٹھی ہوئی تھی لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اگر مسلمان مکہ پر حملہ کر دیں تو یقینی طور پر یہ شہر ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ یہ خیال آتے ہی ان پر خوف طاری ہو گیا اور انہوں نے فی الفور حضرت عثمانؓ کو آزاد کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے داماد مکہ سے حدیبیہ پہنچے اور یہ پیغام لائے کہ مکہ کے قریش حضرت محمد ﷺ کے ساتھ مذاکرات انجام دینے پر آمادہ ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ایک وفد روانہ کریں جو آپؐ سے ملاقات کرے اور باہمی مسائل کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ یوں مکہ کے سردار نہ صرف یہ کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ گفتگو کرنے پر راضی ہو گئے بلکہ انہوں نے ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو' جو مسلمانوں کا تعاقب

کرتے ہوئے حدیبیہ تک پہنچ گیا تھا' یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ مسلمانوں کے لئے مزید مزاحمت نہ کرے۔

اگر پیغمبر اسلام ﷺ' حضرت عمرؓ کا نظریہ مان لیتے اور بدستور مکہ کی طرف گامزن رہتے تو ان کے اور عکرمہ کے ٹولے کے درمیان خوفناک لڑائی چھڑ جاتی اور مکہ کے سرداروں کو یہ کہنے کا بہانہ مل جاتا کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے ماہ حرام میں اور حرم کی حدود میں خون خرابہ کیا ہے لیکن پیغمبر اسلامؐ نے خون کا ایک قطرہ ٹپکائے بغیر مکہ کے قریش کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ عداوت چھوڑ کر خود پیش قدم ہوں اور یہ درخواست کریں کہ ان کے نمائندے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مختلف معاملات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ جنگ احد ایک ماہر جنگ کی نظر میں شکست نہ تھی کیونکہ قشون مکہ نہ تو اسلامی لشکر کا صفایا کر سکا اور نہ ہی مملکت اسلامی یعنی مدینہ پر قبضہ جما سکا تو اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کا حدیبیہ میں قیام اور قریش کے مقابلے میں نرم رویہ اختیار کرنا کچھ اسلامی مؤرخین کے نظریات کے برعکس ایک سیاسی شکست نہ تھی بلکہ انتہائی اہم اور دوررس نتائج کی حامل کامیابی تھی.....!

اگر کوئی انسان اہل سیاست نہ ہو یعنی سیاسی سوجھ بوجھ نہ رکھتا ہو تو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیبیہ میں اپنی سیاسی مہارت سے اپنے حریف کو مات کر دیا اور اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ان کے ارادوں کے سامنے تسلیم ہو جائے البتہ قریش صرف مذاکرات کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ درپردہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی صورتحال کیا ہے۔ آیا وہ ہتھیاروں سے لیس ہیں یا نہیں اور اگر مسلح ہیں تو پیغمبر اسلام ﷺ کی نسبت ان کی وفاداری کس نوعیت کی ہے؟

پہلا شخص جو مکہ والوں کی طرف سے حدیبیہ جانے اور حضرت محمد ﷺ کے ساتھ مذاکرات انجام دینے پر مامور ہوا تو اس کا نام عروہ بن مسعود ثقفی تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے تھا اور وہ طائف کے اشراف میں شمار ہوتا تھا لیکن فی زمانہ طائف سے

کوچ کر کے مکہ میں مقیم ہو گیا تھا۔ عروہ بن مسعود نے اسی درخت کے نیچے جہاں بیعت رضوان انجام ہوئی تھی، پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ تم لوگ کس مقصد کے تحت مکہ آئے ہو؟

حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا کہ ہم صرف خانہ کعبہ کی زیارت کرنے یہاں پہنچے ہیں کسی سے تنازعہ کرنے نہیں آئے۔ پھر آپؐ نے کہا کہ قربانی کے وہ اونٹ جن پر نشان لگائے گئے ہیں عروہ بن مسعود کو دکھائے جائیں۔

عروہ بن مسعود چند مسلمانوں کی معیت میں ان کی خیمہ گاہ تک گیا اور اونٹوں کو دیکھنے کے بعد واپس آ گیا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ اسے ہنوز یقین نہیں کہ مسلمان صرف کعبہ کی زیارت کرنے آئے ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بڑی بیباکی سے حضرت محمد ﷺ کے چہرے پر رکھتے ہوئے بولا: "یا محمد! کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ لوگ جو تمہارے آس پاس کھڑے ہیں جنگ کی صورت میں تمہارا ساتھ دیں گے اور تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں بھاگ نکلیں گے؟"

یہ منظر دیکھتے ہی مسلمانوں میں سے ایک شخص مغیرہؓ بن شعبہ نے اپنی تلوار کی نوک عروہ کے ہاتھ میں چبھوتے ہوئے غضبناک انداز میں کہا: "اے عروہ! مؤدب رہ اور بات کرتے وقت رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر ہاتھ مت رکھ۔" عروہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا جس پر حضرت ابو بکرؓ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اے عروہ! اگر تو ایلچی کی حیثیت سے یہاں نہ آیا ہوتا تو ہم تجھے اس گستاخی کے بدلے میں موت کے گھاٹ اتار دیتے لیکن سن کہ ہم مسلمان لڑائی کے وقت اپنے پیغمبرؐ کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑتے۔ اگر تو جنگ بدر اور احد میں ہوتا تو تجھے رسول اللہ ﷺ سے مسلمانوں کی والہانہ عقیدت کا اندازہ ہو جاتا اور تجھے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

یہ جواب سننے کے بعد عروہ بن مسعود مکہ کی طرف روانہ ہو گیا اور اس نے قریش کے سرکردہ افراد کے سامنے اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے کہا: "اے قریش کے بزرگو!

میں نے روم کا دربار دیکھا ہے اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کا بھی' لیکن جو وفاداری اور جانثاری مسلمانوں کے دلوں میں محمد ﷺ کے لئے پائی جاتی ہے وہ مجھے روم اور حبشہ میں قیصر اور نجاشی کے لئے دیکھنے کو بھی نہ ملی۔"

عروہ بن مسعود کے بعد ایک اور شخص جو قبیلہ بنی کنانہ کا رکن تھا قریش کے سفیر کی حیثیت سے حدیبیہ روانہ ہوا تاکہ پیغمبر اسلام ﷺ اور دوسرے مسلمانوں سے ملاقات کرے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ لوگ کس نیت سے یہاں آئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ جو شخص مکہ سے آیا ہے اس کا تعلق بنی کنانہ سے ہے۔ آپؐ نے کہا کہ یہ شخص ایسے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس کے ارکان قربانی کے اونٹوں کا بڑا احترام کرتے ہیں لہٰذا تم لوگ قربانی کے اونٹوں کو آگے لے جاؤ تاکہ وہ نزدیک سے انہیں دیکھ سکے۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا اور قربانی کے اونٹوں کو آگے کی طرف ہنکا کر خود حج کا مشہور ذکر "لبیک اللھم لبیک" کہتے ہوئے ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔

جیسے ہی مکہ سے آنے والے نمائندے کی نظر قربانی کے اونٹوں پر پڑی اور اس نے دیکھا کہ مسلمان حج کا خاص ذکر ادا کر رہے ہیں تو وہ مطمئن ہو کر لوٹ گیا اور قریش سے کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے قربانی کے اونٹوں کو دیکھا ہے جن پر سلیقہ (یعنی قربانی کا مخصوص نشان) بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ان لوگوں کو حج کا مخصوص ذکر بھی پڑھتے سنا ہے لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ صرف کعبہ کی زیارت کرنے آئے ہیں اور میرے خیال میں ان کا راستہ نہیں روکنا چاہیے۔

لیکن قریش کی تشویش میں کمی نہ ہوئی اور وہ اس بار بھی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر رہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ایک بار پھر کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کرنے اور مذاکرات انجام دینے کی غرض سے حدیبیہ روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مرتبہ "حلیس بن علقمہ" کو یہ ذمہ داری سونپی گئی جو دراصل قبیلہ احابش کا سربراہ تھا۔ قبیلہ احابش مکہ کے پاس رہنے والے قبائل میں سے ایک تھا اور قریش کی نظر

میں حلیس بن علقمہ کی بہت عزت تھی۔ وہ اسے ایک نیک اور سچا انسان تصور کرتے تھے۔

حلیس مکہ سے نکلا اور حدیبیہ کی جانب گامزن ہو گیا اور جب وہاں پہنچا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ ہدایات جاری کیں کہ قریش کے نمائندے کو آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جہاں بھی جانا چاہے جائے' جس سے بھی چاہے ملاقات کرے اور جو چاہے شوق سے دیکھے۔

حلیس بن علقمہ نے بھی یہی دیکھا کہ سارے مسلمان احرام باندھے ہوئے ہیں اور قربانی کے اونٹوں پر مخصوص نشان بھی لگے ہیں۔ حلیس کو مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں جنگی ہتھیاروں کے آثار دکھائی نہ دیئے بلکہ اس نے دیکھا کہ کچھ اونٹ بھوک کی شدت سے ایک دوسرے کے بال نوچ کر کھا رہے ہیں۔

یہ چیزیں دیکھنے کے بعد حلیس بن علقمہ تیزی سے مکہ پہنچا اور قریش کے اجلاس میں اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے بولا: "اے مکہ کے سردارو! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کا مقصد صرف خانہ کعبہ کی زیارت کرنا ہے۔ وہ کسی اور نیت سے یہاں نہیں آئے۔ میرے خیال میں انہیں مکہ آنے کی آزادی ہونی چاہئے تاکہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح خانہ کعبہ کی زیارت کر سکیں۔"

قریش نے جواب دیا کہ ہمیں صرف اس شخص کا (یعنی پیغمبر اسلامؐ کا) ڈر ہے۔ اگر وہ مکہ میں داخل ہو گیا تو کہیں ہمارے شہر پر قبضہ نہ جما لے۔ حلیس بن علقمہ نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔ "میں قسم اٹھانے کو تیار ہوں کہ محمد ﷺ اور اس کے ساتھی سوائے زیارت کے کوئی اور مقصد لے کر یہاں نہیں آئے۔ اگر وہ لوگ مکہ پر قبضہ کرنے کا سوچ کر آتے تو خالی ہاتھ نہ چلے آتے بلکہ اپنے ساتھ جنگی ساز و سامان لے کر آتے۔ میں نے ان کی اقامت گاہ میں ایک بھی نیزہ' زرہ یا ڈھال تک نہ دیکھی۔"

لیکن اس وضاحت کے باوجود قریش کے سردار مسلمانوں کی مکہ آمد پر رضامند نہ ہوئے تو حلیس کو غصہ آ گیا اور وہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا: "تمہارا یہ عمل ایک

مل بخشش گناہ ہے تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ کعبہ کی زیارت کو آنے والوں پر
ری لگاؤ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کعبہ کی زیارت دنیا کے تمام باشندوں کے لئے آزاد ہے
لیکہ وہ کعبہ پر ایمان رکھتے ہوں۔ لہٰذا تم کن اختیارات کی بنا پر مسلمانوں کو جو خانہ کعبہ
مل یقین رکھتے ہیں مکہ آنے سے روک رہے ہو۔ سنو! اگر تم نے محمد ﷺ یا اس
پیروکاروں کو مکہ آنے اور کعبہ کی زیارت کرنے سے منع کیا تو میں تم لوگوں سے علیحدہ
باؤں گا اور تم بھی آج کے بعد مجھے اپنا اتحادی نہ سمجھنا۔"

قریش کے بزرگوں میں سے کچھ نے حلیس بن علقمہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش
اور اسے سمجھاتے ہوئے بولے: "اے حلیس! تم ایک صحرائی باشندے ہو۔ دل کے
قول کے پکے' لیکن بہت سادہ لوح ہو اسی لئے دوسرے کے باطنی ارادوں کو نہیں
سکتے۔ تم ذرا صبر کرو تاکہ ہم مزید صلاح مشورہ کریں اور ایسا راستہ اپنائیں جس میں
مکہ کی بہتری ہو!"

یوں قریش مکہ مزید دو دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور ان دو دنوں میں وہ لوگ' جو
ی چھپے مسلمانوں کا جائزہ لینے مکہ سے حدیبیہ جاتے تو واپسی پر قریش کی مجلس شوریٰ
دارلندوا میں پیش ہو کر باری باری اپنے مشاہدات بیان کرتے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ
انوں کو محمد ﷺ سے غایت درجے عقیدت ہے اور وہ ان کا اس قدر احترام کرتے
کہ اگر آپ' پانی کا ایک پیالہ طلب کریں تو بیسیوں افراد پانی لانے کے لئے دوڑ اٹھتے
اور جو لوگ پانی نہ لا سکیں یا ان تک نہ پہنچا سکیں تو وہ اپنے آپ کو انتہائی بدنصیب
ن سمجھنے لگتے ہیں۔

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی زندگی میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ دن میں
مرتبہ کعبہ کی طرف منہ پھیر کر صفیں باندھ لیتے ہیں اور اپنی خاص عبادت بجالاتے
۔ اس عبادت کی ادائیگی کے وقت ان کا نظم دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور دیکھنے والا اس
مف بیان نہیں کر سکتا۔

حدیبیہ سے واپس آنے والوں کا بیان تھا کہ محمد ﷺ کے لئے مسلمانوں کی وفاداری اتنی زیادہ ہے کہ اگر وہ ایک اشارہ کر دیں تو سارے مسلمان ان پر اپنی جان نچھاور کر دیں یا اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں۔

قریش کے بزرگوں نے یہ باتیں سنیں تو ان پر مزید وحشت طاری ہو گئی اور بقول شخصے ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آخر کار انہوں نے دو شب و روز کے طویل مذاکرات کے بعد ''سہیل بن عمرو'' نامی شخص کو ایک وفد کی قیادت سونپی تاکہ وہ حدیبیہ جائے اور پیغمبر اسلام ﷺ سے ضروری مذاکرات انجام دینے کے بعد مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان ''عدم جارحیت'' کا معاہدہ منعقد کرے۔

روایت ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ نے سہیل بن عمرو کو اپنی جانب آتے دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہمارا کام سہل (یعنی آسان) ہو گیا ہے۔ جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ لغوی اعتبار سے سہیل کا لفظ سہل ہی سے ماخوذ ہے۔

جب قریش کے نمائندوں اور پیغمبر اسلام ﷺ کے درمیان مذاکرات کے کئی دور ہو چکے تو وہ دن آ گیا جب فریقین میں جنگ نہ کرنے اور ایک دوسرے کو حملے کا نشانہ نہ بنانے کا معاہدہ طے ہونا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے داماد حضرت علیؓ بن ابی طالب کو بلوایا اور ان سے کہا کہ وہ معاہدے کی دستاویز تیار کریں۔

حضرت علیؓ نے قلم ہاتھ میں تھاما اور اس طرح لکھنا شروع کیا۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

یہاں سہیل بن عمرو نے فوراً ٹوکا اور بولا ''میں رحمٰن اور رحیم کو نہیں جانتا۔ علی کو ''باسمک اللہم'' لکھنا چاہئے کیونکہ قدیم زمانے سے ہم عربوں کے تمام معاہدے اسی نام سے شروع ہوتے ہیں۔''

حضرت علیؓ نے پیغمبر اسلامؐ سے پوچھا: ''یا رسول اللہ! کیا کروں؟''

حضرت محمد ﷺ نے جواب دیا: ''یا علی! لکھ دو باسمک اللہم۔''

پھر پیغمبرؐ کے داماد نے ان کے کہنے پر یوں لکھنا شروع کیا۔ "یہ معاہدہ منعقد ہوتا ہے' محمد رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو کے درمیان۔"

لیکن سہیل بن عمرو نے ایک بار پھر اعتراض اٹھایا اور کہا کہ یوں مت لکھو کیونکہ ہم تمہیں اللہ کا رسول نہیں مانتے اور اگر مانتے تو مکہ میں آنے سے کیوں روکتے؟ لہٰذا اس معاہدے کا آغاز یوں ہونا چاہئے:

"یہ معاہدہ منعقد ہوتا ہے محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان۔"

حضرت علیؓ نے پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف دیکھا اور آپؐ نے کہا: "یا علی! وہی لکھو جو سہیل کہتا ہے تاکہ اس کی رضامندی حاصل رہے۔" ان دو باتوں کے علاوہ سہیل نے کوئی اور اعتراض نہ اٹھایا چونکہ معاہدے کے بنیادی اصولوں پر پہلے ہی اتفاق رائے ہو چکا تھا۔

حضرت علیؓ نے، جو خود ایک عظیم دانشور، ایک باذوق خوشنویس اور اسلام کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے' درج ذیل الفاظ میں معاہدہ لکھنا شروع کیا۔

"باسمک اللھم۔ یہ معاہدہ منعقد ہوتا ہے محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان اور اس معاہدے کی رو سے قریش یہ منظور کرتے ہیں کہ آئندہ دس سال تک مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان متارکہ جنگ قائم رہے۔"

"ان دس سالوں میں اگر کوئی شخص بنو قریش کی اجازت کے بغیر مسلمانوں سے آ ملے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اسے قریش کے حوالے کر دیں لیکن اگر کوئی شخص مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر قریش کے پاس آ جائے تو وہ اسے مسلمانوں کے حوالے نہیں کریں گے۔"

"متارکہ جنگ کے ان دس سالوں میں نہ کوئی فریق دوسرے کی جان اور مال پر تعرض کرے گا اور نہ ہی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

"اس دس سالہ مدت میں قریش کو اجازت ہو گی کہ جس کے ساتھ چاہیں عہد و پیمان

باندھیں اور آزادانہ اتحاد قائم کریں۔ اسی طرح مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ جس کے ساتھ بھی چاہیں معاہدہ کریں اور اپنی مرضی سے راہ و رسم بڑھائیں۔"

"مسلمانوں کو اس سال مکہ میں داخل ہونے اور کعبہ کی زیارت کرنے کی اجازت نہیں ہو گی لیکن اگلے سال وہ کعبہ کی زیارت کے لئے آ سکتے ہیں۔ تاہم شرط یہ ہے کہ تین دن سے زیادہ مکہ میں نہیں ٹھہریں گے اور تلوار کے علاوہ کوئی دوسرا ہتھیار اپنے ساتھ نہیں لائیں گے۔"

یہ معاہدہ جو ہجرت کے ساتویں سال پیغمبر اسلام ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان منعقد ہوا آج بھی اسلامی مؤرخین کے لئے بحث و مباحثے کا موضوع بنا ہوا ہے اور جو چیز اس بات کا سبب بنی کہ اسلامی مؤرخین اس معاہدے کے فوائد اور مثبت اثرات نہ سمجھ سکیں یہ تھی کہ اس معاہدے سے اس وقت کے مسلمانوں کو بہت صدمہ پہنچا اور ان کی دل شکنی ہوئی۔ حتیٰ کہ ان میں سے کچھ نے اس معاہدے کو اپنی شکست اور خفت سے تعبیر کیا۔

مسلمان اس وقت احرام باندھے ہوئے تھے اور قربانی کے اونٹوں پر سلیقہ (یعنی نشان) بھی لگا چکے تھے اور صرف اس بات کے منتظر تھے کہ مکہ میں داخل ہوں اور خانہ کعبہ کا طواف کریں۔ اس کے علاوہ بعض مسلمان مکہ کے رہنے والے تھے مکہ ان کا مرزبوم تھا۔ ان کے دلوں میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ اپنے آبائی شہر میں قدم رکھیں اور اس کی مٹی کو چوم لیں۔ اس لمحہ انہیں یقین تھا کہ ان کی یہ آرزو جلد ہی عملی جامہ پہننے والی ہے لیکن مذکورہ معاہدے کی ایک شق نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ چنانچہ سبھی مسلمان، کیا انصار کیا مہاجر، قریش کی طرف سے لگائی جانے والی پابندی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے اور اسے اپنی توہین سمجھ رہے تھے لیکن چونکہ وہ لوگ اپنے پیغمبر ﷺ کے لئے غایت درجے کے احترام کے قائل تھے لہٰذا چپ سادھے ہوئے تھے اور دم نہیں مارتے تھے اور ان میں صرف ایک شخص اپنے دل کی بات زبان پر لا سکا اور وہ تھے حضرت

عمرؓ بن خطاب!

حضرت عمرؓ اتنے صاف اور سادہ اور دل کے سچے تھے کہ اپنے احساسات کو چھپا نہیں سکتے تھے، جو ان کے دل میں آتا وہی زبان پر جاری ہو جاتا تھا۔ اسی لئے وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچے اور سوال کیا۔ "یا رسول اللہ! کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم مکہ جائیں گے اور خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟"

پیغمبرؐ نے جواب دیا۔ "بالکل، یا عمر! میں نے یہی کہا تھا لیکن میں نے یہ کب کہا کہ ہم اس سال مکہ میں داخل ہوں گے!"

"پھر ہم کب مکہ جائیں گے اور خانہ کعبہ کا طواف کر سکیں گے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا۔

"تم انشاء اللہ اگلے سال مکہ ضرور جاؤ گے اور خانہ کعبہ کا طواف کرنے کی سعادت حاصل کرو گے۔" حدیبیہ کے معاہدے کی وجہ سے مسلمانوں کے دل غم وغصے سے تو پہلے ہی بھرے تھے لیکن ایک اور واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سہیل بن عمرو کا، جس نے قریش کے وفد کی قیادت کی تھی اور ان کی جانب سے معاہدے پر دستخط کئے تھے ایک لڑکا تھا جس کا نام ابوجندل تھا۔ وہ اپنے باپ کو لاعلم رکھتے ہوئے مسلمان ہو چکا تھا۔

معاہدہ حدیبیہ پر دستخط ہونے کے دو دن بعد ابوجندل مکہ سے بھاگ نکلے اور حدیبیہ پہنچ کر مسلمانوں سے آ ملے۔ انہوں نے بتایا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور تم میرے دینی بھائی ہو لہٰذا مجھے پناہ دو۔ لیکن ابوجندلؓ کے حدیبیہ پہنچتے ہی سہیل بن عمرو بھی وہاں آ دھمکا اور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا: "ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدے کی رو سے اگر کوئی شخص قریش کے ہاتھوں سے بھاگ نکلے اور تمہاری پناہ میں آ جائے تو تمہارا یہ فرض بنتا ہے کہ اسے ہمارے حوالے کر دو۔ لہٰذا میرے لڑکے ابوجندل کو میرے حوالے کیا جائے۔" پیغمبر اسلام ﷺ، ابوجندلؓ کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے اور انہیں لوٹا

دینے پر مجبور تھے چونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حال ہی میں منعقد ہونے والا معاہدہ ٹوٹ جاتا۔ چنانچہ آپؐ نے بادل نخواستہ ابوجندلؓ کو ان کے باپ کے حوالے کر دیا۔ اس سے پہلے کہ ابوجندلؓ اپنے باپ کی گرفت میں آتے' انہوں نے ملتجی ہو کر کہا: "یا رسول اللہؐ! میرا باپ مجھے مار ڈالے گا۔"

پیغمبر اسلام ﷺ نے دلاسا دیتے ہوئے کہا: "ابوجندلؓ ڈرو نہیں۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا"..... اور ایسا ہی ہوا۔ ابوجندلؓ موت سے بچ گئے اور زندہ رہے۔

لیکن اس واقعہ سے مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور کعبہ کی زیارت سے محروم ہونے کے بعد ان کے اعصاب پر یہ دوسری کاری ضرب لگی۔ اگر اس سے پہلے ان لوگوں نے یہ بیعت نہ کی ہوتی کہ پیغمبر گرامی ﷺ کے ہر حکم کو مانیں گے خواہ وہ ان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے تو عین ممکن تھا کہ آپ سے باہر ہو جاتے اور بنا بنایا کھیل بگاڑ بیٹھتے۔ لیکن بیعت رضوان نے انہیں بے قابو نہ ہونے دیا اور اس طرح ان کا اضطراب اندرونی غم و غصے کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

عام مسلمان چونکہ حضرت محمد ﷺ کی طرح سیاسی سوجھ بوجھ نہ رکھتے تھے لہٰذا یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ متارکہ جنگ کا دس سالہ معاہدہ (یعنی صلح حدیبیہ) کس قدر مسلمانوں کے فائدے میں ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس معاہدے کے ذریعے مدینہ کو اقتصادی ناکہ بندی سے نجات دلوا دی اور اب مدینہ کے کاروان آزادی سے اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔ اسی معاہدے کی رو سے مسلمانوں کو یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ جس سے چاہیں پیمان باندھیں اور جیسا بھی چاہیں اتحاد قائم کریں۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن مکہ کے قریش تھے لہٰذا جنگ بندی کا دس سالہ معاہدہ اس بات کا سبب بنا کہ اگلے دس سال کے لئے وہ مکہ والوں کی طرف سے آسودہ خاطر رہیں۔

عام مسلمان ان عظیم سیاسی منافعوں کو جنہیں پیغمبر اسلام ﷺ نے کسی کشت و خون یا کچھ گنوائے بغیر حاصل کیا تھا' دیکھنے اور سمجھنے سے قاصر تھے بلکہ وقتی طور پر مکہ نہ جا

سکنے اور جذباتی طور پر ابوجندلؓ کی واپسی کو اپنی شکست اور توہین سمجھ رہے تھے۔ خاص طور پر ابوجندلؓ کو قریش کے حوالے کرنے کا مسئلہ انہیں سب سے زیادہ رنج پہنچا رہا تھا کیونکہ بادیہ عرب کا یہ اصول تھا کہ پناہ مانگنے والے کی جان و دل سے مدد کرتے تھے خواہ وہ کوئی بھی ہو' ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے پناہ مانگنا تو ایک علیحدہ بات تھی۔ لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ ابوجندلؓ کو معاہدے کے مطابق واپس کیا گیا ہے اور چونکہ وہ جوان معاہدہ ہونے کے بعد مکہ سے بھاگا تھا لہٰذا اسے واپس دینے میں مسلمانوں کی سبکی نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ ثابت ہوتا تھا کہ مسلمان ہر حال میں اپنے عہد کے پابند ہیں۔ تاہم پیغمبر اسلام ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ عام مسلمان بہت ملول اور رنجیدہ خاطر ہیں تو آپؐ نے انہیں ایک بار پھر حدیبیہ کے مقام پر جمع ہونے کو کہا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے گویا ہوئے: ''یہ معاہدہ جو ہمارے اور قریش کے درمیان منعقد ہوا ہے حقیقت میں ایک ''فتح مبین'' ہے یعنی ایسی فتح جو درخشندہ اور برجستہ ہے۔''

اس عظیم سیاسی فتح کے موقع پر جو حدیبیہ میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایک آیت نازل کی جو آج قرآن کی اڑتالیسویں سورۃ ''الفتح'' میں شامل ہے اور ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

''انا فتحنالک فتحا'' مبینا۔'' یعنی ہم نے آپ کو ایک واضح اور روشن فتح عنایت کی۔

بعض علمائے اسلام کہتے ہیں کہ یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر (یعنی صلح حدیبیہ کے بعد) نازل ہوئی تھی جبکہ کچھ کا خیال ہے کہ یہ آیت فتح خیبر سے متعلق ہے۔ تاہم کچھ علمائے دین کے بقول بالائے ذکر آیت تمام اسلامی فتوحات کے بارے میں ہے اور حدیبیہ کی سیاسی فتح بھی اس میں شامل ہے۔

البتہ اس سے پہلے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی وضاحتیں شروع ہوں تو مسلمانوں میں سے ایک شخص نے درد بھرے لہجے میں کہا کہ ہم کعبہ کی زیارت سے محروم ہو گئے ہیں اور

اب کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے! رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ اگر تم یہیں سے کعبہ کی زیارت کرو تو اللہ تمہارا حج قبول کرے گا اور یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے تم نے کعبہ کا طواف کر لیا ہو۔ میں بھی یہیں سے کعبہ کی زیارت کروں گا اور ہم اسی مقام پر اونٹوں کی قربانی بھی دیں گے۔ میں اپنا سر منڈوا کر احرام سے باہر نکلوں گا اور تم لوگ بھی ایسا ہی کرنا۔ میرے بعد اپنے سر منڈوا کر احرام سے نکل آنا۔

مسلمانوں میں سے ایک اور شخص نے وضاحت چاہی کہ یا رسول اللہ ؐ! ابوجندلؓ کو مشرکوں کے حوالے کرنے کے بارے میں بتایئے اور یہ بھی بتایئے کہ یہ کیسا پیمان ہے جو ہم اپنے یہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کو تو واپس نہیں لے سکتے لیکن مشرکوں کے ہاتھوں بچ نکلنے والوں کو واپس دینے پر مجبور ہیں؟!

پیغمبر اسلام ﷺ نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ ابوجندلؓ کو حالیہ معاہدے کے مطابق واپس بھیجا گیا ہے لہٰذا اس میں ہم مسلمانوں کی سبکی یا توہین نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ ابوجندلؓ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا اور وہ انشاء اللہ زندہ رہے گا۔ لیکن بالفرض محال وہ مارا بھی جائے تو اسے ابدی سعادت نصیب ہو گی کیونکہ وہ شہید ہو گا اور ایک شہید مرنے بعد سیدھا بہشت میں جاتا ہے اور اعلیٰ وارفع درجات کا مستحق قرار پاتا ہے..... لیکن رہی یہ بات کہ ہم نے معاہدے میں یہ زور کیوں نہیں دیا کہ ہماری طرف سے بھاگنے والوں کو اہل مکہ واپس بھیجیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے تو وہ ہم میں سے نہیں اور ہمارا بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایسا شخص ہمارے لئے مفید اور کار آمد ثابت نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ ایک خیانت پیشہ اور مرتد انسان ہے جس کی ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے جدا ہو کر مکہ میں پناہ لینے والوں کی واپسی سے چشم پوشی کر لی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسے افراد ہمارے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے لیکن یہ معاہدہ جو ایک فتح مبین ہے' اس بات کا سبب بنے گا کہ ہم اگلے دس سال تک قریش کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہیں۔ ان دس سالوں میں ہم قریش کی

دشمنی اور شاطرانہ چالوں سے بے خوف ہو کر مدینہ کے آس پاس رہنے والے قبائل کو مسلمان بنا سکتے ہیں اور جس سے بھی چاہیں دوستی اور باہمی اتحاد کا پیمان باندھ سکتے ہیں۔ اس معاہدے کا فوری فائدہ یہ ہے کہ مدینہ جو اب تک اقتصادی محاصرے کی زد میں تھا آج کے بعد محاصرے سے نکل آئے گا اور ہم معاشی طور پر بھی اپنے آپ کو مضبوط بنا سکیں گے۔

مسلمانوں میں سے ایک اور شخص نے بڑے ادب سے سوال کیا۔ ”یا رسول اللہؐ! آپ نے اس معاہدے میں یہ کیوں لکھوایا ہے کہ یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان منعقد ہوتا ہے۔ یہ کیوں نہیں لکھوایا کہ یہ معاہدہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منعقد ہو رہا ہے؟“

پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا: ”تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے اس معاہدے میں اپنے آپ کو محمد بن عبداللہ ہی لکھوایا ہے لیکن یہ تو نہیں لکھوایا کہ میں اللہ کا رسول نہیں ہوں لہٰذا اس سے ہم مسلمانوں کے وقار میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور نہ ہی ہمارا کچھ بگڑا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اس لئے رسول اللہ نہیں لکھوایا کہ قریش کی یہی خواہش تھی البتہ ان کی یہ خواہش ایک بچگانہ مطالبہ تھا اور اگر ہم اس مطالبے کو نہ مانتے تو ہم بھی بچگانہ حرکت کے مرتکب ہوتے لہٰذا میں نے ان کی بات مان لی اور اس کے ماننے سے ہمارا کچھ نہ گیا بلکہ ہم اپنا مقصد پانے میں کامیاب ہو گئے جو دراصل یہی تھا کہ قریش کا خطرہ سر سے ٹالا جائے تاکہ ان سے متارکہ جنگ کر کے ہم دین اسلام کی بلا روک و ٹوک تبلیغ کر سکیں گے اور اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کریں۔“

ان وضاحتوں کے بعد کسی نے مزید کچھ نہ پوچھا مگر حضرت عمرؓ کے ذہن میں گویا ابھی تک کشمکش جاری تھی۔ ان سے نہ رہا گیا اور انہوں نے سوال اٹھایا۔ ”یا رسول اللہؐ! کیا ہمارا دین برحق اور مشرکوں کا دین باطل نہیں ہے؟ پھر کیوں ایک سچا دین ایک جھوٹے دین کے سامنے نرم رویہ اختیار کرے اور ان کی ہر بات مان لے؟!“

لیکن کچھ عرصہ بعد خود عمرؓ بن خطاب بھی اس بات کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو گئے کہ حدیبیہ کا معاہدہ مسلمانوں کے بہت فائدے میں تھا اور اس معاہدے سے حاصل شدہ امن و سکون کے سائے میں مسلمانوں نے تیزی سے دین نو کی تبلیغ کی اور بہت سے قبائل کو حلقہ بگوش اسلام کر لیا..... لیکن اس لمحہ احساس محرومیت میں مبتلا ہونے کے سبب عام مسلمان اس معاہدے کے دیرپا اثرات کو نہ سمجھ سکے اور اسی لئے جب وہ اپنے سر منڈوانے اور احرام سے نکلنے کے بعد سوئے مدینہ روانہ ہوئے تو بہت غمزدہ اور دلبرداشتہ تھے اور سب سے بڑھ کر انہیں ابو جندلؓ کی واپسی کا بہت دکھ ہو رہا تھا۔

ایسی حالت میں جبکہ مسلمان دلوں میں درد و غم چھپائے سوئے شمال یعنی مدینہ کی جانب گامزن تھے تو راستے میں ایک اور مسلمان جو مکہ سے بھاگ نکلا تھا ان کے ساتھ آن ملا اور اس نے بھی پناہ کی درخواست کی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلی گھڑی کوئی جواب نہ دیا کیونکہ آپ کو یہ خیال گزرا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی چال ہو۔ قریش نے جان بوجھ کر اسے مسلمانوں کے پاس بھیجا ہو تاکہ ان کے ردعمل کا اندازہ لگا سکیں لیکن جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ مکہ سے بھاگنے والا شخص واقعی مسلمان ہے اور اس کا نام ابو بصیرؓ ہے۔ ابو بصیرؓ مکہ میں قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آکر مسلمانوں سے آملے تھے لیکن ابھی ابو بصیرؓ اطمینان کا سانس نہ لینے پائے تھے کہ قریش کے دو افراد بھی وہاں آدھمکے اور کہنے لگے: "یا محمد (ﷺ) حالیہ معاہدے کی رو سے ابو بصیرؓ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔"

اب حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ وہ آگے بڑھ کر بولے: "یا رسول اللہؐ! اس مرتبہ آپؐ اس شخص کو واپس نہ بھیجیں' یہ ہم سے پناہ مانگنے آیا ہے۔ اگر ہم جان سے گزر جائیں تو بھی اسے قریش کے ہاتھ نہ لگنے دیں گے۔"

پیغمبر اسلام ﷺ نے دو ٹوک جواب دیا کہ ہم ایفائے عہد کے پابند ہیں اور حالیہ معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ یہ جواب سن کر مکہ سے آنے والے دو آدمیوں

نے تمام مسلمانوں کے سامنے ابو بصیرؓ کو اونٹ کی پیٹھ پر باندھا اور رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

لیکن ابو بصیرؓ ایک طاقتور اور دلیر انسان تھے۔ انہوں نے راستے میں اپنی رسیاں توڑ ڈالیں اور رہائی پانے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اونٹ سے اتر کر ان دو میں سے ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ دوسرا اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا۔ ابو بصیرؓ دوبارہ مسلمانوں سے آ ملے اور ان سے پناہ کی درخواست کی۔ اس مرتبہ ابو بصیرؓ نہ صرف یہ کہ قریش کے ہاتھوں سے بھاگ نکلے بلکہ انہوں نے ایک شخص کا خون بھی کر ڈالا تھا اور اب ان سے مقتول کا خون بہا بھی مانگا جا سکتا تھا۔

اگلے دن وہ شخص جو زندہ بچ گیا ایک بار پھر مسلمانوں کے قافلے تک پہنچ گیا اور ابو بصیرؓ کا مطالبہ کرنے لگا۔ جس پر پیغمبر اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ ابو بصیرؓ کو اس شخص کے حوالے کر دیا جائے لیکن اس سے پہلے کہ قریش کا نمائندہ ابو بصیرؓ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے تو وہ ایک بار پھر اس کے ہاتھوں سے بھاگ نکلے۔

جب پہلی بار ابو بصیرؓ مسلمانوں کے پاس آئے تو پیغمبر اسلام ﷺ نے ان سے کہا تھا کہ یا ابو بصیر! ہم حالیہ معاہدے کے مطابق تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ تم مکہ لوٹ جاؤ اور یقین رکھو کہ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ لیکن اب ابو بصیرؓ کو احساس ہوا کہ اگر مکہ لوٹ جائیں تو ان کی جان سو فیصد خطرے میں ہو گی کیونکہ ان کے ہاتھوں قریش کے ایک آدمی کا خون ہو چکا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسے وقت پر انہیں مکہ واپس جانے کو کہا تھا اور یہ بشارت دی تھی کہ اللہ ان کی مدد کرے گا کہ ان کے ہاتھوں کسی کا خون نہیں ہوا تھا لیکن اب ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اگر وہ مکہ واپس جاتے تو خود ان کی جان خطرے میں ہوتی یا کم از کم انہیں خون بہا ادا کرنا پڑتا۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مکہ جانے کی بجائے لامتناہی ریگستان میں پناہ لینے کا فیصلہ

کیا۔ ایک عرب شاعر "شنفریٰ" گویا ابوبصیر کی زبانی کہتا ہے "اے بھائیو! میرے پیچھے مت آنا کہ اب میں بیابان کی طرف چل نکلا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہاں نئے دوست تلاش کروں۔"

"اے دوستو! اب مجھے نہ ڈھونڈنا کہ اب تنہائی میرا مقدر ہے۔ مجھے تاریکیء شب میں اپنا راستہ خود تلاش کرنا ہو گا اور آج کے بعد میرے ساتھی' میرے دوست صحرا کے چیتے' چالاک بھیڑیئے اور لمبے بالوں والے بجو ہوں گے جن کے ساتھ مجھے گزارا کرنا ہو گا!"

بہرحال ابوبصیرؓ قریش کے ہاتھوں بچ نکلنے کے بعد ایسے علاقے میں پہنچے جسے ذوالمروہ کہا جاتا تھا۔ انہوں نے اسی مقام پر ٹھہرنے اور بقیہ زندگی وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد ابوجندلؓ بھی ایک بار پھر مکہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ذوالمروہ پہنچ کر ابوبصیرؓ سے جا ملے۔ پھر ایک اور مسلمان جس کا نام عتبہ بن اسد تھا مکہ سے بھاگ کر ذوالمروہ پہنچا اور رفتہ رفتہ دوسرے مسلمان بھی مکہ سے نکل کر وہاں پہنچنا شروع ہو گئے اور انہوں نے ایک علیحدہ اسلامی گروہ کی شکل اختیار کر لی۔

یہ لوگ عدم جارحیت کے حالیہ معاہدے کے دائرے میں نہیں آتے تھے کیونکہ ذوالمروہ نہ تو مدینے کا حصہ تھا اور نہ ہی اسلامی قلمرو میں شامل ہوتا تھا لہٰذا پیغمبر اسلام ﷺ پر ان لوگوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔

ابھی حدیبیہ کا معاہدہ ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ذوالمروہ میں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ انہوں اپنی ایک مستقل فوج بنا لی اور مکہ کے کاروانوں کا راستہ روک کر مال غنیمت حاصل کرنے لگے یوں ان کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں....!

رفتہ رفتہ ذوالمروہ کے مسلمانوں نے کچھ اس طرح قریش کے ناک میں دم کر دیا کہ انہوں نے ہار مان کر خود ہی پیغمبر اسلام ﷺ سے یہ درخواست کی کہ وہ مکہ سے بھاگ کر ذوالمروہ میں جمع ہونے والے مسلمانوں کو مدینہ بلوا لیں اور وہ لوگ وہیں پر سکونت اختیار کریں اور انہیں مکہ واپس بھیجنے کی بھی ضرورت نہیں!

پیغمبر اسلام ﷺ نے قریش سے کہا کہ وہ لوگ تحریری طور پر درخواست کریں تاکہ ان کے پاس ثبوت رہے اور اس طرح معاہدہ حدیبیہ کی وہ شق جسے عام مسلمان اپنے لئے توہین آمیز سمجھ رہے تھے' خود بخود ختم ہو گئی اور اس کے بعد بھی مذکورہ معاہدے کے وہ حصے جو بظاہر مسلمانوں کے نقصان میں تھے مدہم پڑ گئے اور صرف وہ چیزیں باقی رہ گئیں جو مسلمانوں کے فائدے میں تھیں۔

قریش نے خود اپنے ہاتھوں سے یہ تحریری ثبوت فراہم کر دیا کہ اگر کوئی شخص مکہ سے بھاگ کر مسلمانوں سے آملے تو اسے قریش کے حوالے نہ کیا جائے۔ تب کہیں جاکر عام مسلمانوں کو احساس ہوا کہ وہ غلطی پر تھے اور سارا عرصہ غلط فہمی میں مبتلا رہے کیونکہ حدیبیہ کا معاہدہ ان کے نقصان میں نہیں بلکہ بہت فائدے میں تھا۔



حضرت علیؓ جنگ خیبر میں

حدیبیہ سے واپسی پر پیغمبر اسلام ﷺ نے یہی کوشش کی کہ مسلمانوں اور قریش کے تعلقات میں مزید کشیدگی پیدا نہ ہونے پائے۔ اتفاق سے اسی سال خشک سالی کی وجہ سے مکہ قحط کی لپیٹ میں آگیا۔

جزیرۃ العرب میں ایک قبیلہ ایسا تھا جس کی سرزمین مکہ کی اشیاء خورد و نوش کا انبار سمجھی جاتی تھی۔ اس قبیلے کا نام تھا "یمامہ"۔ قبیلہ یمامہ کے سارے افراد مسلمان ہو چکے تھے اسی لئے قبیلے کے سربراہ نے اہل مکہ کو اشیائے خوردنی کی فروخت پر پابندی عائد کر دی۔ اہل مکہ نے قحط کا دباؤ پڑتے ہی حضرت محمد ﷺ کا دامن تھاما اور آپؐ سے التجا کی کہ یمامہ کے سربراہ کو یہ سفارش کی جائے کہ وہ اہل مکہ کو بھی ضروریات زندگی فروخت کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی درخواست مانتے ہوئے یمامہ کے سربراہ کو یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ اہل مکہ کو اشیاء خوردنی فروخت کرنے پر پابندی نہ لگائے۔ اس

کے علاوہ پیغمبر اسلام ﷺ نے بذات خود پانچ سو سونے کے سکے مکہ بھجوائے تاکہ وہاں کے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔

ابوسفیان نے جب یہ سنا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے سونے کے سکے بھجوائے ہیں تو وہ بولا کہ محمد (ﷺ) کا مقصد یہ ہے کہ اہل مکہ اور خاص طور پر غریبوں کے دل جیت سکیں۔

لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے پانچ سو سکوں کے علاوہ بہت مقدار میں کھجوریں ابوسفیان کے نام بھی بھجوا دیں اور یہ پیغام دیا کہ وہ ان کھجوروں کی قیمت کے طور پر چمڑے یا کھالوں کا تبادلہ کر سکتا ہے۔ اس زمانے میں ابوسفیان کے پاس کچھ چمڑا پڑا ہوا تھا جسے کوئی نہیں خریدتا تھا کیونکہ مکہ جیسے قحط زدہ شہر میں جہاں کے سارے باشندے بھوک مٹانے کے لئے ایک ٹکڑا روٹی یا چند کھجوروں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوں تو وہاں کوئی چمڑا خرید کر کیا کرتا؟ ابوسفیان نے کوشش تو کی کہ کھجوریں واپس کر دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا کیونکہ اہل مکہ کو کھجوروں کی آمد کا علم ہو چکا تھا اور چونکہ وہ بھوک سے ہلکان ہو رہے تھے چنانچہ انہوں نے کھجوریں واپس نہ جانے دیں۔ ابوسفیان نے بادل نخواستہ کھجوریں قبول کر لیں اور ان کی جگہ چمڑا روانہ کر دیا۔ دوسری طرف جب مکہ کے عام باشندوں کو پتہ چلا کہ یہ کھجوریں حضرت محمد ﷺ کی جانب سے بھیجی گئی ہیں تو ان کے دل میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں نیک جذبات ابھرنے لگے۔ لیکن عام لوگوں کے برعکس قریش، جو مکہ کے اعیان و اشراف میں شمار ہوتے تھے بدستور پیغمبر اسلام ﷺ سے بیر رکھے ہوئے تھے اور ان کی دشمنی میں کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔

پیغمبر اسلام ﷺ گرچہ جانتے تھے کہ قریش ان کے دشمن ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے یہی کوشش کی کہ ان کے ساتھ باہمی روابط قائم کریں اور صلح آمیز رویہ اپنائیں کیونکہ وہ قریش کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کو اسلام کی ترقی اور ترویج کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ لوگ کیا کہتے

ہیں۔

دراصل ایک پیغمبر اپنے اللہ کو اس قدر چاہتا ہے کہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار رہتا ہے۔ یہودیوں کی ایک تلمود (Talmud) میں آیا ہے: ''اللہ اپنے پیغمبر سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اسے دل و جان سے چاہے اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ نام سے لے کر جان تک نچھاور کر دے''۔

پیغمبر اسلام ﷺ بھی اپنے اللہ کو دل و جان سے چاہتے تھے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے چاہے لوگ ان کا مضحکہ اڑائیں یا ان پر پتھر برسائیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ ایک باایمان انسان تھے لیکن ایسے باایمان جو باتدبیر اور ہوش مند بھی ہو۔ ایسا انسان جب کسی چیز پر ایمان لے آئے تو پھر مشکلات سے نہیں گھبراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ان پر ضرور قابو پا لے گا۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اس کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹانے سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا بالکل ایسے ہی جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس دن یہ فیصلہ کیا کہ اسلام کی کامیابی کے لئے (کہ مکہ پر غلبہ اس کے نتائج میں شامل تھا) ایک اور انتہائی اہم قدم اٹھائیں کہ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پیغمبر اسلام ﷺ کو یہ خبر ملی تھی کہ عبداللہ بن جحش کی بیوہ اور ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہؓ بیوہ گئی ہیں۔ عبداللہ بن جحش ایک حنیف تھا اور شاید آپ کو یاد ہو کہ وہ اپنی زوجہ کے ہمراہ ہجرت کر کے حبشہ گیا لیکن وہاں جا کر اسلام سے روگردانی کر لی۔ جب اس کا انتقال ہوا اور ام حبیبہؓ بیوہ ہو گئیں تو حضرت محمد ﷺ نے انہیں شادی کا پیغام بھیجنے کا فیصلہ کیا تا کہ رضامندی کی صورت میں وہ رسول اللہؐ کی زوجیت میں آ جائیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ جانتے تھے کہ ہرگاہ ام حبیبہؓ ان کے نکاح میں آ گئیں تو وہ ابوسفیان کے داماد بن جائیں گے اور یہ رشتہ مکہ میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن کی دشمنی میں کمی کا سبب بن سکتا ہے۔ ابوسفیان مکہ کا رئیس تھا اور قشون مکہ کا سپہ سالار بھی۔ اگر اس کی دشمنی

ستی میں بدل جاتی تو یہ اسلام کے بہت فائدے میں تھا۔
ام حبیبہؓ کا تعلق بنو امیہ کے اہم خاندان سے تھا اور اگر ان سے پیغمبر اسلام ﷺ کی نسبت برقرار ہو جاتی تو بنو امیہ کے سارے افراد پیغمبر اسلام ﷺ کے ریبی رشتہ دار بن جاتے اور گزشتہ کی طرح ان سے دشمنی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن م حبیبہؓ اس وقت حبشہ میں تھیں اور حضرت محمد ﷺ سوچ رہے تھے کہ جب وہ ئیں گی تو ابوسفیان اور خاندان بنو امیہ کے دوسرے افراد انہیں پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں ہونے دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے ایک شخص کو اپنا وکیل بنا کر حبشہ روانہ کیا تاکہ وہ ام حبیبہؓ سے شادی کی بات کرے اور رضامندی کی صورت میں انہیں اپنے ساتھ مدینہ لے آئے۔
لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ جب وہ حبشہ سے نکل کر جزیرۃ العرب کی سرزمین میں قدم رکھیں تو قبیلہ قریش انہیں مدینہ جانے اور پیغمبر ﷺ کی زوجہ بننے سے روک دے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایلچی کو نئی ہدایات دیں اور ایک خط بھی لکھوایا جسے ان کے ایلچی نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو پیش کرنا تھا۔ وہ ہدایات جو حضرت محمد ﷺ کی طرف سے جاری کی گئیں یہ تھیں کہ ان کا ایلچی سب سے پہلے ام حبیبہؓ سے رابطہ قائم کرے اور ان سے دریافت کرے کہ وہ پیغمبر ﷺ کی زوجہ بننے پر رضامند ہیں یا نہیں؟ اگر ام حبیبہؓ اپنی رضامندی ظاہر کر دیں تو پھر حضرت محمد ﷺ کا نامہ نجاشی کو پیش کر دیا جائے۔ مذکورہ نامے میں پیغمبر اسلام ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ سے کہا تھا کہ وہ ام حبیبہؓ کا نکاح، جو اس کے ملک میں قیام پذیر ہیں ان کے نام پڑھوا دے۔
ام حبیبہؓ نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور نجاشی نے بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی ہدایت کے مطابق ان کا نکاح غائبانہ طور پر حضرت محمد ﷺ کے ساتھ پڑھا دیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد ابوسفیان کی بیٹی پیغمبر اسلام ﷺ کی زوجہ بن کر حبشہ سے جزیرۃ العرب کی طرف روانہ ہو گئیں۔

قریش کو اس رشتے کا علم ہو چکا تھا لیکن وہ حضرت ام حبیبہؓ کو مدینہ جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ چونکہ اب وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زوجہ تھیں اور سارے اعراب جانتے تھے کہ ایک بیوی کو اس کے شوہر کے پاس جانے سے نہیں روکا جا سکتا۔

حضرت ام حبیبہؓ کے زوجہ پیغمبرؐ بننے سے رسول اللہ ﷺ کے مستقبل کے ارادوں کو بہت تقویت پہنچی اور اس تعلق نے اہل مکہ کو مسلمان بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا جس کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کریں گے۔ بہرحال چونکہ ام حبیبہؓ ابوسفیان کی بیٹی تھیں اور قریش کے تمام برجستہ گھرانوں میں ان کے تعلقات تھے لہٰذا جب بھی ابوسفیان پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زبان کھولنا چاہتا تو اسے یاد آ جاتا کہ وہ ایسے شخص کی مخالفت کر رہا ہے جو اس کے اپنے خاندان سے وابستہ ہے اور چونکہ خاندانی شجرے اور اس کی اہمیت کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے چنانچہ اس کی تکرار غیر ضروری ہو گی۔

دوسری طرف عدم جارحیت کے معاہدے (یعنی صلح حدیبیہ) نے حضرت محمد ﷺ کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ مکہ والوں کی طرف سے آسودہ خاطر ہو کر مدینہ کے شمال میں رہنے والے یہودیوں کی سازشوں کا توڑ کر سکیں اور شمال کی جانب سے مدینہ کی معاشی ناکہ بندی ختم کرنے کے لئے قدم اٹھائیں۔ صلح حدیبیہ کا ایک فائدہ یہ تھا کہ مکہ کے کفار مسلمانوں کی دوستیوں یا لڑائیوں میں بے طرفی کا کردار ادا کرنے پر مجبور تھے۔

خیبر، مدینہ کے شمال میں واقع تھا۔ مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان صلح ہو جانے کے باوجود خیبر کے یہودیوں نے اپنے عداوت بھرے طور طریقے نہیں بدلے۔ وہ لوگ بدستور مسلمانوں کے تجارتی قافلوں کو خیبر کے مضافات سے گزرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے تاکہ مسلمان شمالی ملکوں سے اقتصادی رابطہ قائم نہ کر سکیں۔

خیبر کے یہودی اپنے آپ کو اتنا طاقتور سمجھتے تھے کہ انہیں یہ گھمنڈ ہو گیا کہ وہ کفار مکہ کی مدد اور اعانت کے بغیر ہی مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ یہ سوچ رہے تھے کہ جس طرح صلح اور عدم جارحیت کے معاہدے سے مدینے کا جنوبی

محاصرہ" ختم ہو گیا ہے تو اسی طرح اہل خیبر کی جانب سے شمالی محاصرہ بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔

لیکن خیبر کے یہودی کسی طور بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور صلح کرنے پر رضامند نہ تھے۔ خاص طور پر وہ یہودی جو مدینہ سے جلا وطن کیے گئے تو وہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ خیبر کا شہر مدینہ کے شمال میں دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایسے مقام پر واقع تھا جہاں پانی وافر مقدار میں پایا جاتا تھا اور جہاں پانی کے بے شمار تالاب بھی موجود تھے۔ اسی لئے خیبر کا علاقہ انتہائی زرخیز علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔

اگر خیبر کی حدود سے باہر نکلا جاتا تو آتش فشاں لاوے سے بھرپور ایسا وسیع میدان سامنے آتا جہاں ہریالی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس علاقے سے گزرنا انتہائی دشوار بلکہ ناممکن ہوتا تھا۔

عربی زبان میں خیبر کا مطلب "قلعہ" اور اس شہر میں آٹھ جنگی قلعے موجود تھے۔ جنگ کی صورت میں خیبر کے باشندے بیس ہزار کی فوج اکٹھی کر سکتے تھے۔ خیبر کا شہر دراصل جزیرۃ العرب کی قدیم مملکتوں میں شمار ہوتا تھا اور سن ۵۳۰ھ تک اسے ایک عربی شہر سمجھا جاتا تھا۔ اس سال خیبر کے باشندوں نے "ابونواس" کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے خیبر میں یہودیوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ یہودیوں نے اپنی محنت اور کوشش سے اس شہر کی آبادی اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ وہاں یہودی باشندے اکثریت میں آ گئے اور جس گھڑی پیغمبر اسلام ﷺ نے خیبر کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا تو اس شہر میں حتیٰ کہ ایک بھی عرب موجود نہیں تھا۔

خیبر کے یہودی بہت مالدار تھے اور ان کا شہر بھی تجارت کا انتہائی اہم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ خیبر کے جواہر فروش پورے جزیرۃ العرب میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ وہ مالدار لوگوں کو جواہرات بیچتے یا کرائے پر دیتے تھے لیکن کسی ضمانت یا وثیقے کے بغیر کرائے پر نہیں

دیتے تھے۔ جزیرۃ العرب میں جواہر فروشی کرنا صرف یہودیوں کا پیشہ تھا اور گرچہ شمال اور جنوب میں جواہر فروشی کے متعدد مراکز موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی خیبر جیسی شہرت اور اہمیت کا حامل نہیں تھا۔

وہ علاقہ جہاں خیبر تھا انتہائی مرطوب علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ باہر سے آنے والے اکثر لوگ وہاں پہنچ کر "پانی کی بیماری" میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

اس زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ ٹھہرے ہوئے پانی سے ایسی ریاح یعنی ہوا خارج ہوتی ہے جو انسان کے بدن میں داخل ہو کر اسے بیمار بنا دیتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے مذکورہ بیماری کو "پانی کی بیماری" کا نام دے رکھا تھا لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ وہ بیماری ٹھہرے پانی کی ریاح کی وجہ سے نہیں بلکہ ملیریا کے مچھر کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی۔ دراصل قدیم باشندے ملیریا کے مچھر کو نہیں پہچانتے تھے اور اس موذی کیڑے کی شناخت دراصل جدید دور کے انکشاف میں شامل ہوتی ہے۔

خیبر میں ٹھہرے پانی کے متعدد تالاب موجود تھے جو مختلف بیماریاں خاص طور پر ملیریا پھیلانے کا سبب بنتے تھے۔ بادیہ نشین لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ یہودی باشندے ایسے مرطوب علاقے میں کیسے رہتے ہیں اور پانی کی بیماری سے مرتے کیوں نہیں۔

لیکن یہودی، جو یہ جانتے تھے کہ بدوی باشندے بہت سادہ لوح ہیں، ان سے کہتے کہ اگر کوئی انسان خیبر میں رہنا چاہے اور یہ بھی چاہے کہ پانی کی بیماری سے محفوظ رہے تو اسے چاہیئے کہ خیبر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے گھٹنے اور دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دے اور منہ اٹھا کر گدھے کی آواز نکالے۔ یہ کہتے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو شہر میں داخل ہونے کے بعد بیماری اس کے پاس بھی نہیں پھٹکے گی ورنہ وہ "پانی کی بیماری" میں مبتلا ہونے اور جان گنوانے کے لئے تیار رہے۔

بے چارے سادہ لوح باشندے یہودیوں کی بات مان لیتے اور شہر میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی ہتھیلیاں اور گھٹنے زمین پر ٹیک دیتے اور منہ اٹھا کر گدھے کی آوازیں نکالنے لگتے

اور اپنے آپ کو خوش ہوتے کہ اب بیماری سے بچے رہیں گے۔ اس عمل کو عربی زبان میں "تعشیر" کہا جاتا تھا اسی لئے بدوی اعراب خیبر کو "تعشیر" کے نام سے بھی پکارتے تھے۔

لیکن خود یہودی باشندے "پانی کی بیماری" اور آج بقول ہمارے ملیریا سے بچنے کے لئے کچھ اور تدابیر اختیار کرتے جو دراصل یہ تھیں۔

۱۔ کبھی بھی ٹھہرے ہوئے پانی کو نہ پیتے اور اگر بہتا پانی میسر نہ ہوتا تو ہلکی شراب کا استعمال کرتے تھے۔

۲۔ لہسن کا استعمال کثرت سے کرتے اور چونکہ خیبر کے تمام گھرانوں میں لہسن وافر مقدار میں استعمال ہوتا تھا چنانچہ اس شہر کی فضا ہمیشہ لہسن کی بو سے بھری رہتی تھی۔ آج ہم جانتے ہیں کہ لہسن دراصل ایک جراثیم کش سبزی ہے اور اس میں بعض بیماریوں کی روک تھام کرنے کی خاصیت موجود ہے۔

۳۔ یہودی باشندے نشیبی علاقوں میں نہیں رہتے تھے بلکہ ان کی رہائش مرتفع مقامات پر ہوتی تھی۔ دراصل انہیں یہ تجربہ حاصل ہو چکا تھا کہ اونچی جگہ پر "پانی کی بیماری" کا حملہ بہت کم ہوتا ہے۔

۴۔ ایک اور احتیاطی تدبیر جس پر یہودی کاربند تھے یہ تھی کہ بہار کے تیسرے مہینے یعنی گرمیوں کی آمد پر خیبر سے کوچ کر جاتے اور خزاں کے شروع ہونے پر واپس آ جاتے یعنی وہ لوگ ایسے وقت پر لوٹتے تھے کہ جب ملیریا کا مچھر انہیں بیمار نہیں کر سکتا تھا حالانکہ وہ اس بات سے بالکل غافل تھے کہ "پانی کا بیماری" کا اصلی سبب ملیریا کا مچھر ہے۔

جب خیبر کے یہودیوں کو یہ معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور اہل مکہ کے درمیان عدم جارحیت کا دس سالہ معاہدہ طے پا چکا ہے تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ سمجھ گئے کہ اب ان کا بلاواسطہ آمنا سامنا ہونے والا ہے۔ اس دن تک یہودیوں کو یہ اطمینان تھا کہ اگر

مسلمان خیبر پر حملہ آور ہوں تو ان کے اتحادی یعنی مشرکین مکہ بے دریغ مدینہ پر حملہ کر دیں گے کیونکہ دونوں فریقوں میں یہ طے پا چکا تھا کہ اگر خیبر پر حملہ ہوا تو قریش مدینہ پر ہلہ بول دیں اور اگر مکہ مسلمانوں کے حملے کا نشانہ بنے تو خیبر کے یہودی مدینہ پر چڑھائی کردیں۔ لیکن صلح حدیبیہ کے بعد یہودیوں اور مشرکوں کے درمیان طے پانے والا معاہدہ خود بخود بے اثر ہو گیا بلکہ یوں کہئے کہ یکسر منسوخ ہو گیا۔

بہرحال پیغمبر اسلام ﷺ' یہودیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈیڑھ ہزار کی فوج لے کر مدینہ سے نکلے جبکہ خیبر کے یہودی بیس ہزار جنگجو سپاہی فراہم کر سکتے تھے۔

بعض تذکروں میں آیا ہے کہ خیبر کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ لڑائی میں غافل گیر ہو گئے تھے حالانکہ ایسا ہرگز نہ تھا۔ جس دن اہل خیبر کو معاہدہ حدیبیہ کا علم ہوا تو انہوں نے اسی دن سے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ انہیں اپنے کئے کا احساس تھا اور وہ یہ پیش بینی کر رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن مسلمانوں سے ہاتھا پائی ضرور ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ لشکر اسلام خیبر پہنچا تو وہاں کے رہنے والے دفاع کے لئے تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے ضرورت کی تمام اشیاء آٹھ قلعوں میں محفوظ کر لی تھیں اور ان کے بیس ہزار سپاہی جنگی ساز و برگ سے آراستہ مقابلے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

تاہم خیبر پہنچنے سے پہلے اسلامی لشکر نے دو قبیلوں یعنی غطفان اور بنی فرازہ کی سرزمینوں سے گزر کیا۔ یہ دونوں قبائل یہودیوں کے اتحادی سمجھے جاتے تھے اور اس گھڑی جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ یہودیوں سے نمٹنے کے لئے خیبر کی طرف جا رہے تھے تو قاعدتاً ان دونوں قبیلوں کو بھی یہودیوں کی مدد کے لئے آگے بڑھنا چاہئے تھا لیکن ان پر مسلمانوں کی ایسی دھاک بیٹھی کہ انہوں نے یہودیوں کی مدد کا خیال ترک کر دیا اور یہ وعدہ کر لیا کہ وہ اس جنگ میں بالکل غیر جانبدار رہیں گے۔

دو چیزیں مذکورہ قبائل کے لئے خوف اور وحشت کا سبب بنیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے بدر' احد اور خندق کی جنگوں میں مسلمانوں کی شجاعت' دلیری اور جذبہ ایمانی کو پرکھ لیا

تھا۔ دوسرے یہ کہ انہیں حدیبیہ کے معاہدے کا بھی علم تھا۔ انہوں نے سوچا کہ جب اہل مکہ نے پیغمبر اسلام ﷺ سے صلح کر لی ہے تو ہماری بہتری بھی اسی میں ہے کہ ہم مسلمانوں سے خوامخواہ کی دشمنی مول نہ لیں۔

اکثر مؤرخین کی تصدیق اور تائید کے مطابق خیبر' جزیرۃ العرب کے شمال میں واقع سب سے اہم اور مضبوط قلعہ تھا۔ اس شہر کے استحکامات کے لئے ایسا بندوبست کیا گیا تھا کہ جسے صدیوں بعد ایک فرانسیسی انجینئر "وبان" نے سترہویں صدی میں شہری دفاع کے لئے استعمال کیا یعنی اس کا خیال تھا کہ یہ طریقہ کار اس کی ایجاد ہے۔

بہرحال جب اسلامی لشکر خیبر پہنچا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے بذات خود اس کی کمان سنبھال لی اور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "ہمارے پاس ان عظیم اور مستحکم قلعوں کو فتح کرنے کے لئے ضروری وسائل موجود نہیں۔ ہمارے پاس جو کچھ موجود ہے وہ تلواروں اور تیر کمانوں پر مشتمل تھا۔ ان چیزوں سے مضبوط قلعوں کو جو پتھر سے بنے ہوئے ہیں' نہیں ڈھایا جا سکتا۔ لیکن ہم ایک طریقے سے یہودیوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان کا محاصرہ کر لیں اور ان نہروں پر بند باندھ دیں جو مختلف قلعوں سے گزرتی ہیں۔ اگر یہودیوں کے پاس پانی کا ذخیرہ نہ ہوا تو جلد ہی ہمارے سامنے خم ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

خیبر میں آٹھ مضبوط قلعے تھے۔ مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ باری باری ہر قلعے پر حملہ کریں اور ایک کو فتح کرنے کے بعد دوسرے کی خبر لیں۔ جس گھڑی مسلمانوں نے خیبر کا محاصرہ شروع کیا تو اسی لمحہ انہیں "منجنیق" کے گولوں کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

(یاد رہے کہ منجنیق جسے انگریزی میں Catapult کہتے ہیں دراصل پرانے زمانے کے ایسے دور مار جنگی آلے کا نام تھا جس کے ذریعے پتھر کے گولے دشمن کی طرف پھینکے جاتے تھے۔ اردو زبان میں منجنیق کو گوپھن یا گوپیا بھی کہتے ہیں۔ خلیل)

خیبر کے یہودی پتھروں کو گیند کی شکل میں تراشنے اور ان سے گولے بنا کر منجنیق

کے ذریعے پھینکنے کے فن سے آگاہ تھے۔ چنانچہ محاصرہ شروع ہوتے ہی انہوں نے مسلمانوں پر پتھر کے گولے برسانا شروع کر دیئے اور یہ گولہ باری اتنی سنگین نوعیت کی تھی کہ اس کا سامنا کرنا انتہائی دشوار دکھائی دیتا تھا۔ خاصا یہ کہ مسلمان پہلی بار منجنیق کا سامنا کر رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس انوکھے آلے کا توڑ نہیں جانتا تھا۔

لیکن یہاں بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی ذہانت اور جنگی فراست کام آئی اور آپؐ نے ایسے متحرک برج بنانے کا حکم دیا کہ جن میں بیٹھ کر قلعے کی دیوار تک پہنچا جا سکے۔ یہ برج دراصل بکتر بند گاڑی کا کام دیتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کو بتایا کہ قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچ جانے سے پتھر کے گولوں سے بچا جا سکتا ہے کیونکہ منجنیق کے گولے صرف دور کے نقاط کو نشانہ بناتے تھے، عمودی دیوار کے نیچے کھڑے لوگوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ بھی کہا کہ حصار کے نیچے کھڑے لوگوں کو صرف ایک خطرہ ہو سکتا ہے کہ قلعے کی برجیوں سے ان پر پتھر پھینکے جائیں لیکن یہ پتھر صرف برجیوں سے یا ایسی جگہوں سے پھینکے جا سکتے ہیں جو خاص طور پر اسی کام کے لئے بنائی گئی ہوں لہٰذا دیوار کے بقیہ حصے پناہ لینے کے لئے سب سے موزوں جگہ ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ خیبر پہنچنے کے بعد اسلامی لشکر کی کمان خود حضرت محمد ﷺ کے ہاتھ میں تھی لیکن جلد ہی خیبر کی خراب آب و ہوا نے آپؐ کو بیماری میں مبتلا کر دیا اور آپؐ نے فوج کی سپہ سالاری حضرت ابو بکرؓ کے حوالے کر دی۔

حضرت ابو بکرؓ دو دن سے زیادہ اس عہدے پر فائز نہ رہ سکے کیونکہ شدید بخار نے انہیں بھی بستر بیماری سے لگا دیا۔ چنانچہ انہوں نے اسلامی لشکر کی قیادت حضرت عمرؓ بن خطاب کو سونپی اور خود سبکدوش ہو گئے۔

لیکن جلد ہی حضرت عمرؓ بھی بیماری کی لپیٹ میں آ گئے اور ان کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ انہوں نے بستر بیماری پر لیٹے لیٹے فوج کے سرداروں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا کہ میرے خیال میں اس جنگ میں اسلامی لشکر کی سپہ سالاری کے لئے علیؓ سے زیادہ مناسب

اور کوئی نہیں ہے کیونکہ علیؓ ایک بااستقامت، دلیر اور مستقل مزاج انسان ہیں اور ان کی شجاعت کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک سو سپاہی ان کے مدمقابل کھڑے ہوں تو وہ پھر بھی دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں گے۔ اگر کوئی ان مضبوط قلعوں کو فتح کر سکے تو وہ علیؓ ہی ہیں۔ اسی لئے میں فوج کی قیادت ان کے حوالے کرتا ہوں۔ تم سب پر ان کی اطاعت کرنا فرض ہے۔

جب حضرت علیؓ کو لشکر اسلام کی قیادت سونپی گئی تو وہ بھی ہلکے بخار میں مبتلا تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی اور پہلے ہی دن نطات نامی قلعے کو محاصرے میں لے لیا۔

اسلامی تذکرہ نویسوں میں سے دو افراد جن کا نام "بغوی" اور "ابن ابی الحدید" ہے حضرت علیؓ کو سپہ سالاری سونپے جانے کے واقعے کو قدرے مختلف انداز میں نقل کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ بیمار پڑ گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے کمان سنبھالی اور یہودیوں پر شدید حملہ کر دیا لیکن ان کی شدید مزاحمت کے باعث عقب نشینی پر مجبور ہو گئے۔ حضرت محمد ﷺ نے ان کی جگہ حضرت عمرؓ کو فوج کی قیادت سونپ دی۔ حضرت عمرؓ نے بھی شدید حملے کئے مگر یہودیوں کی پائیداری کے سامنے بے بس ہو گئے اور کہا کہ ان قلعوں کو تسخیر کرنا میرے بس میں نہیں۔ جب پیغمبر اسلام ﷺ کو علم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے لشکر اسلام کی سپہ سالاری سے معذوری چاہی ہے تو آپؐ نے حضرت علیؓ کو یہ ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کر لیا۔

بغوی اور ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ جب حضرت محمد ﷺ نے علیؓ کو فوج کی قیادت سونپنے کے لئے اپنے پاس بلوایا تو وہ آشوب چشم (آنکھوں کے درد) میں مبتلا تھے اور ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی اور اسی دن نطات نامی قلعے پر ہلہ بول دیا۔

بغوی اور ابن ابی الحدید کے بقول اس دن ایک شخص جس کے سر پر فولادی خود تھا قلعہ نطات کی دیوار پر حاضر ہوا اور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا: "تمہارا سپہ سالار

کون ہے؟"

جواب میں حضرت علیؓ نے دیوار کے نیچے سے بانگ لگائی۔ "مسلمانوں کا سپہ سالار میں ہوں اور میرا نام علی بن ابی طالب ہے۔"

اس شخص نے للکارتے ہوئے کہا۔ "یا علی میرا نام مرحب ہے اور ان آٹھ قلعوں میں سے جنہیں تم دیکھ رہے ہو' ایک کا نام میرے نام پر رکھا گیا ہے۔ کیا تم میں اتنی جرات ہے کہ میرا مقابلہ کر سکو؟"

حضرت علیؓ نے اونچی آواز میں جواب دیا: "میں نے آج تک مبارزت کی کوئی دعوت مسترد نہیں کی لہٰذا تیری دعوت بھی مسترد نہیں کروں گا۔"

مرحب نے کہا "تو پھر میں قلعے سے باہر آکر تمہاری طاقت کا امتحان لیتا ہوں۔!"

یہ کہنے کے بعد مرحب دیوار سے نیچے اترا اور قلعے سے باہر نکل آیا۔ اس کے عقب میں قلعے کا دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

اگرچہ حضرت علیؓ کی آنکھیں درد میں مبتلا تھیں اور ان کے بدن پر زرہ بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے مرحب کا' جس کے سر پر آہنی خود اور بدن پر مضبوط زرہ تھی جم کر مقابلہ کیا اور سرانجام اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو گئے۔

مرحب کو شکست دینے کے بعد حضرت علیؓ نے یہ حکم دیا کہ قلعہ نطات کا دروازہ شہتیروں کی مدد سے توڑ دیا جائے۔ (شہتیر دراصل درخت کے بہت بڑے تنے کو کہتے ہیں جسے تیس چالیس افراد مل کر اٹھاتے اور تیزی سے بھاگتے ہوئے قلعے کے دروازے پر مارتے تھے جب دروازے پر شہتیر کی دو تین ضربیں پڑتیں تو وہ جتنا بھی مضبوط ہوتا ٹوٹ کر گر جاتا تھا) اس دن مسلمانوں نے درخت کے تین تنوں کا استعمال کیا اور ہر تنے کو پچاس آدمیوں نے اٹھا رکھا تھا۔ ایک طرف جبکہ مسلمان قلعے کا دروازہ توڑنے میں مصروف تھے تو دوسری طرف حضرت علیؓ نے کچھ مسلمانوں کو معراج یعنی سیڑھی کے ذریعے دیوار پر چڑھنے اور قلعے میں اترنے کا حکم دیا۔

مسلمان سپاہی اپنے پیغمبرؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پہلے قلعے کی دیوار تک پہنچتے پھر سیڑھی کے ذریعے قلعے میں اتر جاتے تھے۔ تاہم مسلمانوں کے شدید حملے کے باوجود قلعہ نطات کے محصور دو دن تک پائیداری کرتے رہے لیکن سرانجام مسلمانوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ مسلمانوں نے قلعہ کا مضبوط دروازہ توڑ دیا اور وہاں موجود یہودیوں کو قیدی بنا لیا۔ اس قلعے سے مسلمانوں کو بہت زیادہ مقدار میں مال غنیمت بھی حاصل ہوا۔

قلعہ نطات پر غلبہ پانے کے بعد حضرت علیؓ نے ناعم نامی قلعے کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جنگ خیبر کے دوران حضرت علیؓ نے دس دنوں میں چار قلعوں کو تسخیر کیا جبکہ بقیہ قلعوں کے رہنے والے خود ہی تسلیم ہو گئے۔ اس دس روزہ مدت میں حضرت علیؓ نے سولہ بار تن بہ تن لڑائی کی اور ہر مرتبہ اپنے حریف کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا اس طرح زخمی کر دیا کہ وہ لڑنے کے قابل نہ رہا۔ کچھ اسلامی تذکرہ نویسوں کے مطابق ان دس دنوں میں حضرت علیؓ متواتر بخار میں مبتلا رہے اور بعض کا کہنا ہے کہ انہیں آنکھ کی تکلیف نے پریشان کئے رکھا تھا۔

ایک اور روایت کے مطابق بقیہ چار قلعوں کے مدافعین بغیر کسی مزاحمت کے تسلیم نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے حضرت علیؓ کے شدید حملوں سے مجبور ہو کر ہتھیار پھینکے تھے۔

جنگ خیبر میں حضرت علیؓ کی فتح اور ان کے ہاتھوں مضبوط ترین قلعوں کی تسخیر ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے اور یہ واقعہ بلاشبہ اسلام کی درخشندہ اور تابندہ کامیابیوں میں سے ایک ہے۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ اسلامی فوج کے سپہ سالار کے پاس قلعوں کو فتح کرنے کے مناسب ہتھیار اور آلات موجود نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان بیس ہزار افراد کی مدافعت کو شکست میں بدل دیا جو آٹھ مستحکم قلعوں کی آڑ لے کر مسلمانوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔

جب مسلمانوں کے ہاتھوں آخری قلعے کے سقوط کی خبر حضرت محمد ﷺ کو موصول ہوئی تو آپؐ حال ہی میں بستر بیماری سے اٹھے تھے۔ آپؐ نے سارے مسلمانوں کے سامنے حضرت علیؓ کو سینے سے لگایا' ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا "یا علی تو اسد اللہ ہے" یعنی اللہ کا شیر ہے۔ یہ لقب آج بھی علیؓ کے دوسرے القاب کے مقابلے میں زیادہ شہرت رکھتا ہے۔

فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کو وافر مقدار میں جنگی غنائم خاص طور پر اشیائے خوردنی حاصل ہوئیں۔ زوجہ پیغمبرؐ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ بننے کے بعد مجھے پہلی بار جی بھر کر کھجوریں کھانے کا موقع ملا اور یہ موقع خیبر کے بعد ہی نصیب ہوا تھا۔ اس سے پہلے ہمارے گھر میں آنے والی کھجوریں اتنی کم ہوتی تھیں کہ انہیں گن گن کر تقسیم کیا جاتا تھا۔

فتح خیبر کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ مہربانی اور درگزر کا رویہ اختیار کیا۔ یہودیوں کو یہ اجازت دے دی گئی کہ چاہیں تو خیبر چھوڑ کر جا سکتے ہیں اور جو چاہیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں لیکن انہیں کھجوریں' بھیڑیں اور دوسرا غلہ لے جانے کی اجازت نہیں بلکہ صرف اثاث البیت یعنی گھریلو سامان اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ تاہم جو یہودی خیبر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے انہیں وہاں رہنے کی اجازت مل گئی اور یہ رعایت بھی حاصل ہو گئی کہ وہ اپنا سابقہ کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے خیبر کے یہودیوں پر ایک اور احسان بھی کیا جو یہ تھا کہ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کو یہودی عورتوں سے "متعہ" کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ متعہ دراصل مغلوب اقوام کی عورتوں سے عارضی شادی کرنے کا دوسرا نام تھا لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودی عورتوں کے سلسلے میں یہ رسم عارضی طور پر منسوخ کر دی۔ اس کے علاوہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت علیؓ نے یہ پابندی بھی لگا دی کہ مسلمان سپاہی یہودیوں کے نخلستانوں اور باغوں میں داخل نہ ہوں تاکہ ان کی پیداوار کو نقصان نہ پہنچے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودیوں اور مسلمانوں کے تعلقات بہتر بنانے کی غرض سے ایک یہودی خاتون سے نکاح بھی کرلیا جس کا نام صفیہؓ تھا (اسلامی تواریخ میں حضرت صفیہؓ کا پورا نام صفیہ بنت حی بن اخطب ذکر ہوا ہے۔ بعض نے اصلی نام زینب ذکر کیا ہے۔ پہلی شادی سلام بن مشکم نامی شخص سے ہوئی۔ اس سے طلاق ہوئی تو کنانہ بن ابی الحقیق کی زوجیت میں آئیں۔ یہ شخص غزوہ خیبر میں لڑتا ہوا مارا گیا تو اسیر ہو کر دحیہؓ کلبی کے حصے میں آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے والد کے مقام کے پیش نظر جو خیبر کا رئیس تھا' ان کا فدیہ ادا کرکے اپنے نکاح میں لے لیا۔ حضرت صفیہؓ نے ساٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ خلیل)

ایک دن ایک مسلمان سپاہی خیبر کے قلعوں سے گزرتا ہوا نامعلوم شخص کے حملے کا نشانہ بنا اور جاں بحق ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے یہودیوں کو اکٹھا کیا اور ان سے قتل کے بارے میں تفتیش کی۔ یہودیوں نے قسم اٹھائی کہ اس شخص کا قاتل یہودیوں میں سے نہیں اور خیبر کے یہودی بے گناہ ہیں۔ حضرت علیؓ نے سارا ماجرا پیغمبر اسلام ﷺ کے گوش گزار کیا اور کہا کہ یہودیوں کے بزرگ کہتے ہیں کہ اس قتل میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں لہٰذا مقتول کا خون بہا کس سے لیا جائے؟

پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا کہ چونکہ ان لوگوں نے قسم کھائی ہے کہ مسلمان سپاہی کا قاتل یہودیوں میں سے نہیں لہٰذا میں ان کی بات مان لیتا ہوں اور مقتول کا خون بہا بذات خود ادا کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی جیب سے خون بہا ادا کر دیا۔

فتح خیبر کے بعد یہودیوں کے دو قبیلوں نے جو وادی القراء کے علاقے میں رہتے تھے اور اسی طرح دو اور قبیلوں نے جو بالترتیب فدک اور تیمہ کے مقام پر سکونت پذیر تھے مسلمانوں کے ساتھ مصالحت آمیز رویہ اختیار کیا اور انہیں "جزیہ" دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

خالد بن ولید نے کہا

”یہ دین دھوکہ نہیں ہو سکتا“۔

جنگ خیبر اپنے عروج پر تھی کہ حبشہ سے دو مسافر خیبر پہنچے۔ ان میں سے ایک پیغمبر اسلام ﷺ کے رضاعی بھائی جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرے عمروؓ بن امیہ تھے۔ یہ دونوں حضرات ان مسلمانوں میں شامل تھے جو پہلی بار ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور حبشہ چلے گئے تھے۔ ان دونوں کی واپسی کے بعد جزیرۃ العرب کا اور کوئی مسلمان حبشہ میں باقی نہ رہا۔

فتح خیبر کے بعد چونکہ یہودیوں کو مختلف مراعات حاصل ہو گئیں لہٰذا انہوں نے اپنی عبادت گاہوں کو از سر نو کھولا اور حسب سابق عبادت میں مشغول ہو گئے۔ یہودیوں کی تمام مقدس کتابیں اور دوسرے اہم کاغذات بھی، جو مسلمانوں کے ہاتھ لگے لوٹا دیئے گئے

اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات اتنے حسنہ ہو گئے کہ ایک یہودی عورت نے اعلان کیا کہ میں اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے بھیجوں گی۔

اس عورت کا نام زینب بن حرث تھا اور وہ سلام بن مشکم کی بیوی تھی۔ اس عورت نے ایک دنبہ ذبح کروایا اور چونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ حضرت محمد ﷺ کو دنبے کی ران بہت پسند ہے لہٰذا اس نے دونوں رانیں بریان کرتے وقت ان میں زہر ملا دیا اور وہ کھانا پیغمبر اسلام ﷺ کو بھجوا دیا۔

جب بریان شدہ گوشت پیغمبر اسلام ﷺ کو پیش کیا گیا تو ان کے پاس ایک صحابی بیٹھے تھے جن کا نام بشیرؓ بن براء بن معرور تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے ایک ران انہیں پیش کی اور دوسری سے ایک بوٹی توڑ کر اپنے منہ کی طرف لے گئے۔

بشیرؓ بن براء نے بھی دانتوں سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا' چبایا اور نگل گئے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلا لقمہ چباتے ہی گوشت تھوک دیا اور بشیرؓ بن براء کو خبردار کرتے ہوئے بولے "یہ گوشت مت کھاؤ اس میں زہر ملا ہوا ہے"۔

بشیرؓ بن براء نے گھبرا کر ران پھینک دی لیکن جو گوشت وہ نگل چکے تھے اس نے اپنا اثر دکھایا اور جلد ہی ان کی موت واقع ہو گئی جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی جان محفوظ رہی۔

زینب بن حرث کو گرفتار کر لیا گیا اور اس سے پوچھا گیا: "کیا رسول اللہ (ﷺ) کو زہر آلود گوشت تو نے بھیجا تھا؟"

اس عورت نے اپنے کئے کا اعتراف کر لیا اور کہا "میں نے یہ سوچ کر گوشت میں زہر ملایا تھا کہ اگر محمد (ﷺ) فرستادہ خدا ہوں اور اللہ کے سچے نبی ہوں تو وہ اس گوشت کو ہرگز تناول نہیں کریں گے اور انہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ لیکن اگر وہ رسول اللہ نہ ہوئے تو گوشت کھا کر جاں بحق ہو جائیں گے۔ لیکن چونکہ محمد (ﷺ) نے گوشت نہیں کھایا اور فوراً اگل دیا لہٰذا مجھ پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں"۔

میں (کونسٹن ویرژیل) نے کسی بھی ماخذ کتاب میں جن میں مسعودی' ابن ہشام' اسد بیگ' طبری اور ابن ابی الحدید جیسے شہرت یافتہ مؤرخین کی کتابیں شامل ہیں یہ نہیں دیکھا کہ مسلمانوں نے اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اسے سزا دی یا بخش دیا یا پھر وہ عورت یہ جاننے کے بعد کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں ان پر ایمان لے آئی اور مسلمان ہو گئی؟!

تاہم کچھ علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے رحلت سے پہلے اپنے اقربا کو بتایا تھا کہ ان کی موت کا اصلی سبب فی الواقع وہی زہر ہے جو خیبر میں انہیں دیا گیا تھا۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آپؐ نے زہریلا گوشت کھایا نہیں فوراً تھوک دیا تھا مگر یہ مانا جائے کہ گوشت کا جو شیرہ ایک بار چبانے سے نکلا ہو گا وہ آپ ﷺ کے بدن میں سرایت کر گیا ہو اور بعد میں آپ کی علالت اور سرانجام رحلت کا سبب بنا ہو۔

اگر بعض علماء کی نقل کردہ روایت صحیح مان لی جائے تو پھر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ بن عبداللہ بھی درجہ شہادت پر فائز ہوئے کیونکہ آپ نے دشمن کے دیئے ہوئے زہر کے نتیجے میں دعوت حق کو لبیک کہا۔

بہرحال یہ تو ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے سن ۶۲۸ء یا ہجرت کے چھٹے سال اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حج و عمرہ پر جانے کا ارادہ کیا اور اسی مقصد سے سوئے مکہ روانہ ہوئے لیکن مکہ کے بت پرستوں نے حدیبیہ کے مقام پر ان کا راستہ روک لیا اور مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ البتہ اسی مقام پر مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان عدم جارحیت کا دس سالہ معاہدہ منعقد ہوا جس کی ایک شق یہ تھی کہ مسلمان اگلے سال خانہ کعبہ کی زیارت کو آسکتے ہیں بشرطیکہ وہ تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ کریں۔ چنانچہ اگلے سال سن ۶۲۹ء یعنی ہجرت کے ساتویں سال پیغمبر اسلام ﷺ اپنے دو ہزار اصحاب کے ہمراہ بغرض عمرہ مکہ روانہ ہو گئے۔

چونکہ سارے مسلمان زیارت کی غرض سے مکہ جا رہے تھے لہٰذا ان کے پاس

سوائے تلوار کے کوئی اور اسلحہ موجود نہ تھا اور یہ تو ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اس زمانے میں تلوار ایک جنگی اسلحہ نہیں بلکہ عربوں کے لباس کا حصہ سمجھی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود جب مسلمین مکہ میں داخل ہوئے تو قریش خوفزدہ ہو کر مکہ سے باہر نکل گئے اور آس پاس کی پہاڑیوں' خاص طور پر ان پہاڑیوں پر چلے گئے جو خانہ کعبہ کے بالکل سامنے تھیں تاکہ وہاں سے مسلمانوں کے حج کا تماشا بھی دیکھ سکیں۔

قریش کے مکہ سے نکل جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں مسلمان مکہ میں داخل ہونے کے بعد ان پر حملہ آور نہ ہو جائیں اور ان کا قتل عام نہ کر ڈالیں۔ دوسری طرف پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی احتیاطی تدابیر ملحوظ خاطر رکھیں اور مکہ میں داخل ہونے سے پہلے سو سواروں پر مشتمل ایک حفاظتی رسالہ جس کی قیادت محمدؓ بن مسلمہؓ کر رہے تھے مکہ کے مضافات میں "مر الظہران" نامی جگہ پر متعین کر دیا اور انہیں ہمہ وقت چوکنا رہنے کی ہدایات دیں۔

محمد مسلمہؓ اور ان کے ساتھی مر الظہران میں واقع ایک پہاڑی پر چڑھ کر مکہ کی نگرانی کر سکتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے محمدؓ بن مسلمہ کو آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم دیکھو کہ بت پرست ہم پر حملہ آور ہو گئے ہیں تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہماری مدد کو آنا ورنہ ہماری واپسی تک وہیں پر ٹھہرے رہو۔

بت پرست' جو نواحی پہاڑیوں سے مسلمانوں کے مکہ میں داخلے کا نظارہ کر رہے تھے ان کے اخلاص اور نظم و ضبط کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ سیاہ فام بلالؓ کو ایک دن جن کے ساتھ پیر بندھوا کر مکہ کی سلگتی زمین پر سورج کی تیز شعاعوں تلے موت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا آج خانہ کعبہ کی بلندی پر کھڑے اذان دے رہے تھے۔

جب مکہ کی فضاؤں میں بلالؓ کی آواز گونجی کہ "اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر لا الہ الا اللّٰہ" تو اہل مکہ جو نزدیکی پہاڑیوں پر کھڑے تھے خشم اور غضب کے مارے لرزنے لگے۔ انہیں توقع تھی کہ خانہ کعبہ کے بڑے بڑے بت آسمان کو اٹھا کر مسلمانوں کے سر پر پٹخ

دیں گے یا پتھروں کی بارش برسا کر انہیں بھس کا ڈھیر بنا دیں گے! لیکن مسلمانوں کے لئے کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا حتیٰ کہ آسمان سے ایک کنکری بھی نہ گری لیکن یہ ضرور ہوا کہ مکہ کی فضائیں پہلی بار پورے طنطنے کے ساتھ "اللہ اکبر" کے کفر شکن الفاظ سے گونج اٹھیں۔

جب مسلمان احرام باندھے اپنے پیغمبرؐ کے دوش بدوش خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے تو فرط شوق سے سب کی آنکھیں پرنم تھیں لیکن عمرؓ بن خطاب جو انتہائی مضبوط دل اور با ارادہ سمجھے جاتے تھے بے اختیار ہو کر بلند آواز میں رو رہے تھے۔ دراصل مسلمانوں کے دل ایک عرصہ سے خانہ کعبہ کے لئے تڑپ رہے تھے اور قریش کی ناروا بندشوں کے باعث وہ اتنے مایوس ہو چکے تھے کہ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کر رہے ہیں-----!

بہرحال مناسک حج کے اختتام پر پیغمبر اسلام ﷺ نے قریش کے ساتھ مزید انس و الفت بڑھانے کی غرض سے مکہ کی ایک انتہائی مشہور خاتون کو اپنے حبالہ نکاح میں لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میمونہؓ بنت حارث پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ حضرت میمونہؓ پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی سالی تھیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی حضرت میمونہؓ سے مناکحت کو اس دور کا انتہائی اہم قدم تصور کرنا چاہئے کیونکہ میمونہؓ کی آٹھ بہنیں تھیں جو مکہ کے آٹھ ممتاز اور بااثر لوگوں کی بیویاں تھیں۔

تین مشہور اسلامی مؤرخ ابن ہشام' زمخشری اور ابن حبیب لکھتے ہیں کہ جو بھی حضرت میمونہؓ سے شادی کرتا تو وہ خود بخود تمام اہل مکہ کا تعلق دار بن جاتا۔ ابن حبیب لکھتا ہے کہ حضرت میمونہؓ کی ماں "ہند" جزیرۃ العرب کی عورتوں میں سب سے اونچا مقام رکھتی تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت میمونہؓ کی باہمی ازدواجی سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ مکہ کے نامور سردار خالد بن ولید بھی آپ ﷺ کے اقرباء میں شامل ہو گئے۔ خالد

بن ولید حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے اور حضرت میمونہؓ نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا تھا۔ لہٰذا جب وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زوجیت میں آئیں تو خالد بن ولید ایک طرح سے آپؐ کے فرزند خواندہ کہلائے۔

اس شادی سے پیغمبر اسلام ﷺ کا مطمع نظر یہ تھا کہ قریش کے بزرگوں کو دعوت طعام دیں اور ان سے کہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھائیں اور ولیمے کی دعوت آپس میں مل بیٹھنے کا بہترین وسیلہ تھی۔

بہرحال حج کے دوسرے دن ضیافت کا بندوبست شروع ہو گیا لیکن اہل مکہ بدستور مضافات کی پہاڑیوں پر کھڑے تھے اور انہیں نیچے اتر کر مکہ میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کے مذہبی ولولے' حضرت بلالؓ کی اذان اور نماز کے وقت مسلمانوں کی منظم صفیں دیکھ کر ان لوگوں پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کیفیت کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑے مکہ کے نامور سردار خالد بن ولید نے اپنے ساتھیوں سے کہا "مجھے اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ یہ دین جس کے ماننے والے اتنے پر خلوص شیدائی ہیں تو یہ کوئی دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک بے عقل انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو لوگ محمد (ﷺ) کے پیروکار ہیں وہ ان پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اگر ان کے دین میں ذرا بھی کھوٹ ہوتی تو لوگ اتنے والہانہ انداز میں ان کے گرویدہ نہ ہوتے"۔

بہرحال مکہ میں قیام کے تیسرے دن پیغمبر اسلام ﷺ نے سوچا کہ قریش کو دعوت دینے کے لئے ایک قاصد روانہ کریں تاکہ وہ قریش کے بزرگوں سے کہے کہ وہ لوگ پہاڑیوں سے اتر کر پیغمبر اسلام ﷺ اور حضرت میمونہؓ کے ولیمے میں شرکت کریں لیکن اس سے پہلے کہ قاصد روانہ ہو' قریش کا ایک وفد مکہ میں داخل ہوا اور سیدھا پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچا۔ اس وفد کی قیادت عبدالعزا نامی شخص کر رہا تھا۔

"عزا" جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ خانہ کعبہ کے تین بڑے بتوں میں سے ایک تھا اور اہل مکہ میں عبدالعزا کی طرح عبداللات اور عبدالمنات جیسے نام بھی کثرت سے پائے جاتے

تھے کیونکہ لات اور منات بھی اِن کے مشہور خداؤں میں شمار ہوتے تھے۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ اہل مکہ اللہ کو بھی پہچانتے تھے اور اس کی بھی لات و منات کی طرح پرستش کرتے تھے اور ہم جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے حضرت محمد ﷺ کے والد کا نام عبداللہ تھا لیکن اہل مکہ کی نظر میں اللہ کو دوسرے بڑے "خداؤں" پر فوقیت نہ تھی بلکہ وہ اللہ کو ابراہیم علیہ السلام کا اللہ سمجھتے تھے اور اس کا احترام بھی کرتے تھے۔

بہرکیف جد عبدالعزا اپنے وفد کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ آپ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ضیافت کا بندوبست کر رہے ہیں۔ وفد کے سربراہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ضیافت کا بندوبست اس لئے کیا جا رہا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے نکاح پر ولیمہ دیا جائے اور قریش کو بھی مدعو کیا جائے تو اس نے بلا تامل کہا "یا محمد (ﷺ) تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فوری طور پر مکہ سے نکل جاؤ کیونکہ معاہدے کی رو سے تم لوگ صرف تین دن تک مکہ میں ٹھہر سکتے ہو اور آج یہ مہلت ختم ہو رہی ہے"۔

چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ نے معاہدے کا پاس رکھتے ہوئے دعوت منسوخ کر دی اور اسی دن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سوئے مدینہ روانہ ہو گئے۔ لیکن ابھی مسلمان مکہ سے دور نہ ہوئے تھے کہ خالد بن ولید جو حضرت میمونہؓ کی نسبت سے پیغمبر اسلام ﷺ کے نزدیکی رشتے دار بن چکے تھے اور مسلمانوں کے اتحاد' ایمان اور تنظیم نے ان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا' مکہ سے نکلے اور مسلمانوں کے قافلے سے جا ملے۔ انہوں نے مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ بعد میں خالدؓ بن ولید نے ایک مسلمان سپہ سالار کی حیثیت سے بہادری اور شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں "سیف اللہ" کے لقب سے نوازا جس کا مطلب ہے "اللہ کی تلوار"۔ حضرت علیؓ کے بعد جنہیں "اسد اللہ" کے لقب سے نوازا گیا' کوئی اور مسلمان اس مقام کو نہ پہنچ سکا جسے خالدؓ بن ولید کی طرح "سیف اللہ" جیسے لقب سے نوازا جاتا۔

جب خالدؓ بن ولید مسلمان ہونے کی غرض سے مسلمانوں کے قافلے کی طرف جا رہے تھے تو انہیں راستے میں ایک شخص ملا جو ملک حبشہ سے آ رہا تھا۔ اس شخص کا نام "عمرو بن العاص" تھا وہ بھی مشرف بہ اسلام ہونے کے لئے اسلامی قافلے کی تلاش میں تھا۔

یہ تو آپ کو یاد ہو گا کہ صلح حدیبیہ کے مطابق اگر مکہ کا کوئی شہری قریش کی اجازت کے بغیر مسلمانوں سے آ ملے تو مسلمان مذکورہ شخص کو قریش کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن جب خالدؓ بن ولید جیسا شخص مسلمانوں سے پیوستہ ہو گیا تو قریش کو انہیں طلب کرنے کی جرات نہ ہو سکی چونکہ انہیں احساس ہو چلا تھا کہ اب اسلام پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز اور مستحکم ہو گیا ہے۔

مسلمانوں کے مدینہ پہنچنے کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاص کے اسلام لانے سے زیادہ تعجب آور اور قابل توجہ ہے اور وہ ہے قشون مکہ کے سپہ سالار اور قریش کے سب سے بڑے سردار ابوسفیان کا پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ آنا۔

ابوسفیان کسی فوج کے بغیر یعنی اکیلے ہی مکہ سے سوئے مدینہ روانہ ہوا اور ایسے شہر میں داخل ہوا جہاں کے سارے باشندے مسلمان تھے لیکن وہ اس شہر میں داخل ہوتے وقت خوفزدہ نہ ہوا کیونکہ ایک تو حدیبیہ کا معاہدہ پوری قوت سے باقی تھا اور وہ جانتا تھا کہ جب تک معاہدہ برقرار ہے مسلمان اسے آزار نہیں پہنچائیں گے۔ دوسرے اسے پیغمبر اسلام ﷺ کے ذاتی خصائل کا بخوبی علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آپؐ امین کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ رحم و مروت اور مہر و محبت میں آپ کا کوئی ثانی نہیں اور تیسری وجہ جس کی بنا پر ابوسفیان اکیلے ہی مدینہ چلا آیا یہ تھی کہ اس کا اکیلا آنا ایک طرح کا پناہ مانگنا تصور ہوتا تھا اور عرب قبیلوں میں پناہ مانگنے والے کی جان اور مال نہ صرف محفوظ رہتے بلکہ وہ اس کی حفاظت کے لئے جان کی بازی بھی لگا دیتے تھے لیکن ابوسفیان مدینہ

کیوں آیا اس کی کہانی درج ذیل ہے۔

صلح حدیبیہ کے مطابق یہ طے پا چکا تھا کہ دونوں فریق جس کے ساتھ چاہیں اتحاد کریں اور جس سے بھی چاہیں مقابلہ آرائی کریں لیکن ایک فریق جب کسی قبیلے یا قبائل سے لڑ رہا ہو تو دوسرا فریق اس کے دشمن کی حمایت نہیں کرے گا اور بالکل بے طرف رہے گا۔ اتفاق سے انہی دنوں مسلمانوں کا اتحادی قبیلہ خزاعی' قبیلہ بنو بکر کی طرف سے جارحیت کا نشانہ بن گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ مکہ کے اشراف نے نہ صرف یہ کہ بنو بکر کو ہتھیار اور سپاہی فراہم کیے ہیں بلکہ اس بات کا بھی ثبوت موجود تھا کہ قبیلہ بنو بکر نے قریش ہی کی مدد اور ترغیب پر قبیلہ خزاعی کو حملے کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ اہل مکہ کا بنو بکر کی مدد کرنا حدیبیہ کے معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی لیکن مکہ کے سرداروں نے اس وقت تک اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی جب تک کہ خیبر مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نہ ہو گیا۔ جب خیبر پر مسلمانوں کا غلبہ ہوا اور جزیرۃ العرب کے شمال میں ایک وسیع خطہ زمین پر مسلمانوں کی برتری قائم ہو گئی تو اس وقت مکہ کے بزرگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ان میں سنسنی پھیل گئی۔ ان پر وحشت و اضطراب کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انہیں مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں ہر دم اپنے قریب آتے محسوس ہونے لگیں۔ لہٰذا اسی تشویش اور اضطراب کو دور کرنے کے لئے ابوسفیان مدینہ پہنچا تھا تاکہ "باہمی اختلاف" حل ہو سکیں۔

مدینہ پہنچنے کے بعد ابوسفیان اپنی بیٹی اور پیغمبر ﷺ کی زوجہ ام حبیبہؓ کے گھر میں داخل ہوا جب ابوسفیان نے ام حبیبہؓ کے کمرے میں قدم رکھا تو انہوں نے کمرے میں بچھا فرش سمیٹ لیا۔ ابوسفیان کو اپنی بیٹی کے اس عمل پر بہت حیرت ہوئی اور اس نے پوچھا "تم نے فرش کیوں سمیٹ لیا ہے؟" ام حبیبہؓ نے اپنے باپ کو جواب دیا کہ اس فرش پر رسول اللہ ﷺ بیٹھتے اور آرام فرماتے ہیں۔ تم جیسا بت پرست اس فرش پر بیٹھنے کے لائق نہیں۔ چنانچہ ابوسفیان نے کھڑے کھڑے اپنی بیٹی سے درخواست کی کہ وہ اپنے خاوند

کے سامنے اس کی سفارش کریں تاکہ دو قبیلوں میں جو نزاع پیش آیا ہے وہ بخیر و خوبی حل ہو جائے!

حضرت ام حبیبہؓ نے جواب دیا کہ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی تم خود رسول اللہ ﷺ سے جاکر ملو اور اپنا مسئلہ انہی کے سامنے بیان کرو۔ ابو سفیان نے پوچھا "وہ اس وقت کہاں ہیں"۔ ام حبیبہؓ نے جواب دیا مسجد میں۔

ابو سفیان مسجد پہنچا۔ پیغمبر اسلام ﷺ اس کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا اور پوچھا۔

"کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟"

ابو سفیان بولا "ہاں یا محمد (ﷺ) میں اس لئے یہاں آیا ہوں کہ قبیلہ بنو بکر اور خزاعی کے درمیان جو ناچاقی پیش آئی ہے اس کے بارے میں آپ سے گفتگو کروں"۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ابو سفیان بولا "میں یہ کہنے آیا تھا کہ قبیلہ بنو بکر اور خزاعی کے درمیان جو لڑائی چھڑی ہے اس میں اہل مکہ نے بنو بکر کی مدد یا حمایت نہیں کی..... لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے قبیلہ بنو بکر کی مدد کی ہے تو ہم قبیلہ خزاعی کا نقصان پورا کرنے کو تیار ہیں!" جواب میں پیغمبر اسلام ﷺ ابو سفیان کو بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوئے "اگر تم لوگوں نے بنو بکر کی حمایت یا مدد نہیں کی تو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے! ہم تم سے خسارہ طلب نہیں کریں گے"۔

ابو سفیان بے جواب ہو کر رہ گیا اور اپنا اندرونی اضطراب چھپائے اسی دن مدینہ سے نکل کر مکہ روانہ ہو گیا۔



لشکر روم سے ٹکر

فتح خیبر کے بعد اسلام کی طاقت اور پیغمبر اسلام ﷺ کے اقتدار میں اتنا اضافہ ہوا کہ انہوں نے مختلف بادشاہوں کو مراسلے ارسال کئے اور انہیں قبول اسلام کی دعوت دی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک نامہ بزنطین کے سلطان اور دوسرا ایران کے بادشاہ کو بھیجا گیا۔ اسی طرح حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور مصر کے شہنشاہ کو بھی خطوط روانہ کئے گئے۔

جزیرۃ العرب کی ہمسائیگی میں ایک حکمران ایسا تھا جو بزنطینی سلطنت کے زیر اثر حکومت کرتا تھا۔ اس شخص کا نام حارث بن ابی شمیر تھا۔ اسے اپنے علاقے میں بادشاہ جیسے اختیارات حاصل تھے اور عام لوگ اسے بادشاہ ہی تصور کرتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک خط حارث بن ابی شمیر کے نام بھی لکھوایا اور اپنے خاص ایلچی حارثؓ بن عمیر کے سپرد کرتے ہوئے یہ ہدایات دیں کہ یہ خط حارث بن ابی شمیر کے حوالے کرنا اور اس سے جواب لے کر آنا۔

لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ کا ایلچی، حارث بن ابی شمیر کی مملکت میں داخل ہوا

تو اس کے ایک سرحدی حکمران شرجیل بن عمرو نے اسے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ واقعہ مسلمانوں پر گراں گزرا اور انہیں حارث بن عمیر کی موت کا بہت صدمہ پہنچا کیونکہ دنیا کی ساری قوموں میں ایک ایلچی کو امان حاصل ہوتی ہے اور اسے قتل نہیں کیا جاتا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حارث بن ابی شمیر کو پیغام بھجوایا کہ تیرے کارندے شرجیل بن عمرو نے ایک بے گناہ شخص کو جو محض ایک خط تجھ تک پہنچانے آ رہا تھا موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ وہ شخص تنہا اور نہتا تیری سرحدوں میں داخل ہوا تھا اور اس کے سفر کا مقصد بھی یہ نہ تھا کہ کسی دشمنی کا اظہار کرے لیکن اس کے باوجود اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ ایک ایلچی کو قتل کرنا کسی بھی قبیلے' قوم یا مذہب میں روا نہیں اور چونکہ تیرے حاکم نے حارث بن عمیر کو ہلاک کیا ہے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے یہ کام تیری رضامندی اور حکم کے مطابق کیا ہے یا اپنی خود سری سے۔ اگر اس نے ہمارے بے گناہ ایلچی کو تیرے حکم کے بغیر موت کے گھاٹ اتارا ہے تو تجھے چاہئے کہ اس شخص کو ہمارے حوالے کر دے تاکہ وہ اپنے کئے کی سزا بھگت سکے۔ لیکن اگر اس جرم میں تیرا بھی حکم شامل ہے تو تو بھی اس قتل کا ذمہ دار ہے اور تجھے بھی سزا کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

حارث بن ابی شمیر نے جواب میں یہ خط لکھوا بھیجا کہ میں اپنے ملک کا خود مختار بادشاہ ہوں' جسے چاہے قتل کروں جیسے چاہے بخش دوں یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ کسی کو مجھ سے جواب طلبی کا حق نہیں پہنچتا۔ واضح ہے کہ اس ایلچی کو میرے ہی حکم پر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔

جب پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا گستاخانہ اور غیر ذمہ دارانہ جواب دریافت کیا تو اسی وقت حارث بن ابی شمیر کی گوشمالی کا فیصلہ کر لیا۔ پھر آپؐ نے تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج اس کی مملکت غسان کی طرف روانہ کر دی۔ اتفاق سے انہی دنوں رومیتہ الصغریٰ کا بادشاہ ایران پر حملہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اسی مقصد کے تحت اس نے ایک لاکھ

کار آموزہ سپاہیوں پر مشتمل ایک عظیم فوج تیار کر لی تھی۔ جب رومیتہ الصغریٰ کے بادشاہ کو حارث بن شمیر کی درخواست موصول ہوئی تو اس نے ایک لاکھ فوج اس کی مدد کو روانہ کر دی۔ یہ معلوم نہیں کہ حارث بن ابی شمیر کے پاس اپنی کتنی سپاہ موجود تھی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے سپاہیوں کی تعداد دس ہزار اور کچھ نے ایک لاکھ درج کی ہے۔ آخری عدد کچھ مبالغہ آمیز دکھائی دیتا ہے کیونکہ حارث بن ابی شمیر ایک چھوٹی مملکت کا کٹھ پتلی بادشاہ تھا اور اس میں اتنی عظیم فوج جمع کرنے کی استطاعت نہیں تھی۔ اگر بالفرض حارث کے پاس اپنی کوئی فوج نہ ہوتی تو بھی ایک لاکھ کا رومی لشکر مسلمانوں کی صرف تین ہزار کی سپاہ کے مقابلے میں ایک عظیم اور طاقتور فوج کی حیثیت رکھتا تھا۔

بہرحال یہ دونوں فوجیں موتہ کے مقام پر ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہو گئیں۔ موتہ کا علاقہ حارث بن شمیر کی مملکت غسان میں واقع تھا۔ اسلامی تذکرہ نویسوں نے قشون اسلام کی قیادت کے بارے میں دو مختلف روایات نقل کی ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ جب لشکر اسلام مدینہ سے روانہ ہوا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خواندہ فرزند زیدؓ بن حارث کو اس کی قیادت سونپی تھی۔ دوسری روایت کہتی ہے کہ حضرت علیؓ کے بھائی جعفرؓ بن ابی طالب کو اسلامی فوج کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ جنگ کے محل وقوع کے بارے میں بھی اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جنگ موتہ غسان نامی علاقے میں مسلمانوں کی دوسری لڑائی تھی۔ جب قلت سپاہ کے باعث مسلمان پیچھے ہٹے تو انہوں نے موتہ کے مقام پر دوسری مرتبہ رومی لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔

بہرحال ایک لاکھ رومی سپاہی جنہیں روم کے بادشاہ نے حارث بن ابی شمیر کی مدد کو بھیجا تھا ہر طرح کے جنگی ساز و برگ سے آراستہ تھے اور انہیں لڑائی کے مختلف طریقوں میں بھی مہارت حاصل تھی۔ وہ لوگ ہر چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایسا دستہ تشکیل دیتے جسے "لیجن" کہتے تھے۔ ہر لیجن تین گروپوں میں تقسیم ہوتا اور ہر گروہ کو "مینی پول" کہا

جاتا تھا۔ یعنی ہر مینی پول دو سو سپاہیوں کا جتھہ ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہر مینی پول دو حصوں میں بانٹ دیا جاتا اور ہر حصے کو "سنتوری" کہتے یعنی ہر سنتوری میں ایک سو سپاہی شامل ہوتے تھے۔ لشکر روم کے تمام سپاہی فولادی خود اور زرہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کی ڈھالیں بہت بڑی اور تلواریں اور نیزے غیر معمولی لمبے تھے۔ لشکر روم کے سپاہی مخصوص جنگی صف آرائی یعنی فالاٹز (یا انگریزی میں Flanks) کی تشکیل کے فن سے بھی آگاہ تھے۔ اس بارے میں ہم نے جنگ بدر کے باب میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

جب مسلمانوں کی مختصر سی سپاہ روم کی عظیم فوج کے مقابل آ کھڑی ہوئی تو کچھ مسلمانوں نے کہا کہ ہمیں آپس میں مشورہ کرنا چاہئے کہ فی الوقت لڑائی کرنے میں ہماری فتح کے امکانات کتنے ہیں۔ انہوں نے کہا اگرچہ گزشتہ تمام جنگوں میں دشمن کی تعداد ہم سے کئی گنا زیادہ ہوتی تھی لیکن اس مرتبہ جو دشمن ہمارے سامنے کھڑا ہے وہ ہم سے چالیس یا پچاس گنا بڑا ہے اور اس کے پاس جو جنگی ساز و سامان ہے وہ بھی انتہائی اعلیٰ ہے اور نئی قسم کا ہے۔ جبکہ ہمارے کچھ سپاہیوں کے پاس زرہ اور آہنی خود تک نہیں اور انہیں کسی حفاظتی لباس کے بغیر میدان جنگ میں اترنا ہوگا۔

اسلامی فوج کے سپہ سالار زیدؓ بن حارث یا جعفرؓ بن ابی طالب نے (اگر جعفرؓ بن ابی طالب سپہ سالار مقرر ہوئے ہوں) پر جوش انداز میں جواب دیا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑنے آئے ہیں اگر دشمن کو مار ڈالیں اور فتحیاب ہوں تو ہمارا انعام بہشت ہے لیکن اگر خود مر جائیں اور مغلوب ہو جائیں تو بھی ہمیں بہشت نصیب ہو گی۔ دشمن کی کثرت سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے لیکن ہم جو یہ جانتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں بہشت ہمارا مقدر ہے تو ہم دشمن کی کثرت سے خوفزدہ کیوں ہوں؟ حضرت زیدؓ بن حارث کے ان الفاظ نے مسلمانوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا اور وہ بے خوف ہو کر لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ یا میں (کونسٹن ویرژیل) کہوں گا کہ موت کا استقبال کرنے کو تیار ہو گئے۔

مسلمانوں نے جنگ شروع ہونے سے پہلے وہی حکمت عملی اختیار کی جسے گزشتہ جنگوں میں آزماتے آئے تھے یعنی انہوں نے فالاثر کی شکل میں اپنی صفیں آراستہ کیں لیکن اس بار مذکورہ صف آرائی سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ وجہ یہ تھی کہ رومی سپاہی بھی اس فن سے آگاہ تھے۔ اس کے علاوہ ان کے جنگی ہتھیار مسلمانوں کے ہتھیاروں سے کہیں بہتر اور ترقی یافتہ تھے۔ انہیں نیزہ پھینکنے میں بھی خاص مہارت حاصل تھی۔

جب لڑائی شروع ہوئی تو جنگ کے ابتدائی لمحات ہی میں زیدؓ بن حارث اجل کو لبیک کہہ گئے اور ان کی جگہ جعفرؓ بن ابی طالب نے سپاہ اسلام کی کمان سنبھال لی۔ وہ مسلسل تلوار چلا رہے تھے اور اپنے سپاہیوں کو مختلف ہدایات بھی جاری کر رہے تھے۔ انہی کی قیادت میں اسلامی سپاہ لڑتے لڑتے موتہ کے مقام تک پہنچ چکی تھی۔ اس مقام پر جعفرؓ بن ابی طالب ایسی حالت میں شہید ہوئے کہ ان کے دونوں ہاتھ کٹ کر گر چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ آخری دم تک ٹانگوں کی مدد سے لڑتے رہے۔

جعفرؓ بن ابی طالب کی وفات کے بعد "عبداللہ بن رواحہ" جن کا تعلق انصار سے تھا اسلام کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ عبداللہ بن رواحہ نے مسلمان سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے اور ان کے عزم و ہمت کو تقویت پہنچانے کی غرض سے بڑی دلنشین آواز میں قرآنی آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ وہ ایسی آیات کی تلاوت کر رہے تھے جن میں جہاد اور اسلام کی راہ میں جانفشانی کرنے اور بہشت میں جانے کا ذکر تھا۔ تاہم وہ اسی حالت میں تلوار بھی چلا رہے تھے اور مسلمانوں کو خبردار بھی کرتے جا رہے تھے کہ وہ اپنی صفوں کو قائم رکھیں اور مکمل اتحاد اور یکجہتی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں۔ اگر مسلمان اس جنگ میں جو "جنگ موتہ" کے نام سے مشہور ہے' اپنی صفوں کو منظم دستوں کی شکل میں برقرار نہ رکھتے تو بلاشبہ سب کے سب جاں بحق ہو جاتے۔ جو چیز اس بات کا سبب بنی کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر سپاہ اپنے سے کئی گنا بڑی اور طاقتور فوج کے سامنے شام تک پائیداری کرتی رہی یہی تھی کہ انہوں نے اپنی صفوں کو نہ ٹوٹنے دیا اور فالاثر جیسی مخصوص صف بندی برقرار رکھی۔

جب عصر کا وقت ہوا تو عبداللہؓ بن رواحہ بھی شہید ہو گئے اور خالدؓ بن ولید نے سپاہ اسلام کی قیادت سنبھال لی۔ کچھ روایات میں آیا ہے کہ جنگ موتہ صرف ایک دن میں ختم ہو گئی۔ جبکہ بعض روایات کہتی ہیں کہ یہ جنگ دوسرے روز بھی جاری رہی تھی۔ میرا (کونسٹن ویرژیل کا) خیال ہے کہ جنگ موتہ اسی دن' کہ جب خالدؓ بن ولید نے لشکر اسلام کی قیادت سنبھالی ختم ہو گئی تھی۔ اگر اسی روز جنگ کا خاتمہ نہ ہوتا اور مسلمان اگلے دن بھی رومیوں سے نبرد آزما ہوتے تو انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑتا۔ دو عوامل ایسے تھے جو اس بات کا سبب بنے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر فوج اس دن شام تک اپنے پیروں پر کھڑی رہی اور اس کی کمر خم نہ ہوئی تو اس میں سے ایک خالدؓ بن ولید کی بے مثال قیادت اور جنگی لیاقت تھی اور دوسرے رات کی تاریکی۔ اس زمانے میں تاریکی چھا جانے پر لڑائی خود بخود ختم ہو جاتی تھی۔

خالدؓ بن ولید سپاہ اسلام کی کمان سنبھالنے سے پہلے پانچ سو سپاہیوں کے ایک دستے کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کی عدیم المثال طاقت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جنگ کے آغاز سے اختتام تک نو مضبوط تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ کر بکھر چکی تھیں یعنی انہوں نے نو مرتبہ اپنی تلوار بدلی تھی۔ بہرحال جب انہوں نے اسلامی فوج کی قیادت سنبھالی تو مسلمانوں کے دستوں کو از سر نو منظم کیا اور دشمن پر تابڑ توڑ حملے کا فرمان جاری کر دیا۔

اس وقت تک مسلمانوں کے چھ فوجی دستوں میں سے تین مکمل طور پر ختم ہو چکے تھے یعنی ڈیڑھ ہزار مسلمان سپاہی شہید ہو گئے تھے۔ لیکن خالد بن ولیدؓ نے باقی ماندہ فوج کو منظم کرنے کے بعد برق آسا حملہ کر دیا اور اتنی تیزی سے پیش رفت کی کہ پہلے ہی حملے میں حارث بن ابی شمیر کے سپہ سالار کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس شخص کا نام "ملک بن البلادی" تھا۔ خالدؓ بن ولید کا حملہ اتنا شدید اور آنی فانی تھا کہ حارث بن ابی شمیر اور روم کی متحدہ افواج کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ یہ سمجھے کہ شاید مسلمانوں کو تازہ دم سپاہیوں کی مدد حاصل ہو گئی ہے' تبھی وہ تو اتنے جوش اور ولولے کے ساتھ حملہ آور ہوئے ہیں۔

انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور اسی اثنا میں رات کی تاریکی پھیل گئی۔ خالدؓ بن ولید بھی اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو دو ہزار انسانی جانوں کا نقصان اٹھانا پڑا یعنی سپاہ اسلام کے تقریباً" ستر فیصد سپاہی شہید ہو گئے۔ شہید ہونے والوں میں دو انتہائی برجستہ شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ ایک جعفرؓ بن ابی طالب تھے جو بچپن سے پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ پلے بڑھے اور ان کے رضاعی بھائی سمجھے جاتے تھے۔ دوسری شخصیت زیدؓ بن حارث تھے جو دراصل آزاد شدہ غلام تھے اور حضرت محمد ﷺ نے انہیں اپنی فرزندی میں لے لیا تھا۔ زیدؓ بن حارث سب سے پہلے اسلام لانے والے دنیا کے ابتدائی چار مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ روایت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے معراج کے سفر میں ایک انتہائی خوبصورت دوشیزہ کو دیکھا جس کے ہونٹ گلاب کے پھولوں کی طرح سرخ تھے۔ پوچھا' یہ عورت کون ہے؟ جواب ملا کہ زیدؓ بن حارث کی منسوبہ ہے اور بہشت میں آنے کے بعد انہیں نصیب ہو گی۔

لیکن خالدؓ بن ولید نے اپنی جنگی مہارت اور کمال شجاعت کی بدولت ایک ہزار مسلمان سپاہیوں کو خطرے سے نکال کر مدینہ پہنچا دیا۔ ان کی اسی دلیری اور بہادری کی بنا پر پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں سیف اللہ کے لقب سے نوازا یعنی اللہ کی تلوار۔ تاہم موتہ کے نتائج سے قطع نظر مسلمانوں کو حجاز کی سرزمین میں پے در پے کامیابیاں نصیب ہوئیں اور جگہ جگہ ان کی فتوحات کے جھنڈے لہرانے لگے۔ گزشتہ ایام میں جو بھی حجاز پر اپنی گرفت مضبوط رکھتا تو پورے جزیرۃ العرب پر حکومت کر سکتا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے خطہ حجاز میں رہنے والے تمام قبائل کو مسلمان بنا لیا اور اسی طرح حجاز کے سارے علاقے میں آپؐ کا حکم چلنے لگا سوائے مکہ کے جو ابھی تک اسلامی حکومت کے زیر نگین نہ آیا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن فتح مکہ کے لئے یہ ضروری تھا کہ ایک طاقتور فوج کے ساتھ وہاں پہنچا جائے۔

اہل مکہ نے متارکہ جنگ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قبیلہ بنو بکر کی حمایت کی تھی تاکہ وہ مسلمانوں کے اتحادی قبیلے خزاعی کو جارحیت کا نشانہ بنائیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ حق محفوظ تھا کہ مکہ پر حملہ کریں اور آپؐ پر صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کا الزام بھی عائد نہیں ہو سکتا تھا۔ صلح حدیبیہ کے سلسلے میں قریش مکہ کی عہد شکنی اتنی روشن اور واضح تھی کہ ابوسفیان سراسیمہ ہو کر اکیلا ہی مدینہ چلا آیا اور اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر قبیلہ خزاعی کو ہمارے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے تو ہم سارے اہل مکہ مل کر انہیں خسارہ ادا کرنے کو تیار ہیں! یہ تجویز اس بات کا بین ثبوت تھی کہ ابوسفیان زبان حال سے قریش کی عہد شکنی کا اعتراف کر رہا ہے۔ البتہ مذکورہ دو قبیلوں کے درمیان جھگڑے کا قصہ مختصر طور پر درج ذیل ہے۔

قبیلہ خزاعی' جس کے سارے ارکان مسلمان نہیں تھے بلکہ معدودے افراد اسلام لائے تھے۔ عقیر نامی علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ یہ علاقہ مکہ سے نزدیک مگر مدینہ سے بہت دور تھا اور چونکہ یہ قبیلہ مسلمانوں کا اتحادی تھا لہٰذا اس کے سارے ارکان مسلمانوں کی حمایت تلے زندگی بسر کر رہے تھے۔ جبکہ دوسرا قبیلہ بنو بکر قریش کا حامی و ہمنوا تھا اور اسے اہل مکہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ قبیلہ خزاعی اور بنو بکر کے درمیان پرانی دشمنی موجود تھی اور اس دشمنی کی جڑیں دور جاہلیت یعنی اسلام سے پہلے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بنو بکر کے سربراہ نوفل بن معاویہ نے اپنے افراد کو قبیلہ خزاعی پر حملہ کرنے کو اکسایا اور انہوں' نے متفقہ طور پر بنو خزاعی پر حملہ کر دیا۔ البتہ قبیلہ خزاعی کے ارکان مسلمانوں سے امداد طلب کر سکتے تھے لیکن ان کے مقام رہائش اور مدینہ کے درمیان بہت فاصلہ تھا چنانچہ اس سے پہلے کہ مسلمان ان کی مدد کو پہنچتے تو وہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتر جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی جان کے خوف سے اپنی سرزمین سے نکلے اور مکہ پہنچ کر خانہ کعبہ میں پناہ لے لی۔ انہیں توقع تھی کہ چونکہ خانہ کعبہ کا علاقہ حرم ہے اور اس کی حدود میں کشت و خون نہیں ہوتا لہٰذا بنو بکر' ان کا تعاقب نہیں کریں گے اور نہ ہی ان کی جان و مال پر خانہ

کعبہ کی حدود میں تعرض کریں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ مکہ کے قریش نے قبیلہ بنو بکر کو قبیلہ خزاعی پر حملہ کرنے کے لئے نہ صرف ہتھیار فراہم کئے بلکہ اپنے آدمی بھی ان کی مدد کو بھیجے۔ حتیٰ کہ سہیل بن عمرو' صفوان بن امیہ اور عکرمہ بن ابو جہل جیسے نامی گرامی افراد بھی تلوار اٹھا کر قبیلہ بنو بکر کی حمایت میں چل نکلے۔

قبیلہ خزاعی کے ارکان کعبہ کی حدود میں پناہ لینے کے بعد یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں امان حاصل ہو گئی ہے۔ اب ان کی جان و مال کو خطرہ لاحق نہ ہو گا لیکن نوفل بن معاویہ نے اپنے افراد کی آتش انتقام کو ہوا دی اور انہیں بھڑکانے کی خاطر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔ "حرم میں داخل ہو جاؤ۔ خزاعی کے آدمیوں کا خون بہانا بالکل جائز ہے۔ ان سب کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دو"۔ قبیلہ خزاعی کے افراد نے خانہ کعبہ سے لپٹے ہوئے بانگ لگائی "اے نوفل بن معاویہ! یہاں خانہ کعبہ ہے۔ اگر تجھے اپنے اعمال پر شرم نہیں تو کم از کم خدائے کعبہ سے حیا کر اور اس مقدس جگہ پر خون مت بہا"۔

لیکن نوفل نے بدستور چلاتے ہوئے جواب دیا: "آج نوفل خدائے کعبہ کو نہیں پہچانتا"۔

پھر بنو بکر کے افراد بنو خزاعی کے قتل عام کے لئے خانہ کعبہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ قبیلہ خزاعی نے حرم کے علاقے میں خون بہنے سے بچنے کی خاطر فرار کی راہ اختیار کی اور اس طرح کعبہ کو امن کا علاقہ سمجھ کر وہاں پناہ لینے والے اپنی جان کے خوف سے وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے لیکن پھر بھی ان کے کئی افراد بنو بکر کے ہاتھوں مارے گئے اور ان کا مال بھی تاراج ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد قبیلہ خزاعی کا سربراہ بدیل بن ورقا مدینہ پہنچا اور واقعے کی تفصیلات پیغمبر اسلام ﷺ کے گوش گزار کیں۔

حضرت محمد ﷺ اس ناگوار واقعے سے بہت متاثر ہوئے' خاص طور پر آپؐ کو اس بات کا بہت دکھ پہنچا کہ قبیلہ بنو بکر نے قریش کی مدد سے جارحیت کی اور خانہ کعبہ کا

احترام بھی پس پشت ڈال دیا۔

جب ابوسفیان مکہ سے مدینہ کی طرف آ رہا تھا تو راستے میں اس کی ملاقات ورقہ بن نوفل سے ہوئی جو مدینہ سے واپسی پر اپنے قبیلے کی طرف جا رہا تھا۔ ان دونوں کی مڈبھیڑ مدینہ سے ایک منزل کے فاصلے پر عفان نامی مقام پر ہوئی۔ ابوسفیان نے پوچھا "کیا مدینہ سے آ رہے ہو؟"

بدیل بن ورقا نے جواب دیا "نہیں' دراصل میں سمندر کے کنارے گیا ہوا تھا اور اب اپنے قبیلے کی طرف جا رہا ہوں"۔

لیکن ابوسفیان' بدیل کے جواب سے مطمئن نہ ہوا اسی لئے اس نے اپنے ساتھیوں میں سے دو افراد کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ چوری چھپے بدیل بن ورقہ اور اس کے ہمراہیوں کا تعاقب کریں اور ان کی نظروں میں آئے بغیر ان کے اونٹوں کی مینگنیاں تلاش کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ان مینگنیوں میں مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں یافت ہوتی ہیں یا نہیں؟ ابوسفیان نے بتایا کہ اگر بدیل بن ورقہ مدینہ گیا ہو تو اس کے اونٹوں نے بلاشبہ مدینہ کی کھجوریں کھائی ہوں گی چنانچہ ان کی مینگنیوں (یا بقول عربوں کے بعر) میں کھجوروں کی گٹھلیاں ملنے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ بدیل مدینہ سے واپس آ رہا ہے یا کہیں اور سے۔

ابوسفیان کے آدمیوں نے بدیل بن ورقہ کے اونٹوں کا تعاقب شروع کیا اور جلد ہی ان کی مینگنیوں میں کھجوروں کی گٹھلیاں ڈھونڈ نکالیں۔ ابوسفیان کو جب یہ علم ہوا کہ بدیل بن ورقہ مدینہ سے لوٹ رہا تھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ یہ واضح ہو چکا تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں پیش آنے والے واقعات کے اصل حقائق سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے حضرت محمد ﷺ سے ملاقات کی تو فوراً یہ پیشکش کر دی کہ اہل مکہ قبیلہ خزاعی کا نقصان پورا کرنے کو تیار ہیں۔



جب مکہ فتح ہوا

ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ میں ابو سفیان کو کیا جواب دیا تھا چنانچہ جب وہ مکہ پہنچا تو اس نے اہل مکہ کو بتایا کہ ہو سکتا ہے محمد (ﷺ) مکہ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں کیونکہ آج وہ اتنے مضبوط اور باثر ہو چکے ہیں کہ اب ہم ان کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتے۔

ابو سفیان کا اندازہ بالکل درست تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ مکہ کو تسخیر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اسی لئے آپ نے مسلمانوں کو جنگی تیاریاں مکمل کرنے کا حکم دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ بن خطاب' جو دونوں پیغمبر اسلام ﷺ کے خسر (سسر) تھے یہ نہ جان سکے کہ وہ کس مقام پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ مسلمانوں کی تیاریاں شروع ہوں تو پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ فرمان بھی جاری کیا کہ مدینے کا رابطہ باہر کی دنیا سے منقطع کر دیا جائے۔ باہر کا کوئی شخص

مدینہ میں داخل نہ ہو اور نہ ہی مدینہ کے باسی شہر کی حدود سے قدم باہر نکالیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ اگر لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی تو لشکر اسلام کی تیاریوں کی خبر آس پاس کے قبائل میں پھیل جائے گی اور رفتہ رفتہ اہل مکہ کے کانوں تک بھی پہنچ جائے گی۔ یا پھر آنے جانے والے مکہ جاکر قریش کو مطلع کر دیں گے کہ مسلمان لڑائی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ گو کہ مذکورہ خبر پہنچانے والے یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ کہاں حملہ کرنا چاہتے ہیں پھر بھی مکہ کے قریش یہ سمجھ جاتے کہ حملے کا نشانہ بننے والا شہر انہی کا شہر ہے۔

بہرحال جلد ہی مدینہ بیرونی دنیا سے مکمل طور پر کٹ گیا۔ نہ تو کوئی مسافر مدینہ میں داخل ہو سکتا اور نہ ہی کوئی شہری وہاں سے باہر نکل سکتا تھا۔ باہر سے آنے والے قافلے شہر سے باہر پڑاؤ ڈالتے اور اپنا سامان فروخت کر کے وہیں سے واپس چلے جاتے تھے۔ بعد میں مذکورہ سامان مدینہ میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔

مدینہ کے شہریوں میں حاطبؓ بن ابی بلتعہ نامی ایک شخص ایسے تھے جو اپنی ذہانت اور ہوش مندی کے سبب یہ جان گئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ مکہ فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے اہل و عیال اور دیگر اقرباء چونکہ مکہ میں مقیم تھے لہٰذا انہوں نے ایک خط لکھا اور سارہ نامی عورت کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اس خط کو مکہ میں ان کے اہل خاندان تک پہنچا دے۔

سارہ مدینے کے ایک تاجر صیفی بن عمرو کی کنیز تھی اور چونکہ اس تاجر کو اشیائے ضرورت کی فراہمی کے لئے شہر سے باہر نکلنے کی اجازت تھی لہٰذا سارہ بھی موقع غنیمت جان کر اپنے آقا کے ہمراہ مدینہ سے باہر نکل آئی اور آنکھ بچا کر مکہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب پیغمبر اسلام ﷺ کے حکم کے مطابق مدینہ کے راستوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے سارہ کا ارادہ بھانپ لیا اور اپنے کارندوں کو اس کے تعاقب میں روانہ کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اس عورت کو حراست میں لے لیں اور

اس بات کا دھیان رکھیں کہ وہ اپنی کوئی چیز ضائع نہ کرنے پائے۔ حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے سارہ کو جا لیا اور اس کے پاس جو خط تھا اسے برآمد کر کے حضرت علیؓ کے پاس لے آئے۔ حضرت علیؓ نے خط کا مضمون پڑھا تو جان گئے کہ یہ خط حاطبؓ بن ابی بلتعہ کی طرف سے ان کے گھر والوں کو لکھا گیا ہے۔ پھر انہوں نے سارہ سے پوچھ گچھ کی تاکہ یہ جان سکیں کہ آیا وہ خود اس خط کے مضمون سے واقف ہے یا نہیں۔ سارہ نے خط کے مضمون سے بے اطلاعی ظاہر کی جس پر حضرت علیؓ نے اس واقعہ کی پوری تفصیل پیغمبر اسلام ﷺ کے گوش گزار کر دی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حاطبؓ کو طلب کیا اور مذکورہ خط دکھاتے ہوئے پوچھا "کیا یہ خط تم نے صیفی بن عمرو کی کنیز کے حوالے کیا تھا تاکہ وہ اسے مکہ پہنچا دے؟"

حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے صاف دلی سے اعتراف کر لیا کہ وہ خط انہی کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے پوچھا "کیا صیفی بن عمرو جانتا ہے کہ تم نے کوئی خط اس کی کنیز کے ذریعے مکہ روانہ کیا تھا؟" حاطبؓ نے جواب دیا بالکل نہیں یا رسول اللہ! صیفی کو اس بات کا قطعی علم نہیں۔ حاطبؓ بن ابی بلتعہ کی وضاحتیں سن کر پیغمبر اسلام ﷺ کو احساس ہوا کہ ان کی نیت پاک تھی اور انہوں نے صرف اس اندیشے کے تحت وہ خط مکہ بھجوانے کی کوشش کی تھی کہ اپنے اہل خاندان کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر سکیں اور انہیں یہ پیغام بھجوا سکیں کہ وہ لوگ جنگ کی صورت میں مکہ سے نکل کر کسی اور مقام پر چلے جائیں۔ چنانچہ آپ نے ہنگامی حالت کے باوجود حضرت حاطبؓ کے قصور سے چشم پوشی کر لی اور انہیں بخش دیا۔

لیکن خود مدینہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کے آئندہ عزائم کے بارے میں دو افواہیں گرم تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ قشون روم کا مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ جنگ موتہ میں مسلمانوں کے نقصان کی تلافی ہو جائے۔ جبکہ بعض کا خیال تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ قبیلہ بنو سلیم کی گوشمالی کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ قبیلہ مسلمانوں کے لئے

مسلسل پریشانیاں کھڑی کرتا رہتا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کو یہ گمان نہ تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی نگاہیں مکہ پر جمی ہوئی ہیں اور آپ دراصل مکہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بہرکیف جبکہ ایک طرف مدینہ میں لڑائی کی تیاریاں پورے زور و شور سے جاری تھیں تو دوسری طرف مسلمان قبائل کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ بھی جنگ میں شرکت کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ پھر مسلمانوں کا جنگی قافلہ مدینہ سے نکلا اور مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں دوسرے مسلمان قبائل بھی قشون اسلام سے آملے اور منزلیں طے ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسلامی تذکرہ نویسوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے مکہ پہنچنے کی تاریخ ۱۰ رمضان سن ۸ ہجری درج کی ہے لیکن یہ وضاحت نہیں کہ اسلامی لشکر کس تاریخ کو مدینہ سے روانہ ہوا تھا۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ جب مسلمان مدینہ سے روانہ ہوئے تو ماہ صیام شروع ہو چکا تھا۔ شاید وہ لوگ رمضان کی پہلی تاریخ کو مدینہ سے چلے ہوں۔ ماہ صیام میں سارے مسلمان روزے رکھتے اور طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کچھ بھی نہ کھاتے پیتے تھے۔ تاہم جب وہ لوگ قدیر (یا غدیر) نامی مقام پر پہنچے تو پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ آج کے بعد روزے نہ رکھیں کیونکہ اللہ نے یہ حکم نازل کیا ہے کہ مسلمانوں کو سفر کے دوران روزے رکھنا معاف ہے۔ چنانچہ اس دن کے بعد مسلمانوں نے روزے رکھے بغیر اپنا سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ مراظہران نامی مقام تک پہنچ گئے جو مکہ سے صرف ایک منزل پر واقع تھا۔ لشکر اسلام نے اسی مقام پر پڑاؤ ڈالا اور جب رات کی تاریکی پھیلنے لگی تو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ آگ جلائیں تاکہ اہل مکہ یہ جان لیں کہ مسلمان ایک لشکر جرار کے ساتھ یہاں پہنچے ہیں۔

عم رسولؐ یعنی حضرت عباسؓ جو مکہ کے جانے پہچانے تاجر تھے اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ اس زمانے کے دوسرے سوداگروں کی طرح سود خوری میں ملوث تھے اپنی چھٹی حس کے سبب یہ جان گئے کہ اب مکہ کے قریش اسلام کے سامنے پائیداری نہ کر

سکیں گے لہٰذا انہوں نے مکہ سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا اور مرا ظہران میں پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیا (وضاحت: یہ تاریخ کا اختلاف ہے جبکہ کچھ اسلامی مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عباسؓ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ خلیل) دوسری طرف ابوسفیان بھی عم رسولؐ کی طرح یہ جان چکا تھا کہ مکہ کی فوج اتنے عظیم لشکر کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گی لہٰذا وہ بھی صورت حال کو بھانپنے کی غرض سے مرا ظہران کے آس پاس پرسے مارنے لگا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا عباس کہتے ہیں کہ میں اس رات لشکر اسلام کی خیمہ گاہ سے باہر کہیں جا رہا تھا کہ میں نے دو آدمیوں کو آپس میں گفتگو کرتے دیکھا۔ میں نے اندھیرے میں کان لگا کر سنا تو ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "یہ مشعلیں جو تم دیکھ رہے ہو دراصل قبیلہ خزاعی کے خیموں میں جل رہی ہیں۔" دوسرے شخص نے جواب دیا "تم غلط سمجھے ہو، قبیلہ خزاعی اتنا بڑا نہیں جو اتنی بے شمار مشعلیں جلا سکے۔ یہ تو ایک عظیم لشکر کے پڑاؤ کی نشاندہی کرتی ہیں۔" میں نے فوراً دوسری آواز پہچان لی اور تاریکی میں پکارا "یا ابا حنظلہ (ابا حنظلہ ابوسفیان کا کنیہ تھا) کیا تم ہو؟" ابوسفیان نے بھی مجھے پہچان لیا اور بولا۔ "یا ابوالفضل تم یہاں کیسے؟" (ابوالفضل حضرت عباسؓ کا کنیہ تھا)

میں اپنی شناخت کراتے ہوئے ان دونوں کے پاس پہنچا تو ابوسفیان نے مضطرب ہو کر پوچھا: "یا ابوالفضل یہ کیا ماجرا ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ "حضرت محمد (ﷺ) دس ہزار کی فوج لے کر قریش کا مقابلہ کرنے اور مکہ کو اپنی تحویل میں لینے آئے ہیں۔ چونکہ قریش نے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کی ہے اور مسلمانوں کے اتحادی قبیلے خزاعی کے آدمیوں کا قتل عام کیا اور ان کا مال بھی لوٹا ہے تو اب اہل مکہ کا بچنا محال ہے لیکن اے ابوسفیان! جب مسلمان مکہ پر حملہ کریں گے اور اسے فتح بھی کریں گے تو سب سے پہلے تیری گردن اڑے گی کیونکہ تو مکہ کا رئیس ہے اور معاہدے کی خلاف ورزی کی ذمہ داری تجھ پر عائد ہوتی ہے۔" ابوسفیان گھبرا کر بولا۔ "پھر کیا کرنا چاہئے؟"

میں نے جواب دیا کہ اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے اور تیری یہ خواہش ہے کہ تیری دولت بھی محفوظ رہے اور تو جنگی قیدی بن کر مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگے تو تیرے پاس ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جا اور اسلام قبول کر لے۔ صرف اسی صورت میں تیری جان بچ سکتی ہے اور تیری آقائی بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ ابو سفیان خاموش کھڑا رہا تو میں نے اسے کہا کہ میں تجھے رسول اللہؐ کے پاس لئے چلتا ہوں مگر تو فی الحال یہیں کھڑا رہ تاکہ میں جاؤں اور رسول اللہؐ کی اونٹنی لے کر آؤں تاکہ تو اس پر بیٹھ کر مسلمانوں کی خیمہ گاہ سے گزر سکے (بعض اسلامی تذکرہ نویسوں نے اونٹنی کی بجائے خچر کا ذکر کیا ہے۔ خلیل) ابو سفیان نے متعجب ہو کر پوچھا: "میں اونٹنی پر کیوں بیٹھوں؟" میں نے کہا: "اس لئے کہ سارے مسلمان تجھے پہچانتے ہیں اور تیرے ہاتھوں لاتعداد صدمے اٹھا چکے ہیں۔ وہ تجھے دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جائیں گے لیکن اگر تو رسول اللہؐ کی اونٹنی پر بیٹھا ہو گا تو تیری جان محفوظ رہے گی کیونکہ وہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ تجھے رسول اللہؐ نے طلب کیا ہے۔"

اس طرح حضرت عباسؓ کی تجویز پر ابو سفیان پیغمبر اسلام ﷺ کی اونٹنی پر سوار مسلمانوں کے خیموں سے گزرتا ہوا پیغمبر اسلام ﷺ کے حضور پیش ہو گیا۔ حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کے خیمے میں داخل ہوا تو میرے پیچھے پیچھے عمرؓ بھی آ دھمکے۔ ان کا چہرہ فرط غضب سے انگارہ بنا ہوا تھا۔ انہوں نے ابو سفیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت محمد ﷺ سے کہا: "یا رسول اللہؐ! اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اڑا دوں...." حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے فوراً بات کاٹی اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے عمرؓ! یہ شخص چونکہ عبد المناف کی اولاد ہے اسی لئے تم اس کا سر قلم کرنا چاہتے ہو۔ یہ اگر قبیلہ بنی عدی سے ہوتا تو کیا پھر بھی اس کی گردن اڑانا پسند کرتے؟" (یاد رہے بنی عدی حضرت عمرؓ کے قبیلے کا نام تھا۔ خلیل)

حضرت عمرؓ نے دو ٹوک الفاظ میں جواب دیا "اگر میرے قبیلے والے بھی رسول اللہ

ﷺ سے دشمنی کریں تو میں ان سب کی گردنیں اڑا دوں گا۔ میں ان لوگوں کا دوست ہوں جو رسول اللہؐ کے دوست ہیں اور ان کا دشمن ہوں جو میرے نبیؐ کے دشمن ہیں۔"

حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ بات لفظی نوک جھونک تک محدود رہی اور اس سے آگے نہ بڑھی۔ تب رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "یا عم! آپ ابوسفیان کو آج رات اپنے خیمے میں لے جائیں کل صبح میرے پاس لے آیئے گا۔" میں نے اطاعت کی اور ابوسفیان کو اپنے خیمے میں لے گیا جہاں اس نے ایک بے چین رات گزاری۔ اگلی صبح جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ابوسفیان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم اللہ کی حقانیت کو تسلیم کرو اور مجھے اس کا پیغمبر مان لو؟" ابوسفیان نے جواب میں کہا "یا محمد (ﷺ) میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ ایک امانت دار انسان ہیں اور آپ کا صلہ رحم بھی زبان زد عام ہے لیکن آپ کی پیغمبری ابھی تک مجھ پر آشکارا نہیں ہوئی جو میں....."

میں (حضرت عباسؓ) نے فوراً ابوسفیان کی بات کاٹی اور کہا "یا ابو حنظلہ ایک تو تم نے عہد شکنی کی ہے اوپر سے جرح و بحث بھی کر رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ عہد شکنی کرنے والے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ کیا خود ہم لوگ وعدہ خلافی کرنے والے کی گردن نہیں مارتے؟ چنانچہ تم اسلام کی پناہ میں نہ آئے تو خود ہی اپنی موت کے ذمہ دار ہو گے"۔

یہ سن کر ابوسفیان نے سر جھکا لیا اور اسلام قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ جس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان سمیت دوسرے مسلمان اکابر کے ساتھ مل کر مشورہ کیا کہ مکہ میں کیونکر داخل ہوا جائے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اہل مکہ کے سامنے ابوسفیانؓ کی عزت اور وقار کو قائم رکھنے کی غرض سے دو احکام جاری کئے۔ ایک یہ کہ اسلامی لشکر، ابوسفیان کے سامنے سلامی دیتے ہوئے گزرے اور دوسرے یہ کہ مکہ کا جو بھی باشندہ ان کے گھر میں پناہ لے لے تو اسے امان حاصل ہو گی اور اس کے مال کو بھی کوئی خطرہ نہ ہو گا۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ابوسفیانؓ کو مکہ روانہ کر دیا تاکہ وہ اہل مکہ کو

درج ذیل پیغام پہنچا دیں۔

☆ چونکہ اہل مکہ نے عہد شکنی کی ہے اور دو فریقی معاہدے کو پامال کیا ہے لہٰذا مروجہ دستور کے مطابق وہ لوگ قتل کے مستحق ہیں اور ان کا مال بھی مسلمانوں پر حلال ہے لیکن جو شخص خانہ کعبہ میں پناہ لے لے تو اس کی جان بخش دی جائے گی اور اس کا مال بھی محفوظ رہے گا۔

☆ اسی طرح جو باشندہ ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے گا تو وہ بھی تعرض سے محفوظ رہے گا۔ جو لوگ اپنے گھروں سے نہ نکلیں اور کوچہ و بازار میں قدم نہ رکھیں تو وہ بھی اسلام کی پناہ میں ہوں گے اور انہیں اپنی جان و مال کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔

ابو سفیان، جو انتہائی فربہ انسان تھے، اونٹ پر بیٹھے اور مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسلامی لشکر بھی حرکت میں آیا اور سوئے مکہ چل پڑا۔ مکہ پہنچنے سے پہلے مسلمانوں نے کسی خونریزی کے بغیر وہاں کے نواحی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ابو سفیان مکہ پہنچنے کے بعد سیدھا خانہ کعبہ کے سامنے پہنچا اور اہل مکہ کو اصل حقائق سنانے کے بعد بولا ”اسلامی لشکر اس شہر میں داخل ہونے کا ارادہ لے کر آیا ہے۔ ہم میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہے نہ طاقت۔ تاہم پیغمبر اسلام ﷺ نے عام معافی کا اعلان کر دیا ہے اور یہ پیغام بھجوایا ہے کہ جو شخص خانہ کعبہ میں پناہ لے یا ابو سفیان کے گھر میں ٹھہرا رہے تو وہ تعرض سے محفوظ رہے گا۔ لیکن جو لوگ خانہ کعبہ نہیں پہنچ سکتے یا میرے گھر میں پناہ نہیں لے سکتے تو انہیں چاہیے کہ اپنے گھروں میں ٹھہرے رہیں اور اطمینان رکھیں کہ ان کی جان و مال کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

ابو سفیان کی بیوی ہندہ (یا ہنت) نے یہ باتیں سنیں تو مارے غصے کے آگ بگولا ہو گئی اور اہل مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے چلائی: ”اس چربی کے ڈھیر کو (ابو سفیان بہت فربہ تھے) جان سے مار ڈالو۔ اس نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ یہ شخص مکہ کا سپہ سالار ہوتے ہوئے بھی لوگوں کو جنگ و قتال کی بجائے گھروں میں بیٹھے رہنے کا مشورہ دے رہا

ہے بزدل کہیں کا!" لیکن جب کسی نے ابوسفیان پر ہاتھ نہ اٹھایا تو ہندہ بھر گئی اور تیزی سے اپنے شوہر کی طرف جھپٹی تاکہ اس کا منہ نوچ ڈالے لیکن لوگ درمیان میں آ گئے اور ہندہ کا ہاتھ ابوسفیان تک نہ پہنچ سکا۔

بہرحال کچھ ہی دیر میں سپاہ اسلام کے منادی مکہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے وہی باتیں دہرائیں جو اس سے پہلے ابوسفیانؓ اہل مکہ کو بتا چکے تھے۔ چنانچہ جو لوگ گلی کوچوں میں تھے بڑی تیزی سے خانہ کعبہ کی حدود میں داخل ہو گئے یا پھر ابوسفیان کے گھر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور جو لوگ اپنے گھروں میں تھے تو انہوں نے کھڑکیاں دروازے بند کر لئے اور اس طرح مکہ کے گلی کوچے دیکھتے ہی دیکھتے سنسان ہو گئے۔ ہر سو پر اضطراب سناٹا چھا گیا اور اہل مکہ آنے والے لمحات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ لشکر اسلام کا پہلا دستہ جو مکہ میں داخل ہوا تو اس کی قیادت حضرت علیؓ کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کا مخصوص پرچم لہرا رہا تھا۔ حضرت علیؓ اپنے سپاہیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے کے بعد سیدھے خانہ کعبہ کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ مکہ کا بڑا دروازہ دراصل وہی تھا جس سے گزر کر حضرت علیؓ اور ان کے سپاہیوں نے مکہ میں قدم رکھا تھا۔

قشون اسلام کا دوسرا دستہ زبیرؓ بن عوام کی قیادت میں مغرب کی جانب سے مکہ میں داخل ہوا۔

سعدؓ بن عبادہ انصاری مشرق کی طرف سے مکہ میں داخل ہونے والے تیسرے دستے کی سربراہی کر رہے تھے۔ سپاہ اسلام کے چوتھے دستے کی قیادت خالدؓ بن ولید کو سونپی گئی۔ انہیں جنوبی راستے سے مکہ میں داخل ہونا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے چاروں سرداروں کو تاکید کی کہ جب وہ اپنی اپنی سپاہ کے ساتھ شہر میں داخل ہوں تو اپنی تلواریں نیام سے نہ نکالیں اور نہ ہی کسی پر حملہ کریں مگر یہ کہ ان پر حملہ کیا جائے اور یہ بات ہرگز نہ بھولیں کہ اہل مکہ کو خانہ کعبہ میں، ابوسفیان کے گھر میں اور خود اپنے گھروں میں امان

دی جا چکی ہے۔

لیکن سعدؓ بن عبادہ جب مکہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے بے اختیار ہو کر یہ بانگ لگا دی۔ "الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الحرمہ" یعنی آج کا دن حملے کا دن ہے آج حرمت ختم ہو گئی ہے! جب یہ خبر پیغمبر اسلام ﷺ تک پہنچی تو آپ نے سعدؓ بن عبادہ کو فوری طور پر دستے کی سربراہی سے ہٹا دیا اور ان کی جگہ حضرت علیؓ کو سپہ سالاری کے فرائض سونپ دیئے۔ دراصل پیغمبر اسلام ﷺ کے اس فوری اقدام کا مقصد یہ تھا کہ سعدؓ بن عبادہ کہیں اپنے کہنے پر عمل نہ کر بیٹھیں اور مکہ میں جنگ و قتال کا بازار گرم نہ ہو جائے۔

بہر طور سپاہ اسلام کے سارے دستے کسی مزاحمت کے بغیر مکہ میں داخل ہو گئے ماسوائے خالدؓ بن ولید کے جنہیں جنوب کے راستے مکہ میں داخل ہوتے وقت قبیلہ احابش اور قریش کے کچھ لوگوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ خالدؓ بن ولید نے، جو اپنی بہادری کے سبب سیف اللہ کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے، حملہ آوروں کو مخاطب کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالو اور بے جہت اپنا خون مت بہاؤ کیونکہ تمہارا حملہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا۔ آج رسول اللہؐ نے مکہ کو فتح کرنے کا عزم کر لیا ہے اور تم یقین رکھو ایسا ہو کر رہے گا۔ لیکن ان لوگوں نے خالدؓ بن ولید کی باتوں کا کوئی اثر نہ لیا بلکہ تلواریں سونت کر حملہ آور ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے پندرہ لوگوں کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو مسلمان اور بقیہ قبیلہ احابش اور قریش کی متحدہ فوج سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی بچ جانے والوں نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو جان بچا کر بھاگ نکلے۔

جب اسلامی لشکر کے چاروں دستے جو چار طرف سے مکہ میں داخل ہوئے خانہ کعبہ کے سامنے ایک دوسرے سے آ ملے تو پیغمبر اسلام ﷺ سفید اونٹنی پر سوار ظاہر ہوئے اور آپؐ نے سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ پھر آگے بڑھے اور خانہ کعبہ کے کلید بردار

عثمان بن طلحہ کو امر کیا کہ وہ کعبہ کا دروازہ کھول دے۔ عثمان بن طلحہ کی ماں وہیں پاس کھڑی تھی۔ وہ سیخ پا ہو کر بولی : "ہم یہ دروازہ نہیں کھولیں گے۔" لیکن عثمان بن طلحہ نے اپنی ماں کو سمجھایا اور کعبہ کا دروازہ کھول دیا۔ اس دن پانچ افراد نے اللہ کے گھر میں قدم رکھا۔

پہلے خود حضرت محمد ﷺ۔ دوسرے حضرت علیؓ پیغمبر اسلامؐ کے داماد۔ سوئم عثمانؓ بن زید' ایک برجستہ مسلمان۔ چہارم سیاہ فام بلالؓ اسلام کے مشہور مؤذن اور پنجم کعبہ کا کلید بردار عثمانؓ بن طلحہ۔

جب حضرت محمد ﷺ مذکورہ چار افراد کے ہمراہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو مکہ کے باشندے جو پناہ کی غرض سے وہاں آئے ہوئے تھے اچانک انجانے خوف کا شکار ہو گئے۔ ان کے دلوں میں یہ اندیشہ سر اٹھانے لگا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کہیں ان کے قتل عام کا حکم نہ دے دیں۔ ان کی دولت جائیداد ضبط اور ان کی عورتوں کو کنیز بنا کر نہ لے جائیں۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ اہل مکہ کافر اور مشرک تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا وعدہ توڑا تو وہ "حربی کافر" کے زمرے میں آئے یعنی ایسے کافر جو مسلمانوں سے پیکار کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی عسکری طاقت کے بل پر مکہ فتح کیا تھا۔ اسی مقصد کے لئے آپؐ نے ایک عظیم لشکر فراہم کیا۔ اس کے علاوہ مکہ کے کچھ باشندوں نے قبیلہ احابش کی مدد سے مسلمانوں کے ایک دستے پر حملہ کیا اور دو افراد کو جاں بحق بھی کر دیا۔ لہٰذا مروجہ قوانین کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ کو یہ حق حاصل تھا کہ شہر کے سارے مردوں کو تہہ و تیغ کر ڈالیں یا انہیں اپنا غلام بنا لیں لیکن آپؐ نے اہل مکہ کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بخشش نے اہل مکہ کو نئی زندگی عطا کی۔

بہرحال طواف کرنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ خانہ کعبہ کے دروازے پر پہنچے اور وہاں کھڑے ہو کر اہل مکہ کو مخاطب کیا۔ آپؐ کے خطبے کے الفاظ درج ذیل ہیں :

"اے مکہ کے باشندو! تم لوگ جنگ کے قانون سے آگاہ ہو اور جانتے ہو کہ عہد شکنی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ اور اب جبکہ تم مغلوب ہو تو مسلمانوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ تم سب کو تہہ تیغ کر ڈالیں یا اپنا غلام بنا لیں لیکن آج میں تم سے وہی بات کہہ رہا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے مسند قدرت پر بیٹھنے کے بعد اپنے بھائیوں سے کہی تھی اور وہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب کی بخشش فرما دی ہے چنانچہ تم لوگ آزاد ہو اور تمہاری جان و مال پر کوئی تعرض نہیں ہو گا۔"

عربی زبان میں اہل مکہ کو "طلقا" کے نام سے پکارا جاتا ہے یعنی "آزاد شدہ غلام"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل مکہ، مروجہ قوانین کے مطابق چونکہ مسلمانوں کے غلام بن چکے تھے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا اسی لئے وہ طلقا کے نام سے مشہور ہوئے۔

پھر حضرت محمد ﷺ نے اہل مکہ کے سامنے درج ذیل قرآنی آیت کی تلاوت کی:

"انا خلقناکم ذکر او التگی..... الی آخر"

ہم نے گزشتہ ابواب میں مندرجہ بالا آیت کی تفصیل سے وضاحت کی تھی لہٰذا یہاں اس کی تکرار طوالت کا سبب بنے گی۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ آیت پڑھنے کے بعد اہل مکہ کو پھر مخاطب کیا کہ: "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے۔ انہیں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ اور چونکہ اللہ کی نظر میں سارے انسان برابر ہیں لہٰذا دور جاہلیت کے وہ تمام اعزازات جو حسب و نسب اور قبیلہ و منصب کی بالادستی پر قائم تھے آج منسوخ کئے جاتے ہیں لیکن صرف ایک منصب باقی رہے گا اور وہ ہے "سقایت" کا منصب (یعنی پانی تقسیم کرنے کا عہدہ)۔ یہ منصب گزشتہ کی طرح میرے چچا عباسؓ کے پاس رہے گا چونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اپنی ذاتی پسند یا اقربا پروری کو خاطر میں لائے بغیر برابری اور مساوات کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے اہل مکہ میں پانی تقسیم کرتے ہیں۔"

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جب اہل مکہ مسلمان ہو گئے (جیسا کہ آپ اگلی سطور میں پڑھیں گے) تو عثمان بن طلحہ کو بدستور خانہ کعبہ کا والی اور کلید بردار مقرر کیا گیا اور اس کے بعد یہ عہدہ ان کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا اور آج بھی جو لوگ خانہ کعبہ کے متولی اور کلید بردار ہیں تو وہ دراصل عثمان بن طلحہ کی اولاد سے ہیں۔

بہرکیف جب پیغمبر اسلام ﷺ خطبے سے فارغ ہوئے تو آپ نے خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے سب سے بڑے بت کو اپنے ہاتھوں سے گرا کر پاش پاش کر دیا۔ پھر اپنے داماد علیؓ بن ابی طالب سے کہا کہ وہ بقیہ بتوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیں اور ان تصویروں اور مورتیوں کو بھی مٹا دیں جو خانہ کعبہ کی اندرونی اور بیرونی دیواروں سے لٹک رہی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے تاکید کی کہ جو تصویر میرے ہاتھ سے نیچے ہے اسے نہ مٹایا جائے۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ وہ تصویر حضرت مریمؑ کی تھی جس میں وہ حضرت عیسیٰؑ کو گود میں لئے بیٹھی تھیں لیکن مستند روایات کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے یہی حکم دیا تھا کہ خانہ کعبہ میں رکھی ہوئی ہر قسم کی مورتی، تصویر، مجسّے یا بت کو یکسر نابود کر دیا جائے۔

جب پتھر کے بت سرنگوں ہو کر پاش پاش ہونے لگے اور لکڑی کے بتوں کو کلہاڑی کی مدد سے چیرا جانے لگا اور تصویروں کے پرزے ہوا میں اڑنے لگے تو وہاں پر موجود قریش کے لوگوں نے فرط خوف سے اپنے چہرے کپڑوں میں چھپا لئے کیونکہ ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ جس لمحہ پیغمبر اسلام ﷺ بتوں کو توڑیں گے تو اسی آن یہ دنیا بھی زیر و زبر ہو جائے گی لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بت ٹوٹتے رہے، بکھرتے رہے مگر کوئی ناگوار حادثہ پیش نہ آیا۔

خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے، جو پہلے ہی عام معافی کا اعلان کر چکے تھے، وہاں پر موجود لوگوں سے کہا کہ تم جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو کسی کو تم سے کوئی سروکار نہیں۔ جو لوگ ابو سفیان کے گھر یا اپنے گھروں میں بند ہیں ان سے

کہہ دو کہ وہ باہر نکل آئیں اور اپنے روزمرہ کاموں میں مصروف ہو جائیں۔

جب سب لوگ چلے گئے تو خود پیغمبر اسلام ﷺ خانہ کعبہ کے دروازے پر تنہا کھڑے رہ گئے کیونکہ آج اپنے آبائی شہر میں ان کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا! آج سے آٹھ سال پہلے حضرت محمد ﷺ مکہ کے ایک خوبصورت دو منزلہ مکان میں رہتے تھے جو حضرت خدیجہؓ کی ملکیت تھا اور اسے مکہ کے اعلیٰ گھروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد یہ مکان حضرت علیؓ کے بھائی عقیل کی ملکیت میں آیا اور انہوں نے بھی وہ گھر کسی دوسرے شخص کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

مسلمانوں میں سے کچھ نے کہا کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ پر غلبہ کیا اور درحقیقت اس شہر کو فتح کیا لہٰذا آپؐ کو یہ حق حاصل ہے کہ مکہ کے کسی بھی گھر کو اپنی رہائش کے لئے اختیار کر لیں۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ تجویز مسترد کرتے ہوئے جواب دیا کہ مکہ کے باسیوں کی جان و مال اور گھر بار سب امان ہیں لہٰذا میں مکہ کے کسی بھی گھر کو اپنی رہائش کے لئے منتخب نہیں کروں گا۔ یہ کہنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ اپنے خیمے کی طرف روانہ ہو گئے جو "الخانف" نامی مقام پر نصب تھا۔

اب آیئے دوسرے واقعات کی طرف:

اس سے پہلے کہ حضرت محمد ﷺ اپنی سپاہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں تو اس شہر کا ایک حکمران تھا جو "عتاب بن اسید" کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ماہ رمضان کی پندرہ تاریخ تھی جب اسلام کے مشہور مؤذن بلالؓ اذان دینے کے لئے آمادہ ہوئے۔ انہیں ایک بلند مقام کی تلاش تھی جہاں سے ان کی آواز دور دور تک پہنچ سکے۔ انہوں نے سوچا کہ اس بار بھی خانہ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی جائے چنانچہ اگلے ہی لمحے وہ خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہوئے تھے۔

حضرت بلالؓ کی آواز جب بام کعبہ سے مکہ کی فضاؤں میں گونجی تو عتاب بن اسید کسی عتاب زدہ کی طرح بھاگتا ہوا آیا اور بلالؓ کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا:

"نیچے اترو وہاں سے وگرنہ...." لیکن حضرت بلالؓ کمال بے اعتنائی سے اذان دینے میں مصروف رہے اور ان کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق نہ آیا جبکہ عتاب بن اسید نیچے کھڑا مسلسل ناسزا کہتا رہا۔

بہرحال اذان ختم ہونے کے بعد حضرت بلالؓ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچے اور ان سے شکایت کی کہ عتاب بن اسید نے انہیں برا بھلا کہا اور ان سے بدکلامی بھی کی ہے۔ گو کہ عتاب بن اسید کا (جو اس وقت ایک مشرک تھا) کسی مسلمان کو ناسزا کہنا اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ وہ مذہبی فریضہ انجام دے رہا ہو انتہائی سنگین جرم تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے عتاب بن اسید کو بخش دیا چنانچہ اسی عفو و درگزر سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی ان کے گزشتہ منصب کی توثیق کر دی اور وہ مسلمانوں کی طرف سے دوبارہ مکہ کے حاکم مقرر ہو گئے۔

فتح مکہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے اور اسلام کے کئی سرسخت دشمنوں کے مقابلے میں انتہائی نرمی اور فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور انہیں عفو و بخشش سے نوازا۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک شخص عکرمہ بن ابوجہل تھا جو مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنی جان کے خوف سے بھاگ نکلا تھا۔ عکرمہ کی بیوی حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچی اور اپنے شوہر کے لئے امان طلب کی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے عکرمہ کی جان بخش دی اور یوں وہ مکہ آنے کے بعد اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

اسلام کے انتہائی خطرناک دشمنوں میں ایک ابوسفیان کی بیوی ہندہ (یا ہنت) تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس عورت نے اسلام کے نامی گرامی سردار حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالا تھا اسی لئے وہ "ہندہ جگر خور" کے نام سے مشہور ہے۔ ہندہ نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ ہی نہیں چبایا بلکہ وہ اسلام دشمنی میں اتنا آگے بڑھ گئی کہ اس نے مسلمانوں کے جنازوں کو مثلہ کیا' ان کے کان اور ناک کاٹ کر ہار بنایا اور اس ہار کو گلے میں ڈال کر دیوانہ وار ناچی بھی تھی۔ لیکن ایسی سفاک عورت بھی رسول اللہ ﷺ کی رحمت اور عطوفت سے

محروم نہ رہی اور جب تک زندہ رہی تو مسلمانوں کی طرف سے اسے کوئی گزند نہ پہنچا۔ اسلام کا ایک اور بڑا دشمن صفوان بن امیہ تھا جو پیغمبر اسلام ﷺ کی جان کا دشمن تھا اور اسی مقصد کے لئے اس نے ایک آدم کش مزدور کو مدینہ روانہ کیا تھا تو ایسا شخص بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے عفو و درگزر سے بہرہ مند ہوا لیکن اس کے باوجود اس نے یہی کہا کہ میں مسلمان ہونا نہیں چاہتا۔ تاہم اپنی بخشش کے پانچویں دن صفوان بن امیہ نے ایک سو زرہ اور پانچ ہزار درہم نقد سپاہ اسلام کو پیش کئے اور آخرکار چند مہینوں کے بعد (جس کی تفصیل آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے) جنگ حنین کے خاتمے پر وہ بھی حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

جس وقت پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ پر غلبہ کیا تو خانہ کعبہ کے خزانے میں چار لاکھ بیس ہزار مثقال سونا موجود تھا (یاد رہے کہ ہر مثقال تقریباً" پانچ گرام یا ساڑھے چار ماشے کے برابر ہے) حضرت محمد ﷺ نے حکم دیا کہ سونا بدستور خانہ کعبہ کے تصرف میں رہے اور اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔

فتح مکہ کے پہلے دس دنوں میں قبیلہ قریش کے دو ہزار افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان لوگوں کے مسلمان ہونے کا طریقہ یہ تھا کہ باری باری حضرت عمرؓ بن خطاب کے سامنے سے گزرتے اور کلمہ شہادت زبان پر لاتے اور حضرت عمرؓ انہیں نصیحت کرتے کہ زنا اور خاص طور پر "زنائے محصنہ" سے احتراز کریں اور ہمیشہ نیک کام انجام دیں۔

ہو سکتا ہے یہ پوچھا جائے کہ حضرت عمرؓ نئے مسلمان بننے والوں کو یہ کیوں کہتے تھے کہ وہ زنا سے پرہیز کریں اور فی المثل یہ نصیحت کیوں نہ کرتے کہ وہ رباخوری سے پرہیز کریں؟ جواب یہ ہے کہ مکہ میں مشرکین میں زنا اور زنائے محصنہ اتنا رواج پا چکا تھا کہ اس کی قباحت بالکل ختم ہو گئی تھی۔ مکہ کے شہر میں کچھ عورتیں خاص طور پر بیوہ عورتیں معزز خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے گھروں پر جھنڈے نصب کرتی تھیں جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ عورتیں اپنے گھروں میں غیر مردوں کی پذیرائی کے لئے تیار ہیں

لیکن فتح مکہ کے بعد فسق و فجور کی یہ رسومات مکمل طور پر ختم ہو گئیں۔

حضرت عمرؓ کے سامنے سے گزر کر کلمہ پڑھنے اور اسلام لانے والوں میں ابوسفیانؓ کی زوجہ ہندہ بھی شامل تھی اور اس طرح اسلام کی بے رحم دشمن آخرکار حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب حضرت محمد ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے تو آپ کو پورا یقین تھا کہ مکہ کو فتح کر لیں گے۔ اس بات کا ثبوت مدینہ میں نازل ہونے والی "والنصر" نامی سورت ہے جو آج قرآن کی ایک سو دسویں سورہ شمار ہوتی ہے اور بسم اللہ کے بعد اس آیت سے شروع ہوتی ہے:

"اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح"

اس آیت میں اللہ نے اپنے پیغمبر کو بشارت دی کہ آپ مکہ کو فتح کر لیں گے۔ دوسری آیت کہتی ہے:

"ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا"

یعنی لوگوں کو دیکھئے گا کہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ یعنی فتح مکہ کے بعد عام باشندے گروہ در گروہ حلقہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اور تیسری آیت میں آیا ہے:

"فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا"

یعنی اے پیغمبر (اس فتح کے شکرانے کے طور پر) اللہ کی حمد و ثنا بیان کریں اور استغفار کریں کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

بعض علمائے اسلام کہتے ہیں کہ جیسے ہی مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے کہا کہ توبہ کیجئے تو حضرت محمد (ﷺ) سمجھ گئے کہ ان کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت سنی تو بے اختیار ہو کر رو دیئے کیونکہ وہ بھی جان گئے کہ رسول اللہ ﷺ عنقریب رحلت فرما جائیں گے۔ ایک اور روایت کے

مطابق بنت رسول حضرت فاطمہؓ نے جب مذکورہ آیت کو سنا تو وہ بھی پریشان ہو کر رونے لگیں۔ انہیں بھی احساس ہو چلا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا بلاوہ آگیا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جب انہیں روتے دیکھا تو بولے: "بیٹی غم نہ کرو۔ میرے اہل بیت میں تم سب سے پہلے مجھ سے ملو گی"۔

بہرحال فتح مکہ سے پہلے مکہ کے سارے اغنیا شراب پیتے اور سور کا گوشت استعمال کرتے تھے لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد یہ چیزیں ان کے لئے حرام ہو گئیں۔ ایک اسلامی مؤرخ طبری لکھتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے مغلوبین کی دل جوئی اور اخوت و محبت کی فضا قائم کرنے کے لئے داؤد لیث کی بیٹی ملیقہ سے نکاح کر لیا تھا لیکن ملیقہ کا نام ازدواج رسولؐ میں کہیں بھی موجود نہیں لہٰذا طبری کا یہ کہنا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ملیقہ نامی خاتون سے عقد نکاح کیا تھا تاریخی نقطہ نظر سے قطعی مستند نہیں۔

فتح مکہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے پندرہ دن تک مکہ میں قیام کیا اور اس مدت میں تقریباً تمام اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔ اہل مدینہ یعنی انصار نے جب یہ دیکھا کہ مکہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کا قیام طویل ہوتا جا رہا ہے تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے اور یہ سوچنے لگے کہ مکہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کا زاد بوم ہے لہٰذا اب وہ اس شہر کو ترک نہیں کریں گے لیکن رسول اللہ ﷺ نے انصار سے کہا "میں جب تک زندہ ہوں تمہارے ساتھ رہوں گا اور وہیں پر اجل کو لبیک کہوں گا جہاں تم لوگ دنیا سے رخصت ہوتے ہو"۔ چنانچہ پندرہ یوم کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے مکہ سے مراجعت کی اور سوئے مدینہ روانہ ہو گئے۔ اہل مدینہ نے جو اس احساس میں مبتلا تھے کہ رسول اللہؐ شاید پھر کبھی ان کے شہر کا رخ نہ کریں، جب آپؐ کو مدینہ جاتے دیکھا تو فرط شوق سے آنسو بہانے لگے اور ان کی ساری فکر مندی دور ہو گئی۔



وادی حنین میں

مسلمانوں کے ہاتھوں مکہ کی فتح اور اہل مکہ کے مسلمان ہو جانے سے تمام جزیرۃ العرب میں اسلام کی کامیابی سو فیصد یقینی ہو گئی۔ مکہ ایک مذہبی' سیاسی اور تجارتی شہر ہونے کے ناطے جزیرۃ العرب میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ جب مسلمانوں نے مکہ پر غلبہ کیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے جزیرۃ العرب کے مذہبی' سیاسی اور تجارتی مرکز کو اپنے تصرف میں لے لیا ہے۔

مکہ کے جنوب میں (جہاں اسلام سے پہلے قبیلہ قریش کا مسکن تھا) ایک قبیلہ سکونت پذیر تھا جسے ہوازن کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ قبیلہ ہوازن کی متعدد شاخیں تھیں اور یہ شاخیں مستقل قبائل کی صورت میں مکہ کے جنوب سے لے کر ملک یمن کی سرحدوں تک ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا کہ دو قبیلے یا دو قومیں ایک دوسرے کے کنارے زندگی بسر

کریں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھیں اور ان کے درمیان جنگ و جدال بھی پیش نہ آئے۔ قبیلہ ہوازن اور اہل مکہ کئی بار ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو چکے تھے اور قبیلہ ہوازن نے حتیٰ کہ حرمت والے مہینوں میں بھی قریش کے خلاف جنگ کرنے سے گریز نہ کیا تھا۔ عرب باشندے ماہ حرام میں ہونے والی لڑائی کو "فجار" کے نام سے پکارتے تھے۔

قبیلہ ہوازن اور اہل مکہ ایک دوسرے کے قدیمی اور خاندانی دشمن تھے۔ زوجہ پیغمبرؐ حضرت خدیجہؓ کے والد ہوازن اور قریش کے درمیان ہونے والی ایک لڑائی میں جاں بحق ہوئے تھے اور خود پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی نو عمری کے زمانے میں اپنے چچا ابو طالب کی معیت میں قبیلہ ہوازن کے خلاف ایک لڑائی میں شرکت کی تھی۔

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہوازن دراصل کلمہ "ہوزن" کی جمع ہے اور چونکہ ان قبیلوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لہٰذا مجموعی طور پر ان کی شناخت ہوازن کے نام سے ہوتی تھی۔ قبیلہ ہوازن کا ایک حصہ بحیرہ احمر اور صحرائے عرب کے درمیانی علاقے یعنی حجاز میں سکونت پذیر تھا اور یہ لوگ عموماً صحرا نشین تھے۔ ہوازن کا دوسرا حصہ قبیلہ ثقیف کے نام سے طائف میں مقیم تھا اور انہیں شہر نشین کہا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک دایہ جنہوں نے اپنے دودھ سے آپ کی پرورش کی' دراصل ہوازن کی ہی ایک شاخ "بنو سعد" سے تعلق رکھتی تھیں۔ قبیلہ بنو سعد' بنو بکر' بنو سلیم اور ہوازن کے دوسرے قبائل بدستور اسلام دشمنی اور حضرت محمد ﷺ سے ذاتی عداوت میں پیش پیش تھے۔

فتح مکہ کے تیسرے دن پیغمبر اسلام ﷺ نے کچھ مسلمانوں کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ مکہ کے مضافات میں جائیں اور جہاں بھی بت نظر آئیں انہیں توڑ ڈالیں۔ انہی لوگوں میں خالدؓ بن ولید بھی شامل تھا جنہیں یہ حکم ملا کہ وہ نخلہ جا کر وہاں کے بتوں کا صفایا کر دیں۔ جزیرۃ العرب کا مشہور اور معروف بت "عزیٰ" نخلہ ہی میں نصب تھا۔

جب ہوازن نے یہ دیکھا کہ مسلمان ان کے بتوں کی توڑ پھوڑ کر رہے ہیں اور

حقیقت میں ان کے مذہبی عقائد کی جڑیں کاٹ رہے ہیں تو انہوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے پر کمر باندھ لی۔ انہوں نے دوسرے قبائل کو بھی خبردار کیا کہ جتنا جلدی ہو سکے وہ بھی میدان جنگ میں حاضر ہو جائیں۔ جلد ہی بیس ہزار جنگجو افراد اپنے بیوی بچوں اور مال مویشیوں سمیت مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لئے میدان کارزار کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہوازن اس مقصد کے تحت اپنے بیوی بچوں اور حتیٰ کہ مال مویشیوں کو ساتھ لے آئے تھے کہ وہ جان لیں کہ ان کے لئے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ ہے فتح کا راستہ۔ دوسرا راستہ ان کے اہل و عیال اور مال و منال کی طرف سے مسدود ہو چکا ہے۔ اگر وہ پسپائی اختیار کرنا چاہیں تو ان چیزوں سے ہاتھ دھو کر ہی ایسا کر سکتے ہیں۔

بیوی بچوں اور مال مویشیوں کو میدان جنگ میں لے آنا اس بات کی علامت تھی کہ ہوازن آخری دم تک پائیداری اور استقامت کا عزم لے کر آئے ہیں اور اپنی ہستی نیستی کو داؤ پر لگا کر اپنے آپ کو قائل کر چکے ہیں کہ وہ یا تو جان سے گزر جائیں اور ان کے بیوی بچے اسیر ہو جائیں اور ان کا مال و دولت مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے یا پھر اتنی پائیداری کریں کہ اپنے عدو پر غلبہ پا کر مکہ کو بھی قبضے میں لے لیں تاکہ ان کے لئے مزاحمت ایجاد کرنے والا کوئی نہ رہے۔ اس سے پہلے یہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا کہ ہوازن کسی جنگ میں شرکت کے لئے بیس ہزار جنگجو افراد کا سہارا لیں لیکن اس مرتبہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے اتنی عظیم سپاہ فراہم کر لی۔

جب مکہ کے قریش کو یہ خبر ملی کہ ہوازن مکہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کے دلوں سے مسلمانوں کے بارے میں کدورت کے آخری آثار بھی مٹ گئے اور انہوں نے متفقہ طور پر مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے دیرینہ دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صفوان بن امیہ' مکہ کے مشہور سردار نے فتح مکہ کے بعد سپاہ اسلام کو ایک سو زرہیں اور پانچ ہزار درہم نقد پیش کئے تھے لیکن اس کے باوجود اس نے ایک بار پھر اسلحہ اور نقد رقم فراہم کی

تاکہ مسلمان، ہوازن کے مقابلے میں پوری طرح مسلح ہو کر ظاہر ہوں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہوازن کا مقابلہ کرنے کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کی فوج تشکیل دی جن میں دو ہزار سپاہی قبیلہ قریش کے نو مسلم مسلمان تھے۔ لشکر اسلام مورخہ ۳۰ جنوری ۶۳۱ء شام کے وقت وادی حنین میں پہنچا اور وہیں پر پڑاؤ ڈال دیا۔ حنین ایسا خطہ زمین ہے جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ اس کا کچھ حصہ دشوار گزار پہاڑیوں اور صعب العبور گھاٹیوں پر مشتمل ہے۔ سپاہ اسلام انہی دشوار راستوں سے گزر کر صبح طلوع ہوتے وقت مذکورہ گھاٹی میں داخل ہو گئی۔ لشکر اسلام کا قراول دستہ بغیر کسی خطرے کے گھاٹی سے گزر گیا لیکن میرے (کونسٹن ویرژیل) خیال میں قراول دستے کے سالار سے یہ غفلت ہو گئی کہ اس نے اپنے نگہبانوں یعنی راستے کی جانچ پڑتال کرنے والوں کو پہاڑیوں کے بالائی حصے سے گزرنے کا حکم نہ دیا۔ اگر قراول دستے کے کچھ سپاہی پہاڑیوں کے اوپر سے گزرتے تو ان کے پیچھے چھپے ہوئے دشمن کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ غفلت اس وجہ سے ہوئی کہ جنگ حنین میں عام مسلمان اپنی افرادی قوت کے پیش نظر یہ گمان کر بیٹھے کہ اب انہیں شکست دینے والا کوئی نہیں رہا!

بہر حال مسلمانوں کا پہلا دستہ کسی مزاحمت کے بغیر گھاٹی سے گزرا اور وہاں کا سکوت اور ٹھہرا ہوا ماحول دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے اپنے گرد و نواح میں ضروری جانچ پڑتال کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ جنگ حنین میں تشون ہوازن کی کمان مالک بن عوف نصری نامی شخص کے ہاتھ میں تھی۔ اس شخص نے جنگ حنین میں اپنے تجربہ کار سالار ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ مالک بن عوف نے اپنے سپاہیوں کو کچھ اس طرح گھاٹی کے دونوں طرف چھپا دیا کہ اسلامی فوج کا پہلا دستہ یہ نہ جان سکا کہ دشمن کمین لگائے بیٹھا ہے۔ جب مسلمانوں کا قروال دستہ گھاٹی سے عبور کر رہا تھا تو ہوازن کے سردار نے مسلمانوں کو دیکھا لیکن حملے کا حکم جاری نہ کیا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ یہ صرف مقدمتہ الجیش ہے اصلی فوج پیچھے آ رہی ہے چنانچہ اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ اصلی فوج کے داخل ہونے کا انتظار

کرنا چاہیئے۔ حضرت محمد ﷺ اس دن سپاہ اسلام کے عقب میں حرکت کر رہے تھے۔ آپؐ سفید رنگ کے ایک خچر پر سوار تھے جس کا نام ''شہبا'' تھا۔ یہ خچر حبشہ کے بادشاہ نے تحفتاً پیش کیا تھا۔ حارثؓ بن حرث نامی ایک صحابی پیغمبر اسلام ﷺ کے جلودار کی حیثیت سے آگے آگے چل رہے تھے۔

قشون ہوازن کا سالار مالک بن عوف اتنا سرد مزاج اور زیرک انسان تھا کہ جب سپاہ اسلام کے اصلی حصے گھاٹی میں اترنا شروع ہوئے تو بھی اس نے حملے کا حکم جاری نہ کیا بلکہ اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ سارے مسلمان گھاٹی میں جمع ہو جائیں اور جب اسلامی فوج کا عقبی حصہ (جس میں پیغمبر اسلامؐ بھی شامل تھے) گھاٹی میں قدم رکھ چکا تو مالک بن عوف نے اپنے سپاہیوں کو حملے کا اشارہ کر دیا۔ پلک جھپکتے ہی ہزاروں لوگ پہاڑیوں کی اوٹ سے نکل آئے اور انہوں نے مسلمانوں کو تیروں اور پتھروں کی آماجگاہ بنا دیا۔

اسلامی دستے اس وقت راہ پیمائی کی حالت میں تھے چنانچہ جنگی صف آرائی اور نظم و ترتیب سے عاری تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بے خبری میں ان پر حملہ ہوا تو وہ گھبرا گئے اور جلد ہی یہ گھبراہٹ افراتفری میں بدل گئی۔ سوارہ فوج کے سپاہیوں نے گھوڑوں کی لگامیں موڑ لیں اور یہ کوشش کرنے لگے کہ جس راستے سے آئے ہیں وہیں پلٹ جائیں۔ سوارہ فوج کی یہ حالت دیکھ کر بقیہ سپاہی بھی ہمت ہار بیٹھے اور بے تحاشا پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نویں سورہ توبہ میں اس واقعہ کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے:

ترجمہ : اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت سے مواقع پر (یعنی جنگوں میں) فتح یاب کیا اور جنگ حنین کے دن تمہیں اپنی کثرت پر تعجب ہوا (یعنی مغرور ہو گئے) اور یہ سمجھ بیٹھے کہ چونکہ تمہاری تعداد زیادہ ہے لہٰذا فتح حاصل کر لو گے۔ لیکن اس تصور کے باوجود تم لوگ اللہ کی مدد سے بے نیاز نہ تھے اور زمین تم لوگوں پر یوں تنگ ہو گئی کہ یہ نہ جان سکے کہ کس طرف بھاگ نکلیں۔

علمائے اسلام کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اسی (۸۰) چھوٹی بڑی جنگوں میں

شرکت کی اور ان تمام مقابلہ آرائیوں میں جو چیز مسلمانوں کی فتح و نصرت کا سبب بنی تو وہ اللہ کی مدد و استعانت تھی، سپاہیوں کی تعداد نہیں۔ لیکن جنگ حنین کے موقع پر وفور سپاہ دیکھ کر مسلمان گھمنڈ میں آگئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی چیز ان کی فتح کا راستہ نہیں روک سکتی لیکن وہ اس بات سے غافل ہو گئے کہ ان کی فتح کا سبب اللہ کی مدد اور حمایت ہے سپاہیوں کی تعداد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ حنین میں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد گزشتہ تمام جنگوں کی نسبت زیادہ تھی مگر وہ لڑائی کے ابتدائی لمحات میں ہی شدید دباؤ کا شکار ہو گئے۔ تاہم قرآن کی نویں سورہ توبہ میں اللہ نے مسلمانوں کی مدد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ و علی المؤمنین و انزل جنودا" لم تردھا و عذاب الذین کفروا و ذلک جزاء الکافرین"۔ یعنی جب اللہ نے اپنے پیغمبر اور مومنوں کے لئے تسکین کا وسیلہ فراہم کیا (یعنی ان کی روح کو آرام اور دلوں کو حوصلہ عطا کیا) تو اس کے بعد ایسے لشکر ان کی مدد کو بھیجے جنہیں تم نہ دیکھ پائے (وہ نامرئی لشکر جسے اللہ نے اپنے پیغمبر اور ان کے ماننے والوں کی مدد کو بھیجا دراصل وہی قوت قلب اور عزم و ارادہ کی بازیافت تھی جسے حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں نے اپنی عبوری شکست کو فتح کامل میں بدل دیا) اور اللہ کافروں کو عذاب دیتا ہے کہ کافروں کی جزا یہی ہے۔

(وضاحت: جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کونسٹن ویرژیل نے جہاں بھی قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے تو ان کا مفہوم بیان کیا ہے تحت اللفظی ترجمہ نہیں اور بعض جگہ آیات کی تفسیر خود اس کا ذاتی نظریہ ہے ہمارا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ خلیل)

بہرحال جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ اسلامی لشکر پسپا ہو رہا ہے تو آپؐ اپنے مرکب سے اتر آئے اور اس کی لگام حارثؓ بن حرث کو تھماتے ہوئے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر مسلمانوں کو پکارنے لگے کہ "آیا تم لوگ مجھے نہیں دیکھ رہے میں اللہ کا رسول ہوں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ اے مہاجرو، اے انصار اے وہ لوگو جو حدیبیہ میں

میرے ساتھ تھے پسپائی اختیار نہ کرو اور یہاں میرے پاس آکر جمع ہو جاؤ"۔

بعض تذکروں میں مرقوم ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی آواز بہت رسا تھی اور وہ بلند آوازوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کی باتوں کو دہرا رہے تھے۔ بہر طور حضرت محمد ﷺ کی ذاتی شجاعت اور مستقل مزاجی اس بات کا سبب بنی کہ بھاگتے ہوئے لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور ایک منظم فوج کی شکل اختیار کر لی۔ تب پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ حکم دیا کہ مسلمانوں کا ایک دستہ گھاٹی کا چکر کاٹ کے دوسری طرف واقع "اوطاس" نامی میدان میں پہنچ جائے۔ مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا اور چونکہ ہوازن کا سارا مال و اسباب' اہل و عیال اور چوپائے اس میدان میں جمع تھے لہٰذا مسلمانوں نے ان سب پر قبضہ کر لیا۔

ہوازن کے جنگجوؤں نے مسلمانوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ چونکہ مسلمان سپاہی جنگی صف آرائی اور نظم و ترتیب سے آگے بڑھ رہے تھے چنانچہ ہوازن کو ہزیمت اٹھانا پڑی اور ان میں سے کچھ مقتول ہوئے جبکہ بقیہ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ ان کے اہل و عیال' مال و اسباب اور بے شمار مویشی مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ سارا مال غنیمت جعکرانہ کے مقام پر منتقل کر دیا جائے اور قیدیوں کے لئے مناسب خوراک اور لباس کا بندوبست کیا جائے۔ جعکرانہ' مکہ کے شمال میں پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا (جعکرانہ کو بعض اسلامی کتب میں "جعرانہ" کے طور پر بھی لکھا گیا ہے۔ خلیل)

سپاہ اسلام کی پیش قدمی نے ہوازن کے حوصلے پست کر دیئے اور وہ جان بچانے کی خاطر طائف کے شہر میں پناہ گزین ہو گئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی طائف پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس زمانے میں طائف کی دو فصیلیں تھیں۔ جب اہل شہر نے یہ دیکھا کہ اسلامی لشکر ان کی جانب بڑھ رہا ہے تو انہوں نے شہر کے دروازے بند کر لئے اور دفاع کے لئے آمادہ

ہو گئے۔ مسلمانوں نے شہر کے دروازے توڑنے اور فصیل ڈھانے کے لئے منجنیقوں کا استعمال کیا اور حضرت سلمانؓ فارسی کی تجویز پر جنگی ٹھیلے بھی بنائے اور شہر کی دیوار تک پہنچنے کے لئے ان سے فائدہ اٹھایا۔ سلمانؓ فارسی وہی ایرانی مسلمان تھے جنھوں نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا تصور پیش کیا تھا اور یہی خندق مدینہ پر حملے کے وقت دشمنان مکہ کے لئے وبال جان بن گئی تھی۔ جنگی ٹھیلے جو مسلمانوں کی طرف سے بنائے گئے درحقیقت ایک متحرک پناہ گاہ کی شکل کے تھے جن میں بیٹھ کر مسلمان سپاہی شہر کی دیوار تک پہنچ سکتے تھے اور انہیں دشمن کے تیروں اور پتھروں کا بھی خطرہ نہیں تھا۔

بہرحال جنگ حنین میں واضح کامیابی کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے اور وہ مکمل خود اعتمادی سے دشمن پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ انہوں نے ہوازن کے سپہ سالار مالک بن عوف کے گھر کو بھی ویران کر دیا جو طائف کے جنوب میں واقع تھا لیکن طائف کو تسخیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اہل طائف کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ لوگ ہتھیار ڈال دیں اور تسلیم ہو جائیں تو امان میں رہیں گے۔ اس دعوت کے جواب میں اسی (۸۰) افراد طائف سے نکل کر پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ طائف عرصہ چالیس یوم تک محاصرے میں رہا لیکن اس کے سقوط کی صورت نظر نہ آئی تو پیغمبر اسلام ﷺ نے لشکر کی قیادت کسی اور کو سونپی اور خود جعکرانہ کی جانب روانہ ہو گئے تاکہ مسلمانوں میں جنگی غنائم تقسیم کر سکیں اور اس طرح تمام مال غنیمت جن میں چھ ہزار قیدی بھی تھے مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔

قیدیوں میں ایک خاتون ایسی تھی جس کا نام تھا "شمہ"۔ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچی اور بولی کہ میں آپ کی رضاعی بہن ہوں۔ جس وقت آپ حلیمہؓ کے دودھ پرورش پا رہے تھے تو میں بھی اس کی چھاتیوں سے دودھ پیتی تھی۔ پھر اس نے اپنے زخم کا ایک نشان دکھایا اور حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "یاد ہے لو

جب ہم دونوں بچے تھے اور آپس میں کھیلا کرتے تھے تو ایک کھیل کے دوران میں زخمی ہو گئی تھی جس کا نشان آج بھی باقی ہے"۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا "اے شمہ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ مسلمان ہو کر آزادانہ زندگی بسر کرو"۔

شمہ بولی "میرے لئے آزادی کا مطلب یہ ہے کہ صحرا لوٹ جاؤں اور بادیہ نشینی کی زندگی بسر کروں"۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا "میں تمہیں آزاد نہیں کر سکتا مگر ایک صورت میں اور وہ یہ کہ تم جنگی غنائم سے میرے حصے میں آ جاؤ۔ اس وقت میں تمہیں آزاد کر سکتا ہوں" ایسا ہی ہوا۔ شمہ کو پیغمبر اسلام ﷺ کے حصے میں شامل کر دیا گیا اور اس طرح وہ عورت آزاد ہو گئی۔ (وضاحت: بعض اسلامی کتب میں مذکورہ خاتون کا نام "شیما" درج ہوا ہے اور یہ بھی آیا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ خلیل)

بہر حال جب شمہ نے رہائی پالی تو دوبارہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس پہنچی اور بولی کہ میرا خاوند بھی قید میں ہے اور جنگی قانون کے مطابق اب وہ مسلمانوں کا غلام ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ اسے بھی آزاد کر دیں۔

چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک بار پھر یہ خواہش ظاہر کی کہ اس عورت کے خاوند کو ان کے حصے میں آنے والے قیدیوں میں شامل کر دیا جائے اور جب ایسا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے شمہ کے خاوند کو بھی آزاد کر دیا۔

دوسرے قیدیوں نے جب یہ دیکھا کہ شمہ اور اس کا شوہر آزاد ہو چکے ہیں تو انہوں نے کچھ لوگوں کو واسطہ بنا کر پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ آپ کی دایہ قبیلہ ہوازن سے تعلق رکھتی تھی لہٰذا ہم سب آپ کے رضاعی بہن بھائی ہیں۔ آپ ہمیں بھی آزاد کر دیں تاکہ ہم لوگ بھی اپنے گھروں کو جا سکیں اور آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ تم لوگ مسلمانوں میں

تقسیم ہو چکے ہو۔ قیدیوں کے نمائندوں نے کہا "کیا آپ گوارا کریں گے کہ حلیمہ کے قبیلے والے غلام اور باندی بن کر ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتے رہیں؟" پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا کہ میں صرف یہی کر سکتا ہوں کہ ان غلاموں اور کنیزوں کو جو میرے حصے میں آئے ہیں آزاد کر دوں لیکن میں دوسروں کا ذمہ نہیں لے سکتا اور نہ ہی ان پر دباؤ ڈال سکتا ہوں بلکہ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے کہ اپنے غلاموں کو آزاد کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے وعدے پر عمل کیا اور ان کے حصے میں جتنے بھی غلام اور باندیاں آئیں سب کو آزاد کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھی اپنے حصے کے قیدیوں کی رہائی کا اعلان کر دیا۔ حضرت علیؓ نے بھی اپنے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ دوسرے مسلمانوں نے جب دیکھا کہ بزرگان اسلام اپنے غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کر رہے ہیں تو انہوں نے بھی اپنے حصے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ تاہم ان کا مال قبضے میں رکھا۔ دوسری طرف جب ہوازن کے آدمیوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے جود و سخا کا مشاہدہ کیا اور عام مسلمانوں کی طرف سے اطاعت رسول ﷺ کا ایمان افروز منظر دیکھا تو سب کے سب مسلمان ہو گئے اور ایسی حالت میں جبکہ ان کے ہونٹوں پر کلمہ شہادت جاری تھا اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

رہائی پانے والوں میں ہوازن کا سپہ سالار مالک بن عوف بھی شامل تھا جسے اس کا سارا مال بھی واپس دے دیا گیا چونکہ اس کا مال پیغمبر اسلام ﷺ کے حصے میں آیا تھا۔ مالک بن عوف اسی وقت مسلمان ہو گئے اور بعد ازاں انہوں نے اسلام کے لئے شایان ذکر خدمات انجام دیں..... اور یوں ہوازن کے اسرا اور اموال کی تقسیم کا مسئلہ اختتام کو پہنچا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک بار پھر طائف جانے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ وہاں کی صورت حال کا جائزہ لے سکیں۔

طائف کے محاصرے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی اور قشون اسلام کا وہ حصہ جو طائف کے محاصرے کی وجہ سے جعکرانہ نہ جا سکا ابھی تک شہر پر غلبہ پانے میں کامیاب

نہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ قبائل ہوازن اسلام لے آئے تھے لہٰذا اب شہر طائف مسلمانوں کے لئے خطرہ نہیں بن سکتا تھا بلکہ اس کی حیثیت ایسے جزیرے کی مانند تھی جو اسلام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں چاروں طرف سے گھرا ہوا ہو۔ پیغمبر اسلام ﷺ جانتے تھے کہ طائف کا محاصرہ اگر مختصر سی فوج کے ذریعے بھی جاری رہے تو آخر کار وہ شہر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا چنانچہ آپؐ نے ابوسفیانؓ کو ایک مختصر فوج کی کمان سونپتے ہوئے محاصرہ جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود دیگر مسلمانوں کے ہمراہ سوئے مکہ روانہ ہو گئے۔



عام الوفود یا سفیروں سے ملاقات کا سال

جب حضرت محمد ﷺ مکہ واپس پہنچے تو انصار یعنی مدینہ کے مسلمانوں نے عدم رضامندی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ قبیلہ ہوازن کے مال غنیمت سے قریش کو ہم سے زیادہ حصہ ملا ہے۔

اس بات میں مبالغہ بھی نہ تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے تقسیم غنائم کے وقت انصار کے مقابلے میں نو مسلم قریش کو زیادہ بخشش سے نوازا لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ آپؐ نے انصار کا حصہ قریش کو دے دیا ہو۔ دراصل عرف عام اور مروجہ دستور کے مطابق جنگی غنائم کا پانچواں حصہ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے اہل بیتؓ کے لئے وقف ہوتا تھا اور حضرت محمد ﷺ نے جو اکثر اوقات اپنے حصے کا مال غنیمت دوسروں کو بخش دیتے تھے' اس بار بھی اپنا حصہ قریش میں تقسیم کر دیا تاکہ ان کی دلجوئی ہو سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے بمقتضائے زمان یہ ضروری سمجھا کہ قریش سے نسبتاً" زیادہ

محبت کا برتاؤ کیا جائے تاکہ نئے نئے مسلمان ہونے والے دل و جان سے اسلام کے گرویدہ ہو جائیں۔ اگرچہ انصار کو شکایت کرنے کا حق نہیں پہنچتا تھا پھر بھی پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں دلداری دیتے ہوئے سمجھایا کہ:

"قریش کو زیادہ حصہ ملنے پر تم لوگوں کو خفا یا دل گیر نہیں ہونا چاہئے چونکہ قریش مکہ میں رہ جائیں گے اور میں تمہارے ساتھ مدینہ چلوں گا اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی گذاریں گے"۔

"آیا تمہارے نزدیک ایک اونٹ یا چند بھیڑوں کا زیادہ مل جانا بہت اہمیت رکھتا ہے یا رسول اللہؐ کی قربت تمہیں زیادہ عزیز ہے"۔

"آیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے رسولؐ کے ساتھ زندگی گزارنا تمہارے لئے کتنی خوش نصیبی کی بات ہے کیونکہ اللہ کی رحمت نہ صرف تمہارے شامل حال ہوگی بلکہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی برکات الہی سے فیض یاب ہوتی رہیں گی"۔

جب انصار نے یہ باتیں سنیں تو انہیں شدید ندامت کا احساس ہوا اور گلوگیر ہو کر کہنے لگے "یا رسول اللہ! ہمیں اپنے کہے پر افسوس ہے اور ہم بہت نادم ہیں" یہ کہنے کے بعد سارے انصار بے اختیار رو دیئے۔ پھر چند روز کے بعد جب حضرت محمد ﷺ نے مدینہ روانگی کا ارادہ کیا اور انصار کے ہمراہ مکہ سے نکل کر سوئے مدینہ روانہ ہوئے تو اس لمحہ انصار اتنے مسرور تھے کہ مارے خوشی کے ہلہلہ مچانے لگے جبکہ کچھ لوگ ترنم کے ساتھ اشعار پڑھنے لگے اور کچھ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی تیر رہے تھے۔

البتہ مدینہ روانگی سے قبل پیغمبر اسلام ﷺ نے بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان کو جس کی عمر بمشکل تیس سال تھی، مدینے کا حکمران مقرر کیا اور اسے شہر کا نظم و نسق سونپ کر مدینہ روانہ ہوئے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد اہل طائف کا ایک وفد پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کرنے وہاں پہنچا۔ وفد کے ارکان نے بتایا کہ اہل طائف مسلمان ہونے پر رضامند ہیں بشرطیکہ انہیں یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ گزشتہ

کی طرح فحشا اور منکرات میں مشغول رہیں' سود خوری جاری رکھیں اور شراب وغیرہ کا بھی استعمال کرتے رہیں! پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کا مطالبہ نا منظور کر دیا اور کہا کہ اسلام میں فحشاء' سود خوری اور شراب نوشی کی قطعی گنجائش نہیں بلکہ یہ چیزیں یکسر حرام ہیں۔

وفد کے ارکان واپس چلے گئے اور اہل طائف سے گفتگو کرنے کے بعد دوبارہ لوٹ آئے اور کہنے لگے کہ طائف کے باشندے فحشاء و منکرات اور رباخوری و مسکرات سے تائب ہونے کو تیار ہیں لیکن انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ سے ایک درخواست کی ہے کہ انہیں جہاد میں شریک ہونے' روزہ رکھنے اور زکوٰۃ دینے سے معاف کر دیا جائے!

واضح رہے کہ صدر اسلام میں تمام مسلمان مرد بلا امتیاز میدان جنگ میں حاضر ہوتے اور لڑائی میں شرکت بھی کرتے تھے۔ آج بھی ہر مسلمان مرد پر جہاد واجب ہے مگر یہ کہ بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے اتنا کمزور ہو جائے کہ جنگ میں شرکت کرنے کے قابل نہ رہے۔ تاہم اس بار حضرت محمد ﷺ نے اہل طائف کی درخواست منظور کر لی جس پر دوسرے مسلمانوں نے حیران ہو کر پوچھا "یا رسول اللہؐ! آپ نے کیونکر اہل طائف کو جہاد میں شرکت کرنے' روزہ رکھنے اور زکوٰۃ دینے سے معاف فرما دیا ہے آیا جہاد' روزہ اور زکوٰۃ اسلام کے واجبات میں سے نہیں؟" پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا "کیوں نہیں۔ لیکن تم ان لوگوں کو پہلے مسلمان تو ہو لینے دو پھر وہ خود ہی اسلامی واجبات کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ ہو جائیں گے اور ان پر عمل درآمد بھی شروع کر دیں گے"۔ ایسا ہی ہوا کچھ ہی دنوں بعد اہل طائف اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے۔ "یا رسول اللہؐ! ہم لوگ جہاد کرنے' روزہ رکھنے اور زکوٰۃ دینے پر دل و جان سے آمادہ ہیں"۔

(وضاحت: مجھ حقیر کو کونسٹن ویرژیل کی طرف سے بیان کردہ مندرجہ بالا واقعے کا ماخذ نہ مل سکا کیونکہ اس نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے وہ انتہائی قدیمی ہونے کے ناطے

عام لوگوں کی دسترس سے دور ہیں۔ ہمارے اپنے مؤرخین نے بھی طائف کے بارے میں بہت مختصر طور پر لکھا ہے اور زیادہ تر یہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے طائف کا محاصرہ اٹھارہ دن کے بعد اٹھا دیا تھا۔ مگر یہ وضاحت نہیں کی کہ اہل طائف کیونکر مسلمان ہوئے۔ حتیٰ کہ سیارہ ڈائجسٹ کے جہاد نمبر اور رسولؐ نمبر میں بھی اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ بعض مؤرخین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ اللہ کی مرضی یہی تھی کہ اہل طائف تلوار کی بجائے اسلامی تعلیمات کے زیر اثر مسلمان ہوں۔ خلیل)

اب ہم آتے ہیں پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کے اس دورانئے کی طرف جو اسلامی تاریخ میں عام الوفود کے نام سے مشہور ہے۔ ہجرت کے نویں سال کو مسلمانوں نے "عام الوفود" کا نام دیا ہے۔ یعنی سفیروں اور وفدوں کا پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کا سال۔

اس تاریخ سے نو سال پہلے یہ وہی محمد (ﷺ) تھے جو اپنے قبیلے اور شہر کے باسیوں کے معاندانہ رویئے سے تنگ آکر اپنا آبائی وطن یعنی مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے باوفا دوست حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں مدینے کا رخ کیا اور راستے میں ایسی غار میں پناہ لی جہاں سانپوں کے ڈسنے کا خطرہ موجود تھا۔

اس سفر میں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے سر کی بولی لگائی گئی اور یہ اعلان بھی ہوا کہ جو شخص بھی انہیں زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے گا تو اسے انعام کے طور پر ایک سو اونٹ دیئے جائیں گے۔

لیکن اب جبکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ہجرت کو نو سال بیت چکے ہیں تو آپ نے نہ صرف مکہ کو تسخیر کر لیا بلکہ ایسے لوگ جو آپؐ کے دشمن تھے اب اسلام کے سر بکف فدائی بن گئے اور وہ لوگ بھی جو دن رات پیغمبر اسلام ﷺ کی جان کے درپے تھے اب ان کی راہ میں اپنی جان نچھاور کرنے کو اپنے لئے سب سے بڑی خوش نصیبی اور سعادت تصور کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ابو جہل کا بیٹا عکرمہ، جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا

سلمان ہو گیا اور میدان جنگ میں شہادت کے رتبے پر فائز ہوا۔ مکہ کا برجستہ سردار اور شمن مکہ کا سالار ابوسفیان جو جنگ احد اور خندق میں پیغمبر اسلام ﷺ سے پیکار کر چکا ما حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں نجران کا حاکم مقرر کر دیا۔ ملہ کے ایک اور نامور سردار خالدؓ بن ولید نے مسلمان ہونے کے بعد اسلام کے شہرت فتہ سپہ سالار ہونے کا اعزاز پایا اور "سیف اللہ" کا لقب بھی دریافت کیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہجرت کے نویں سال تک نہ صرف مکہ فتح کیا بلکہ پورے زیرۃ العرب کو اپنے تصرف میں لے لیا یعنی پورا جزیرۃ العرب مسلمان ہو گیا یا پھر مسلمان ہونے والے مسلمانوں کی برتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جب ہم جزیرۃ العرب کی وسعت کا اندازہ لگائیں تو دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ہجرت کے پہلے سال سے دسویں سال تک اوسط طور پر روزانہ ۸۲۲ کلو میٹر مربع علاقے پر اسلام کی برتری قائم کی یعنی ہجرت کے آغاز سے دسویں سال تک اسلام نے جزیرۃ العرب کی سرزمین پر روزانہ ۸۲۲ مربع کلو میٹر کے حساب سے پیش قدمی کی ہے۔

اسلام کے آغاز میں مسلمان اتنے تہی دست اور بے بضاعت تھے کہ پہلی تین جنگوں میں ہر دو سپاہیوں کے پاس ایک اونٹ ہوتا تھا۔ جنگ بدر میں، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور ان کے لشکر میں صرف دو گھوڑے شامل تھے۔ لیکن بعد میں مسلمان اتنے طاقتور اور مالدار ہو گئے کہ جنگ حنین میں ان کے پاس ایک ہزار گھوڑے تھے۔ اس طرح جنگ تبوک میں، جس کی تفصیل آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے اسلامی لشکر دس ہزار گھوڑے لے کر چلا تھا۔

مسلمانوں نے اپنی پہلی لڑائی صرف چار افراد کے بل بوتے پر لڑی اور وہ لڑائی نخلہ کے مقام پر پیش آئی تھی۔ دوسری لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی۔ جنگ احد میں سات سو مسلمان سپاہی میدان کارزار میں اترے لیکن جنگ تبوک میں انہوں نے تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں قدم رکھا تھا۔

بعض جنگوں میں مسلمانوں کا نقصان بہت کم ہوا اور بعض میں انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا لیکن جزیرۃ العرب کے عظیم حدود اربعہ کے پیش نظر' جسے مسلمانوں نے اپنے تصرف میں لیا' ان کا نقصان برائے نام تھا۔

ہجرت کے نویں سال جزیرۃ العرب کے وہ باشندے جو مسلمان ہو چکے تھے اس عقیدے پر کاربند تھے کہ اسلام پانچ بنیادی ارکان پر مشتمل ہے:

اول: تشہد۔ یعنی اس بات کا اعتراف اور اقرار کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔

دوئم: نماز۔ یعنی ہر روز معین اوقات پر اللہ کی عبادت کرنا۔

سوئم: صوم۔ یعنی سال کے ایک مخصوص مہینے میں روزے رکھنا۔

چہارم: زکوۃ۔ یعنی ایسا ٹیکس جو ہر مسلمان اپنے مال سے اسلامی ریاست کو ادا کرتا ہے۔

پنجم: حج۔ یعنی خانہ کعبہ کی زیارت بشرطیکہ یہ زیارت کسی مسلمان مرد یا عورت کے لئے مقدور ہو۔

ہجرت کے نویں سال حضرت محمد ﷺ قدرے علیل ہو گئے اور مدینہ میں ہی مقیم رہے۔ ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی کسالت کے بارے میں اظہار نظر کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ اسلامی مؤرخین نے ان کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تاکہ درج شدہ علامات کی مدد سے یہ معلوم ہو سکے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بیماری کی نوعیت کیا تھی اور آج کے جدید علم طب کی رو سے اسے کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

بہرحال اس سال پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ میں سفیروں اور اطراف و اکناف کے قبائل کی نمائندہ جماعتوں سے پے در پے ملاقاتیں انجام دیں۔ عربی زبان میں وفد کا مطلب ہے نمائندہ جماعت یا سفیر اور "وفود" اس کی جمع ہے۔ ہجرت کا نواں سال چونکہ سفیروں اور نمائندہ جماعتوں سے ملاقات کا سال تھا اسی لئے یہ سال عام الوفود کے نام سے

مشہور ہوا۔

اس موقع پر حضرت محمد ﷺ پورے جزیرۃ العرب کے مذہبی' سیاسی اور عسکری پیشوا تھے لیکن اس کے باوجود جب کوئی سفیر یا وفد ان سے ملنے آتا تو دیکھتا کہ آپ کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی پر بیٹھے ہیں اور آپؐ کا اسباب زندگی وہی ہے جو برسوں پہلے تھا۔

جب کوئی سفیر پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کو آتا تو سیاہ فام بلالؓ ان کا استقبال کرتے اور اسے اس کمرے میں لے جاتے جہاں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوتے تھے۔ مختلف وفود جب مدینہ پہنچتے تو رملہ بنت حارث کے مکان میں جو نجاریہ نامی محلے میں واقع تھا قیام کرتے تھے۔ یہ مکان باہر سے آنے والے "سرکاری" مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ کبھی کبھی نمائندہ جماعتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جاتی کہ ان سب کو ایک گھر میں ٹھہرانا مشکل ہو جاتا۔ ایسی صورت میں پیغمبر اسلام ﷺ کے حکم سے مدینہ کی مسجد میں خیمے لگا کر باہر سے آنے والوں کے قیام کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

اگرچہ ہجرت کے نویں سال جزیرۃ العرب کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل چکا تھا لیکن پھر بھی پیغمبر اسلام ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا چونکہ یہ دونوں فرقے اہل کتاب تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے نجران کے پاپائے مسیحیت ابوالحارث کے نام جو خط لکھا اس میں جزیرۃ العرب کے مسیحیوں کی مذہبی آزادی کے خطوط بخوبی واضح ہوتے ہیں (نجران جزیرۃ العرب کے جنوب میں واقع ایسے علاقے کا نام تھا جو یمن کی سرحدوں سے ملا ہوا تھا۔ وہاں کے باشندوں کی اکثریت مسیحی تھی۔ اسلام سے پہلے یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے وہاں کے عیسائیوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ قرآن کی سورہ البروج میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ خلیل)

پاپائے نجران کے نام پیغمبر اسلام ﷺ کے مراسلے کی عبارت درج ذیل ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے نجران کے اسقف اعظم اور

دوسرے اساقفہ کے نام۔ واما بعد۔

اسقف اعظم اور دوسرے مسیحی راہنما جان لیں کہ کلیساؤں کا نظم و نسق چلانا انہی کی ذمہ داری ہے اور اللہ اور اس کا رسول ان لوگوں کو اپنی حمایت سے نوازتے ہیں۔ اس خط کے ذریعے اللہ کا رسول یہ اعلان کرتا ہے کہ کوئی اسقف یا مذہبی راہنما اپنے مقام سے برکنار نہ ہو گا اور ان کے اختیارات میں بھی کمی واقع نہیں ہو گی۔ اس کے علاوہ ان کی مذہبی رسومات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی اور جب تک علمائے مسیحیت دل لگی اور ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے تو ان کا وقار محفوظ رہے گا اور انہیں (یعنی عیسائیوں) کو بھی چاہئے کہ دوسروں کے لئے مشکلات کھڑی نہ کریں"۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا بالائے ذکر نامہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں عیسائیوں (اسی طرح یہودیوں) کو اپنے مذہبی فرائض انجام دینے کی مکمل آزادی تھی اور انہیں مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا۔

ہجرت کے نویں سال نجران کے مسیحیوں کی ایک نمائندہ جماعت پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ پہنچی۔ اس جماعت میں دین مسیحیت کے برجستہ علماء شامل تھے جن میں پاپائے نجران ابوالحارث، اسقف عبدالمسیح اور سربراہ کارواں الایہم کے نام قابل ذکر ہیں۔ جب نجران کے مسیحی علماء مدینہ پہنچنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ سے ملاقات کرنے جا رہے تھے تو انہوں نے اپنے مخصوص روحانی لبادے زیب تن کئے ہوئے تھے اور مدینہ کے باشندے بڑی حیرت سے ان کے خوبصورت اور چمکدار کپڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ مسیحیت کے ماننے والوں کو بادیدہ احترام دیکھتے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں بھی انہیں اچھے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی پانچویں سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۸۲ تا ۸۴ میں عیسائیوں کو عزت افزائی سے نوازا ہے اور آیت نمبر ۸۲ میں آیا ہے: ترجمہ "آپ دو گروہوں کو مسلمانوں کی نسبت زیادہ دشمن پائیں گے۔ ایک یہودی دوسرے مشرک لیکن

نصاریٰ مسلمانوں کے دوست ہیں کیونکہ ان میں کچھ اہل علم اور کچھ عبادت کرنے والے ہیں اور وہ تکبر بھی نہیں کرتے"۔

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۸۳ میں یوں آیا ہے:

ترجمہ "جب یہ لوگ سنتے ہیں کہ قرآنی آیات رسول اللہ پر نازل ہوتی ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں (یعنی اہل مسیحیت پر قرآن کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ رونے لگتے ہیں) کیونکہ یہ لوگ قرآن کی حقانیت کو سمجھتے ہیں اور اپنے تئیں کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لے آئے اور ہمارا حساب شاہدین کے ساتھ رکھ"۔

یہاں اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ اہل مسیحیت کی قدردانی میں نازل ہونے والی ان آیات کے کچھ حصے حبشہ کے عیسائی بادشاہ کے اس حسن سلوک کی خاطر نازل ہوئے جو اس نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔

ہجرت کے نویں سال یعنی ۶۳۱ء میں حج کے موقع پر بت پرستوں نے بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ خانہ کعبہ کی زیارت کی لیکن وہ سال بت پرستوں کے لئے خانہ کعبہ کے طواف کا آخری سال ثابت ہوا چونکہ اس کے بعد اللہ کی طرف سے مشرکین کے لئے خانہ کعبہ کی حدود میں داخل ہونے کی پابندی ہو گئی۔ اللہ کا یہ حکم آج قرآن کی نویں سورہ کی ۲۸ ویں آیت میں درج ذیل الفاظ میں موجود ہے:

ترجمہ: "اے ایمان والو! جان لو کہ مشرک نجس (ناپاک) ہیں اور آج کے بعد انہیں مسجد الحرام میں داخل ہونے کی اجازت نہیں"۔

بہرحال ہجرت کے دسویں سال یعنی جس سال سے مشرکوں کے لئے خانہ کعبہ کی زیارت ممنوعہ قرار دی گئی تو پیغمبر اسلام ﷺ حج کے موقع پر چودہ ہزار مسلمانوں کی معیت میں مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس سال پیغمبر اسلام ﷺ نے تمام مناسک حج کو مکمل طور پر انجام دیا اسی لئے جو کچھ آپ نے انجام دیا وہ سنت بن گیا اور آج تک سارے مسلمان اسی طریقے کی پیروی کر رہے ہیں۔ البتہ میں (کونسٹن ویرژیل) یہ

نہیں کہنا چاہتا کہ اس سے پہلے آپ مناسک حج انجام نہیں دیتے تھے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پچھلے سال پیغمبر اسلام ﷺ بذات خود مکہ نہیں گئے اور ہجرت کے آٹھویں سال بھی انہوں نے کم و بیش جنگ کے ذریعے مکہ کے دروازے کھولے اور اس سے پہلے آپ کو صرف ایک بار حج کرنے کا موقع ملا لیکن اس وقت بھی قریش کی حوصلہ شکنی کے باعث آپ ارکان حج مکمل طور پر انجام نہ دے سکے اور اس سے قبل تو ویسے بھی آپ عرصہ سات سال تک مدینہ میں مقیم رہے اور خانہ کعبہ کی زیارت نہ کر سکے۔ تاہم ہجرت کے دسویں سال حضرت محمد ﷺ نے تمام مناسک حج انجام دیئے۔ احرام باندھا' سات بار خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان ''سعی'' کا عمل بھی انجام دیا۔ سعی درحقیقت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ کی یاد میں انجام دی جاتی ہے جنھوں نے پانی کی تلاش میں دو پہاڑیوں کے درمیان کئی چکر کاٹے تھے۔

بہرحال پیغمبر اسلام ﷺ نے ذی الحجہ کی نو (۹) تاریخ کو ان تمام مسلمانوں کو جو حج کی غرض سے مکہ آئے ہوئے تھے' مقام عرفات میں واقع جبل الرحمہ نامی پہاڑی پر جمع ہونے کی دعوت دی تاکہ آپ مسلمانوں سے گفتگو کر سکیں یا بقول عربوں کے خطبہ دے سکیں۔ اس موقع پر مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسرا انسان زائرین میں شامل نہیں تھا۔

جب پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں کا جم غفیر دیکھا تو انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی آواز سارے مسلمان نہیں سن سکتے۔ چنانچہ آپؐ نے اونچی آواز کے مالک چند افراد کو مختلف مقامات پر متعین کر دیا تاکہ وہ لوگ آپؐ کے الفاظ دہرائیں اور سارے مسلمان رسول اللہ ﷺ کا خطبہ سن سکیں۔ یہ وہی خطبہ ہے جسے مسلمانوں نے خطبتہ الوداع کا نام دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے الفاظ دہرانے والوں میں اسلام کے مشہور موذن بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اور ایک دوسرے مسلمان ربیعہ بن امیہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) شامل تھے۔ ان دونوں کی آواز بہت رسا اور صاف تھی۔

اس سے پہلے کہ پیغمبر اسلام ﷺ خطبہ شروع کریں تو آپؐ نے لوگوں سے پوچھا: "آیا جانتے ہو یہ مہینہ کون سا مہینہ ہے؟"

سب لوگوں نے مل کر جواب دیا: "یہ مہینہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے اور حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے۔"

پیغمبر اسلامؐ نے دریافت کیا: "آیا جانتے ہو یہ سرزمین کون سی سرزمین ہے؟"

حاضرین نے یک صدا ہو کر کہا: "یہ عرفات کی مقدس سرزمین ہے یا رسول اللہؐ"

اس کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے اصلی گفتگو کا آغاز کیا۔ پہلے آپؐ نے اللہ کا نام لیا اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد شہادتیں پڑھیں پھر یوں کہنا شروع کیا:

"اے اللہ کی امت میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ہمیشہ اللہ کا خوف رکھو اور اس کی اطاعت کرو۔ میں جو کچھ کہتا ہوں غور سے سنو اور اس پر عمل بھی کرو۔ شاید یہ آخری بار ہے کہ میں اس مقام پر مسلمانوں کے عظیم اجتماع میں شرکت کر رہا ہوں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ پھر تم لوگوں کے ساتھ یہاں آسکوں گا یا نہیں اور تم لوگوں سے اے اللہ کی امت! دوبارہ ملاقات ہو سکے گی یا نہیں۔ اے لوگو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے اور اس کی اطاعت کرتے رہے تو یقین رکھو کہ تمہاری جان و مال اور عزت و ناموس ہر طرح کے گزند سے اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک کہ اللہ تمہیں اپنی طرف بلا نہ لے کیونکہ تمہاری جان اسی کے قبضے میں ہے۔"

اس کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے خطبے کا موضوع تبدیل کرتے ہوئے حاضرین کو مخاطب کیا اور پوچھا: "آیا میں پیغمبر ہونے کے ناطے اپنا فرض ادا کر سکا ہوں یا نہیں؟ اے اللہ تو ہی بتا کہ جو ذمہ داری تو نے مجھے سونپی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں؟"

حاضرین نے یک صدا ہو کر جواب دیا: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اپنا فرض پورا کر دیا۔"

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "اے لوگو! میں جو کہتا

ہوں اس پر عمل کرو اور تم لوگوں کے لئے میری نصیحت ہے کہ جس کسی کے پاس کوئی امانت ہے تو وہ اسے اصلی حالت میں لوٹا دے اور کبھی بھی امانت میں خیانت نہ کرے۔ اے لوگو! ربا سے پرہیز کرو۔ زمانہ جاہلیت کی رباخوری اسلام میں منع ہے لیکن تمہارا مال اور تمہاری دولت تم پر حلال ہے۔ اللہ نے رباخوری کی ممانعت کی ہے اور پہلا شخص جسے میں رباخوری سے منع کرتا ہوں میرے چچا عباس بن عبدالمطلب ہیں۔

اے لوگو! اگر کوئی شخص کسی کے قتل کا مرتکب ہوا تو اس کی سزا بھی قتل ہی ہوگی لیکن اگر کوئی قتل غیرارادی طور پر واقع ہو جائے تو قاتل کو دیت کی صورت میں ایک سو اونٹ ادا کرنا ہوں گے۔ تاہم غیرارادی قتل کے سلسلے میں ایک سو اونٹ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے اور جو کوئی ایسا کرے تو جان لے کہ اس نے دور جاہلیت کی رسومات کی پیروی کی ہے۔"

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک بار پھر پوچھا: "آیا میں اپنا فرض ادا کرسکا ہوں یا نہیں۔ اے اللہ! تو ہی بتا جو ذمہ داری تو نے مجھے سونپی وہ پوری ہوئی یا نہیں؟"

لوگوں کے جم غفیر نے باصدائے بلند جواب دیا: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اپنا فرض بحسن و خوبی انجام دیا۔"

حضرت محمد ﷺ نے خطبہ جاری رکھا اور فرمایا: "اے لوگو! جان لو کہ آج ابلیس بہت سیخ پا ہے کیونکہ وہ جان چکا ہے کہ اب تمہاری سرزمین میں یعنی اسلام کی سرزمین میں اس کی بات ماننے والا کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی اس کی پیروی کرنے کو تیار ہے۔ مگر اے لوگو! مت بھولو کہ شیطان ہمہ وقت تمہارے تعاقب میں ہے۔ وہ کوشش کرے گا کہ تمہیں ایسے راستے دکھائے جو گمراہی پر ختم ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تمہارے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرسکتا لیکن وہ کوشش کرے گا کہ دوسرے کاموں خاص طور پر فروعات میں مداخلت کرے۔ لہٰذا تم لوگ ہمیشہ ہوشیار رہو اور شیطان سے بچتے رہو حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بے اہمیت کاموں میں بھی حزم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو

تاکہ شیطان بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں میں مداخلت کر کے تمہارے دین کی جڑیں کھوکھلی نہ کر سکے۔ اے لوگو! ایک عام مہینے کو حرمت والے مہینوں میں جگہ دینا وہ بدعت ہے جسے بے دین لوگوں نے اپنایا تھا چنانچہ وہ گمراہ ہوئے۔ انہوں نے اس مہینے کو ایک سال تو عادی جانا جبکہ دوسرے سال اسی مہینے کو حرمت والے مہینوں میں شمار کیا۔ اسلام کے مہینے وہی ہیں جو اللہ نے معین کئے ہیں اور اللہ کی کتاب میں بھی جن کا ذکر ہوا ہے یعنی سال میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت والے (ماہ حرام) ہیں اور ان چار مہینوں میں تین مہینے پیاپے آتے ہیں جو ذیقعدہ' ذی الحجہ اور محرم کے مہینے ہیں جبکہ چوتھا مہینہ رجب ہے جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان واقع ہے۔

اے لوگو! اب میں تمہاری عورتوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری عورتیں تم پر حق رکھتی ہیں اور تم بھی ان پر حق رکھتے ہو۔ ان کا فرض ہے کہ تمہاری عزت اور ناموس کی حفاظت کریں اور جنہیں تم پسند نہیں کرتے انہیں گھر میں نہ آنے دیں۔ اگر وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کریں تو اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ ان سے دوری اختیار کرو اور بوقت ضرورت مارو بھی لیکن شدت سے نہیں۔ اگر وہ اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیں تو ان کے لئے اچھی غذا اور مناسب لباس فراہم کرو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی عورتوں سے بہترین سلوک روا رکھو اور ان کے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آؤ۔ تمہاری عورتیں تمہارے پاس اللہ کی امانت ہیں اور تمہیں یہ اجازت ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق ان سے نزدیکی کرو (یعنی شرع دین کے مطابق ان سے نکاح کرو) اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اپنی عورتوں سے نہایت اچھا برتاؤ رکھو۔"

یہاں پیغمبر اسلام ﷺ نے پھر استفسار کیا: "آیا میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے؟ اے اللہ تو ہی فیصلہ کر کہ جو ذمہ داری تو نے مجھے سونپی وہ پایہ تکمیل کو پہنچی یا نہیں؟"

حاضرین نے یک زبان ہو کر جواب دیا: "یا رسول اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اپنا فرض نبھا دیا۔"

تب حضرت محمد ﷺ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "اے لوگو! جو ایمان لائے اور اسلام میں داخل ہوئے وہ آپس میں بھائی ہیں اور ایک بھائی کا مال دوسرے بھائی کی دسترس سے محفوظ ہونا چاہیے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے مال میں دست اندازی نہیں کر سکتا مگر یہ کہ پہلے اس کی رضامندی حاصل کر لے۔ اے لوگو! میرے بعد ایک دوسرے کی جان کے دشمن نہ بن جانا اور ایک دوسرے کی گردن زنی پر مت اتر آنا بلکہ اسلامی اخوت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا اور تمہارے درمیان میں نہیں رہوں گا لیکن میرے بعد اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت تمہاری راہنمائی کرتی رہے گی اور تمہیں گمراہ ہونے سے بچاتی رہے گی۔ آیا میں نے اپنا فرض پورا کر دیا یا نہیں۔ اے اللہ! تو ہی بتا کہ جو ذمہ داری تو نے مجھے سونپی تھی وہ پایہ تکمیل کو پہنچی یا نہیں؟"

حاضرین نے ایک بار پھر والہانہ انداز میں جواب دیا: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔"

پیغمبر اسلام ﷺ نے خطبہ جاری رکھا "اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا جد بھی ایک ہی تھا۔ سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے چنانچہ تم سب کا خمیر ایک ہے اور وہ ہے مٹی۔ تم میں سے کوئی کسی دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا بلکہ اللہ کے نزدیک برتر وہی ہے جس کے دل میں خوف اللہ ہو۔ کوئی عرب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کسی غیر عرب پر برتری رکھتا ہے بلکہ برتر وہی ہے جو متقی اور پرہیز گار ہو۔"

پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا: "آیا میں اپنا فرض پورا کر سکا ہوں یا نہیں۔ اے اللہ! تو ہی بتا جو ذمہ داری تو نے مجھے سونپی وہ تکمیل کو پہنچی یا نہیں؟"

حاضرین نے گزشتہ کی طرح یک زبان ہو کر جواب دیا: "ہم گواہی دیتے ہیں یا رسول اللہؐ کہ

آپؐ نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔“

”اے لوگو!“ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ جاری رکھا۔ ”جو لوگ یہاں حاضر ہیں میری باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں تاکہ سارے مسلمانوں تک میری بات پہنچ جائے۔ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کے لئے اس کی میراث سے ایک حصہ مقرر فرمایا ہے جو اسے ضرور ملنا چاہئے۔ لہٰذا ایسی وصیت مت کرنا کہ ایک وارث کو اس کے حصے سے زیادہ ملے۔ اگر کسی اجنبی کے لئے وصیت کرنا چاہو تو یاد رکھو کہ ایک اجنبی کا حصہ، جو تمہارا رشتہ دار بھی نہیں تمہاری وراثت کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ اے لوگو! طفل صغیر اس کی ماں سے متعلق ہے اور جو مرد زنائے محصنہ کا مرتکب ہو تو اسے سنگسار کر دیا جائے۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کو اپنا باپ کہے یا کوئی اپنے آقا کے علاوہ کسی اور کو آقا جانے تو ایسا شخص اللہ کی لعنت سے دوچار ہو گا۔ فرشتے اور انسان بھی اس پر لعنت بھیجیں گے اور قیامت کے دن ایسے شخص کا دیہ اور فدیہ قبول نہ ہو گا۔“

آخر میں پیغمبر اسلام ﷺ نے السلام علیکم یعنی ”تم پر امن و سلامتی ہو“ کے الفاظ کے ساتھ اپنا خطبہ اختتام کو پہنچایا۔ اس خطبے نے وہاں موجود لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ بعض اسلامی تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس دن ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان جبل الرحمہ میں جمع تھے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی آواز سن رہے تھے۔ جب حضرت محمد ﷺ خطبہ دینے میں مصروف تھے تو حاضرین باصدائے بلند انؐ کے الفاظ دہراتے خاص طور پر جب پیغمبر اسلام ﷺ اپنے فرض کی ادائیگی کے بارے میں استفسار کرتے اور حاضرین ”من حیث المجموع“ جواب دیتے تو ایسا روح پرور منظر وجود میں آتا جو دلوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیتا تھا۔ جب ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان یک صدا ہو کر پیغمبر اسلام ﷺ کے سوال کا جواب دیتے تو یوں لگتا جیسے پہاڑ اور صحرا کپکپا رہے ہوں۔ جن لوگوں نے اس دن پیغمبر اسلام ﷺ کا خطبہ سنا تو وہ اسے زندگی

کے آخری دن تک نہ بھلا سکے گویا اس خطبے کے الفاظ ان کی ہستی کے ذرے ذرے میں پیوست ہو چکے تھے۔

آج جب ہم اس خطبے کو پڑھتے ہیں تو گرچہ ہم یورپی باشندے ہیں اور ہم نے پیغمبر اسلام ﷺ کی آواز نہیں سنی اور نہ ہی ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے یہ خطبہ سنا لیکن اس کے باوجود اس خطبے کے الفاظ ہمیں بہت متاثر کرتے ہیں لہٰذا ان لوگوں کی تو بات ہی علیحدہ ہے جنہوں نے بلاواسطہ پیغمبر اسلام ﷺ کی آواز سنی اور اس باشکوہ منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ جزیرۃ العرب میں کلام کی وہ اہمیت ہے کہ ایک عرب باشندہ "کلام و بیان" سے جو چیز استنباط کرتا ہے اسے ہم یورپی لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

بالائے ذکر خطبے کو "حج البلاغ" بھی کہتے ہیں کیونکہ ان احکام کے علاوہ جنہیں پیغمبر اسلام ﷺ نے ابلاغ کیا تو "بلغت" کا کلمہ بھی استفہام کے طور پر استعمال کیا یعنی آیا میں نے اپنا فرض پورا کر دیا یا نہیں لیکن اکثر مسلمان اس خطبے کو خطبہ حج الوداع کے نام سے پہچانتے ہیں اور آج تک یہ خطبہ اسی نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ اسلام میں انتہائی اہمیت اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا اور آج بھی سارے پڑھے لکھے مسلمانوں کو یہ خطبہ زبانی یاد ہے یا اس کے مضمون سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔



رسول اللہ ﷺ کی علالت

مدینہ پہنچنے کے بعد ایک مہینے تک پیغمبر اسلام ﷺ کی صحت بحال رہی پھر آپؐ
یل ہو گئے۔ تاہم آپ کی بیماری ایسی نوعیت کی تھی کہ آپ بعض اوقات گھر سے باہر
لتے اور مسجد میں جا کر نماز ادا کر سکتے تھے۔ جن دنوں پیغمبر اسلام ﷺ بذات خود مسجد
ں نہ آسکتے تو ان کی جگہ حضرت ابو بکرؓ امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بعض تذکرہ
یسوں نے حضرت علیؓ کی طرف سے امامت کئے جانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جب بھی حضرت
بو بکرؓ یا حضرت علیؓ مسجد میں قرآن کی تلاوت کرتے اور پیغمبر اسلام ﷺ اپنے گھر میں
ن کی آواز سنتے تو اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ پھر آپؐ خود بھی مسجد میں پڑھی جانے والی آیات
لو دہرانے لگتے۔

جب تک پیغمبر اسلام ﷺ دوسروں کی مدد سے چل سکتے تھے تو مسجد جانے سے
ریغ نہ کرتے اور گرچہ آپ دو افراد کا سہارا لے کر چلنے پر مجبور تھے مگر مسجد ضرور جاتے
اکہ فریضہ نماز بجالائیں اور عام مسلمانوں سے ملاقات بھی کر سکیں۔ ایک دن پیغمبر اسلام
ﷺ نے عام مسلمانوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "اے بھائیو بہت جلد ایک شخص جو
نہیں بہت چاہتا ہے تمہارے درمیان سے چلا جائے گا" جو لوگ مسجد میں حاضر تھے یہ بات

سن کر بے اختیار رو دیئے کیونکہ وہ ان الفاظ کا مطلب سمجھ چکے تھے اور جان گئے تھے کہ جو انہیں بہت چاہتا ہے اور ان کے درمیان میں سے چلا جائے گا وہ ان کا محبوب پیغمبر ہی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے ان لوگوں کو دلاسا دیا اور بولے کہ گریہ زاری مت کرو۔ ہم سب مشیت الٰہی کے سامنے بے بس اور تسلیم ہیں۔

البتہ بیماری کے دوران اگر پیغمبر اسلام ﷺ کی طبیعت قدرے سنبھل جاتی تو آپ رات کے وقت اپنے گھر سے نکل کر قبرستان جنت البقیع کی طرف روانہ ہو جاتے جہاں کچھ مسلمانوں' خاص طور پر جنگ احد کے شہداء کی قبریں تھیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا معمول تھا کہ رات گئے تک قبرستان میں ٹھہرے رہتے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جب آپ شہدائے احد کی قبروں پر پہنچتے تو کن سوچوں میں ڈوب جاتے تھے لیکن جب بھی مسجد جاتے تو عام مسلمانوں سے بھی کہتے کہ بھائیو اور بہنو اگر مجھ سے کسی کے بارے میں کوئی زیادتی ہو گئی ہے تو میں اس کا بدلہ چکانے کو تیار ہوں۔ جو بھی مجھ سے قصاص لینا چاہے لے سکتا ہے۔ اگر میں نے کسی کو مارا ہے تو آئے اور اپنا بدلہ لے لے۔ میں اس کی ضرب دریافت کرنے کے لئے اپنی پیٹھ خم کر دوں گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا گھر' وہی گھر جہاں آپ نے زندگی کے آخری لمحات گزارے مسجد مدینہ کے قریب تھا۔ یہ ایک منزلہ گھر گرمیوں کے موسم میں بے تحاشا تپنے لگتا تھا۔ گھر کے چاروں طرف صحن تھا جہاں کچھ بکریاں چرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک دن صبح کے وقت پیغمبر اسلام ﷺ کی حالت بہت بگڑ گئی۔ انہوں نے اپنے اقرباء سے کہا کہ وہ جائیں اور مدینہ کے سات مختلف کنوؤں کا پانی لے کر آئیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے اقرباء پانی کی تلاش میں نکلے اور سات مختلف کنوؤں کا پانی سات برتنوں میں لے کر حاضر ہو گئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر برتن سے ایک گھونٹ پیا پھر کچھ دیر کے بعد انہوں نے بتایا کہ ان کی طبیعت قدرے بہتر ہو گئی ہے۔

ہمیں (مخاطب یورپی قارئین ہیں) اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے کیونکر سات کنوؤں کا پانی طلب کر کے اپنا معالجہ کرنا چاہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرب باشندے کی نظر میں پانی ہی اس کی بہترین دوا ہے۔ پانی کی اہمیت ایک عرب

جان سکتا ہے جو ساری عمر تشنگی سے دست و گریباں رہتا ہے۔ پانی کی قدر ہم کیا جانیں ہیں وافر مقدار میں یہ نعمت دستیاب ہے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت سے لاعلم ہیں۔ ایک عرب کی نگاہ میں نہ صرف اس کے جسم و روح کی غذا ہے بلکہ اس کے سارے دوں کی دوا بھی ہے۔ جزیرۃ العرب کی سوزاں سرزمین پر جب کوئی بیمار پڑ جاتا تو اس کا ج پانی سے ہی کیا جاتا تھا۔

(آج بیسویں صدی کے آخری عشرے میں جدید علمی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو لی ہے کہ انسان کی بہت سے بیماریوں کا علاج صرف پانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ اج میں نزلہ، زکام جیسی عام بیماریوں سے لے کر معدے کے جملہ امراض، بلڈ پریشر، قلبی راض اور حتیٰ کہ بعض سرطانی بیماریوں کا علاج بھی شامل ہے۔ یہ تحقیقات امریکہ جیسے تی یافتہ ملک میں انجام پائی ہیں اور اس سلسلے میں اب تک مختلف بین الاقوامی سیمینار بھی معقد ہو چکے ہیں۔ خلیل)

بہر حال اس دن جب سات کنوؤں کا پانی پینے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کو افاقہ سوس ہوا تو آپؐ نے مسجد جانے کی خواہش ظاہر کی اور دو افراد کی مدد سے مسجد کی طرف وانہ ہو گئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ چاہتے تھے کہ ایک بار پھر عام مسلمانوں سے ملاقات ریں۔ آپؐ نے اس دن بھی اپنے وہی الفاظ دہرائے کہ اگر کسی کو مجھ سے کوئی شکایت ہے تو اس کا برملا اظہار کرے میں ہر طرح سے اس کی شکایت دور کرنے کو تیار ہوں۔ اے گو! اگر میں نے کسی پر ضرب لگائی ہے یا کسی کی توہین کی ہے تو آگے آئے اور اپنا بدلہ لے لے اور اس بات سے قطعی خوفزدہ نہ ہو کہ مجھ پر ضرب لگانے یا میری اہانت کرنے سے میری بدنامی ہو گی۔ ایسا بالکل نہیں بلکہ میری نظر میں دنیا کی بدنامی آخرت کی رسوائی کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ اپنی اپنی یادداشت کو ٹٹولیں اور جستجو کریں کہ آیا میں نے ان سے کوئی ادھار لیا ہے؟ اگر ں ان کا مقروض ہوں تو آئیں اور اپنی طلب وصول کر لیں۔ حاضرین میں سے ایک شخص ٹھا اور بولا: "یا رسول اللہؐ! آپ نے مجھ سے تین درہم لئے تھے"۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے فوراً اس شخص کا قرضہ چکا دیا پھر موضوع سخن بدلتے ہوئے اسامہؓ کے بارے میں گفتگو

کرنے لگے۔

اسامہؓ زید بن حارثؓ کے فرزند تھے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ زیدؓ ابتداء میں پیغمبر اسلام ﷺ کے غلام تھے لیکن آپ نے انہیں آزاد کر دیا تھا۔ زیدؓ بن حارث کا تعلق قبیلہ "بنی کلب" سے تھا۔ وہ ابھی کمسن تھے کہ ایک لڑائی میں اسیر ہو گئے اور ایک شخص حکیم بن حزا نے انہیں اپنی پھوپھی زاد بہن خدیجہ بنت خویلد کے لئے خرید لیا۔ یہ وہی خدیجہ (رضی اللہ عنہا) ہیں جو چالیس سال کی عمر میں زوجہ پیغمبر بنیں اور انہوں نے زیدؓ بن حارث کو حضرت محمد ﷺ کے سپرد کر دیا۔ لیکن آپ نے انہیں نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ اپنی فرزندی میں بھی لے لیا اور مکہ کے باشندے زید بن حارث کو زید بن محمدؐ کے نام سے پکارنے لگے۔ یہ نام اس وقت تک زبان زد عام رہا جب تک کہ اللہ کی طرف سے ایک آیت نازل نہ ہو گئی۔ یہ آیت آج قرآن کی ۳۳ ویں سورۃ "الاحزاب" میں شامل ہے۔ مذکورہ آیت میں یہ تاکید ہوئی ہے کہ زید بن حارث کو زید بن محمدؐ کے نام سے نہ پکارا جائے۔ گو کہ پیغمبر نے انہیں اپنی فرزندی میں لے رکھا ہے مگر وہ حضرت محمد ﷺ کی حقیقی اولاد نہیں۔ مذکورہ آیت میں گرچہ زیدؓ بن حارث کا نام ذکر نہیں ہوا لیکن اس آیت کا ایک حصہ انہی کے بارے میں نازل ہوا ہے۔

زیدؓ بن حارث جنگ موتہ میں شہید ہوئے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی بیماری کے دنوں میں ان کے فرزند اسامہؓ کو شام کی افواج کا مقابلہ کرنے والی اسلامی سپاہ کا کماندار مقرر کیا۔ اس وقت اسامہؓ کی عمر صرف اکیس برس تھی۔ یہ بات بعض معمر سرداروں پر گراں گزری۔ گو کہ اس لمحہ وہ لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کے احترام میں کچھ نہ بولے مگر بعد میں اپنی ناگواری کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ یہ اکیس سالہ نوجوان ملک شام کی عظیم فوج کا مقابلہ کیسے کرے گا۔ آیا اس میں سپہ سالاری کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟

پیغمبر اسلام ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپؐ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس بنا پر اسامہ بن زید کو سپہ سالار مقرر کیا ہے کہ وہ زید کا بیٹا ہونے کے علاوہ ایک بہادر اور قابل نوجوان ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں سپہ سالاری کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اسامہؓ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے باعث جنگی کارروائی مکمل نہ کر سکے لیکن جب حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کے خلیفہ بنے تو انہوں نے بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے فیصلے کی پابندی کرتے ہوئے اسامہؓ کو قشون اسلام کی سپہ سالاری سونپ کر شام کی جانب روانہ کر دیا۔ اسامہؓ شام پہنچے، مقابلہ آرائی کی، فتح یاب ہوئے اور یہ ثابت ہو گیا کہ اس نوجوان پر پیغمبر اسلام ﷺ کو جو اعتماد تھا وہ بے بنیاد نہیں تھا۔ شام میں اسامہؓ کی فتح نے اسلام کے لئے اس ملک کے دروازے کھول دیئے اور حضرت عمرؓ کی خلافت میں شام کا پورا علاقہ اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔

جس دن حضرت محمد ﷺ نے اسامہؓ کے بارے میں گفتگو کی تو آخر میں اپنی بات کا رخ انصار کی طرف موڑ دیا اور بولے: "اے مہاجرو، جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے ہو، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ انصار سے، جو مدینہ کے اصلی باشندے ہیں انتہائی نیک برتاؤ کرو کیونکہ مجھے انصار پر بہت بھروسہ ہے۔ جب ہم ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے تو ان لوگوں نے ہمارے لئے بڑی قربانیاں دیں اور ازحد فداکاری کا مظاہرہ کیا لہٰذا اگر انصار سے کوئی خطا ہو جائے تو درگزر سے کام لینا کیونکہ انصار میرے لئے میرے جسم کی پوشاک کی مانند ہیں۔ انہوں نے آج تک اپنے فرائض بخوبی انجام دیئے ہیں اور اب ان پر کوئی فرض باقی نہیں رہتا مگر تم لوگوں پر ان کا بہت حق بنتا ہے۔

اے لوگو! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں اور تم مجھے سپرد خاک کر دو تو میری قبر کے سامنے سجدہ نہ کرنا چونکہ رکوع و سجود کے لائق صرف خدائے وحدہ کی ذات ہے۔ یہ کہنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ مسجد سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے اور مسجد میں موجود مسلمان اشکبار آنکھوں سے اپنے پیغمبر کو جاتا دیکھتے رہے۔

رحلت

اس سے پہلے کہ ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کے آخری دنوں کا ذکر کریں تو میں (کونسٹن ویرژیل) یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی آخری جنگ یعنی جنگ تبوک کے بارے میں کچھ گفتگو کروں۔

یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ مکہ سے واپسی پر علیل ہو گئے۔ تاہم کبھی کبھی عارضی طور پر انہیں بہبودی بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ ملک شام میں جہاں کے بعض امراء سلطنت روم کے زیر سایہ حکومت کرتے تھے' یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں چنانچہ روم کے بادشاہ نے شام کے راستے جزیرۃ العرب پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ مسلمانوں کی سرکوبی کر سکے۔

جب یہ خبر پیغمبر اسلام ﷺ تک پہنچی تو انہوں نے خود آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور گرچہ ان کی طبیعت ناساز تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے جنگ کی عام تیاری کا حکم جاری کر دیا۔ اس موقع پر مسلمانوں کے بیت المال کی حالت اچھی نہ تھی۔ خشک سالی کے باعث اشیائے خورد و نوش عنقا تھیں۔ گرمی کی شدت بھی مشکلات میں اضافہ کر رہی تھی۔ ان حالات کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق سپاہ اسلام کی مدد کرے اور ہر مسلمان مرد اگر بضاعت رکھتا ہے تو اپنے لئے جنگی ہتھیار خود ہی فراہم کرے۔

مسلمانوں میں سے ایک شخص عبدالرحمان بن عوفؓ سپاہ اسلام کے لئے چار ہزار درہم لائے اور کہنے لگے "یا رسول اللہؐ! میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے۔ میں چار ہزار درہم اپنے بیوی بچوں کے لئے چھوڑ آیا ہوں اور بقیہ رقم آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں تاکہ قشون اسلام کے کام آ سکے"۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں دعا دی کہ اللہ تیرے اس مال میں جو تو سپاہ اسلام کے لئے لایا ہے اور اس مال میں بھی جو تو اپنے اہل و عیال کے لئے چھوڑ آیا ہے برکت عطا کرے۔ بعد میں عبدالرحمان بن عوف اتنے مالدار ہو گئے کہ جب انہوں نے وفات پائی تو ان کی بیویوں میں سے ہر ایک کے حصے میں اسی ہزار مثقال سونا آیا جبکہ ہر زوجہ کا حصہ ان کی کل جائیداد کا آٹھواں حصہ تھا۔ یاد رہے کہ ان کی چار بیویاں بھی تھیں (اسی ہزار مثقال یعنی ہر زوجہ کے حصے میں تقریباً" ۳۴۰ کلو سونا آنا قدرے مبالغہ آمیز دکھائی دیتا ہے۔ معلوم نہیں کونسٹن ویرژیل نے یہ اعداد کہاں سے حاصل کئے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ اپنے دور کے مالدار ترین افراد میں شمار

ہوتے تھے۔ غالباً" یورپی مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ رسول گرامی ﷺ کی دعا کے اثر سے بہت دولت مند بن گئے تھے۔ خلیل)

حضرت عمرؓ بھی اپنا آدھا مال لے آئے جبکہ ابوبکرؓ کے پاس جو کچھ تھا اسے سمیٹ کر پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پیش ہو گئے۔ حضرت محمد ﷺ کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ "میں اپنے گھر میں اپنے اللہ اور رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں"۔ ایک اور مسلمان عاصم بن عدی نے، جن کے پاس نقد رقم نہیں تھی ایک سو "وسق" کھجوریں پیش کیں اور ابو عقیل، جن کا تعلق انصار سے تھا دو "صاع" کھجوریں لے آئے اور کہنے لگے "یا رسول اللہ! میرے پاس یہی دو صاع کھجوریں تھیں جن میں سے ایک آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں تاکہ مسلمان بھائیوں کے کام آسکیں۔

(وضاحت: صاع وزن کا پیمانہ تھا جو ہمارے آج کے تین کلو کے برابر ہے اور ایک وسق ساٹھ صاع کے برابر ہوتا تھا۔ خلیل)

بہرحال مسلمانوں نے حقیقی معنوں میں ایثار اور قربانی کا بے مثال نمونہ پیش کیا اور اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کے علاوہ جو کچھ ان کے پاس تھا اسے اسلام کی راہ میں نچھاور کر دیا اور یوں تیس ہزار افراد پر مشتمل ایک باایمان اور طاقتور فوج وجود میں آئی کہ جس میں دس ہزار سوارہ سپاہی بھی شامل تھے۔ جب اسلام کا یہ عظیم لشکر منظم صفوں میں مدینہ سے شام کی طرف روانہ ہوا تو ان کی حرکت کا یہ منظر اس وقت کی تاریخ اسلام میں اپنی مثال آپ تھا اور مسلمانوں نے اتنا باشکوہ منظر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

جب یہ لشکر شام کی سرحدوں پر پہنچا تو مقامی امراء اور حکمران جو رومی فوج کی مدد سے سرزمین اسلام پر حملہ کرنے کی سوچ رہے تھے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنی جان بچانے کی خاطر شام کی سرحدوں میں گھس گئے۔ حتیٰ کہ رومی فوج بھی جو مقامی حکمرانوں کی شہہ پر مسلمانوں پر حملہ کرنے آئی تھی عقب نشینی پر مجبور ہو گئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کچھ عرصہ تک شام کی سرحدوں کے پاس ٹھہرے رہے اور اس دوران میں انہوں نے مختلف قبائل اور مقامی مذہبی رہنماؤں کو جو عموماً" مسیحی تھے اپنا مطیع بنا لیا یعنی وہ لوگ مسلمانوں کو جزیہ دینے پر رضامند ہو گئے۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ اپنی طاقتور سپاہ

کے ہمراہ مدینہ واپس آ گئے اور چونکہ شام کی سرحدوں کے پاس اسلامی فوج کا مرکز ایک قلعہ تھا جو تبوک کے نام سے شہرت رکھتا تھا چنانچہ اسی مناسبت سے یہ فوج کشی جنگ تبوک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اگرچہ جنگ تبوک میں پیغمبر اسلام ﷺ نے لڑائی نہیں کی تاہم ان کی فوج کشی سے مختلف قبائل اور شام کے سرحدی حکمرانوں پر اسلام کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ عدم جارحیت یا بے طرفی کا معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ روم کی کیل کانٹوں سے لیس طاقتور فوج بھی مسلمانوں کا سامنا نہ کر سکی اور پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔

جنگ تبوک کے موقع پر جسے مسلمان غزوہ تبوک کہتے ہیں چند مسلمان اپنی آرام طلبی، کاہلی یا دنیوی لگاؤ کے سبب لشکر اسلام کے ہمراہ نہیں گئے۔ یہ لوگ ابولبابہ، اوس بن ثعلبہ اور ودیعہ بن حرام تھے۔ سپاہ اسلام کے چلے جانے کے بعد یہ تینوں اپنے کئے پر نادم ہوئے اور جب حضرت محمد ﷺ مدینہ واپس پہنچے تو انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا اور کہنے لگے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ ہمیں معاف نہیں کریں گے تو ہم اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی عادت تھی کہ جب بھی سفر سے لوٹتے تو مسجد میں جاکر دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ اس دن تبوک سے واپسی پر جب حضرت محمد ﷺ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں داخل ہوئے تو آپؐ نے دیکھا کہ تین افراد مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے دریافت کیا ”تم لوگوں نے اپنے آپ کو ستونوں سے کیوں باندھ رکھا ہے؟“ انہوں نے جواب دیا: ”ہم گناہگار ہیں یا رسول اللہؐ کیونکہ ہم میدان جنگ میں نہیں گئے لہٰذا جب تک آپ ہمیں معاف نہیں کریں گے تو ہم اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے خواہ ہماری جان چلی جائے“۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جواب دیا: ”بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا اللہ ہی ہے۔ میں کون ہوتا ہوں جو بندے کے گناہوں کو معاف کردوں“۔

اسی موقع پر ایک آیت نازل ہوئی جو آج قرآن کی نویں سورۃ توبہ کی ۱۰۲ویں آیت ہے۔

ترجمہ: ”(واقعہ تبوک) کے خطاکاروں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے برے

عمل کو اچھے عمل سے ملایا تو اللہ بھی ان کی توبہ قبول کرتا اور اللہ بہت بخشش کرنے والا اور رحیم ہے"۔

مندرجہ بالا آیت کی رو سے ان تین افراد کا گناہ بخش دیا گیا اور انہوں نے بھی پیغمبر اسلام ﷺ سے کہا کہ وہ شکرانے کے طور پر اپنا سارا مال اسلامی بیت المال میں دینے کو تیار ہیں۔ لیکن اللہ کی طرف سے ایک اور آیت نازل ہوئی جو اسی سورۃ یعنی سورہ توبہ میں شامل ہے۔ مذکورہ آیت کے مطابق اللہ نے اپنے رسول سے کہا کہ ان تین افراد کے مال سے صرف زکوٰۃ وصول کی جائے اور بقیہ مال انہیں لوٹا دیا جائے۔

بہرحال جنگ تبوک کی لشکر کشی کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے کسی اور جنگ میں شرکت نہیں کی لیکن آپؐ اسلام کی ترویج اور ترقی کے سلسلے میں ایک لمحہ بھی غافل نہ رہتے تھے۔ آپؐ نے بیماری کی حالت میں بھی اسامہ بن زیدؓ کو ایک فوج کی قیادت سونپ کر شام کی جانب روانہ کرنا چاہا لیکن آپ کی وفات اسامہؓ کی روانگی میں حائل ہو گئی۔ جس دن پیغمبر اسلام ﷺ مسجد گئے اور مسلمانوں سے مخاطب ہوئے تو اس کے دوسرے دن ان کی حالت مزید بگڑ گئی اور انہوں نے اپنے اقرباء کو بتایا کہ میری بیماری کا اصلی سبب وہی زہر ہے جو اس یہودی عورت نے خیبر میں مجھے دیا تھا (جس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں) اس زہر کی وجہ سے میں کبھی کبھار بیمار ہو جاتا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ نڈھال ہو کر بستر بیماری سے لگ جاؤں لیکن اب یوں لگتا ہے جیسے میں کبھی بھی نہ اٹھ سکوں گا۔

ان دنوں کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ شدید بیمار تھے اور گھر سے مسجد تک بھی نہ آ سکتے تھے تو بعد تذکرہ نویسوں کے مطابق حضرت علیؓ ان کی جگہ نماز پڑھاتے تھے جبکہ اکثر اسلامی مؤرخین کے بقول حضرت ابوبکرؓ امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ایک دن جب عارضی طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کی طبیعت سنبھلی تو وہ اپنے چچا عباسؓ کے دو بیٹوں کی مدد سے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت عباسؓ کے دونوں بیٹوں نے حضرت محمد ﷺ کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ اسی حالت میں مسجد میں داخل ہوئے۔ اس لمحہ حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کو خطبہ دے رہے تھے۔ ان کی نظر پیغمبر اسلام ﷺ پر پڑی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی جگہ آپ کو دینی چاہی لیکن آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے

انہیں بیٹھنے کو کہا اور چونکہ آپؐ پر شدید نقاہت طاری تھی لہٰذا عباسؓ کے دو بیٹوں کے سہارے مسجد سے نکل کر اپنے حجرے میں واپس آ گئے۔

جیسا کہ ایک بار پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہم حضرت محمد ﷺ کی بیماری یا اس کی نوعیت کے بارے میں اظہار نظر نہیں کر سکتے کیونکہ اسلامی مؤرخین نے پیغمبر اسلام ﷺ کی بیماری کی علامات نہیں بیان کیں تاکہ ان کی مدد سے یہ معلوم ہو سکے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو کیا عارضہ لاحق تھا لہٰذا اس سلسلے میں جو کچھ کہا جائے اس کی وقعت محض ایک مفروضے سے زیادہ نہ ہو گی۔

بہر طور ہجرت کے گیارہویں سال ربیع الاول کے مہینے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی علالت شدت اختیار کر گئی اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ وہ جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ معاً انہیں یاد آیا کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے پاس سات دینار رکھوائے تھے۔ اسلام کے پیامبر اور سرزمین اسلام کے عظیم فرمانروا کی ساری پونجی یہی سات دینار تھے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو بلوایا اور پوچھا: ”وہ سات دینار جو میں نے تمہیں دیئے تھے کیا اب بھی موجود ہیں؟“

”جی ہاں موجود ہیں“ زوجہ پیغمبر نے جواب دیا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا ”وہ سات دینار غریب لوگوں میں تقسیم کر دو چونکہ مجھے ایسی حالت میں اللہ کے سامنے جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ دنیا کے مال سے سات دینار میرے پاس موجود ہوں!“

ہجرت کے گیارہویں سال ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو بروز سوموار پیغمبر اسلامؐ کی طبیعت پہلے سے زیادہ بگڑ گئی۔ واضح رہے کہ جہاں تک اسلامی روایات سے پتہ چلتا ہے پیغمبر اسلام ﷺ نے دورہ علالت میں کبھی دوا استعمال نہیں کی۔ تاہم بارہ ربیع الاول یا اس سے ایک دن پہلے انہیں کچھ دوا کھلائی گئی۔ البتہ آپؐ کو دوا کھانے میں ہمیشہ کراہت محسوس ہوتی تھی۔

آخری فرمائش جو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے اہل خاندان سے کی، یہ تھی کہ انہیں مسواک دی جائے تاکہ وہ دانتوں کی صفائی کر سکیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت محمد ﷺ صفائی اور پاکیزگی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور آپؐ ہی کا یہ قول ہے کہ

عمل کو اچھے عمل سے ملایا تو اللہ بھی ان کی توبہ قبول کرتا اور اللہ بہت بخشش کرنے والا اور رحیم ہے"۔

مندرجہ بالا آیت کی رو سے ان تین افراد کا گناہ بخش دیا گیا اور انہوں نے بھی پیغمبر اسلام ﷺ سے کہا کہ وہ شکرانے کے طور پر اپنا سارا مال اسلامی بیت المال میں دینے کو تیار ہیں۔ لیکن اللہ کی طرف سے ایک اور آیت نازل ہوئی جو اسی سورۃ یعنی سورہ توبہ میں شامل ہے۔ مذکورہ آیت کے مطابق اللہ نے اپنے رسول سے کہا کہ ان تین افراد کے مال سے صرف زکوٰۃ وصول کی جائے اور بقیہ مال انہیں لوٹا دیا جائے۔

بہرحال جنگ تبوک کی لشکر کشی کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے کسی اور جنگ میں شرکت نہیں کی لیکن آپؐ اسلام کی ترویج اور ترقی کے سلسلے میں ایک لمحہ بھی غافل نہ رہتے تھے۔ آپؐ نے بیماری کی حالت میں بھی اسامہ بن زیدؓ کو ایک فوج کی قیادت سونپ کر شام کی جانب روانہ کرنا چاہا لیکن آپ کی وفات اسامہؓ کی روانگی میں حائل ہو گئی۔ جس دن پیغمبر اسلام ﷺ مسجد گئے اور مسلمانوں سے مخاطب ہوئے تو اس کے دوسرے دن ان کی حالت مزید بگڑ گئی اور انہوں نے اپنے اقرباء کو بتایا کہ میری بیماری کا اصلی سبب وہی زہر ہے جو اس یہودی عورت نے خیبر میں مجھے دیا تھا (جس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں) اس زہر کی وجہ سے میں کبھی کبھار بیمار ہو جاتا تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ نڈھال ہو کر بستر بیماری سے لگ جاؤں لیکن اب یوں لگتا ہے جیسے میں کبھی بھی نہ اٹھ سکوں گا۔

ان دنوں کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ شدید بیمار تھے اور گھر سے مسجد تک بھی نہ آ سکتے تھے تو بعد تذکرہ نویسوں کے مطابق حضرت علیؓ ان کی جگہ نماز پڑھاتے تھے جبکہ اکثر اسلامی مؤرخین کے بقول حضرت ابوبکرؓ امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ایک دن جب عارضی طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کی طبیعت سنبھلی تو وہ اپنے چچا عباسؓ کے دو بیٹوں کی مدد سے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت عباسؓ کے دونوں بیٹوں نے حضرت محمد ﷺ کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ اسی حالت میں مسجد میں داخل ہوئے۔ اس لمحہ حضرت ابوبکرؓ مسلمانوں کو خطبہ دے رہے تھے۔ ان کی نظر پیغمبر اسلام ﷺ پر پڑی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی جگہ آپ کو دینی چاہی لیکن آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے

انہیں بیٹھنے کو کہا اور چونکہ آپؐ پر شدید نقاہت طاری تھی لہٰذا عباسؓ کے دو بیٹوں کے سہارے مسجد سے نکل کر اپنے حجرے میں واپس آ گئے۔

جیسا کہ ایک بار پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہم حضرت محمد ﷺ کی بیماری یا اس کی نوعیت کے بارے میں اظہار نظر نہیں کر سکتے کیونکہ اسلامی مؤرخین نے پیغمبر اسلام ﷺ کی بیماری کی علامات نہیں بیان کیں تاکہ ان کی مدد سے یہ معلوم ہو سکے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو کیا عارضہ لاحق تھا لہٰذا اس سلسلے میں جو کچھ کہا جائے اس کی وقعت محض ایک مفروضے سے زیادہ نہ ہو گی۔

بہر طور ہجرت کے گیارہویں سال ربیع الاول کے مہینے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی علالت شدت اختیار کر گئی اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ وہ جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ معاً انہیں یاد آیا کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے پاس سات دینار رکھوائے تھے۔ اسلام کے پیامبر اور سرزمین اسلام کے عظیم فرمانروا کی ساری پونجی یہی سات دینار تھے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو بلوایا اور پوچھا: "وہ سات دینار جو میں نے تمہیں دیئے تھے کیا اب بھی موجود ہیں؟"

"جی ہاں موجود ہیں" زوجہ پیغمبر نے جواب دیا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا "وہ سات دینار غریب لوگوں میں تقسیم کر دو چونکہ مجھے ایسی حالت میں اللہ کے سامنے جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ دنیا کے مال سے سات دینار میرے پاس موجود ہوں!"

ہجرت کے گیارہویں سال ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو بروز سوموار پیغمبر اسلامؐ کی طبیعت پہلے سے زیادہ بگڑ گئی۔ واضح رہے کہ جہاں تک اسلامی روایات سے پتہ چلتا ہے پیغمبر اسلام ﷺ نے دورہ علالت میں کبھی دوا استعمال نہیں کی۔ تاہم بارہ ربیع الاول یا اس سے ایک دن پہلے انہیں کچھ دوا کھلائی گئی۔ البتہ آپؐ کو دوا کھانے میں ہمیشہ کراہت محسوس ہوتی تھی۔

آخری فرمائش جو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے اہل خاندان سے کی' یہ تھی کہ انہیں مسواک دی جائے تاکہ وہ دانتوں کی صفائی کر سکیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت محمد ﷺ صفائی اور پاکیزگی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور آپؐ ہی کا یہ قول ہے کہ

صفائی نصف ایمان ہے۔

بارہ ربیع الاول بروز سوموار (آٹھ جون ۶۳۲ء) پیغمبر اسلام ﷺ کے داماد حضرت علیؓ ان کے چچا زاد بھائی ابوالفضلؓ شام جانے والی فوج کے منتخب سپہ سالار اسامہ بن زیدؓ شکران نامی ایک غلام کہ جس کا نام ابھی تک ذکر نہیں ہوا تھا اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تمام زوجات ان کی بالین پر موجود تھے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اس وقت کمسنی کے سبب یہ نہ سمجھ سکی کہ میرے خاوند موت کی آغوش میں جا رہے ہیں۔ میں بڑی معصومیت سے ان کے سرہانے بیٹھی تھی کہ اسی حالت میں ان کی روح پرواز کر گئی مگر میں پھر بھی نہ سمجھ سکی۔ یکایک عورتوں کی شیون زاری نے مجھے چونکا دیا اور جب مرد بھی اپنے چہروں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے تو اس لمحہ مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ہیں۔

جس لمحہ پیغمبر اسلام ﷺ نے زندگی کو وداع کیا تو اسلامی روایات کے مطابق اسی آن مہر نبوت، جو ان کے کندھوں کے درمیان واقع تھی خود بخود محو ہو گئی چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد ان کی پیغمبری کے فرائض بھی ختم ہو چکے تھے۔

جب پیغمبر اسلام ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے پاس دنیا کے مال سے صرف ایک خچر (جو حبشہ کے بادشاہ نے "تحفتاً" پیش کیا) اور چند تلواروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اعراب میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی قائد فوت ہوتا تو اسے وہیں دفن کرتے جہاں اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی وہیں دفنانے کا فیصلہ کیا گیا جہاں پر انہوں نے وفات پائی تھی۔ یہ جگہ دراصل حضرت عائشہؓ کا حجرہ تھا۔

حضرت محمد ﷺ مکہ کے رہنے والے تھے مگر وہ مدینہ میں فوت ہوئے لہٰذا ان کے اقرباء اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ ان کی لحد مکہ کی رسم کے مطابق تیار کی جائے یا مدنی طریقے کے مطابق۔

مکہ میں میت کو دفنانے کا یہ طریقہ تھا کہ قبر کھودنے کے بعد جنازہ براہ راست اس میں رکھ دیا جاتا پھر قبر کو مٹی سے ڈھانپ دیا جاتا تھا لیکن مدینہ میں قبر کھودنے کا طریقہ کار

مختلف تھا۔ وہاں میت دفنانے کے لئے پہلے ایک گڑھا کھودا جاتا پھر اس کے اندرونی پہلو میں غار یا کھو کی شکل میں عام قبر جتنی جگہ بنائی جاتی جہاں جنازہ رکھ کر کھو کا دہانہ بند کر دیا جاتا جس کے بعد گڑھا بھی مٹی سے بھر دیا جاتا تھا۔

آخر کار پیغمبر اسلام ﷺ کے اقرباء نے فیصلہ کیا کہ دو گورکن، ایک مکی اور ایک مدنی کو بلوایا جائے کہ وہ پیغمبرؐ کے گھر آئیں اور قبر کھودنے کا کام انجام دیں۔ اگر مکی گورکن پہلے آ گیا تو حضرت محمد ﷺ کی قبر مکہ کی رسم کے مطابق کھودی جائے اور اگر مدینے کا گورکن پہلے پہنچ گیا تو لحد رسولؐ مدنی طریقے کے مطابق تیار کی جائے۔

اس دن مدنی گورکن مکی گورکن سے پہلے پہنچ گیا چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ کی لحد مدینہ کی مروجہ رسم کے مطابق تیار کی گئی۔ جب قبر تیار ہو گئی تو پیغمبر اسلامؐ کی واحد قبا انہیں پہنا دی گئی تاکہ کوئی دوسرا اسے استعمال نہ کر سکے۔ پھر آپؐ کو غسل دیا گیا کیونکہ اعراب میں یہ رسم تھی کہ دفنانے سے پہلے میت کو غسل دیتے تھے۔ آج بھی سارے مسلمان میت دفنانے سے پہلے اس رسم کی پیروی کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کو غسل دیتے وقت بقصد احترام ان کے کپڑے نہیں اتارے گئے بلکہ ان کے جسد کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا۔ پھر جسد رسولؐ کو سرخ رنگ کے کپڑے اور بعض اسلامی روایات کے مطابق سرخ رنگ کی دری یا قالین کے ٹکڑے میں لپیٹ کر قبر میں اتار دیا گیا۔ دفن کرتے وقت میت کو ایک پہلو رکھا گیا اور قبر بھی کچھ اس طرح بنائی گئی کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا رخ کعبہ کی جانب رہے۔ اس کے علاوہ جسد رسولؐ کچھ اس طرح دفن کیا گیا کہ آپؐ کے چہرے کا ایک پہلو زمین سے لگا رہے۔ پھر کھو کا دہانہ بند کرنے کے بعد گڑھے کو مٹی سے بھر دیا گیا اور ایک پودا لگا کر پانی بھی چھڑک دیا گیا۔

اعراب، مردے کو تابوت میں رکھ کر نہیں دفناتے تھے۔ نہ ہی انہیں اس بات میں دلچسپی تھی کہ جنازے کو تابوت میں رکھ کر دفنایا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کے مرنے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتی مگر وہ چیزیں جنہیں وہ اپنی زندگی میں اپنی روح کے ذریعے وجود میں لاتا ہے باقی سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔

جب مسجد میں جمع عام مسلمانوں کو یہ علم ہوا کہ پیغمبر اسلام ﷺ رحلت فرما چکے ہیں تو ان میں کہرام مچ گیا اور سب لوگ بے اختیار ہو کر رونے لگے۔ اسی لمحہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے مسجد میں قدم رکھا اور لوگوں کو روتا دیکھ کر گرجدار آواز میں بولے۔ "کیوں روتے ہو یہ شیون زاری کیا ہے؟" پھر انہوں نے اپنی تلوار بر آمد کرلی اور مجمع کو للکارتے ہوئے بولے: "جو کوئی یہ کہے کہ رسول اللہؐ فوت ہو چکے ہیں تو میں اسی تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ ہمارے رسولؐ فوت نہیں ہوئے بلکہ اللہ کے پاس گئے ہیں اور جلد ہی واپس آجائیں گے اور ہم انہیں دوبارہ دیکھ سکیں گے۔" تب حضرت ابو بکرؓ بھی مسجد میں داخل ہوئے اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے "یا عمر! خاموش رہو اور اپنی تلوار میان میں رکھ لو" پھر انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے لوگو! ہمارے رسولؐ خود یہ کہتے تھے کہ میں بھی ایک انسان ہوں تم جیسا اور ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت کی آغوش میں جانا ہوتا ہے خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے پہلے بھی جتنے پیغمبر آئے وہ سب موت کے آگے تسلیم ہوئے اور آج ہمارے پیغمبرؐ بھی زندگی کو وداع کہہ گئے ہیں لیکن اے لوگو! اگر رسول اللہؐ وفات پا چکے ہیں تو اس کے برعکس اللہ ہمیشہ زندہ ہے۔ اس کی ذات حئی و قیوم ہے اور اسے کبھی موت نہیں آتی۔"

جب حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ سنے تو خستہ حال ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ دوسرے مسلمان بھی، جو چند لمحوں کے لئے خاموش ہو چکے تھے یہ منظر دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور مسجد کی فضا ایک بار پھر آہ و فغاں کی سوزناک آوازوں میں ڈوب گئی۔

..... اور یوں رخصت ہوئی اس دنیا سے وہ ہستی جو آسمان تاریخ پر درخشندہ ستارے کی طرح جگمگاتی رہے گی۔

اللھم صل علی سیدنا و مولنا محمد و علی آل سیدنا و مولنا محمد و بارک وسلم

